

READING SECTION
Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

☆ — "قرآنی آیات کی روشنی میں" آپ کے مسائل کا حل

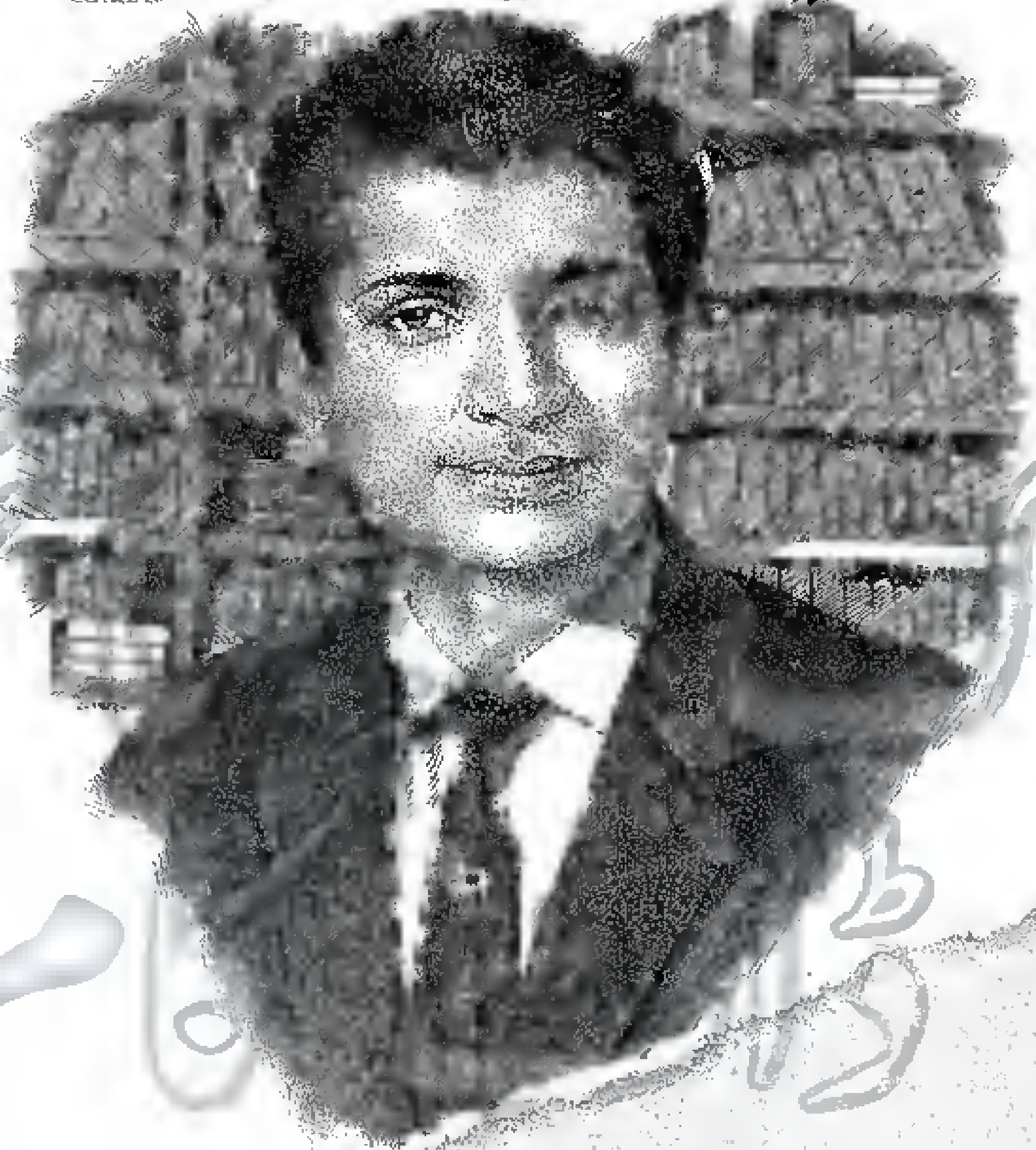
☆ — ایم اے راحت کا نیا سلسلہ اور کاشی چوہان کا ناول "زہر عشق"

Monthly SACH-C…ANIYAN Reg.No.Sc-117 July 2016 SR 12 Rs 60

فون: 021-35893121-35893122 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی، سٹی پریس، OB-7 ٹالپر روڈ، کراچی

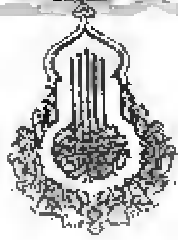
زرسالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 890 روپے افریقہ 65 ڈالر کینیڈا 71 آسٹریلیا 65 ڈالر ایشیا یورپ 55 ڈالر / 6 قانونی مشیر کے ایم ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

ہم نہیں بھولے.....



1932ء......2002ء

یہ رنگ رنگ کہانی، یہ حرف حرف فسوں
تمہارے عزم کو ہم سب سلام کرتے ہیں



عیدالفطر مبارک

ماہ رمضان اپنے اختتام کی طرف رواں دواں ہے اور عیدالفطر کی آمد آمد ہے۔ بہت خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں یہ ماہِ مقدس نصیب ہوا اور انہوں نے اپنی عبادت اور تزکیہ نفس سے رب کائنات کو راضی کیا۔ انعام کے طور پر اللہ ان نیک روحوں کو اور ان کے صدقے تمام مسلمانوں کو عیدالفطر کی خوشیاں عطا فرمائیں گے۔ ان خوشیوں میں اپنے آس پاس موجود تمام لوگوں کو شریک کرنا ضروری ہے۔ اور جس ایثار اور رواداری کا مظاہرہ ہم نے ماہِ رمضان میں کیا اسی رویے کو ساری زندگی کے لیے اپنا لینا چاہیے کیونکہ اسی میں بھلائی ہے۔ وقت کا پہیہ بہت تیز چلتا ہے اور زندگی کی دولت برق رفتاری سے خرچ ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایسے میں ہر دن، ہر گھنٹہ، ہر لمحہ اپنے رب کو راضی کرنے کی سعی کرنے میں گزارنا چاہیے یہی مومن کی معراج ہے...... میری جانب سے تمام پڑھنے والوں کو عیدالفطر مبارک......

منزہ سہام

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور ان کے جواب

پیارے ساتھیو! عید مبارک! سارا گھر سویا پڑا تھا۔ چپ چاپ دبے پاؤں گرم گرم دوپہروں میں، میں کیسے چھت پر چڑھا ٹنڈ منڈ بیری کے پیڑ پر پیر جمایا۔ بیر جیبوں میں بھرے۔ اک گلہری چٹر چوں چٹر چوں کرتی قریب آئی اسے بیر مار کر دور بھگایا۔ وہیں سے نیچے گوندنی کے چکنے تنے پر چڑھ کر گوندنیاں کھانا شروع کردیں۔ گلی سے آواز آئی۔ یار ادھر کچھ تو دے دے۔ دھڑ سے تازہ تازہ گوندنیاں اور بیر باہر پھینکے، اتنے میں انجیر کے گھنے درخت سے کوئل کوکوکرتی نظر آئی۔ وہیں پر جست لگائی اور انجیریں توڑ توڑ کر سیمنٹ کی چھت پر ڈھیر لگا ئیں، دوسرا دوست پھر درخت پر چڑھا اس نے کچے پکے آموں کا نشانہ لیا اور بس...... سب بڑے سوئے پڑے رہے اور ہمارا دن بھی تمام ہوا۔ آرام سے منہ ہاتھ دھو کر واپس سونے والے کمرے میں چلے گئے۔ سب بڑے سوئے ہی رہے...... ساتھیو! یہ میرا بچپن تھا۔ آپ کا بھی ایسا ہی ہوگا بس بے فکری کے وہ دن تو گئے۔ آج! کوئی سوچ سکتا ہے ایسی بے فکری کا۔ رمضان کی بہاریں ہی الگ تھیں۔ افطار سے پہلے جو رونق ہوتی تھی، اس کی مثال آج نہیں مل سکتی۔ آج تو گھر کا دروازہ کھلا رہ جائے تو خوف کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ کوئی فقیر بھی دروازہ بجائے تو ڈکیت کا گمان ہوتا ہے۔ سائرن بجا اور افطار کرتے ہی نئی فکریں شروع۔ عید بازار بھی ہوا ہوگئے۔ سارے ہی بزنس ٹھپ...... کیوں آخر کیوں ہے یہ خوف بھلا...... ہم نے اپنے جذبہ ایمانی کو کمزور کر دیا ہے اور اسی لیے یہ خوف ہماری آپ کی رگوں میں سرایت کر گیا ہے۔ خدا کرے کہ کوئی معجزہ ایسا ہو جائے، کہ ہم پھر سے اپنی جون میں آجائیں اور پکے، سچے والے مسلمان بن جائیں۔ اگر ایسا ہوگیا نا تو پھر دیکھیے گا ہمارے بچے، ہمارے معماران وطن پھر سے اپنا بے فکری والا بچپن پا سکیں گے اور ملک خداداد پھر سے ترقیوں پر گامزن ہو جائے گا۔

ساتھیوں! ایک بار پھر عید مبارک۔ آئیں اب محبتوں کے طلسم کدے ''احوال'' میں قدم رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے کون ہمارا مہمان ہے دیکھتے ہیں۔ اور سب سے پہلے احوال میں براجمان ہیں۔ ٹی منجن آباد سے خواجہ حسین لکھتے ہیں۔ ''سچی کہانیاں یکم جون کو موصول ہوا۔ سرورق پر کیا تبصرہ کروں دوشیزہ ثقافت کی بھرپور عکاسی کررہی تھی۔ ''احوال'' کی طرف دو قدم آگے بڑھا تو محترم اقبال حسین کے والد محترم کے انتقال کی خبر پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ شانی خامان کے بابا کی وفات پر، بہن منزل خان کے دکھ میں بھی برابر کا شریک ہوں۔ ''احوال'' میں مجید احمد جائی صاحب، بہن عظمیٰ شکور، اصغر علی رانا صاحب، بہن حنا بشریٰ، ملک عاشق حسین کا احوال اچھا تھا۔ سیدہ آسیہ عنبر گیلانی نے پہلی مرتبہ احوال میں دستک دی۔ خط مختصر تھا لیکن اچھا تھا۔ کہانیاں پڑھ کر تبصرہ کروں تو یقیناً اتنی دیر ہو جائے گی کہ میرا تبصرہ اشاعت سے محروم رہے گا۔ ہائیڈ پارک میں راحیلہ بنت مہر علی شاہ نے بہت اچھا لکھا۔ اللہ پاک بہن کو اور اچھا لکھنے کی ہمت دے اور آخر میں ان

لوگوں سے معافی کی طلب جو اچھے تبصرہ کے حقدار تھے لیکن وقت کی قلت کے باعث میں ان پر تبصرہ نہ کر سکا۔"

☆ پیارے بھائی! خوش رہو۔ تبصرے کا شکریہ۔ کہانی کے لیے بس اتنا کہنا ہے کہ باری آنے پر شائع ہو گی۔

✉: ہمارے بہت سویٹ ساتھی عبدالعزیز جی آ چکوال سے ایک عرصہ بعد شامل احوال ہیں۔ لکھتے ہیں "اک مدت کے بعد سچی کہانیاں کے در پہ دستک دے رہا ہوں۔ امید ہے نظر استحسار کی ٹھوکروں کی بجائے بنظر التفات فرمائیں گے۔ بہت دکھی ہوں اکیلا تنہا ڈرا ڈرا سہما ہوا لٹا پٹا سا۔ لگتا ہے جیسے دعاؤں کا سائبان سر سے اڑ گیا ہے۔ 25 فروری کی صبح جب ماں جی کا انتقال ہوا تو میں ان کی آخری ہچکی نہ بن سکا۔ میں ان کے پاس ہوتا تو سنتا، میں تو کوسوں دور وہاں تھا جہاں چند سال پہلے ایک نوکری کے عوض اپنی ذات گروی رکھی تھی۔ ماں کی جدائی میں بہت رویا ہوں۔ اس پاکیزہ پیکر کی آغوش میں پہلی سانس سے لے کر آج الوداعی لحہ غمگین تک کا خلاصہ آنسوؤں کی صورت آنکھوں سے بادل کی طرح برسا۔ ماں کی رفاقت میں گزرا ایک ایک پل کسی تیز دھار آلے کی طرح کلیجہ کا تار تار رہا۔ روح سسکتی رہی دل تڑپتا رہا سلگتا رہا جلتا رہا۔ کاش میں اب بچہ نہیں رہا۔ بڑا ہو گیا ہوں کیونکہ بچہ کہنے والی ہستی شہر خموشاں میں منوں مٹی تلے جا سوئی ہے۔ غم کی اس دلدوز گھڑی میں آپ نے میری والدہ کے سانحہ ارتحال کا اشتہار چھاپ کر پیارے قارئین کو آگاہ کیا میں شکر گزار ہوں آپ کا۔ اسی طرح ممتاز احمد، مجید جمالی، نبیل جاوید، حنا بشریٰ، سدرہ انور، کنزہ ملک، سونیا خان، منزل خان اور تحسین جونیجو نے اپنے خطوط میں میرے نام تعزیتی پیغام بھیجے۔ آپ سب کا مشکور و ممنون ہوں۔ نیک تمناؤں کے ساتھ نامہ بند کرتا ہوں۔ ہر یاد کرنے والے کو سلام۔"

☆ پیارے بھائی! مائیں تو سانجھی ہوتی ہیں۔ خدا آپ کو اس عظیم صدمے سے جانبر ہونے کی ہمت عطا فرمائے۔ ہم سب تو آپ ہی کے ہیں۔ آپ کے ساتھ ہیں خود کو تنہا سمجھنا چھوڑ دیں۔

✉: شبانہ نسیم دوسطری خط کے ساتھ کراچی سے احوال کا حصہ بن رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ "میں آپ کو اپنی تحریر بھیج رہی ہوں امید ہے آپ اسے اپنے ماہنامہ سچی کہانیاں میں جگہ دیں گے اور مجھے شکریہ کا موقع دیں گے اور میری حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔"

☆ لیجیے شبانہ! آپ کی دوسطری تحریر کو ہم نے جگہ دی۔ امید ہے آپ کی حوصلہ افزائی ہوگئی ہوگی۔

✉: بہت عرصے بعد ہماری بہن ثمینہ ناز عبدالقیوم کی اورنگی ٹاؤن کراچی سے آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔ "سرورق بہت شاندار تھا سب سے پہلے منزہ آپی کا اداریہ "بارش کا پہلا قطرہ" پڑھا۔ سچا کھرا اور ہمیشہ کی طرح سیدھا دل میں اتر گیا۔ اس کے بعد احوال میں جا پہنچے۔ ماشاء اللہ نئے اور پرانے ساتھیوں نے خوب محفل سجا رکھی ہے۔ سب کو تہہ دل سے بہت بہت سلام جنہوں نے ہمیں یاد رکھا۔ سدرہ! ہم سب کی دعا میں تمہارے ساتھ ہیں۔ زرینہ جونیجو اور تحسین جونیجو آپ کیسی ہیں۔ نئے اور پرانے دوست آپ سب لوگ کیسے ہیں۔ "ایک شام ہمارے ساتھ" تصویری جھلکیاں دیکھ کر سب سے ملنے کا بہت دل چاہا۔ سفرنامہ "بھارت میں بلیک لسٹ" تو مجھے بے حد پسند ہے۔ کاشی بھائی آپ کا ناول "زہر عشق" بہترین جا رہا ہے۔ طویل کہانیوں میں سب سے پہلی کہانی نسیم سحر کی "پرفیکٹ لائف" پڑھی۔ منفرد ٹاپک خوب صورت انداز تحریر۔ بانو آپا کی "اک دیا جلتا ہے" سچ آپا آپ نے تو ہمیں بہت رلایا بہت شاندار تحریر پٹھانی اپنے مکافات کو پہنچی۔ آصف اقبال کی "وہ سب کی سنتا ہے" بس ٹھیک ہی تھی۔ عظمیٰ شکور کی "کتنی محبت باقی ہے" ارم ناز کی

کہانی ''کھوٹ'' کنول عمران کی'' کیسے کیسے لوگ'' اچھی تھیں۔ آخری کہانی سید ملازم حسین کی'' قانون خاموش ہے'' پڑھی اس میں مردہ انسانوں کا گوشت کھانے اور لاش کی بے حرمتی کی سزا دو سال بہت کم ہے۔ ایسے ملزمان کی سزا عمر قید یا سزائے موت ہونی چاہیے۔ شاعری میں ایم حسن نظامی کی غزل'' داستانِ وفا'' اور شاعر خضر حیات کی'' احساس تو ہے'' بہت زبردست، تیر نیم کش میں ابو ہریرہ اور مختار بانو کا قطعہ بہت خوب تھا۔ ان تمام بہن بھائیوں سے معذرت جن کی کہانیاں وقت کی کمی کی بنا پر نہ پڑھ سکی۔''

☆ پیاری بہن ثمینہ! سدا خوش رہو۔ تمہارا خط آیا تو سکون ملا کہ تم خیریت سے ہو۔ احوال میں شامل رہا کرو۔ خدا تمہاری پریشانیاں دور کرے۔ شاعری جلد ہائیڈ پارک کا حصہ ہوگی۔

✉ میاں چنوں سے فوجی بھائی مقصود احمد بلوچ عرض کرتے ہیں۔''لگاتار تین ماہ کی غیر حاضری کے بعد اب دوبارہ اس محفل کا حصہ بن رہا ہوں۔ معمول کے مطابق اس دفعہ سچی کہانیاں 31 مئی کو میرے ہاتھوں میں تھا۔ ٹائٹل بہت ہی جاندار تھا۔ مکمل ہار سنگھار کیے لڑکی بہت ہی خوب صورت انداز میں مسکرا رہی تھی۔ اس دفعہ پلیٹ فارم نمبر تمام نمبروں پر حاوی رہا۔ مجھے پلیٹ فارم اسٹوریاں بہت زیادہ پسند ہیں۔ کاشی بھائی! میری یہ ریکوسٹ ہے کہ پلیٹ فارم نمبر سال میں دو دفعہ ہونا چاہیے۔ اب بات ہو جائے اسٹوریوں کی۔ اس دفعہ جو سب سے ٹاپ کلاس اسٹوریاں تھیں ان میں سب سے پہلے محمد سلیم اختر'' اشارہ''، ممتاز احمد'' پکوڑے گرم'' ویلڈن ممتاز بھائی بہت ہی اچھی تحریر تھی آپ کی۔ محمد کاشف مغل'' اسٹیشن کی وہ رات'' کمال کر دیا تمہارے خواب نے۔ ویری گڈ مغل صاحب۔ ملک این اے کاوش اعوان'' انتظار'' ملک صاحب آپ کی اسٹوری نے تو مجھے رلا دیا۔ بہت ہی اچھی تحریر تھی آپ کی۔ صائمہ مجید'' زمین دہاں بھی ملے گی'' بہت ہی منفرد تحریر تھی۔ خدا میری اس بہن کو سدا سلامت رکھے اور دلی مراد بھی پوری کرے۔ شمسہ قمر'' کس نے کھیل کھیلا ہے؟'' میری اس بہن نے واقعی بہت اچھا لکھا۔ سید عامر حسین کی'' دیوانہ''، محمد ابو ہریرہ بلوچ'' اوور ٹائم'' کے علاوہ باقی اسٹوریاں بھی اچھی تھیں۔ اس دفعہ تو میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ ہر رائٹر نے ایک سے بڑھ کر ایک لکھا۔ میں پلیٹ فارم کے حوالے سے لکھی ہوئی تحریروں کے تمام رائٹر کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اگر زندگی نے وفا کی تو پھر ملیں گے۔ تب تک اللہ نگہبان۔''

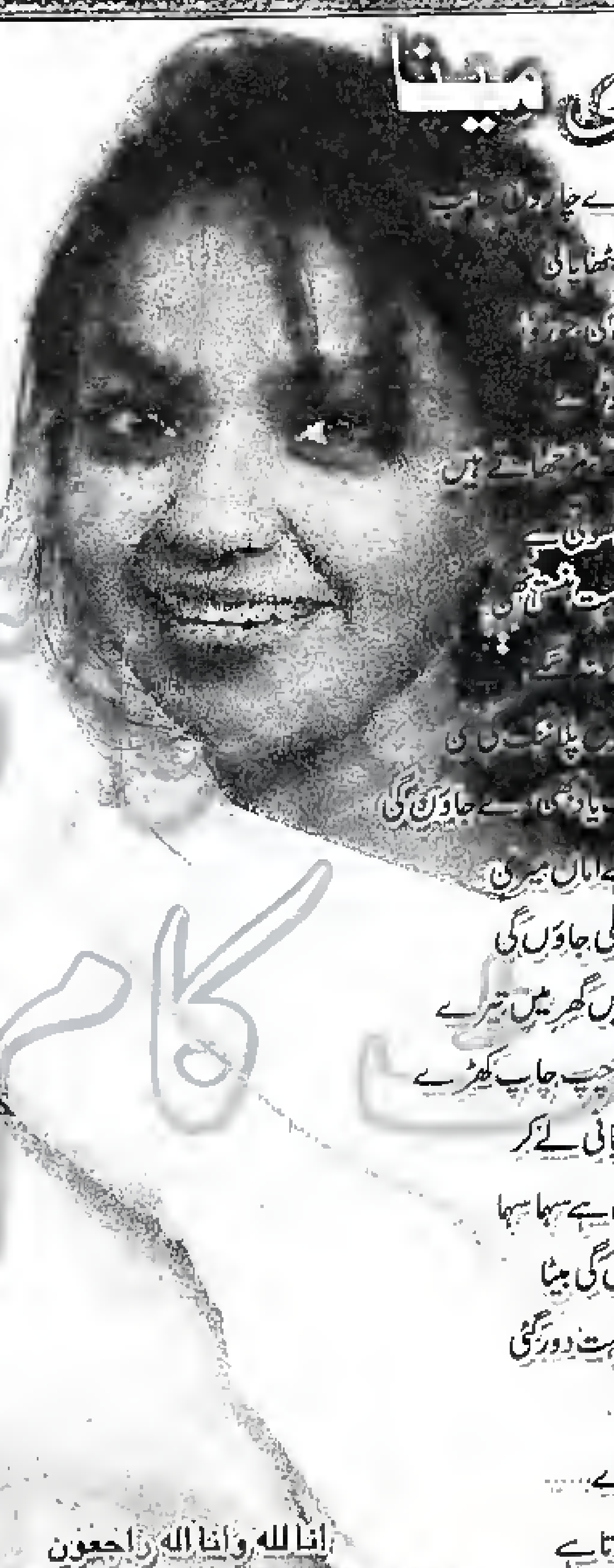
☆ پیارے مقصود! تبصرے کا شکریہ! تبصرہ پرچے پر بھیا! ہم تو رائٹرز کو عزت دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتے۔ اگلے ماہ تبصرے کا انتظار رہے گا۔

✉ نزاہت اقبال مہورہ فتح جنگ سے لکھتے ہیں۔'' ماہ جون کا شمارہ'' پلیٹ فارم نمبر'' آج ملا۔ حمزہ آپی نے بہت اچھی بات کہی کہ کبھی تو ایسا ہو مگر آپی اطمینان رکھیں ہمارے حکمران ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ خدا انہیں ہدایت دے، فیض نے سچ کہا تھا کہ

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
تھا ہمیں انتظار جس کا یہ وہ سحر تو نہیں!

'' احوال'' میں سدرہ انور علی اللہ آپ کو شفا دے۔ شاہد حسین نظام، نیا نام مبارک، ویسے اس کی وجہ کیا ہے؟ سیدہ آسیہ عنبر گیلانی خوش آمدید۔ آتی رہا کریں بہن۔ کنسٹبل آپی آپ لوگ غائب نہ ہوا کریں۔ شمائلہ شہزاد خوش آمدید۔ فیصل آباد سے محمد شعیب آپ کو بھی خوش آمدید۔ خضر حیات، ملازم حسین تبصرہ اچھا تھا آپ کو مبارک باد۔ منشی عزیز صاحب! کہاں چلے گئے آپ؟ فیصل ندیم، کنزہ ملک اچھے تبصرے تھے آپ کے۔ منزل آپی اللہ آپ کو صبر عطا فرمائے۔ مائی ڈیئر ایلڈر سسٹر فرح انیس کہاں ہیں آپ پیاری بہنا؟ جلد لوٹیں

ایک تھی مینا



لفظ ہی لفظ ہیں بکھرے مرے چاروں جانب

”کھٹیا، شمع کب تک جلی، میٹھا پانی

چائے کا ایک کپ، کیاری کی جھوڑو!“

ان گنت لکھ کے فسانے چھوڑے

لفظ اُگتے ہیں، بڑے ہوتے ہیں مرجھاتے ہیں

پر جو آواز تری ہے وہ کہاں سوتی ہے

درد آنکھوں میں چھپا کر تو بہت ہنستی تھی

لفظ بیمار تھے، تجھ سے وہ ادا ہو نہ سکے

تُو نے جانے کی بھی اک طرح پلاننگ کی تھی

سب سے مل جاؤں گی، اک یاد بھی دے جاؤں گی

مجھ کو بڑھاپے سے ڈر لگتا ہے اماں میری

میں تجھے چھوڑ کے جوانی میں چلی جاؤں گی

ہر طرف تیری ہی آوازیں ہیں گھر میں تیرے

پیڑ جو تُو نے لگائے تھے ہیں چپ چاپ کھڑے

پھول کھلتے ہیں مگر آنکھ میں پانی لے کر

ہاں تیرا پھول ”علی“ اب بھی ہے سہما سہما

تُو نے آنے کا کہا تھا کہ آؤں گی بیٹا

بس تُو چپ ہی رہی اور دور بہت دور گئی

ہائے مینا تیرے اماں باوا......

ہائے مینا تیرے رشتے سارے......

ہائے مینا بھلا ایسے بھی کوئی کرتا ہے

لفظ ہی لفظ بکھیرے اور پرواز بھری

انا للہ وانا الیہ راجعون

(میناتاج اب ہم میں نہیں)

ادھر۔ سونیا خان آپا اور مسز نوید ہاشمی کہاں ہیں۔ جون کی گرمی سے تو نہیں ڈر گئیں آپ؟ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ ناول بھی خوب جا رہے ہیں۔ "میرا دامن تار تار" پڑھ کر مصطفیٰ زیدی یاد آئے کہ

سیدھی سادھی عقل ہمیشہ مار ہی کھاتی آئی ہے
ہم بھی پیری مریدی کرتے تو ہم سے اتراتا کیا؟

بہر حال سبق آموز کہانیاں تھی۔ سفر نامہ بہت شاندار جا رہا ہے۔ کاشی بھائی سرورق ڈبل صفحہ ختم کریں پلیز پہلے کی طرح ٹھیک ہے۔ "تیر نیم کش" تو غالب کی ایجاد ہے۔ اس پر بھلا ہم کیسے اعتراض کریں نام ہی بہت اچھا ہے۔ شعر اچھے تھے۔ صائمہ مجید بہن بہت خوب اچھی کہانی تھی آپ کی۔"

☆ پیارے نزاہت! یقیناً تم نے ہماری بات کو منفی معنوں میں لیا ہے۔ ہم نے تو لکھا ہے کہ تمہاری "اپنی شاعری" ہم نے نہیں پڑھی۔ بھیجو تو پتا چلے کہ ہمارا بھائی کن خیالات کا ترجمان ہے۔ خوش رہو۔

✉: اکوال، تلہ گنگ سے بہت پیارے بھیا سلیمان شبیر لکھتے ہیں۔ "سچی کہانیاں جون 30 جون کو ملا۔ ایک دفعہ پھر کاشی بھائی آپ کی محنت خود بتا رہی ہے کہ سچی کہانیاں کا ہر ماہنامہ ایک سے بڑھ کر ایک ہوتا ہے۔ بہن سیدرہ انور علی کے لیے دعا ہے۔ اب آتے ہیں ماہنامے کی طرف۔ اشتہارات کو پھلانگتے ہوئے منزہ آپی کا "کبھی تو ایسا ہو" پڑھا اور پھر دل نے یہی کہا کہ کاشی کبھی تو ایسا ہو۔ اس کے بعد "احوال" میں پہنچے تمام احوالیوں سے ملاقات ہوئی۔ سب نے اپنے اپنے انداز میں خوب صورت تبصرے کیے۔ اسماء اعوان "لائف بوائے" میں پھر خوب صورت تحریر لائیں۔ محمد تسلیم اختر کی "اشارہ" اس ماہ رسالے کی جان تھی۔ "پکوڑے گرم" بھائی ممتاز احمد ایک دفعہ پھر شاہکار تحریر لائے۔ "کورا کاغذ" ثمینہ فیاض کی بھی اچھی تحریر تھی۔ شیشہ، عزت اور پتھر، انجام محبت ایک ہی موضوع پر پُر اثر تحریریں تھیں۔ "میرا دامن تار تار" سعدیہ سیٹھی نے ہمارے معاشرے کے ایک گھناؤنے چہرے سے نقاب ہٹایا۔ "چوہے" غزالہ نزہت فاطمہ، "مقدر کا سکندر" نزہت ناز، "ایک رشتہ" مومینہ بتول کی خوب صورت تحریریں تھیں۔ اس کے علاوہ تمام لکھنے والوں نے خوب صورت تحریریں پڑھنے کو دیں۔ "بادبان" نعمان اسحاق بھی کافی دلچسپ ہوتی جا رہی ہے۔ "زرد لومڑی" ایم اے راحت صاحب کی دوسری قسط بھی زبردست تھی اور "زہر عشق" اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ "ہائیڈ پارک" اور "تیر نیم کش" میں بھی سب کے انتخاب اچھے تھے۔ "مسئلہ یہ ہے" بابا جی کو اللہ پاک اجرِ عظیم عطا فرمائے، آمین۔ اس کے ساتھ ہی اگلے ماہ تک اجازت۔"

☆ پیارے سلیمان! تمہارا تبصرہ بہت اچھا لگا۔ تمہاری محبت کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں۔

✉: نعمان احمد آرائیں کوٹری سے پہلی پہلی آمد کے ساتھ احوال میں شریک ہیں، لکھتے ہیں۔ "میں نے رسالہ ستمبر سے پڑھنا شروع کیا ہے۔ تمام احوالیو اور کہانیاں لکھنے والوں اور ناول لکھنے والوں میں کاشی چوہان اور ایم اے راحت، "مسئلہ یہ ہے" میں بابا جی، "ہائیڈ پارک" میں مراسلے اور انتخاب لکھنے والوں اور "تیر نیم کش" میں شعر لکھنے والوں کو سلام کہتا ہوں۔ ستمبر سے لے کر تمام اداریے اور احوال و تبصرے سچ پر مبنی کہانیاں اور ناول، مسئلہ یہ ہے، ہائیڈ پارک، تیر نیم کش اور جنوری سے شامل ہونے والا سفر نامہ بھارت میں بلیک لسٹ اور فروری سے شامل ہونے والا ناول "بادبان"، ایم اے راحت کا نیا ناول "زرد لومڑی" سمیت تمام سلسلے ہی بہت اچھے ہیں۔ سب کچھ بہت خاص ہے اس رسالے میں اور یہ ایک مکمل رسالہ ہے۔ "احوال" میں نئے شامل ہونے والوں کو خوش آمدید کے بعد سلام اور سچی کہانیاں میں شامل تمام لوگوں میں سے جن کے عزیز و اقارب اس دنیا فانی سے پردہ کر چکے ہیں ان سب کے لیے دعائے مغفرت۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔"

سانحۂ ارتحال

ایڈیٹر سچی کہانیاں کاشی چوہان کے پھوپا طالب حسین گزشتہ ماہ وفات پا گئے۔ قارئین سے مرحوم کے ایصالِ ثواب کے لیے دعا کی درخواست ہے۔ ادارہ دکھ کی ان گھڑیوں میں ان کے ساتھ ہے اور اہلِ خانہ کے لیے صبر کی دعا کرتا ہے۔

☆ پیارے بھائی نعمان! خوش آمدید! جگ جگ جیو! تم نے تبصرہ لکھ کر ہماری فیملی میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔ اپنا بہت خیال رکھنا اور اب ہم سے دور نہ ہونا۔

✉: فوزیہ فرید احمد، گوجر خان سے عرض کرتی ہیں۔ ''پچھلی تحریروں کی اشاعت پر میں آپ کی بے حد مشکور ہوں۔ اب جو تحریر بھیج رہی ہوں یہ بالکل سچا واقعہ ہے اس میں، میں نے سب کچھ سچ ہی لکھا ہے بس ایک ریکوسٹ ہے اس میں بہن بھائیوں کی تعداد میں رد و بدل کر دیا جائے کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ اصل کردار پڑھ کر یا اس کے بچے یہ کہانی پڑھ کر کوئی ایکشن لیں۔''

☆ بہن فوزیہ! پراسرار نمبر کے لیے آپ کی تحریر منتخب ہو گئی ہے۔ پتا نہیں آپ کی طرف سے آپ کے بھائی کو پرچے پر تبصرہ کب ملے گا۔

✉: ملک علی رضا نثار کالونی فیصل آباد سے احوال میں شامل ہیں۔ لکھتے ہیں ''جون کا شمارہ فیصل آباد کے مشہور شمع بک اسٹال سے ملا۔ بہت شکریہ میرا خط شامل کرنے کا۔ سچی کہانیاں کی شگفتگی تازہ بہ تازہ ہے اور آپ سب کی ادب سے محبت کا ثبوت ہے۔ دعا گو ہوں کہ یہ شگفتگی اسی طرح قائم و دائم رہے۔ کچھ احباب کی تحریریں جن میں محترمہ اسماء اعوان، نائلہ طارق، عقیلہ حق، محمد سلیم اختر، ایم اے راحت نے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچا بہت خوب رہا۔ جناب افضل آزاد، قاسم خان بلوچ، ذیشان ریاض، عمارہ ناز نے میرے خط کو پسند کیا جس کے لیے میں ان احباب کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ ایک اور بات، محترم رانا حبیب الرحمٰن کی تحریر کب ملے گی پڑھنے کے لیے یا اس کی خواہش دل میں رکھیں، آخر میں شعیب فیصل آباد سے، سلیم اختر صاحب، عاصم ہونا، سیدہ حجاب فاطمہ، سدرہ انور علی، طالیہ داؤد، نسیم سحر، ارم خان، ممتاز احمد، روبینہ ناز رومی، خالد یوسفی صاحب کے خطوط بہت شاندار تھے۔ رمضان شریف کا بابرکت مہینہ ہے سب دوست دعاؤں میں یاد رکھنا۔ سب قارئین کو ایڈوانس عید مبارک ہو۔''

☆ پیارے بھائی علی رضا! مختصر پیرائے میں بہت خوب صورت احوال تحریر کیا۔ خوش رہو اور احوال میں ہر ماہ شامل رہو۔

✉: ہمارے بہت پیارے ساتھی ممتاز احمد سرگودھا سے شامل احوال ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ''ماہ جون کا شمارہ 31 مئی کو موصول ہوا۔ احوالیوں کے خوب صورت خطوط اور تبصروں سے محفل خوب جگمگا رہی تھی۔ سب سے اچھا تبصرہ سنبل کا تھا۔ ملازم حسین شیرازی نے اچھا خط اور تبصرہ لکھا۔ ''احوال'' کے آخر میں کاشی چوہان کی نظم ''اوکسی ڈی نیشن'' نے دل موہ لیا۔ بہت عمدہ دل میں اتر جانے والی نظم تھی۔ ماہ جون کا شمارہ ''پلیٹ فارم نمبر'' انتہائی زبردست اور منفرد تھا۔ کاشی بھائی آپ کو مان گیا ہوں یار آپ اتنی محنت لگن اور عرق ریزی سے کام کرتے ہو تو شمارے کا ایک ایک ورق آپ کی شب و روز محنت اور دیانت داری سے کام کی بھرپور عکاسی کر رہا تھا۔ اللہ پاک آپ کو سلامت رکھے۔ سچی کہانیاں اور زیادہ ترقی کرے اور کامیابیوں کی طرف گامزن رہے، آمین۔ شمارے میں شامل تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ ''اور پٹڑی بدل گئی'' میں ایک اچھا پیغام دیا گیا

اور یہ درس دیا گیا کہ قدرت نے جو عطا کر دیا ہے اس کی دل و جان سے قدر کرو۔ کہانی میں اصلاح کا پہلو تھا۔ ''اسٹیشن کی وہ رات'' ایک پراسرار کہانی تھی۔ ''انتظار'' بہت اچھی کاوش تھی۔ ''انسان V/S حیوان'' ایک انسان کے حسد اور ایک کتے کی وفاداری کی شاندار کہانی تھی۔ ''ٹرین وہاں بھی ملے گی'' افسانوی رنگ لیے ایک اچھوتی کہانی تھی۔ آنٹی، کورا کاغذ، کس نے کھیل کھیلا ہے؟ اچو ہے، مقدر کا سکندر، ایک رشتہ مہک رہا ہے، میرا دامن تار تار، آزادی بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ ''اوور ٹائم'' درس عبرت دیتی کہانی تھی۔ ''انجام محبت'' بہت شاندار تخلیق تھی۔ یہ ناسمجھ لڑکیوں کے کچے ذہنوں پر ایک دستک دیتی کہانی تھی۔ جاوید راہی کی ''کانٹا کھنچ گیا'' جرم و سزا اور پلیٹ فارم کی مناسبت سے لکھی ہوئی تحریر شمارے کی سب سے شاندار اور بہترین کہانی تھی۔ دعا ہے اللہ کریم جاوید راہی صاحب کو اور زور قلم عطا فرمائے۔ ''کیپٹن، ٹرین اور حال'' بلاشبہ نمبر ون کہانی تھی۔ لیجیے خط کا اختتام کرتا ہوں انشاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی اگر زندگی نے وفا کی تو......''

☆ پیارے بھیا! آپ کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح شاندار رہا۔ آپ کی محبت ہی ہماری کامیابی ہے، خوش رہیے۔

☆: سید ملازم حسین شیرازی کوہاٹ سے عرض کرتے ہیں۔ ''آپ نے مئی 2016ء کا پرچہ اعزازی ارسال کیا۔ وہ واپس Redirect ہوا۔ مسئلہ کوئی نہیں ہے سب خیر ہے چونکہ میں جیل میں حوالاتی ہوں۔ قانونی موشگافیوں پر بات کرنا مناسب نہیں۔ بعض اوقات جیل انتظامیہ کے نئے اہلکار آتے ہیں وہ سسٹم میں نئی تبدیلی لاتے ہیں چونکہ میں جیل سے L.L.M کے آخری سال کی تیاری کر رہا ہوں (قانون کی اعلیٰ ترین ڈگری جیل سے کرنا ایک ریکارڈ ہے، دعا کریں) اور اسی سلسلے میں ملک سے اور باہر سے کافی ڈاک آتی ہے۔ کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی سنسر نہیں ہوتی، ماشاء اللہ کوئی غیر قانونی، غیر اخلاقی مواد نہیں ہوتا۔ پرچہ واپس ہونا معمول میں شامل ہے۔ تشویش کی بات نہیں۔ جیولری کی دکان چہرے پر سجائے دوشیزہ بہت معصوم لگ رہی ہے۔ سرورق نہایت موثر ہے۔ کہانیاں، احوال بہت دلچسپ اور معیاری ہیں۔ سچی کہانیاں کی سب سے بڑی خوبی اور اس کی پسندیدگی اس کا ادبی معیار ہے۔ اداریہ ذہنوں اور ضمیروں کو جھنجھوڑتا ہوا اور دل سے نکلتا اداریہ، پہلا اثر انگیز ''اشارہ'' محمد سلیم اختر ایک مشکل عجیب و غریب وانوکھی کہانی لیکن دلچسپی کی حامل۔ ''پکوڑے گرم'' عبرت انگیز دلچسپ کہانی۔ ''آنٹی'' عجیب و غریب واقعہ۔ ''ٹرین وہاں بھی......'' صائمہ مجید کی عمدہ تحریر۔ ''مقدر کا سکندر'' ہمت مرداں مدد خدا سبق آموز کہانی۔ ''ایک رشتہ'' مومنہ بتول، ٹرین کا سفر بعض اوقات کیسے حسین رشتے بنا دیتا ہے۔ ''اوور ٹائم'' عبرت ناک کہانی۔ ''انسان V/S حیوان'' محبت ہر مخلوق میں پائی جاتی ہے عمدہ تحریر۔ ''کیپٹن ٹرین حال'' ایڈونچر، حب الوطنی پر مشتمل خوب صورت تحریر۔ ''بھارت میں بلیک لسٹ'' نئی نئی معلومات ہر ایک کے لیے استفادہ دیتی۔ ''بادبان'' بہترین سلسلہ۔ ''زرد لومڑی'' ایڈونچر داستان۔ بہترین سلسلہ۔ ''زہر عشق'' کاشی چوہان، عشق و خوف سے بھرپور ایسی داستان جس کے اثرات عرصہ دراز تک ذہنوں پر چھائے رہیں گے۔ قابل صد تحسین باقی کہانیاں بھی لاجواب ہیں۔ ''احوال نامے'' سدرہ انور علی ان کو آفت کی پڑیا کا خطاب حاصل ہے۔ مور شاہد حسین! اب ان کی شناخت شاہد حسین نظام ہوگی۔ شناخت بدلنے سے کیفیات نہیں بدلا کرتیں۔ خلوص اپنائیت تو وہی ہوگی خوش رہیں۔ سنبل! خوب صورت خط جو ذہن میں لہو گرماتا ہے۔ سلامت رہیں۔ یمیٰں غزالہ نہاں! تبصرہ، خط نہایت جاندار بہت خوب۔ حنا بشریٰ! تبصرے احوال دلچسپیوں کے حامل۔ منشی عزیز مے! تعلقات پائیدار اور استوار رکھنے والے عزت دار کہلاتے ہیں ماشاء اللہ۔ فیصل ندیم بھٹی! آپ کے تبصرے خطوط بڑے شوق سے پڑھے

خواتین کی محبوب قلم کار

"رفعت سراج" کا تازہ ترین شاہکار "دامِ دل"

رفعت سراج کے جادوگر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں جو قارئین کی دھڑکنیں بے ترتیب کر رہی ہیں

"دامِ دل" ...... دوشیزہ ڈائجسٹ میں مقبولیت کی بلندیوں پر

"دامِ دل" ...... کہانی ہے محبت کرنے والے ایک جوڑے کی...... اور جب محبت کرنے والے سماج کی آنکھوں میں کھٹکنے لگ جائیں تو......

"دامِ دل" ...... کہانی ہے اُس ماں کی...... جسے بیٹیوں کی پیدائش پر سسرالی رویوں نے سولی چڑھا دیا

"دامِ دل" ...... کہانی ہے محبت کی دنیا میں آگ لگانے والے کریہہ چہروں سے نقاب اُتارنے والوں کی

"دامِ دل" ...... کہانی ہے معاشرے کے ان لالچی کرداروں کی...... جن کی ہوس نے محبت کی زمین کو اجاڑ ڈالا

تو پھر پڑھنا نہ بھولیے گا۔

رفعت سراج کا شاہکار ناول "دامِ دل"

آپ کے اپنے ماہنامہ "دوشیزہ" ڈائجسٹ میں ہر ماہ شائع ہو رہا ہے

جاتے ہیں۔ سلیمان شبیر! آپ کی شرکت نے محفل سچی کہانیاں کو رونق بخشی ہے۔ منزل خان! اللہ پاک آپ کے دکھ اور رنج، خوشیوں اور راحتوں میں بدلے، آمین۔ عظمیٰ شکور! تبصرہ خط لطف دیتے ہیں۔ کنزہ ملک! آپ کی تحریروں اور باتوں میں ادبی پیار چھلکتا ہے۔ ماشاء اللہ سے صائمہ مجید، مجید احمد جائی دونوں کو یکجا کر کے مخاطب کرنا اچھا لگتا ہے۔ صدیوں سکھی رہیں۔ باقی افضل آزاد، تحسین جونیجو سب کے خطوط نہایت عمدہ ہیں۔ کاشی چوہان صاحب! آپ کے جریدے کی بدولت دکھ، غم، رنج، الم میں مبتلا ذہنوں کو جو سکون راحتیں آپ اور آپ کا ادارہ فیض یاب کر رہا ہے یہ بہترین خدمت ہے۔ اس کا اجر صلہ رب العزت دے گا۔''

☆ پیارے بھائی! آپ کے تبصرے نے دل شاد کیا۔ آئندہ تبصرے میں تاخیر نہ ہو کہ آپ کی غیر حاضری ہمیں قبول نہیں۔

✉: ریاض حسین شاہد قبولہ شریف (پاکپتن) سے ہمارے احوالی بن رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ''مئی میں ''انگاروں پر رقص'' شامل اشاعت کرنے پر آپ کا شکر گزار ہوں۔ اگلے ماہ کے احوال میں جن دوستوں نے اپنی آراء کا اظہار کرتے ہوئے میری کاوش کو سراہا، ان سب کا بے حد مشکور ہوں۔ بالخصوص قاسم خان بلوچ ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ ارم خان چکوال، راجہ تنویر، عائشہ اور جنت نے میر پور آزاد کشمیر سے کال کر کے مجھے عزت افزائی بخشی۔ عاشق حسین ساجد مظفر گڑھ کے قابل ستائش تبصرے نے مجھے جلا بخشی۔ میرے شہر کے جناب حسن نظامی صاحب نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اپنی آراء سے نوازا اور بے حد تعریفی کلمات سے نوازا۔

☆ پیارے بھائی ریاض! آپ کے نامے کا شکریہ مگر تھوڑا تبصرہ بھی ہو جاتا تو ہم مزید عزت افزائی پر آپ کے مشکور ہوتے۔

✉: کمالیہ سے یہ آمد ہے ہماری شاعرہ بہن عمارہ ناز کی۔ لکھتی ہیں۔ ''ماہ جون کا سچی کہانیاں پلیٹ فارم نمبر دو جون کو مارکیٹ میں آیا۔ زیورات میں لدی اور سجی مسکراتی خوب صورت ماڈل کی تصویر سے مزین ٹائیٹل بہت دلکش تھا۔ آپ نے اس بار پلیٹ فارم نمبر شائع کر کے ہم سب کے دل جیت لیے۔ شمارے کا ایک ایک ورق آپ کی محنت کا ثبوت ہے۔ اس بار ''پلیٹ فارم'' کی نسبت سے مختلف کہانیاں پڑھیں۔ سب سے ٹاپ کلاس بیرون کہانی ممتاز احمد صاحب کی ''پکوڑے گرم'' تھی۔ ماروشہ کا کردار انتہائی مثبت تھا۔ وہ ایک باکردار اور مخلص ہمدردی عورت تھی مگر ظہیر نے اپنا گھٹیا پن دکھا کر اپنا ہی نقصان کیا۔ دوسرے نمبر پر صائمہ مجید کی کہانی ٹرین وہاں بھی ملے گی جو کہ بہت شاندار اور بہترین کہانی تھی اور پٹری بدل گئی۔ ایک سبق آموز اور اصلاحی کہانی تھی۔ ''انتظار'' بہت اچھا کہانی تھی۔ آنٹی، کورا کاغذ، کس نے کھیل کھیلا ہے، شیشہ، عزت اور پتھر اچھی تحریریں تھیں۔ کانٹا کھنچ گیا ایک اچھوتی کہانی تھی۔ جرم اور پلیٹ فارم کی نسبت سے اچھی کہانی پڑھنے کو ملی۔ جی جناب پلیٹ فارم نمبر کی خصوصی کہانی کیپٹن، ٹرین اور حال...... واقعی ایک خصوصی کہانی تھی۔ مجموعی طور پر شمارہ زبردست رہا۔ کوئی کمی نظر نہیں آئی۔

☆ اچھی عمارہ! تمہارے تبصرے میں بھی کوئی کمی نظر نہیں آئی۔ تبصرہ ہر ماہ کیا کرو۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ تم سب ہم سے کتنی محبت کرتے ہو۔

✉: کوٹ مومن، ضلع بھلوال سے پہلی آمد ہے ہماری بہن فرزانہ گل کی۔ لکھتی ہیں۔ ''میرا نام فرزانہ گل ہے اور کوٹ مومن تحصیل بھلوال سے میرا تعلق ہے۔ پڑھنے لکھنے کی بہت شوقین ہوں تو یہی وجہ ہے کہ بہت سارے ناول پڑھ چکی ہوں اور کافی رسالے میرے زیر مطالعہ رہتے ہیں تو سچی بات یہ ہے کہ ان سب رسالوں میں مجھے سچی کہانیاں بہت ہی معیار اور اعلیٰ پائے کا لگا یہ ہر لحاظ سے ایک بہترین ڈائجسٹ ہے۔ کسی

سانحۂ ارتحال

ہمارے ساتھی، سرکولیشن منیجر محمد اقبال زمان کے بہنوئی محمد زمان گزشتہ ماہ طویل علالت کے بعد وفات پا گئے۔ قارئین سے مرحوم کے ایصالِ ثواب کے لیے دعا کی درخواست ہے۔ ادارہ دکھ کی ان گھڑیوں میں ان کے ساتھ ہے اور صبر کی دعا کرتا ہے۔

بھی ڈائجسٹ میں میرا یہ پہلا خط ہے۔ رہی بات کہانیوں کی تو وہ بھی بہت اچھی ہوتی ہیں۔ مصنفین بہت اچھا لکھتے ہیں خاص طور پر جاوید راہی صاحب، ممتاز احمد صاحب، مجید احمد جائی صاحب، ارم ناز صاحبہ، نزہت جبیں ضیاء صاحبہ، محمود شام صاحب، ''بھارت میں بلیک لسٹ'' بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ جناب ایم اے راحت صاحب تو بلاشبہ ایک بلند پایہ ادیب ہیں اور ماشاءاللہ کاشی چوہان صاحب ''زہرِ عشق'' کے عنوان سے بہت اچھا ادب تخلیق کر رہے ہیں۔ جون کے شمارے میں ممتاز احمد کی کہانی ''پکوڑے گرم'' ٹاپ کلاس نمبر ون تھی۔ دوسرے نمبر پر جاوید راہی کی کہانی کا نٹا کھنچ گیا۔ تیسرے نمبر پر صائمہ مجید کی ''ٹرین وہاں بھی ملے گی'' نزہت جبیں ضیاء کی ''انجام محبت دل میں اتر گئی۔ محمد ابو ہریرہ بلوچ کی اور نام ایک سبق آموز کہانی تھی۔ باقی تمام مصنفین نے بھی اچھا لکھا۔ اب تک کے لیے اتنا ہی۔ آئندہ بھی حاضری ہوتی رہے گی اگر آپ نے ویلکم کہا تو او کے جی اجازت چاہتی ہوں۔

☆ فرزانہ جی! ویلکم! خوش آمدید! لیجیے ہم نے آپ کو دل سے خوش آمدید کہا۔ اب آپ کا فرض بنتا ہے اپنا وعدہ نبھاتے ہوئے ہر ماہ ہمارے احوال میں رونق افروز ہوں۔

✉: بہت اچھے ساتھی ایم یعقوب احمدانی ڈیرہ غازی خان سے عرض گزار ہیں۔ ''جون کا پرچہ 29 مئی کو ہاتھ لگا۔ ''پلیٹ فارم نمبر'' پیارا لگا۔ منزہ سہام کی بات کبھی تو ایسا ہو کاش کبھی تو واقعی ایسا ہو احوالی دوست نئے و پرانے سبھی شامل ہوں۔ شاندار آفت کی پڑیا سدرہ انور علی لاجواب تبصرہ کے ساتھ تھیں اور میری دعا ہے کہ اللہ جلد صحت یابی دے۔ رئیسہ خالد، مور شاہد، حسین نظام، مہر پرویز، عائشہ بتول، عائشہ صدیقہ، سنبل، حسین خولجہ، فوزیہ فرید، ایم افضل آزار، ردبینہ شاہین زبردست تبصرہ کیا۔ عاشق حسین، حنا بشریٰ جی لاجواب تبصرہ کیا۔ ثمین غزالہ بہت پیارے تبصرے پر مبارک باد۔ ثمر احمد، شائلہ شہزاد نئے احوالی محمد شعیب، مومنہ بتول، داؤد احمد، خضر حیات، ملک احوال ملازم حسین شیرازی، منشی عزیز مبارک ہو نظر آگئے۔ ندیم بھٹی، مزمل خان، عظمیٰ شکور، نزہت ناز، کاشف کمال۔ رانا شہزاد شاہین اور بھائی عاصم لعل احمدانی احوال کا حصہ تھے۔ دوستوں آپ کی چاہت میرے لیے انمول تحفے ہیں۔ سدا سلامت رہو۔ اب اسٹوریوں کی طرف آتے ہیں۔ ''اشارہ'' خاص نہیں لگی۔ بڑے بھائی محترم ممتاز احمد ''پکوڑے گرم'' لاجواب اسٹوری تھی۔ جب پیٹ بھر جائے تو لات مارنا غریب کا پہلا اصول ہے۔ ''اسٹیشن کی وہ رات'' وہ صرف خواب تھا۔ ''انتظار'' بہت ہی اچھی اور لاجواب تھی۔ مبارک باد چھوٹی سی غلط فہمی نے تیرہ برس کی جدائی دی۔ انسان V/S حیوان آج کسی کی عزت نہیں یونس نے کوئی نیا کام نہیں اور پٹڑی بدل گئی سمجھ نہیں آئی۔ ''آنٹی'' صدف آصف بہت خوب بدھائی ہو۔ ''کورا کاغذ'' ثمینہ فیاض خیالات ملتے جلتے ہیں۔ ''بادبان'' نعمان اسحاق جاوید راہی اور ''زہرِ عشق'' کاشی چوہان زبردست ناول کا سلسلہ ہے اور احوال کے سبھی دوستوں میں سے عبدالغفار عابد، بھائی ممتاز احمد پیاری ارم خان فرح انیس غائب تھے کیوں جی ناراضگی ہے کوئی؟ فرح انیس جی کیسی ہیں آپ کاشی جی اب اجازت چاہیے۔''

☆ اچھے یعقوب! تمہارا محبت نامہ بصورت تبصرہ ہاتھوں میں ہے۔ بس ہم سے محبت کا یہ تعلق ہمیشہ برقرار رکھنا۔

✉ ہمارے شاعر ساتھی خالد یوسفی اندرون گول چوک کچہری بازار سرگودھا سے احوال میں شریک ہیں، لکھتے ہیں۔ ''جون کا پلیٹ فارم نمبر شائع کرنے پر بہت بہت مبارک ہو۔ پرچہ بہت جاندار اور شاندار تھا۔ جون کے شمارے میں پلیٹ فارم کے حوالے سے لکھی گئی تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں جن میں خاص طور پر ممتاز احمد کی کہانی ''پکوڑے گرم'' جاوید راہی کی کہانی ''اور کانٹا کھنچ گیا'' صائمہ مجید کی کہانی ''زرین وہاں بھی ملے گی'' ''اور پٹری بدل گئی اور ''آنٹی'' شمارے کی سب سے بہترین اور زبردست کہانیاں تھیں۔ ان کے لکھاریوں کو بہت بہت مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ دوسری کہانیاں بھی بہت اچھی رہیں سب نے احوال میں اچھا لکھا۔ تمام دوستوں کی خدمت میں سلام اور آداب اب اجازت چاہوں گا۔ اس دعا کے ساتھ سلامتی، صحت، تندرستی کے ساتھ خوش رہو آباد رہو کوئی دکھ غم تکلیف نہ ملے۔ آمین۔''

☆ بھائی خالد! آپ کا یہ مختصر تبصرہ بھی آپ کی محبت کی خوشبو سے لبریز ہے۔ خوش رہیے۔

✉ عرصہ دراز بعد ہماری بہن شازیہ گل کی مانسہرہ بھیر کنڈ سے آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔ ''پیپرز سے فراغت کے بعد ننھے زاویار کی آمد کی وجہ سے بھی ٹائم کا پتا ہی نہیں چلتا۔ جب تک ڈائجسٹ کی سبھی کہانیاں پڑھ پاتی ہوں لیٹر لکھنے کی تاریخ نکل چکی ہوتی ہے۔ اس بار کوشش کی کہ جلدی خط لکھ سکوں اور احوال کا حصہ بن سکوں کیونکہ بہت سے بہن بھائی شازیہ گل کو بھول ہی چکے ہیں۔ سدرہ جی اللہ آپ کو عمر خضر عطا فرمائے۔ رمضان المبارک کی مبارک ساعتوں کا آغاز ہو چکا ہے۔ میری طرف سے بھی احوالیوں کو رمضان مبارک اور جب تک دوسرا رسالہ آئے گا عید آ چکی ہو گی۔ اس لیے ایڈوانس میں ہی عید مبارک اینڈ سدرہ جی۔ نوشابہ نوش، فصیحہ آصف، ماہ نور کنول، امامہ سید کو ڈھیروں سلام کہانیوں میں سبھی بہت اچھی تھیں، جیسے کہ ''لائف بوائے'' اسماء اعوان، ''اشارہ'' محمد سلیم اختر، ''پکوڑے گرم'' ممتاز احمد، ''اسٹیشن کی وہ رات'' محمد کاشف مغل، ''انتظار'' ملک این اے کاوش اعوان اور ''پٹری بدل گئی'' عائشہ صدیقہ ضمیر، ''آنٹی'' صدف آصف، ''زرین وہاں بھی ''صائمہ مجید، ''کورا کاغذ ثمینہ فیاض ''کس نے کھیل کھیلا'' شمسہ تیز، ''ایک تصویر اک کہانی'' دانیال کسی، ''زرد لومڑی'' ایم اے راحت، ''چوہے'' غزالہ نزہت فاطمہ، ''مقدر کا سکندر'' نزہت ناز، ''دیوانہ'' سید عابر حسین، ''ایک رشتہ'' مومنہ بتول، ''میرا دامن تارتار'' سعدیہ سیٹھی، ''آزادی'' شفیع محمد مری بلوچ، ''ادور ٹائم'' محمد ابوہریرہ بلوچ، ''شیشہ، عزت اور پتھر'' راحت وفا راجپوت، ''انجام محبت'' نزہت جبین ضیاء، ''بادبان'' نعمان اسحق، ''کانٹا کھنچ گیا'' جاوید راہی، ''کیپٹن ترین اور حالی'' ''زہر عشق'' ہمیشہ کی طرح لاجواب جس کا انتظار ہمیشہ بے چین رکھتا ہے۔ انسان V/S حیوان اعجاز احمد فکرال سبھی کہانیاں عمدہ تھیں ہائیڈ پارک میں نوشابہ نوش کی شاعری نے بہت متاثر کیا۔ ویلڈن باقی بھی سبھی کے مراسلے اچھے لگے۔ ''تیر نیم کش'' میں ابوہریرہ بلوچ، راحیلہ بنت مہر علی شاہ، قاسم خان بلوچ، نبیل جاوید کے انتخاب بہت اچھے لگے اور محمود شام کا سفرنامہ ''بھارت میں بلیک لسٹ'' بھی بہت خوب تھا۔''

☆ بہت اچھی بہن شازیہ! پہلے تو زاویار کی آمد کی مبارک باد قبول کرو اور حقیقت یہی ہے کہ آنکھ بوجھ پہاڑ اوجھل۔ زاویار تمہارے لیے خوش خبری لایا ہے۔ تمہاری کہانی کی اشاعت ہماری طرف سے تحفہ سمجھو۔

✉ یہ احوال میں پہلی پہلی آمد ہے۔ جناح کالونی فیصل آباد سے ہماری بہن بشریٰ کنول کی۔ لکھتی ہیں۔ ''سچی کہانیاں میں میرا یہ پہلا خط ہے۔ ایک سرکاری اسکول میں سینئر ٹیچر ہوں چونکہ پڑھنا پڑھانا میرا

پیشہ ہے تو مختلف رسائل، میگزین اور کتابیں پڑھنا میرا شوق ہے۔ گزشتہ دو سال سے سچی کہانیاں کا مطالعہ متواتر کر رہی ہوں۔ مجھے اس میں ذوق اور اچھا معیار نظر آیا تو یہ چند سطریں لکھنے کے لیے قلم اٹھایا ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ کسی بھی جریدے یا میگزین کا معیار اس کے ایڈیٹر پر ہوتا ہے۔ معیاری جریدے کے پس منظر میں اس کے ایڈیٹر کی محنت کارفرما ہوتی ہے۔ سچی کہانیاں مجھے سب سے الگ اور منفرد نظر آ رہا ہے اور اس کا معیاری ہونا یقیناً کاشی چوہان جیسے زیرک ایڈیٹر کی انتھک محنت کا ایک بھرپور ثبوت ہے۔ رب کائنات اور زیادہ ترقی عطا کرے آمین۔ جون کا شمارہ پلیٹ فارم نمبر میرے خیال میں اپنی نوعیت کا پہلا اور انفرادی شمارہ ہے آج تک کسی ڈائجسٹ نے ایسا اچھوتا موضوع نہیں چنا۔ موضوع کے اعتبار سے لکھی گئی تمام کہانیاں اچھی رہیں۔ ویسے تو میں گزشتہ ڈیڑھ سال سے پلیٹ فارم کہانی پر ہر ماہ پڑھتی آ رہی ہوں جسے سرگودھا والے ممتاز احمد لکھتے رہے ہیں تو حقیقت حال یہ ہے کہ ممتاز احمد نے اس موضوع پر لکھنے کا حق ادا کر دیا ہر ماہ نئے آئیڈیا سے بھرپور شاندار کہانی پڑھنے کو دیتے رہے ہیں اور اس بار تو کمال کر دیا۔ شمارے کی سب سے بہترین منفرد اور جدا کہانی ”پکوڑے گرم“ گرم تھی۔ جاوید راہی کی کہانی ”اور کانٹا کھینچ گیا“ بہت عمدہ اور زبردست کہانی تھی۔ صائمہ مجید کے قلم سے لکھی گئی کہانی ”ٹرین وہاں بھی ملے گی“ ایک اچھوتی کہانی تھی۔ حالات اور واقعات زبردست لکھے۔ اسی طرح پٹری بدل گئی اصلاح کا پہلو لیے اچھی کہانی تھی۔ علاوہ ازیں آنٹی، اسٹیشن کی وہ رات، انتظار، کورا کاغذ، مقدر کا سکندر، چوہے، میرا دامن تار تار، اوور ٹائم، انجام محبت۔ پلیٹ فارم سے جڑی بہترین کہانیاں تھیں۔ اب اجازت چاہوں گی انشاء اللہ وقتاً فوقتاً حاضر ہوتی رہا کروں گی۔“

☆ اچھی بہن بشریٰ! خوش آمدید! آپ کے تبصرے نے ہمیں مہمیز کیا اور مزید اچھا کرنے کی لگن پیدا کر دی۔ آپ کی آمد برقرار رہے گی تو انشاء اللہ ہمارے عزم کو بھی تقویت ملتی رہے گی۔

✉: سپاہی عاصم لعل احمدانی خان پور چوک بیڑا نگ سے لکھتے ہیں۔ ”جون کا پرچہ بڑی آسانی سے مل گیا تھا۔ سب سے پہلے جلدی سے اپنا لیٹر دیکھنے لگا تو بہت خوشی ہوئی جناب جگہ دینے کی آپ کی الفت کو سلام۔ منزہ سہام کی بات بھی تو ایسا ہو شاید بدلے تو ایسا ہو۔ احوالی دوست میرے لیے نئے تھے اور سدرہ انور علی، حسین خواجہ، ایم انفس آزاد، حنا بشریٰ لاجواب تبصرے لکھے۔ فوزیہ فرید، رشید خالد، روبینہ شاہین، عاشق حسین، ثمر احمد، سیمیں غزالہ ملک، ملازم حسین شیرازی داؤد احمد خضر حیات عشی عزیز مے حنا بشریٰ، منزل خان، نزہت ناز، عظمیٰ شکور، کاشف کمال، رانا شہزاد، ایم یعقوب احمدانی (پیارے کزن صاحب)، شمائلہ شہزاد، محمد شعیب، عائشہ صدیقہ، سنبل آپا، اسٹوریز سے اسماء اعوان اشارہ پکوڑے گرم...... اسٹیشن کی وہ رات، انتظار لاجواب کہانیاں تھیں۔ انسان V/S حیوان اور پیڑی بدل گئی۔ کھیل کس نے کھیلا۔ شمسہ قمر، ایک تصویر ایک کہانی، مقدر کا سکندر، صدف آصف، آزادی، راحت وفا راجپوت، ثمینہ فیاض، آنٹی، دیوانہ، مومنہ بتول، میرا دامن تار تار، انجام محبت، چوہے، کیپٹن ٹرین اور حال، نزہت ناز، جاوید راہی ان سب کی بڑی عزت تھی سب کو مبارک باد اور بادبان نعمان اسحاق، زہر عشق کاشی چوہان، زرد لومڑی ایم اے راحت لاجواب ناول ہیں اور سلسلے مسئل یہ ہے قرآنی آیات سے ہائیڈ پارک، تیر نیم کش اچھے ہیں آخر میں ایم یعقوب احمدانی اللہ خوش رکھے آپ کو۔ نیک تمناؤں اور دعاؤں کے ساتھ الوداع۔“

☆ پیارے عاصم! تبصرہ تو اچھا کر دیا تم نے۔ تمہاری محبت ہی ہمارے لیے زندگی ہے۔ خوش رہو۔

✉: احوال میں یہ پہلی بار آمد ہے اسد اللہ ساگی کی رحیم یار خان سے، لکھتے ہیں۔ ”پہلی بار احوال میں

حاضر ہوں۔ عقیدت مندانہ سلام عرض ہے۔ تمام اہل ادب کو بالخصوص محترمہ منزہ سہام صاحبہ کو اور عزیزان من جناب کاشی چوہان صاحب کو عالی جان تبصرہ کیا ہوتا ہے میں نہیں جانتا اور کیسے کیا جاتا ہے مجھے پتا نہیں (یہ تو ہم نے دیکھ لیا بھائی) بہن سدرہ انور علی اللہ پاک آپ کو لمبی عمر صحت کاملہ کے ساتھ عطا فرمائے (آمین)۔ کہانی کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں بہن عائشہ صدیقہ کو۔ آپی سنبل! ماشاء اللہ آپ اچھا تبصرہ کر لیتی ہیں۔ پیارے پیارے بھائی جان ایم افضل آزاد صاحب آپ کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔ بہن حنا بشریٰ، بھائی ملک عاشق حسن ساجد، روبینہ شاہین، فوزیہ فرید احمد، سیدہ آسیہ عنبر گیلانی، ہیمیس غزالہ، شمائلہ شہزاد، محمد شعیب، مومنہ بتول، ملازم حسین شیرازی، تحسین جونیجو، آپ سب کے خطوط پسند آئے۔ جناب منشی محمد عزیز صاحب آپ کا اور سچی کہانیاں کا ساتھ اتنا پرانا ہے جتنا پرانا میں خود ہوں۔ 26 مئی 1990ء کی پیدائش ہے میری یعنی کے جس دور میں، میں ...... چلو چھوڑو اس بات کو تو میں کہہ رہا تھا کہ اس دور سے آپ سچی کہانیاں سے وابستہ ہو میرے لیے تو آپ ہی بابائے سچی کہانیاں ہو۔ فیصل ندیم بھٹی، سلمان شبیر، بہن منزول خان، عظمیٰ شکور، کاشف عبید، کنزہ ملک، صائمہ مجید، مجید احمد جائی، تبصرے بھی باکمال تھے لیکن جو میرے دل کو بھا گئے وہ ریاض حسین تبسم چوہان، شمائلہ شہزاد، شاذلی، سعید مغل علی، اصغر انصاری اور ملک عاشق حسین ساجد کے اشعار تھے۔ بس پسند اپنی اپنی ہوتی ہے اور ہائیڈ پارک میں خضر حیات حسین، خواجہ راحیلہ بنت مہر علی شاہ، فرح عالم، مومنہ بتول آپ لوگوں نے ہائیڈ پارک کو چار چاند لگا دیئے۔ میں آپ احباب کو داد دیتا ہوں اور آخر میں اگر میری وجہ سے کسی کو دکھ یا تکلیف پہنچی ہو تو وہ ماہ اگست کے شمارے میں مجھ سے بدلہ لے سکتا ہے اگر کسی کے دل میں یہ خیال آئے کہ میں معافی مانگوں گا تو (سوچی وی نا)۔"

☆ بھائی اسد اللہ سانگی! خوش آمدید، 22 صفحات کا خط لکھ کر تم نے کیا ثابت کیا، سچ میں ہم سمجھنے سے قاصر رہے۔ پرچے پر تبصرہ ہوتا ہے۔ تبصروں پر تبصرہ نہیں ہوتا بنے میاں! امید ہے سمجھ گئے ہوں گے۔ (آپ کی طرف سے آواز آئی ہے سوچیں وی ناں)۔

✉: کراچی سے ہماری بہن فرح امین لکھتی ہیں۔ "شمارہ میں نے پڑھا ہی نہیں امتحان کی مصروفیت کی وجہ سے پھر سدرہ کا خط پڑھ کر دل اداس ہو گیا۔ انشاء اللہ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔ میری بہن۔ کاشی بھیا! ایک پراسرار تحریر بھیج رہی ہوں۔ آپ پڑھ لیجیے گا پلیز مہربانی ہوگی۔ سب کو سلام اور دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔

☆ پیاری بہن فرح! خوش رہو، تحریر بھیجنے میں تم واقعی لیٹ ہو گئیں۔ امید ہے سمجھ گئی ہوں گی۔ خوش رہو۔

✉: ہمارے بہت پیارے قاری رانا نعیم اللہ، ہڈالی سے مختصر نامے کے ساتھ احوال میں شریک ہیں، لکھتے ہیں۔ "ماہنامہ سچی کہانیاں کے تمام اسٹاف رائٹرز اور قارئین کی خدمت میں سلام۔ کیا حال ہیں آپ سب کے؟ امید کرتا ہوں کہ سب خیریت سے ہوں گے۔ ڈائجسٹ ابھی تک نہیں ملا۔ بار بار پتا کیا مگر...... پھر مجبور ہو کر کاغذ قلم لے کر لکھنے لگا ہوں کہ کہیں اس بار بھی احوال سے غیر حاضر نہ ہو جاؤں۔ ڈائجسٹ تو ملا نہیں ابھی تک مگر کوئی شکوہ گلہ نہیں کیونکہ امید ہے کہ جب ڈائجسٹ ملے گا تو تمام تھکاوٹ راحت میں تبدیل ہو جائے گی۔ میگزین معلومات اور بہترین کہانیوں سے بھرا ہوا ہوگا۔ ہر کہانی قارئین کو اپنی گرفت میں لے لے گی کیونکہ پلیٹ فارم نمبر ہے۔ اسی انتظار کے ساتھ اجازت۔"

☆ پیارے نعیم! پرچہ نہیں ملا تمہیں اب تک ...... یہ خبر ہمیں شاکڈ میں مبتلا کر گئی۔ بھائی تم سالانہ خریدار بن جاؤ۔ ہر ماہ وقت پر پرچہ تمہارے ہاتھ میں ہوگا۔

✉: احسن ابرار رضوی، ساہیوال سے عرض گزار ہیں ماہ جون 2016ء کا سچی کہانیاں پلیٹ فارم پوری آب تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ سرورق پہ بیٹھی خوبصورت دوشیزہ مسکرا رہی تھی۔ اداریہ میں منزہ سہام "کبھی تو ایسا ہو" اللہ تعالیٰ ہر لاپتا غریب کے نصیب اچھے کرے اور وہ بھی اپنوں میں واپس آجائیں۔ احوال میں کاشی بھائی ہمیشہ کی طرح اچھی باتیں کر رہے ہیں۔ صدارت کی کرسی پہ سدرہ انور علی براجمان تھیں۔ اس کے علاوہ سبھی احوالی خوبصورت تبصرے کر رہے تھے۔ آپ کی نظم بہت پیاری لگی۔ کہانیوں میں اسٹیشن کی وہ رات، انتظار، اور پٹری بدل گئی، آنٹی، کورا کاغذ، کس نے کھیل کھیلا، چوہے، مقدر کا سکندر، دیوانہ، ایک رشتہ، آزادی، انجام محبت، پکوڑے گرم...... بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ ٹرین وہاں بھی ملے گی، اچھوتی، کاٹ دار جملوں سے مزین کہانی تھی۔ اشارہ، خاص پسند نہیں آئی۔ انسان اور حیوان کمال کی تھی۔ سلسلے وار زرد لومڑی، بادبان، زہر عشق تجسس سے رواں دواں ہیں۔ اس کے علاوہ پرچہ زیر مطالعہ ہے۔ پلیٹ فارم نمبر نکال کر کاشی بھائی تاریخ رقم کر دی ہے۔ ویری گڈ مائی سویٹ برادر۔ جیتے رہو۔

☆: پیارے سویٹ بھائی احسن! تمہارا تبصرہ ہمیں بہت سویٹ لگا۔ اگلے ماہ تبصرے کا انتظار رہے گا۔

✉: ہمارے بہت پیارے ساتھی ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا، رجب والا ملتان سے احوال کا حصہ بن رہے ہیں، لکھتے ہیں۔ ماہ رمضان تمام اہل اسلام کو مبارک ہو اور پیشگی عید الفطر کی ڈھیر ولی ڈھیر مبارک باد قبول ہو۔ ماہ جون کا سچی کہانیاں اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ ملا۔ سرورق بہت شاندار پیش کیا گیا۔ اداریہ منزہ سہام نے اہم مسئلے کی طرف توجہ دلائی۔ احوال میں کاشی بھائی، پیاری پیاری باتیں کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سلامتی کے ساتھ سلامت رکھے آمین۔ اس بار احوال کی محفل خوشبوؤں سے معطر معطر تھی۔ کیا ہوا اگر کسی نے ہمیں یاد نہیں کیا۔ ہم چند ماہ غیر کیا ہوئے سبھی بھلا دیا۔ بڑے بے مروت ہو گئے ناں۔ اس بار سدرہ انور علی، سید ملازم حسین شیرازی، کنزہ ملک، صائمہ مجید، مجید احمد جائی، ملک عاشق حسین ساجد، فیصل ندیم بھٹی، احوال کی رونق بڑھا رہے تھے۔ باقی احوالی بھی کسی سے کم نہیں تھے۔ پیارے علی حسنین تابش اب آنکھوں کا کیا حال ہے۔ جلدی صحت یابی کے ساتھ احوال میں واپس لوٹ آؤ۔ پیاری محفل سے نکلتے ہی کہانیوں کی وادی میں سیر کو نکل گئے۔ پکوڑے گرم......، آنٹی، دیوانہ، انجام محبت، کانٹا کھنچ گیا، اور پٹری بدل گئی، اور ٹائم، آزادی، انسان اور حیوان، کیپٹن، ٹرین اور حال، چوہے، کورا کاغذ، انتظار لاجواب کہانیاں تھیں۔ ٹرین وہاں بھی ملے گی کا کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ صائمہ مجید بھائی نے پہلی کہانی پلیٹ فارم بہت اعلیٰ لکھی۔ سلامتی کے ساتھ سلامت رہے۔ قسط وار زرد لومڑی، بادبان، بھارت میں بلیک لسٹ، رنگ جمائے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو محنت کا ثمر عطا فرمائے آمین ثم آمین۔

☆: پیارے ڈاکٹر صاحب! آپ کے تبصرے کا شکریہ، آپ کی کہانی کا شکریہ اور آپ کی محبت کا شکریہ۔ خوش رہیے۔

✉: ہماری بہت پیاری اور رونقِ احوال کنزہ ملک، قاسم پور کالونی، ملتان سے لکھتی ہیں۔ ماہ رمضان میرے لیے ڈھیروں خوشیاں لایا۔ اسکول سے چھٹیاں اور امی سے اجازت نامہ مل گیا۔ ہاں بھائی سچی کہانیاں کھلے عام کچن میں، برآمدے میں، ٹیرس پہ، کمرے میں، جہاں دل چاہے پڑھ سکتی ہوں۔ مگر شرط یہ تھی کہ پورے رمضان کے روزے رکھنے ہیں سدا جیتی رہیں۔ میری پیاری امی جان۔ آپ نے دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت بھی بنا دی لو جی سچی کہانیاں ناراض نہ ہو جائے پہلے اُن سے ہیلو ہائے ہو جائے، سرورق پہ بیٹھی لڑکی مسکرا رہی ہے اور ہونٹوں پہ لپ اسٹک بھی لگی ہوئی ہے۔ اداریہ میں منزہ سہام "کبھی تو ایسا ہو" کاش ایسا ہی

ہو جائے۔غریبوں کے گلشن میں بہار آئے۔احوال کی محفل کاشی بھیا نے خوب سجائی ہوئی تھی کاشی بھیا کون سی نسل کے بادام کھاتے ہیں جو نصیحت بھری باتیں کرتے ہیں۔ہمیں تو بتائیں۔بادام ہم بھی کھائیں۔سدرہ انور علی! بہنا لکھاری ہو کر مایوسی کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔فیصل ندیم بھئی ،ملتان آئیں رج برج سوہن حلوے کھلائیں۔ملتانی میٹھے ہیں محبتیں بانٹتے ہیں۔مبارک باد کے لیے شکریہ۔احوال کی پُر رونق محفل میں جن ساتھیوں نے یاد رکھا،سب کا تہہ دل سے شکریہ۔جنہوں نے یاد نہیں رکھا ،اللہ اُنہیں بھی توفیق دے۔آمین آمین۔شانی خامان کے والد محترم کا اِس دُنیا سے چلے جانا دُکھی کر گیا۔احوال کی پُروقار ،پُررونق محفل سے کہانیوں کی طرف گئے تو پلیٹ فارم کہانیوں کی دھوم مچی تھی ہر کہانی پلیٹ فارم کے حوالے سے خاص کر یہ پرچہ ممتاز احمد صاحب کے لیے اہمیت کا حامل ہو گا۔وہ بیچارے ہر ماہ پلیٹ فارم کہانی لکھتے ہیں۔ناں پکوڑے گرم...... نے آخر تک تجسس قائم رکھا۔ویلڈن۔اور پٹری بدل گئی، آنٹی ،چوہے ،دیوانہ ،ایک رشتہ ،میرا دامن تار تار ،انجام محبت ،شیشہ ،عزت اور ،اوور ٹائم۔آزادی ،اسٹیشن کی وہ رات ،انتظار ،اچھی رہیں۔ٹرین وہاں بھی ملے گی ،صائمہ مجید نے عمدگی کے ساتھ جاندار کہانی لکھی ،ویلڈن۔زر د، لومڑی ،بادبان ،بھارت میں بلیک لسٹ زبردست جارہے ہیں۔زہر عشق میں ٹرین آجاتی تو مزہ آجاتا۔جنات بھی تو آخر ٹرین میں سفر کرتے ہوں گے۔مستقل سلسلے ٹھیک چل رہے ہیں۔آخر میں کاشی بھیا کو بہت بہت مبارک باد ،اُنہوں نے پلیٹ فارم کہانی نمبر سجا کر ہم تک پہنچایا۔ویلڈن ،شاباش ،ہزاروں خوشیاں ،آپ کے نام......

☆: بہت پیاری کنزہ! تمہاری محبتوں کی رونق سے بھرپور خط مزہ دے گیا۔خوش رہو۔

✉: ایم اے راحیل ،ملتان سے لکھتے ہیں۔پیشگی عید الفطر کی مبارک باد کے ساتھ ماہ جون 2016ء کے احوال کی طرف بڑھتے ہیں۔سب سے پہلے ٹائٹل کی بات کرتے ہیں۔ٹائٹل میں مسکراتی لڑکی کو دکھایا گیا ہے۔اداریے میں منزہ سہام نے لاپتا افراد کی طرف توجہ دلائی ہے۔کاش اُن کی باتیں سچی ہو جائیں۔احوال کی محفل کاشی بھائی سجائے بیٹھے ہیں۔ہر کسی کو بغور دیکھ رہے ہیں۔سدرہ انور علی اور منزل خان کی مصیبتوں ،پریشانیوں سے نجات کی دُعائیں کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ قبول فرمائے آمین۔احوال کی محفل کی بات کی جائے تو چند خطوط کے علاوہ سبھی خوبصورت تبصرے کر رہے تھے۔چند لوگوں نے بس اپنی بات کی ہے اور چل دیئے۔جن کو کاشی بھائی ،واضح کر رہے ہیں۔یہ لوگ سچی کہانیاں کا مطالعہ تو نہیں کرتے ہیں بس اپنا نام شائع کروانے کے لیے بے معنی خط لکھ کر بھیج دیتے ہیں۔ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔احوال کی خوبصورت محفل سے نکلے تو لائف بوائے ہمارا منتظر تھا۔لو جی ہم تو نہاتے ہی لائف بوائے سے ہیں۔آخر ہم بھی بوائے کی کیٹگری میں آتے ہیں۔اس کے علاوہ ''پکوڑے گرم......''اسٹیشن کی وہ رات'' آنٹی'' اور پٹری بدل گئی'' ٹرین وہاں بھی ملے گی'' کورا کاغذ'' کس نے کھیل کھیلا'' مقدر کا سکندر'' دیوانہ'' ایک رشتہ'' آزادی'' انجام محبت'' کانٹا کھینچ گیا ،انسان اور حیوان کمال کی کہانیاں تھیں۔قسط وار زرد لومڑی ،بادبان ،زہر عشق کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں۔اشارہ'' کہانی متاثر نہ کر پائی۔بھارت میں بلیک لسٹ سفر نامہ بہترین جارہا ہے۔مستقل سلسلے تیر نیم کش ،ہائیڈ پارک مسئلہ یہ ہے۔بہترین جارہے ہیں۔

☆: پیارے راحیل! تبصرہ جاندار رہا تمہارا...... اگلے ماہ تمہارے تبصرے کا انتظار رہے گا۔

✉: لیجیے جی ،ایک اور جالی ایم مجاہد حسین جالی ملتان شریف سے پہلی بار تشریف لائے ہیں ،لکھتے ہیں۔پہلی بار سچی کہانیاں کی محفل میں بنا دستک کے چلا آیا ہوں ،اُمید ہے درگزر کرتے ہوئے محفل میں خوش آمدید کہیں گے۔ایک عرصے سے سچی کہانیاں زیر مطالعہ رہا ہے مگر اس بار پلیٹ فارم نے حد سے زیادہ متاثر

کر دیا۔ پہلے صرف ایک ہی کہانی پلیٹ فارم پر پڑھنے کو ملتی تھی اب کی بار پورے کا پورا پرچہ پلیٹ فارم، واہ، کاشی بھائی، واہ۔ اداریہ منزہ سہام نے اچھا لکھا۔ احوال کی محفل پاکستان کے کونے کونے سے آئے دوستوں سے سجی تھی۔ سب کو آپ کی محبتیں ہی کھینچ لائی ہیں۔ سینئر جونیئر سب ساتھ ساتھ ہیں۔ محبتوں کا پیغام۔ واہ واہ۔ سارے احوال پیارے تھے، ممتاز احمد صاحب دوسرے ماہ سے احوال کی محفل میں نظر نہیں آرہے، خیریت۔؟ آپ کی مختصر نظم اعلیٰ تھی۔ لائف بوائے کی کہانیاں عمدہ جارہی ہیں۔ پلیٹ فارم کی تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ میرے علاقے سے لکھی کہانی، ٹرین وہاں بھی ملے گی۔ تجسس بھرا نام اور کہانی بھی سپرہٹ تھی۔ صائمہ مجید ویلڈن بہت بہت مبارک۔ کیپٹن، ٹرین اور حال، انسان v/s حیوان، اور پٹری بدل گئی، دیوانہ، ایک رشتہ، کمال کی تحریریں تھیں۔ زرد لومڑی، زہر عشق بے مثال کامیابی کے ساتھ منزل کی طرف محو سفر ہیں، بادبان نعمان الحق نے عمدہ قلم چلایا۔ بھارت میں بلیک لسٹ، انجام محبت بھی خاصے کی تحریریں تھیں۔ مستقل سلسلے ہائیڈ پارک، تیر نیم کش، مسئلہ یہ ہے، اچھے ہیں۔

☆: پیارے مجاہد! خوش آمدید! لو خوش ہو جاؤ، پورا خط احوال کی زینت بن گیا۔ اب ہر ماہ ہمارے احوال کا حصہ بننا ہوگا۔ منظور ہے نا۔

✉: ہمارے مجید احمد جائی، ملتان شریف سے برقی نامے کے ساتھ موجود ہیں، لکھتے ہیں۔ امید واثق ہے بخیریت ہوں گے۔ جب جولائی 2016 کا سچی کہانیاں مارکیٹ میں آئے گا تو عید کی آمد آمد ہوگی۔ تمام اہل اسلام کو پیشگی عید کی خوشیاں مبارک۔ یقیناً آپ نے ماہ رمضان کی برکتوں، رحمتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہوگا۔ سچی کہانیاں جون 2016 یکم جون کو مل گیا۔ ٹائٹل دیدہ زیب تھا۔ کبھی تو ایسا ہو، منزہ سہام نے بہت عمدہ لکھا اور اقتدار میں بیٹھے لوگوں کو اس مسئلے کی طرف توجہ دلائی۔ احوال میں کاشی بھائی کی باتیں ہمیشہ اعلیٰ ہوتی ہیں، نصیحتیں اور درس دیتی باتیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ اللہ عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ شاہد حسین نظام، نام بدل دیا کوئی بات نہیں، آپ کی مرضی اور دعاؤں میں دینے کے لئے ممنون ہوں۔ ملازم حسین شیرازی بھائی مختصر خط لکھنا مجبوری ہوتی ہے، باقی ساتھیوں کو جگہ ملنی چاہیے۔ یاد رکھنے کا شکریہ۔ نزاہت افشاں مہوروہ۔ کبھی کبھی دوسروں کی خوشیوں کے لئے ہار جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔ یہ ہار، ہار نہیں جیت ہی ہوتی ہے۔ سلامت رہیے۔ اس کے علاوہ احوال کی محفل نئے اور پرانے احوالیوں سے سجی ہوئی تھی۔ تمام کے تبصرے عمدہ اور اعلیٰ تھے۔ جن دوستوں نے مجھے یاد رکھا تہہ دل سے ممنون و مشکور ہوں۔ اللہ سلامت رکھے۔ آمین۔ اوکسی ڈی نیشن، نظم بہت اعلیٰ تھی۔ کاشی بھائی ویری گڈ۔ ہر بار نظم ہونی چاہیے۔ کہانیوں میں آنٹی، اور پٹری بدل گئی، چوہے، مقدر کا سکندر، اوور ٹائم، کیپٹن، ٹرین اور حال، انسان بمقابلہ حیوان سپر رہیں۔ پکوڑے گرم...... پراسرار تجسس سے بھرپور تھی۔ آخر تک کہانی کا پتا نہ لگ سکا آخری پیرے میں واضح ہوا۔ زبردست کہانی تھی۔ کانٹا کھنچ گیا، انجام محبت، بادبان، زرد لومڑی، کورا کاغذ، کس نے کھیل کھیلا ہے، اچھی رہی، زہر عشق خوب چل رہی ہے۔ لفظ لفظ تجسس بھرا۔ بھارت میں بلیک لسٹ نامور صحافی خوب لکھ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ مستقل سلسلے خوب چل رہے ہیں۔ سارے پرچے کی بات کی جائے تو سپر ہے۔ کاشی بھائی، کی لگن، محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اللہ سبھی کو سلامت تا قیامت رکھے آمین۔

☆: لو مجید! اب خوش ہو جاؤ کہ ہر غم کے بعد خوشی ملتی ہے۔ خدا تم کو جلد خوشی سے نوازے (آمین)۔

✉: یہ پہلی آمد ہے نور صباء۔ ملت کالج قاسم پور، ملتان سے لکھتی ہیں۔ آپ کہہ رہے ہوں گے۔ جان نہ پہچان، بن گئی مہمان۔ ناراض نہ ہوں۔ لیجئے تعارف۔ میرا نام نور صباء۔ ملتان میں میرا بسیرا ہے اور ملتان کی

سوہنی دھرتی، میرا مسکن۔ ماں باپ کی دُوسری اولاد ہوں۔ غم تو کوئی ہے نہیں۔ مگر خوشیاں ہی خوشیاں ہر سو پھیلی ہیں۔ سچی کہانیاں میں آنے کا سہرا اپنی جان سے پیاری سہیلی، دوست، صائمہ مجید کے سر جاتا ہے۔ ہم شادی کی تقریب میں ملیں اور ان کے ہینڈ پرس میں ملا بھی تو کیا "سچی کہانیاں"۔ پہلے تو حیران ہوئی، پھر ہاتھوں میں لئے دیدار کیا۔ تو اِس کی دیوانی ہوتی گئی۔ ورق ورق اپنے سحر میں قید کرتا چلا گیا۔ یہ ماہ جون کا سچی کہانیاں، پلیٹ فارم نمبر ہے۔ اداریہ سے ہوتے احوال میں پہنچے۔ تو کاشی۔ کاشی۔ کاشی۔ کی آوازیں سماعتوں سے ٹکرانے لگی۔ خیر اب ہم بھی سچی کہانیاں میں وارد ہو گئے ہیں دیکھتے ہیں کتنی چاہتیں، محبتیں ہمارے نام ہوتی ہیں۔ کہانیوں میں "ٹرین وہاں بھی ملے گی" پڑھی، صائمہ مجید نے کہانی کے ساتھ خوب انصاف کیا ہے۔ پکوڑے گرم...... شاندار کہانی تھی، اور پٹری بدل گئی، انجام محبت، انسان اور حیوان، دیوانہ، اوور ٹائم، مقدر کا سکندر، انتظار، چوہے، بہترین کہانیاں تھیں۔ قسط وار کہانیاں پڑھی نہیں۔ پہلی قسطیں جو نہیں پڑھی۔ اب کوئی ترکیب نکالوں گی کہ سابقہ اقساط بھی پڑھ سکوں۔ پہلی حاضری میں اتنا ہی، کاشی بھیاء نے ہمیں لفٹ کرائی تو ہم بھی بھرپور حاضری دیں گے۔

☆: ارے ارے بی بی! ذرا دم تو لو۔ پہلے تو خوش آمدید! لو جی! ہم نے آپ کا ویلکم کیا اب آپ بھی ہر ماہ حاضر ہوں گی احوال میں تبصرہ اچھا تھا۔

✉: رمشا ملک، آزاد کشمیر سے پہلی بار احوال کا حصہ بن رہی ہیں، لکھتی ہیں۔ پیشے کی لحاظ سے ٹیچر ہوں اور آج کل بچوں کو چھٹیاں ہیں تو ہم گھر میں بالکل فری ہیں۔ یہ تو بھلا ہو، میری ہم جولی نازلی کا جس نے سچی کہانیاں کا پرچہ مجھے گفٹ بھیجا۔ اصل نام اُس کا کوئی اور ہے۔ میری نازلی ہے۔ بڑے نخرے والی ہے لیکن دل کی کھری ہے۔ سچی کہانیاں کی دیوانی ہے۔ سو مجھے بھی گفٹ کر دیا۔ ماشاللہ! اُس کی دیوانگی دُرست ہے۔ اداریہ منزہ سہام دُرست کہہ رہی ہیں، ہمارے ملک کا المیہ ہی یہی ہے کہ ہم امیروں کو ترجیح دیتے ہیں اور غریبوں کو اہمیت نہیں دیتے۔ جب تک ہم سوچ کے دائرے کار کو وسعت نہیں دیں گے ہم ترقی نہیں کر سکتے۔ احوال کی گفتگو قہقہے بکھیر رہی تھی۔ تمام دوستوں نے پیارے خط لکھے تھے۔ خطوط کی اتنی تعداد پرچے کی مقبولیت کو ظاہر کرتی ہے۔ پلیٹ فارم کی کہانیاں، پکوڑے گرم......، دیوانہ، مقدر کا سکندر، آزادی، اوور ٹائم، انجام محبت، ایک رشتہ، میرا اُس تار تار، کیپٹن ٹرین اور حال، انسان اور حیوان، چوہے، آنٹی، کورا کاغذ، اور سب سے بڑھ کر ٹرین وہاں بھی ملے گی، تھی۔ ان کے علاوہ باقی کہانیاں اچھی ہی ہوں گے، میں نے ابھی تک پڑھی نہیں، اور بغیر پڑھے تبصرے سے معذرت۔ پہلی حاضری کامیابی کی سند پائے گی تو دوسری حاضری یقینی ہوگی۔ اُس وقت کے لئے اجازت۔

☆: پیاری لڑکی! خوش آمدید! کاشی بھیا آپ کو تہہ دل سے احوال میں منتظر پائیں گے۔ تبصرہ ہر ماہ آنا چاہیے۔

✉: صائمہ مجید، ملتان شریف سے عرض گزار ہیں۔ سبھی کو ماہ رمضان کی ڈھیروں مبارک باد اور آنے والی عید الفطر کی ہزاروں خوشیاں مبارک ہو۔ عید کی خوشیوں میں اپنے اردگرد کے لوگوں کا بھی خیال رکھے گا۔ ماہ جون کا سچی کہانیاں ادارے کی طرف سے اعزازی ملا تو ڈھیروں خون بڑھ گیا۔ ہماری پہلی کہانی سچی کہانیاں کی زینت بنی۔ ٹرین وہاں بھی ملے گی، کیسی لگی۔ قارئین کی رائے بتائے گی۔ بہت شکریہ کاشی بھیا۔ ٹائٹل پہ پہاڑی شہزادی زیورات سے لدی، مسکرا رہی تھی۔ بہت خوب، زبردست۔ اداریہ میں منزہ سہام "کبھی تو ایسا ہو" سچی کھری باتیں کر رہی ہیں۔ احوال میں کاشی بھیا بھی کسی سے کم نہیں۔ ہر بار خوب سے

پراسرار کہانی نمبر 2

Email : pearl ublications@hotmail.com

پراسرار نمبر 1 کی پذیرائی کے بعد پراسرار نمبر 2

ایک ایسا شاہکار شمارہ جس میں دل دہلا دینے والی وہ سچ بیانیاں شامل ہیں جو آپ کو چونکنے پر مجبور کر دیں گی۔

آپ کے اُن پسندیدہ رائٹرز کے قلم سے، جو آپ کی نبض شناس ہیں۔

جن کی کہانیوں کا آپ کو انتظار رہتا ہے۔

جنوں، بھوتوں اور ارواحِ خبیثہ کی ایسی کہانیاں جو واقعی آپ کو خوف میں مبتلا کر دیں گی۔

ہمارا دعویٰ ہے!

اس سے پہلے......

ایسی ناقابلِ یقین، دہشت انگیز اور خوفناک کہانیاں شاید ہی آپ نے پڑھی ہوں۔

آج ہی اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال پر اپنی کاپی مختص کرا لیں۔

سچی کہانیاں کا ماہِ اگست کا شمارہ، پراسرار نمبر 2 ہوگا۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرما لیں۔

اگست 2016ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا/کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کریں۔

نام:--

مکمل پتا:--



اگست 2016ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا/بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کریں۔

عنوان کہانی:------------------ تعداد صفحات:------------------

نام:--

مکمل پتا:--

فون/سیل نمبر:--



اگست 2016ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا/کرتی ہوں۔ میری رائے میں

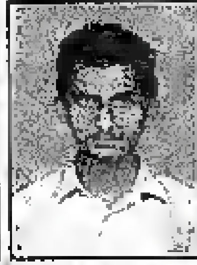
اوّل، عنوان:------------------ مصنف:------------------

دوم، عنوان:------------------ مصنف:------------------

سوم، عنوان:------------------ مصنف:------------------

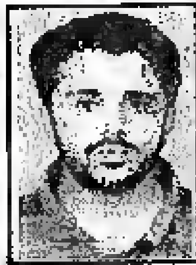
نام:------------------ شہر:------------------

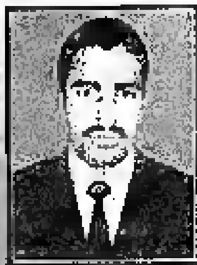
احوال میں شامل ہونے والے نئے احوالی


فیضان خورشید قصور


انور بلوچ کراچی


چک نمبر 190 گ ب


امتیاز عاصم ساہیوال


کنول جی تنہا گگومنڈی


جاوید اقبال ساہیوال

خوب تر باتیں کرتے ہیں اور اتنے ذہین ہیں کہ ہر بات میں موتی بکھیرتے ہیں۔ بہت خوب۔ پیاری بہن
مدسفول علی [illegible]
مجید! واقعی کم گو ہیں، کم بولتے ہیں اور زیادہ لکھتے ہیں لیکن ان دنوں امتحانات میں مصروف ہیں، سو کم لکھ رہے ہیں۔ میں نے ان پہ کوئی پابندی نہیں لگائی۔ فیصل ندیم بھٹی، سلامت رہیں۔ اس کے علاوہ تمام احوال زبردست تھے۔ سبھی احوالیوں نے خوب سے خوب تر لکھا۔ سبھی کو مبارک باد، اس بار منشی محمد عزیز مے بھی شامل حال ہوئے جو کہ چند ماہ سے غیر حاضر تھے۔ اُمید ہے باقی لوگ بھی جلد واپس لوٹ آئیں گے۔ کاشی بھیا اپنی نظم کے ساتھ ساتھ کچھ اپنی باتیں پھر سے شروع کریں۔ کہانیوں میں ''اور پٹری بدل گئی'' ''آنٹی'' شیشہ، عزت اور ''اوور ٹائم'' ''انجام محبت'' ''کانٹا کھینچ گیا'' کیپٹن، ٹرین اور حال ''دیوانہ'' ''ایک رشتہ'' چوہے ''انتظار'' اسٹیشن کی وہ رات'' کورا کاغذ بہت اچھی تھیں۔ پکوڑے گرم...... کمال کی تحریر تھی۔ کس نے کھیل کھیلا، مقدر کا سکندر بھی اعلیٰ تحریریں تھی۔ زرد لومڑی، بادبان، بھارت میں بلیک لسٹ خوب جا رہے ہیں اور زہر عشق نے اپنے عشق میں قید کیا ہوا ہے۔ ہر قسط ایک نیا در کھول دیتی ہے۔ انسان v/s حیوان نے کمال کر دیا۔ اس کے علاوہ مستقل سلسلے ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش خوبصورتی سے چل رہے ہیں۔ آخر میں سب کے لئے دُعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ سبھی کو تندرست رکھے آمین۔

☆: پیاری سی بھابی! تم جیو ہزاروں سال، تبصرے کرتے ہوئے۔

✉: ثنا ملک اور شہناز پروین کی ملتان سے پہلی بار آمد ہے، لکھتی ہیں۔ ہم دونوں سہیلیاں ہیں اور سچی کہانیاں شوق سے پڑھتی ہیں۔ آج پہلی بار دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کاغذ قلم کا سہارا لے کر خط لکھ رہی ہیں۔ خط لکھنے کی خاص وجہ پلیٹ فارم نمبر ہے۔ ہمیں ٹرین کا سفر بہت اچھا لگتا ہے۔ اس بار بھی ٹرین کے سفر میں تھیں کہ اسٹیشن پہ سچی کہانیاں سنہری حروف میں ''پلیٹ فارم نمبر'' لکھا دیکھا تو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر خرید لیا۔ ٹرین میں ٹرین کہانیاں پڑھنے کا اپنا ہی مزہ ہے۔ سرورق پہ بیٹھی پہاڑی دوشیزہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ احوال میں جگمگاتے چہرے، میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے۔ سبھی کے خط پسند آئے۔ کہانیوں میں، مقدر کا سکندر، چوہے، دیوانہ، ایک رشتہ، آزادی، انجام محبت، پکوڑے گرم...... ٹرین وہاں بھی ملے گی، اوور ٹائم زبردست رہی۔ باقی تحریریں بھی کم نہیں تھیں۔ پسند اپنی اپنی۔ زہر عشق نے ڈرا دیا، زرد لومڑی بھی ٹھیک رہی، بھارت میں بلیک لسٹ سفرنامہ پیارا ہے۔ پہلی بار ہے، حوصلہ افزائی ہوئی تو اگلے ماہ آئیں گی۔

☆: پیاری سہیلیو! خوش آمدید! لو بھئی تمہاری تو حوصلہ افزائی ہوگئی۔ اب اگلے ماہ آ کر ہماری حوصلہ افزائی بھی کر دینا۔

سونیا خان، بستی نیو شاہ گردیز، کوٹلہ رحم علی، ملتان سے اپنے احوال کے ساتھ موجود ہیں، لکھتی ہیں۔ اُمید کرتی ہوں ماہ رمضان کی خاص برکتیں سمیٹے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ماہ رمضان کے صدقے تمام مومن مسلمانوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے آمین۔ ماہ جون کا سچی کہانیاں ممتاز آباد سے خریدا۔ ماشاءاللہ! سرورق بہت اعلیٰ اور عمدہ ہے۔ خوشیوں کی نوید لیے سچی کہانیاں سج دھج کے ساتھ جلوگر ہوا اور اپنے سحر میں جکڑتا چلا گیا۔ اداریہ میں منزہ سہام دل گیر سچی باتیں کر رہی تھیں۔ احوال میں کاشی بھیاء ہمیشہ کی طرح کھری باتیں کر رہے ہیں۔ کیا کریں جی، ہم ٹھہرے بے عمل لوگ۔ اللہ تعالیٰ عمل کرنے کی توفیق دے۔ آمین ۔گرمیوں کی چھٹیاں ہو چکی ہیں۔ اب فری ہی فری ہیں اور ماہ رمضان کی برکتیں، رحمتیں سمیٹ رہے ہیں ۔افطاری کے بعد سچی کہانیاں کا مطالعہ ضرور کرتی ہوں۔ احوال کی محفل روشن خیال لوگوں سے سجی تھی۔ سبھی کے تبصرے زبردست تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ”ترین وہاں بھی ملے گی“ جو میری بھابی صائمہ مجید نے لکھی۔ کمال کی جملے بازی کی گئی تھی۔ اور تمام کا تمام پرچہ پلیٹ فارم کہانیوں پر مشتمل تھا۔ واہ بھائی واہ ۔کمال ہی کر دیا۔ اور پٹڑی بدل گئی، انتظار، آنٹی، چوہے، دیوانہ، انسان اور حیوان، اور ٹائم، ایک رشتہ، شیشہ ،عزت اور، انجام محبت سپرہٹ کہانیاں تھیں۔ زردلومڑی، بادبان، بھارت میں بلیک لسٹ، اور زہر عشق خوب چل رہی ہیں۔ کاشی بھیاء واقعی آپ بہت محنتی ہیں۔ اس کی ثبوت سچی کہانیاں کا پلیٹ فارم نمبر ہے۔ آپ کی محنت، ہمیشہ رنگ لاتی ہے، طویل کہانی نمبر، پلیٹ فارم نمبر یا پُراسرار نمبر ہو۔ واقعی آپ کمال کر دیتے ہیں۔

☆: پیاری سونیا! تم لوگوں نے پلیٹ فارم نمبر پسند کیا، ہماری محنت وصول ہو گئی، خوش رہو۔

پیارے ساتھیو! لیجیے احوال اپنے اختتام کو پہنچا اور عید بھی اب کچھ ہی قدم پر ہے۔ میری اور میرے ادارے کی جانب سے آپ سب کو دلی عید مبارک قبول ہو۔ اجازت لینے سے قبل تازہ ترین نظم آپ کی نذر......

بلیو گلیکسی

جس طرف دیکھیے
خلا ہی خلا
آگ ہی آگ ہر طرف ہے یہاں
سنتے تھے آسماں سے نیلی دِکھے
ہائے! اب تو فقط دھواں ہی دھواں
جب بھی دیکھوں مدار سے باہر
نیلی میری زمیں دِکھے ہے سرخ
نیلی میری زمین نارنجی دِکھے
نیلی میری زمیں دھواں سا لگے
اب تو آثار یہ بتاتے ہیں
تیسری جنگ بھی دھوئیں میں چھڑے
یا خدا اُبھر دے
اس گلیکسی میں بلیو رنگ پھر سے
ساتھ ہی [illegible]

آپ کا اپنا
کاشی چوہان

لائف بوائے... کچھ نیا کر دکھائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت
سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

اُس وقت میری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ میرے شوہر شاہنواز ڈاکٹر تھے اور آسٹریلیا میں سیٹل تھے۔ جانے کے بعد میں نے برسوں پلٹ کر میکے کی خبر بھی نہ لی لیکن بڑی اَدّے اور بی جان کی یاد ایک میٹھی کسک بن کر میرے دل میں ضرور اٹھتی تھی۔ ان کا خلوص ان کی محبت ایسی تو نہ تھی کہ جس کو اتنی آسانی سے بھلا دیا جاتا۔

اماں ابا کے اچانک گزر جانے کے بعد بڑی اَدّے ہی تھیں جو مجھے ماں کی طرح پیار کرتی تھیں۔ میں سب سے چھوٹی ہونے کے ناتے گو کہ سب ہی لاڈلی تھی۔ مگر بڑی اَدّے کی محبت نے اماں کی محبت کو جیسے اپنی آغوش میں بھر لیا تھا۔

آسٹریلیا میں ہونے کے باوجود اپنے وطن سے محبت بھلا کہاں دل سے نکل سکتی ہے اور یہ جو رشتے ہوتے ہیں نا۔ یہ اپنی جڑیں اتنی گہری رکھتے ہیں کہ ان سے فرار ممکن نہیں۔ جب ہم آسٹریلیا گئے تو سیٹلائٹ پر صرف پاکستانی ایک دو چینل ہوا کرتے تھے مگر اب تو ڈیڑھ سو دو سو چینل ہمارے اپنے ہیں۔ میں نیوز چینل انہماک سے دیکھ رہی تھی کہ لائف بوائے، اسٹرانگ اینڈ تھک شیمپو کے اشتہار جس میں ماڈل بتا رہی تھی کہ لائف بوائے شیمپو کے استعمال سے بال دکھیں۔ 30 فیصد تک زیادہ گھنے...... نے مجھے واپس اپنے پاکستان اپنوں کے درمیان لاکھڑا کیا۔ مجھے یاد آ گیا کہ اسکول جانے سے قبل ہمیشہ ہی بڑی اَدّے مجھے لائف بوائے شیمپو سے سر دھونے کی تاکید کرتی تھیں۔ مجھے بھی لائف بوائے شیمپو سے ایک محبت تھی جو اب تک قائم ہے۔ بس اس اشتہار میں ماں بیٹی کے رشتے نے مجھے بڑی اَدّے کے پاس لاکھڑا کیا تھا۔ مجھے دیکھ دیکھ میری سہیلیاں بھی لائف بوائے شیمپو ہی استعمال کرتی تھیں۔ لائف بوائے شیمپو کی ہمیشہ سے یہ خوبی رہی ہے کہ اس کے باقاعدہ استعمال سے بال مضبوط، گھنے اور چمکدار ہو جاتے ہیں۔ بالوں کے دو موہے پن سے بھی نجات ملتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب بھی ہمیشہ لائف بوائے شیمپو کے حق میں ہی رہے ہیں۔ ان کے اندازے کے مطابق آسٹریلیا میں بھی بیسٹ سیلنگ شیمپو یہی لائف بوائے شیمپو ہی ہے۔ خیر اپنے بابل کے گھر کی یاد مجھے لائف بوائے شیمپو نے ہی دلائی تھی۔ میں فوراً بڑی اَدّے سے ملنے کو بے چین ہو گئی تھی۔

مجھے خوب خوب یاد تھا جن دنوں میری شادی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں ہمارے گاؤں میں ٹیلی فون کی سہولت بھی نہیں تھی کہ میں ان سے رابطہ کرتی۔ شاہنواز کی تو ساری فیملی ہی باہر تھی اس لیے ان کا پاکستان آنا جانا ہی نہ تھا۔ ان کی اکلوتی چھوٹی بہن سبرینہ کے شوہر انعام شاہ

دبئی میں مقیم تھے اور ان کے بڑے بھائی شاہد لالہ بھی ڈاکٹر تھے جو کئی برسوں سے سعودی عرب میں تھے اور والدین انہی کے ساتھ رہتے تھے۔ ہم دو دفعہ سعودی عرب ان کو ملنے گئے۔ عمرے کی سعادت بھی حاصل کی۔ سبرینہ کو ملنے دبئی بھی گئے لیکن اپنا وطن میرے لیے ایک بھولی بسری یاد بن کر رہ گیا تھا۔ کچھ یہاں آ کر زندگی ہی اتنی مصروف ہوگئی تھی کہ کچھ سوچنے کے لیے وقت بھی کم ہی ملتا تھا پھر بچوں کی پیدائش کے بعد تو روٹین اتنی ٹف ہوگئی تھی، کام، کام اور کام۔ یوں اپنوں سے بچھڑے پندرہ برس گزر گئے۔

☆......☆

ایک دن اچانک شاہنواز نے بتایا کہ پاکستان میں ڈاکٹروں کی کوئی کانفرنس ہو رہی ہے جس میں وہ بھی انوائیٹڈ ہیں، اس کانفرنس میں شرکت کے لیے وہ دو ہفتے کے لیے پاکستان جا رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی میرے دل میں لائف بوائے شیمپو نے جو امنگ جگائی تھی۔ وطن جانے کی ہوک پھر سے اٹھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ بچوں کی چھٹیاں نہیں تھیں۔ میں نے بڑی سوچ بچار کے بعد اپنی ہمسائی اور بہت اچھی دوست فریدہ کو بچوں کی دیکھ بھال کے لیے تیار کر لیا اور اپنی تیاری بھی شروع کر دی۔

میں بہت برسوں تک سب کو بھولی رہی تھی لیکن اب اچانک میرے دل میں بڑی اڈے بی جان کے ساتھ زرمینہ آپا، رخشی آپا، محمود لالہ اور بابر لالہ کی محبت بھی جوش مارنے لگی۔ مجھے یاد آ رہا تھا کہ یہ سب لوگ مجھ سے کتنا پیار کرتے تھے کیونکہ اپنے بہن بھائیوں میں، میں سب سے چھوٹی تھی۔ اماں بابا کی لاڈلی تو میں تھی ہی لیکن بڑے بہن بھائیوں کے لیے تو گویا میں ایک کھلونا تھی۔ سارا دن مجھے اٹھائے پھرتے تھے۔ بڑی اڈے اور بی جان تو بھی کے لیے سراپا محبت تھیں، وہ ہم سب پر ہی جان چھڑکتی تھیں۔

زرمینہ آپا اور رخشی آپا نے قرآن پاک کے علاوہ گاؤں کے اکلوتے اسکول سے مڈل کا امتحان پاس کیا تھا اور ان کی شادیاں ہوگئیں جبکہ میں چونکہ بابا کی بہت لاڈلی تھی اس لیے ضد کر کے گریجویشن کر لیا۔ میری خاطر بابا نے اپنی پرانی روایات کو توڑتے ہوئے مجھے بورڈنگ بھیج دیا تھا لیکن ساتھ ہی بڑی اڈے، اماں اور بی جان نے ڈھیر ساری نصیحتوں کی گٹھڑی باندھ کر ہمراہ کر دی تھی جس کی وجہ سے وہ سارا وقت میں نے بڑے پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے گزارا تھا لیکن اسکول اور کالج کی ایک بات مشترک تھی۔ بڑی اڈے کا پیار اور میری لائف بوائے شیمپو سے ازلی محبت، میں بورڈنگ میں بھی لائف بوائے شیمپو کی ایمبیسیڈر رہی گردانی جاتی تھی۔ اور پھر میں تعلیم مکمل کر کے آئی تو چھ ماہ کے اندر اندر میری شادی ہوگئی۔

شاہنواز سے میرا رشتہ پہلے سے ہی طے تھا۔ ان کے والد بابا کے پرانے دوست تھے۔ میری شادی کے کچھ عرصے بعد اماں اور بابا، کاکا جی صاحب کے مزار پر سلام کرنے سوات گئے تھے۔ اماں نے کوئی منت مان رکھی تھی۔ واپس آتے ہوئے ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آیا۔ وہ دونوں موقع پر ہی جان بحق ہوگئے۔ ابھی ہم بمشکل اس صدمے سے نکلے ہی تھے کہ جائیداد کی تقسیم کا مرحلہ در پیش ہوا۔ اماں کی ساری جیولری دونوں بھابیوں نے قبضے میں کر لی تھی۔ بابا کا سارا بینک بیلنس پتا نہیں کس طریقے سے بھائیوں نے اپنے نام منتقل کروا لیا۔ باغات اور شہری جائیداد میں سے بھی بہنوں کو بے دخل کر کے زرعی اراضی میں سے حصہ دے دیا اور وہ بھی بنجر اراضی کا۔ ان تمام ناانصافیوں کے باوجود بڑی اڈے اور بی جان نے حق کا ساتھ دینے کی بجائے مجھے چپ رہنے کو کہا تو میں ان سے بھی خفا ہوگئی اور اتنے سالوں تک پلٹ کر ان کی خیریت بھی معلوم نہ کی لیکن اب نجانے کیوں میرا دل چاہتا تھا کہ اڑ کر ان سب سے جا ملوں۔

چند دنوں میں ہی ہماری تیاری ہوگئی۔ بس بڑی اڈے کے لیے میں کچھ گفٹ لینے سپر مارکیٹ خاموشی سے نکل گئی۔ اور پھر میری بھی تیاری مکمل ہوگئی۔

☆......☆......☆

اسلام آباد ایئرپورٹ پر اترتے ہی میرا دل اپنے گاؤں جانے کے لیے ہمکنے لگا لیکن شاہنواز نے کانفرنس اٹینڈ کرنی تھی۔ میری بے قراری دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا کہ کل تم ہوٹل سے کار لے کر گاؤں چلی جاؤ، میں کانفرنس ختم ہوتے ہی وہاں پہنچ جاؤں گا اور پھر اکٹھے واپس آئیں گے۔

اگلے ہی دن شاہنواز نے ہوٹل سے کار ہائیر کر کے

مجھے پشاور روانہ کر دیا۔ میں جلدی نکلنا چاہتی تھی تاکہ دن کی روشنی میں گاؤں پہنچ جاؤں لیکن تیاری کرتے کرتے تھوڑی دیر ہوگئی اور میں لنچ کے بعد ہی وہاں سے نکل سکی۔ گاڑی شہر کے ہنگاموں اور رش سے نکل کر مین پشاور روڈ پہ چڑھی تو میں نے ریلیکس ہو کر اپنا سر سیٹ سے لگالیا اور گاڑی سے باہر بھاگتے ہوئے درخت اور عمارتیں دیکھنے لگی۔ ان سالوں میں کتنا کچھ بدل گیا اور تو اور سڑک کے کنارے لگے ہوئے نیون سائن ہی کتنے نامانوس سے نظر آرہے تھے۔ میں چپ چاپ اپنے بچپن کے محبت بھرے خوب صورت دنوں کو یاد کر رہی تھی جب اماں اور بابا کے محبت بھرے سائے میں ہم سب خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے۔ بڑی اَدے نے سارے گھرانے کو مالا کی طرح ایک دھاگے میں پرو رکھا تھا۔ سب اکٹھے مل کر رہتے تھے۔

وہ بچپن کے دن پھر سے مجھے اماں اور بڑی اَدے کی گود میں لے گئے۔ اور میں پھر سے یادوں کی وادیوں کی سیر کو نکل گئی۔ بڑی اَدے مجھے لائف بوائے شیمپو دیتے ہوئے جلدی سے نہانے کا کہتے ہوئے میرا لنچ بنانے چلی گئیں۔

میں لائف بوائے شیمپو کی بوتل ہاتھ میں پکڑ کر اکثر خود کو بھی بوتل پر بنی بال لہراتی لڑکی ہی تصور کرتی تھی۔ نہا کر آئی تو اماں نے تولیے سے بال خشک کیے اور اپنے سامنے بٹھا کر دو چوٹیاں گوندھ دیں۔

اماں اتنی مضبوطی سے چوٹی کستی تھیں کہ میرا سر دکھ جاتا تھا۔

''اماں آپ ہمیشہ مضبوط چوٹی کیوں گوندھتی ہیں۔'' میرے سوال پر اماں مسکرا کر رہ جاتیں۔

''یہ بالوں کے لیے اچھا ہوتا ہے تمہارے بالوں کی حفاظت کے لیے لائف بوائے شیمپو ہے اور تمہارے بالوں کی بقا اور دیکھ بھال کے لیے میرا پیار......'' اماں مسکرا کر کہتی کتنی پیاری لگا کرتی تھیں۔

''یعنی میری دو ماں ہوئیں۔ ایک آپ اور ایک لائف بوائے شیمپو۔'' میں اٹھلا کر کہتی دونوں چوٹیاں گھمانے لگتی۔

''بالکل! میری بچی!'' بڑی اَدے دور سے یہ نظارہ دیکھ کر محظوظ ہوتی رہتیں۔

بی جان کا چھوٹا سا بنگلہ اگرچہ حویلی کے دوسرے سرے پر تھا لیکن بی جان کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ بھی اپنے گھر کا کام نمٹا کر ادھر ہی آجایا کرتی تھیں۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی محبتیں ہم سب پر ہی لٹائی تھیں اور میں تو ان کی چہیتی تھی۔ میرے کتنے ناز اٹھایا کرتی تھیں وہ۔ ان کی یاد آتے ہی ایک نرم سی مسکراہٹ خود بخود میرے لبوں پر پھیل گئی۔

ہم پشاور کے مضافات میں پہنچے تو دن بھر کا تھکا ہارا سورج اپنا سفر مکمل کر کے غروب ہونے کو تھا۔ ایک بڑا سا اورنج تھال تھا جو دھیرے دھیرے دھرتی کے سینے میں اتر رہا تھا۔ میں پوری طرح الرٹ ہو کر بیٹھی تھی تاکہ ڈرائیور کو راستہ بتا سکوں۔ ہمارے گاؤں کو جانے والی سڑک یہیں سے سیدھے ہاتھ کو جاتی تھی۔ میں نے ڈرائیور کو بتایا تو اس نے گاڑی کو اس سڑک پر ڈال دیا۔ مجھے یہ دیکھ کر ایک خوشگوار حیرت ہوئی کہ سڑک اب پکی ہوگئی تھی۔ دونوں کناروں پر یوکلپٹس کے درخت ابھی لگے تھے۔ اگر موڑ پر گاؤں کا نام نہ لکھا ہوتا تو شاید میں پہچان بھی نہ سکتی۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ ایک اداس اور سوگوار سی شام دھیرے دھیرے نیچے اتر رہی تھی۔ بہت ساری تبدیلیوں کے باوجود کچھ جانی پہچانی نشانیاں ابھی باقی تھیں جو بتا رہی تھیں کہ میں صحیح راستے پر جا رہی ہوں۔ میں ڈرائیور کو گائیڈ کرتی جا رہی تھی۔ جب گاڑی ہمارے گاؤں کی مانوس گلیوں میں داخل ہوئی تو اندھیرا پوری طرح چھا چکا تھا لیکن میری یادداشتوں میں تمام راستے، گلیاں اور موڑ اسی طرح تر و تازہ تھے۔ جب گاڑی ہماری قدیم حویلی کے بڑے سے آہنی گیٹ کے سامنے جا کر رکی تو دستک سے قبل ہی کرمو کاکا نے گیٹ کھول دیا۔ ڈیوڑھی میں زرد سا بلب روشن تھا۔ میں اپنی گرم شال کو اپنے جسم کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر گاڑی سے اتری تو اتنی مدت کے بعد بھی کرمو کاکا نے مجھے فوراً پہچان لیا۔ میرے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے ان کی بوڑھی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں جنہیں بار بار وہ اپنے کمبل سے رگڑ کر صاف کر رہے تھے۔ اتنی دیر میں ڈرائیور نے میرا سامان نکال کر باہر رکھ دیا۔ طے شدہ رقم اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ

رخصت ہوگیا۔ کرموکا کا میرا سامان اٹھا کر بڑی حویلی کی طرف چل پڑے۔ میرے قدم بے ساختہ بی جان کے چھوٹے سے بنگلے کی طرف اٹھ گئے جو حویلی کے دوسری جانب آخری کنارے پر بنا تھا۔

شاہ بلوط کے اونچے درختوں کی اوٹ میں بنا یہ چھوٹا سا گھروندا مجھے ہمیشہ بی جان کی طرح ہی لگتا تھا جیسے سفید ململ کا دوپٹہ لپیٹے جاء نماز پر بیٹھی تسبیح رول رہی ہوں۔ مجھے ان کی طرح ان کے اس چھوٹے سے گھروندے سے بھی بہت پیار تھا جس میں ہمارے بچپن کے بہت خوشگوار دن بیتے تھے۔ سردیوں میں بی جان آتش دان کے گرد صندلی لگاتی تھیں جس میں اُن سمیت ہم سب گھس جایا کرتے۔ درمیان میں چھوٹی ٹیبل پر ڈرائی فروٹ کی ڈش پڑی ہوتی۔ چلغوزے' بادام' پستے وغیرہ جو آغا جی کابل سے لایا کرتے تھے' کوئلوں پر قہوے کی تام چینی کی کیتلی سے بھاپ اٹھ رہی ہوتی' ٹیبل پر قہوے کی چھوٹی چھوٹی پیالیوں کے ساتھ قندانی میں مصری کی ڈلیاں اور ایک پیالے میں رنگ برنگے ریپروں میں لپٹی ٹافیاں پڑی ہوتیں جن کو منہ میں رکھ کر ہم قہوہ پیا کرتے۔ آغا جی موج میں ہوتے تو ہمیں کہانی سنایا کرتے جو اتنی لمبی ہوتی کہ رات ختم ہو جائے' یہ کہانی ختم نہیں ہوتی تھی یا پھر وہ ہمیں جنگ عظیم کے قصے سنایا کرتے تھے۔ کیا خوب دن ہوا کرتے تھے وہ بھی!

میں اپنی سوچوں میں گم ان کے بنگلے کے گیٹ تک جا پہنچی۔ میں نے ہلکا سا ہاتھ لگایا تو گیٹ کھلتا ہی چلا گیا۔ برآمدے میں زرد رنگ کا بلب جل رہا تھا جس کی دھندلی سی روشنی آنگن تک آ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے آنگن پار کیا تو سردی کی ایک لہر میرے پورے وجود کو کپکپا گئی۔ مرکزی دروازہ کھلا تھا' سامنے آتش دان میں موٹی موٹی لکڑیاں جل رہی تھیں۔ بی جان اپنی مخصوص ساگوان کی آرام کرسی پر گرے رنگ کی شال اوڑھے بیٹھی سویٹر بن رہی تھیں' کوئلوں پر قہوے کی بھاپ اڑاتی کیتلی پڑی تھی۔ اخروٹ کی لکڑی کی چھوٹی تپائی پر دو پیالیاں اور مصری والی قندانی بھی پڑی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ ذرا حیران نہیں ہوئیں' نہ ہی چونکیں' مجھے یوں لگا جیسے میرے آنے کی اطلاع انہیں پہلے ہی مل چکی ہو۔ کوئی شکوہ شکایت کیے بغیر وہ بڑے خلوص سے مجھے ملیں اور پیالی میں قہوہ ڈال کر مجھے دیا۔ میں نے مصری کی ایک ڈلی اٹھا کر منہ میں رکھی اور گرم گرم قہوے کے گھونٹ حلق سے اتارنے لگی۔ میں خاموشی سے بیٹھی انہیں دیکھ رہی تھی اور اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ان گزرے سالوں نے ان پر کیا اثرات ڈالے تھے؟ وہ مسکرا کر بولیں۔ ”کیا تم ابھی تک ناراض ہو؟“

”نہیں بی جان' اگر ناراض ہوتی تو کیا خود چل کر آپ کے پاس آتی؟“

”بیٹا! شاید ہم ہی غلط ہوں مگر ہماری تربیت ہی کچھ اس انداز سے ہوئی تھی کہ مادی اشیاء کو رشتوں پر فوقیت نہ دی جائے کیونکہ رشتے بہرحال زیادہ اہم ہوتے ہیں۔“

”لیکن یہ سوچ دونوں طرف ہونی چاہیے نا' قربانیاں صرف عورتوں کو ہی کیوں دینی پڑتی ہیں؟“

”اس لیے کہ ہمارا معاشرہ مردوں کا معاشرہ ہے۔ ہم عورتوں کو ہمیشہ مرد کے سہارے کی ضرورت رہتی ہے۔ باپ' بھائی یا شوہر ہی عورت کا محافظ ہوتا ہے۔ بازو ٹوٹیں تو گلے کو آتے ہیں۔ اب زیتون کو دیکھو نا' جوانی میں بیوہ ہوگئی تھی۔ انہیں اور ان کی یتیم بچیوں کو کس نے سہارا دیا تھا؟ بھائیوں نے۔ ورنہ رواج کے مطابق انہیں اپنے آوارہ مزاج دیور سے شادی کرنا پڑتی جس کی پہلے ہی دو بیویاں اور کئی بچے تھے۔ اگر بھائی ان کے ساتھ کھڑے نہ ہوتے تو وہ زبردستی کرکے اس کی زندگی جہنم بنا دیتے اور پھر تمہیں یاد ہوگا' تمہارے بابا میرے ساتھ کتنی محبت کرتے تھے' ان محبتوں کو قائم رکھنے کے لیے مادی اشیاء کے علاوہ بھی بہت کچھ قربان کرنا پڑتا ہے جو ہمیں سکھایا گیا تھا اور جس کو ہم ٹھیک سمجھتے تھے' وہی نصیحت ہم اپنے بچوں کو کر سکتے تھے نا؟ کیا تم جانتی ہو کہ ان محبتوں کو قائم رکھنے کے لیے مجھے کیا کچھ قربان کرنا پڑا تھا؟“

میں حیرت سے بی جان کو دیکھ رہی تھی۔ آج مجھے وہ ہمیشہ سے بہت مختلف نظر آ رہی تھیں۔

”تمہیں پتا ہے نا' تمہارے دادا جی اور بڑی اڈے شادی کے کئی سال بعد تک اولاد کی نعمت سے محروم رہے تب مجبوری کے تحت انہیں چھوٹی اڈے سے شادی کرنا پڑا لیکن بڑی اڈے کے عزت و احترام میں کوئی فرق نہ

آیا۔ انہوں نے بھی چھوٹی اڈے کو چھوٹی بہن کا درجہ دے دیا۔ ہم نے ان دونوں کو کبھی روایتی سوکنوں کی طرح لڑتے جھگڑتے یا ایک دوسرے کی جڑیں کاٹتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ چھوٹی اڈے پر اللہ کی مہربانی ہوئی اور ایک سال کے اندر ہی تمہارے دا جی کو اپنی جائیداد کا وارث مل گیا۔ ان کی اس خوشی میں بڑی اڈے نے ان سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تمہارے بابا کو جنم تو چھوٹی اڈے نے دیا تھا لیکن ان کو پالا پوسا بڑی اڈے نے ہی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تمہارے بابا اپنی ماں سے بڑھ کر بڑی اڈے کو چاہتے تھے پھر شاید اللہ تعالیٰ کو بڑی اڈے کی محرومی پر رحم آ گیا۔ تمہارے بابا کے تین سال بعد اللہ نے میری شکل میں ان کو بیٹی سے نواز دیا لیکن تمہارے بابا کی محبت میں کمی نہیں آئی۔ وہ ہمیشہ ان کو مجھ سے زیادہ چاہا کرتی تھیں اور تمہیں یاد ہے نا کہ جب اسکول جانے سے پہلے ایک دن تمہارا لائف بوائے شیمپو ختم ہو گیا تھا۔ تم نے سارا گھر سر پر اٹھا لیا تھا تو بڑی اڈے نے مسکراتے ہوئے اپنے صندوق سے تمہیں لائف بوائے شیمپو کی نئی بوتل نکال کر دی تھی اور کہا تھا یہ شیمپو میں نے صرف اس لیے سنبھال کر رکھا تھا کہ میری گڑیا کو ایمرجنسی میں کبھی ایسی صورت حال پیش آ جائے تو وہ پریشان نہ ہو۔"

میری آنکھوں میں بڑی اڈے کی محبت یاد کر کے آنسو آ گئے۔

☆☆......☆☆

شام کو پورے گھر میں رونق سی لگ گئی تھی۔ آج لگ رہا تھا کہ حویلی پھر وہی رونقیں لے کر ماضی کا حصہ بن گئی ہے۔ لیکن ماضی تو ماضی ہوتا ہے۔ آج سب خوشیوں کے ہنڈولے میں جھول رہے تھے۔ میری نظریں بڑی اڈے کو ڈھونڈ رہی تھیں اور پھر کرمو کاکا نے بڑی اڈے کے آنے کی اطلاع دی۔ سب خاموش ہو گئے۔ بڑی اڈے کچھ دیر بعد ہم سب کے درمیان تھیں۔ بڑی اڈے مجھے دیکھ کر بے اختیار رو رہی تھیں۔

"میری گڑیا! تم نے تو ہمیں اپنے ہجر میں ختم ہی کر دیا تھا۔ میں ہر نماز میں تم سے ملنے کی دعائیں کرتی تھی اور دیکھو اس رمضان کس بابرکت مہینے میں میری دعائیں قبول ہوئی ہیں۔"

میری آنکھوں میں بھی جیسے ساون ٹھہر گیا تھا۔ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ میں خود سے بڑی اڈے کو جدا کر دوں اور پھر جب مردوں نے تراویح پڑھنے کے لیے اٹھنا چاہا تو میں یکدم بول پڑی۔

"آج چونکہ میرا بچپن پھر سے ایک بار میرے سامنے آ گیا ہے۔ اس لیے میں بڑی اڈے کو وہ چیز پیش کروں گی جو مجھے آپ سب کے درمیان واپس آنے پر مجبور کر گئی تھی۔"

سب میری طرف متوجہ تھے۔ میں اُٹھ کر اپنے کمرے میں گئی اور بیگ سے بڑی اڈے کے لیے لایا ہوا گفٹ لے آئی۔

"بڑی اڈے یہ آپ کے لیے ہے۔"

"ارے اس میں کیا لے آئیں میری گڑیا! بھلا اس عمر میں میں تم سے تحفے لیتی اچھی لگوں گی۔"

"بڑی اڈے یہ تحفہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ وہ خاص چیز ہے جس نے مجھے آسٹریلیا سے آپ کی حویلی میں آنے پر مجبور کر دیا۔ پلیز اسے کھول کر دیکھیے۔"

بڑی اڈے نے گفٹ پیپر ہٹایا تو اُس میں سے لیپ ٹاپ نکلا۔

"یہ کیا ہے گڑیا؟ میں اس کا کیا کروں گی؟"

"بڑی اڈے میں نے کہا نا کہ میں آپ کو وہ چیز دکھا رہی ہوں جس نے مجھے آپ کے پاس آنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد میں نے اُسے آن کیا اور سرچ کر کے کچھ دیر بعد اُس میں لائف بوائے شیمپو کا اشتہار آنے لگا۔

"بڑی اڈے یہ لیجیے۔" میں نے لائف بوائے شیمپو کی بوتل بڑی اڈے کو تھمائی۔

"بڑی اڈے لائف بوائے شیمپو میرا بچپن اور آپ کی یاد بن کر ہمیشہ میرے ساتھ رہا۔ اور یہ اشتہار میرے پاکستان آنے کی وجہ بنا۔"

وہاں پر موجود سب اس محبت پر جھوم اٹھے تھے اور سب نے ایک واشگاف نعرہ بلند کیا۔

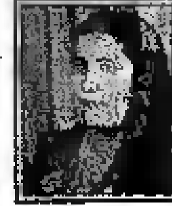
"لائف بوائے شیمپو تم واقعی باکمال ہو۔ لائف بوائے شیمپو ہمیشہ کچھ نیا کر دکھائے۔"

☆☆......☆☆

پہلی سچ بیانی

اپنے دیس سے، اپنے شہروں سے موصول، وہ سچ بیانیاں جن کو پڑھ کر، اپنی مٹی کی خوش بُو، آس پاس محسوس ہوتی ہے

نئے چراغ



اقبال بانو

علم کی کنجی سے ہر نفرت کا تالا کھولا جاسکتا ہے

اقبال بانو کے شر بار قلم سے ایک انوکھی داستانِ حق

''بابا جی! آپ سمجھنے کی کوشش کریں نا؟''
''کیا سمجھوں۔ تُو جو کہہ رہا ہے میں وہ بات اپنے ذہن میں لانا ہی گناہ سمجھتا ہوں۔ اور تُو سمجھنے کی بات کررہا ہے۔'' چودھری اللہ نواز گرجے۔

''مگر بابا جی۔ میں آپ کو یہ اجازت نہیں دوں گا کہ آپ ملک خان محمد کا گھر اجاڑیں۔'' اس کے بچوں کو یتیم کریں۔''
''انھوں نے بھی تو ہمارے دو بندے مارے

تھے۔ صغراں بیوہ نہیں ہوئی، صرف دو ماہ کی بیاہی دلہن۔ اشرف اور شریف بچے نہیں ہیں کیا۔ وہ یتیم نہیں ہوئے؟'' چوہدری اللہ نواز، نصیر کی آنکھوں میں اپنی سرخ سرخ آنکھیں الجھائے پوچھ رہے تھے۔

''یہ ٹھیک ہے۔ بہت پرانی بات ہوگئی۔ اب آپ تاریخ کیوں دہرانا چاہتے ہیں۔ وہ زخم ملک محمد خان کے بچوں کے سینوں پر کیوں لگانا چاہتے ہیں جو اشرف اور شریف کے سینے پر لگا ہے۔''

ملک اللہ نواز بیٹے کو دیکھتے رہے اور وہ بولتا رہا۔ ''صغراں آپا کی طرح آگ کیوں لگانا چاہتے ہیں، کیا ہوگا کیا مل جائے گا آپ کو۔'' نصیر بولا۔

''کچھ ملے یا نہ ملے۔ مگر اس دل میں جو انتقام کے شعلے بھڑک رہے ہیں وہ آگ صرف اسی وقت دھیمی پڑے گی جب ملک خان محمد کی لاش خون میں نہائی ہوئی میرے سامنے ہوگی۔'' چوہدری اللہ نواز حقہ گڑگڑانے لگے۔

''اس میں ملک خان محمد کا کیا قصور ہے۔ جب بھائی شبیر اور ریاض کا قتل ہوا وہ تو کراچی گیا ہوا تھا۔ اپنی تعلیم کے سلسلے میں۔''

''وہ خان محمد کی اولاد تو ہے نا۔'' چوہدری اللہ نواز کے پاس ہر بات کا جواب تھا۔

''مگر بابا جی۔ خان محمد کو تو آپ نے ختم کر دیا تھا۔ جس کی سزا میں نے بھگت لی ہے۔ حساب برابر ہوا۔'' نصیر بولا۔

''اوئے بے وقوف! صرف خان محمد مرا تھا ان کی طرف سے اور ہماری طرف سے شبیر اور ریاض کام میں آئے تھے پھر چودہ سال تُو نے جیل کاٹی اب بتا ہمارا حساب برابر کیسے ہوا، تُو حساب میں کورا ہی ہے۔ اوئے بھلے ان کا ایک اور بندہ مرے اور ایک سزا کاٹے تب حساب برابر ہوگا۔''

''پھر ہماری طرف سے بھی تو کوئی سزا کاٹے گا جب قتل کرے گا اور یہ سلسلہ تو چلتا رہے گا۔''

''یہ زمین داری کے چکر ہیں اور یہ تو چلتے رہتے ہیں۔ سمجھ لے کہ یہ ہمارے کھیل ہیں۔ میں تو تیرے آنے کا منتظر تھا۔ اب تُو آ گیا ہے تو ان کا ایک آدھ بندہ تو ٹھکانے لگ ہی جائے گا یعنی خان محمد۔''

''مگر میں نہیں کروں گا یہ کام۔ نصیر مضبوط لہجے میں بولا۔''

''او کیوں؟'' انھوں نے گھورا۔

''یہ ظلم ہے۔'' نصیر بولا۔

''پہلے تو تُو اُسے ظلم نہیں سمجھتا تھا۔'' وہ طنز سے بولے۔

''پہلے میں نے علم حاصل نہیں کیا تھا۔''

''اوئے ہم نے یہی بے عقلی کی کہ تجھے پڑھا دیا تو وہی مڈل پاس ٹھیک تھا جب جیل گیا تھا۔ پتا نہیں کس الو کے پٹھے نے تیرے کو پڑھائی کا شوق پا دیا۔'' اللہ نواز غصے سے بولے۔

''بابا جی۔ میں اس شخص کا مشکور ہوں جس نے علم کی روشنی کا چراغ میرے دل میں روشن کیا۔ آج میں بری اور اچھی بات کی پہچان کر سکتا ہوں۔''

''میں نے تو تجھے جیل میں اس لیے پڑھنے دیا کہ تیرا وقت اچھا گزرے گا مگر مجھے کیا خبر تھی کہ پڑھ کر تُو آسمانی باتیں کرنے لگے گا۔'' چوہدری اللہ نواز جھنجلا کر بولے۔

''بس بابا جی۔ میں نے کہہ دیا میں کوئی انتقام نہیں لے سکتا۔'' نصیر نے نہایت مضبوط لہجے میں کہا۔

''اوئے تُو عزت خاک میں کیوں ملوانا چاہتا ہے ہماری؟''

''کوئی نہیں عزت خاک میں ملتی۔''

''وہ ہم کو بزدل سمجھیں گے۔'' چوہدری اللہ نواز بولے۔

''سمجھتے رہیں۔'' نصیر بے پروائی سے بولا۔

''تُو سزا سے ڈرتا ہے یا موت سے۔''

''میں سزا سے ڈرتا ہوں مگر اس دنیاوی سزا سے نہیں بلکہ وہ سزا جو موت کے بعد خدا مجھے دے گا کہ میں نے عقل و شعور رکھتے ہوئے ایک ہنستے بستے گھر کو آگ کیوں لگائی۔''

''اوئے وہاں تو ہر ایک کو سزا اور جزا کے لیے تیار رہنا ہے۔'' وہ ہنسے۔

''پھر آپ سمجھتے ہوئے بھی یہ کہہ رہے ہیں۔''

''نصیر پتر! لوگ ہمیں بزدل سمجھیں گے کہ ہم نے اپنے بندوں کا انتقام نہیں لیا۔'' چوہدری اللہ نواز اسے سمجھانے لگے۔

''درگزر کرنے والا بزدل نہیں بہادر ہوتا ہے۔'' نصیر بولا۔

''بابا! تم اس کو چھوڑو۔ اس کی آنکھوں کا تو پانی مر گیا ہے۔ ہم خود ہی بہت ہیں۔'' شمشیر نصیر کا بڑا بھائی تھا اور کافی دیر سے باپ بیٹے کی بحث سن رہا تھا، جھنجلا کر بولا۔

''مجھے بھی لگتا ہے یہ نہیں مانے گا۔'' چوہدری اللہ نواز کا لہجہ شکست خوردہ تھا۔

''بابا جی! میرا تو آپ کو بھی یہی مشورہ ہے کہ پرانی باتوں پر مٹی پاؤ۔'' نصیر نہایت رسان سے بولا۔

''تو زیادہ بک بک نہ کر۔ چلو شمشیر۔'' چوہدری اللہ نواز نے اسے گھرکا اور کمرے سے نکل گئے۔ تب نصیر صرف ہلتے پردے کو دیکھتا رہ گیا۔

''او بابا جی۔ یہ ہم کس راستے پر جا رہے ہیں۔''

''یہ فنا کا راستہ ہے۔''

''یہ سراسر خودکشی ہے۔''

''جو کچھ آپ کر رہے ہیں یہ ظلم ہے۔''

نصیر نے اپنے ہاتھ پر مکا مارتے ہوئے سوچا۔

''اُف میں کیسے سمجھاؤں آپ کو؟'' وہ بڑبڑایا اور تیزی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ ملک خان محمد تک کیسے اطلاع پہنچائے کہ وہ کہیں چلا جائے۔ میرا باپ اور بھائی تمہارے خون کے پیاسے ہیں۔ مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے نہیں علم تھا کہ ملک خان محمد کہاں رہتا ہے۔

☆☆☆

چوہدری اللہ نواز بہت بڑے زمین دار تھے۔ ان کی کئی اراضی زمین تھی اور گزشتہ نصف صدی سے ان کے خاندان کی دشمنی قریبی زمین دار ملک خان محمد سے چلی آ رہی تھی۔ کبھی وہ چوہدری کا کوئی بندہ مار کر انتقام لے لیتے اور کبھی چوہدری، ملکوں کا کوئی آدمی قبر کی گہرائیوں میں پہنچا دیتے اور سزا پاتے۔

چوہدری اللہ نواز کے پانچ بیٹے اور پانچ ہی بیٹیاں تھیں۔ انھیں اپنے بیٹوں پر بہت ناز تھا۔ کیونکہ ملک خان محمد کا صرف ایک ہی بیٹا تھا خان محمد جو کہ شہر میں تعلیم پا رہا تھا۔

چوہدری اللہ نواز کو اپنی بڑائی اور زیادہ طاقت کا احساس مارے دیتا تھا۔ سارے پنڈ میں ان کا شملہ ہمیشہ اکڑا ہی رہتا۔ ان کی خواہش تھی کہ ملکوں کا نام ونشان دنیا سے مٹ جائے۔ اور ان کے بزرگوں کے جو زمینوں سے ملکوں سے جھگڑے ہیں۔ ان کو نمٹانے کا سہرا انہی کے سر ہو۔

چوہدری اللہ نواز کے پانچوں لڑکے بہت کمینی صفت کے تھے۔ منیر، شبیر، ظہیر کو تو انھوں نے شادی کے بندھن میں باندھ کر گاؤں میں سکون کروا دیا تھا۔ بس اب شمشیر اور نصیر ہی لفنگوں کی طرح پھرتے رہتے۔ کسی کی عزت کا کوئی پاس نہ کرتے، نصیر نے تو گاؤں کے اسکول سے مڈل تک پڑھ لیا تھا۔ مگر پھر آگے نہ پڑھ سکا اور یونہی زمینوں کی دیکھ بھال کرتا رہتا اور پھر تو اس کی مونچھیں بھی آ گئیں اور نئی نویلی مونچھوں کو مروڑے دیتے ہوئے آنکھوں میں شیطانی چمک بھر کر لڑکیوں کو تاڑنا اس کا معمول بن گیا۔ حالانکہ اس کے اصغر ماموں کی ریشماں صرف تین روز کی تھی کہ ان دونوں کی بات چیت طے ہو گئی تھی۔

ریشماں صرف تین روز کی تھی اور نصیر گیارہ برس کا تھا۔ اس بندھن کو نو برس ہو گئے تھے۔ مگر ابھی کئی برس تھے جب وہ نصیر کے خوابوں کی حقیقت کا رنگ بھرتی۔ نصیر کے جذبے تو ابھی سے شوریدہ تھے۔ اٹھان ہی اس کی ایسی تھی۔ خمیر ہی ان کا ایسی مٹی سے اُٹھایا گیا تھا کہ تقاضے اپنا آپ مانگتے ہیں۔

تب ہی ایک روز ایک دم ہی وہ کچھ ہو گیا جس نے نصیر کے دہکتے جذبوں کو برف کی سل کی طرح منجمد کر دیا۔

ملک جان محمد کا بیٹا شہر سے تعلیم مکمل کر کے ایک ماہ بعد آنے والا تھا اور ملک جان محمد اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ چوہدری اللہ نواز کے پاس راضی نامہ کرنے آیا تھا۔ ان کی ملاقات ڈیرے پر ہوئی۔

چوہدری اللہ نواز اسے دیکھ کر بھپر ہی گئے۔ ان کے پاس ہی ریاض اور شبیر بیٹھے ہوئے تھے۔ ریاض ان کی بیٹی صغراں کا شوہر تھا جن کی شادی کو دو ماہ قبل ہوئی تھی اور ریاض ہی کی بہن ریشماں، صغراں کے بدلے میں نصیر سے بیاہی جانی تھی۔

''تم کیوں آئے ہو ملک جان محمد۔'' چوہدری اللہ نواز اپنی مسند سے کھڑے ہو گئے اور نہایت کڑے تیوروں سے جان محمد کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''چوہدری۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم صلح کر لیں۔'' ملک جان محمد نہایت رسان سے بولے۔

''نہیں...... نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔''

''میں ہر جانہ دینے کو تیار ہوں۔ میرے دادا نے جو زمینیں تمہارے دادا سے لی تھیں ان سے دُگنی میں تمہیں دینے کو تیار ہوں۔'' ملک جان محمد نے پیشکش کی۔

''او کیوں؟''

''آخر ہم کب تک یہ خونی ہولی کھیلتے رہیں گے۔ کب تک ہم سرہانے ریوالور رکھ کر سوتے رہیں گے۔'' ملک جان محمد بولے۔

''جب تک ہم دونوں میں سے کوئی ایک صفحہ ہستی سے نہیں مٹ جاتا۔'' چوہدری اللہ نواز سفاکی سے بولے۔

''نہیں چوہدری۔'' ملک جان محمد کا لہجہ ملتجیانہ تھا۔

''کیوں...... ہار گئے؟''

''آخر ان دشمنیوں نے ہمیں دیا ہی کیا ہے؟''

''بہت کچھ دیا ہے۔ بس تمہارا پتر آ جائے پھر تم دونوں باپ بیٹے سے دو دو ہاتھ کر لیں گے۔'' چوہدری اللہ نواز نے کہا۔

تب ملک جان محمد بولے۔

''تو ابھی کر لو نا دو دو ہاتھ۔''

''چوہدری اللہ نواز تو چاہتے بھی یہی تھے۔ شیر خود کچھار میں آ گیا تھا۔ اور پھر پتا بھی نہ چلا اور آناً فاناً لڑائی شروع ہو گئی۔ ملک جان محمد اور اس کے ساتھیوں نے خوب مقابلہ کیا۔ ریاض اور شبیر زخمی ہو کر گر پڑے اور پھر زخمی چوہدری اللہ نواز نے نشانہ تاک کر ملک جان محمد کو گولی مار کر ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔ ملک جان محمد کے دونوں ساتھی جان بچا کر بھاگ گئے تب ہی نصیر آ گیا۔ چوہدری اللہ نواز کے ہاتھ میں اب تک ریوالور تھا اور وہ ملک جان محمد کے مردہ وجود کو مزید چھلنی کر رہے تھے۔ نصیر نے وہ ریوالور چھین لیا۔ اور گھبرا کر ملک جان محمد کی لاش کی طرف دیکھا۔

''بابا۔''

''ہاں اب میں نے قصہ ختم کر دیا ہے اس کا پتر۔''

''بابا! یہ قتل میں نے کیا ہے۔ میں نے۔''

نصیر نے لمحے کے ہزارویں حصے میں فیصلہ کر لیا۔ ابھی تو اس کی دو بہنیں کنواری تھیں۔ شمشیر کا مسئلہ تھا۔ بخت جہاں اور صغراں بھی بیوہ ہو گئی تھیں اور اشرف اور شریف یتیم ہو گئے تھے۔ اب تو سب کی ذمہ داری بابا پر تھی اور چوہدری اللہ نواز ایسا ستون تھے جس پر پورے گھر کی عمارت کھڑی تھی۔ وہ نہ ہوتے تو باقی بھائی اپنا حصہ بٹور کر علیحدہ ہو جاتے۔ اور پھر پولیس آئی اور نصیر کو گرفتار کر لیا گیا۔

مقدمہ چلا اور قتل کے الزام میں وہ پھانسی سے تو دولت کی وجہ سے بچ گیا مگر بیس سال قید بامشقت کی سزا سنائی دی گئی۔ سب کو یہ اطمینان تھا کہ چلو زندہ تو ہے۔

جیل میں نصیر ملکوں سے انتقام لینے کے نت نئے منصوبے بناتا رہتا۔ اس کا چہرہ نہایت کھردرا

تھا۔ وہ کسی بھی شخص سے بات نہیں کرتا تھا۔ جب سب قیدیوں کے ساتھ اسے بھی کام کے لیے لے جایا تو وہ الگ تھلگ اپنے کام میں لگا رہتا۔ اس نے کبھی جیل میں بھاگنے کے بارے میں نہ سوچا۔ بس اس کے ذہن میں ایک ہی جملہ بس گیا تھا۔

''انتقام۔''

اور..... صرف انتقام۔

جیل میں اس کی ملاقات حامد شاہ سے ہوئی۔ وہ بھی قاتل تھا اور گزشتہ پانچ سال سے جیل کاٹ رہا تھا۔ اس کی ہسٹری بہت دردناک تھی۔

اس کی بہن خالدہ کو اس کے میاں نے اولاد نہ ہونے کی بنا پر طلاق دے دی تھی۔ حامد شاہ مارے جوش کے بہنوئی کے پاس پہنچا اور اسے قتل کر دیا۔ تاکہ وہ اس کی بہن کا نہیں رہا تو کسی کا نہ رہے۔ کوئی اس کا نام لینے والا نہ تھا، وہ بے نام ہی مر گیا اور پھر وہ جیل آ گیا۔ یہاں پر اس نے پڑھنا شروع کیا۔ میٹرک تو تھا ہی اور اس سال بی اے فائنل کا امتحان دے رہا تھا اسے کافی سہولتیں تھیں۔ حامد شاہ نے نصیر کو مشورہ دیا کہ تم پڑھائی شروع کر دو، فضول کے خیالات تمہیں پریشان نہیں کریں گے اگر تم کتابوں سے دوستی کر لو گے۔''

نصیر کو حامد شاہ کا مشورہ ذرا نہ بھایا۔

کیونکہ وہ تو پڑھائی سے دور بھاگتا تھا۔ مگر جب حامد شاہ نے بی اے کر لیا تو اس کی سزا میں کمی ہو گئی۔ حامد شاہ قرآن پاک پڑھتا تو اس کی سزا میں چند دنوں کی کمی کر دی جاتی۔

تب نصیر نے تہیہ کر لیا کہ وہ پڑھے گا۔ اور جب بھائی منیر ملاقات کے لیے آئے تو اس نے اپنا ارادہ ظاہر کر دیا۔ انھیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

اور یوں نصیر جیل میں پڑھنے لگا۔ حامد شاہ پڑھائی کے دوران اس کی مدد کرتا اب زیادہ سختی بھی ان دونوں پر نہ تھی اور ویسے بھی وہ کون سے عادی مجرم تھے کہ ان پر سختیاں کی جاتیں۔ حامد شاہ نصیر کو پڑھاتا۔ یونہی وقت گزرتا رہا۔ نصیر نے انٹر کیا تو حامد شاہ کو حیدر آباد جیل میں منتقل کر دیا گیا اور یوں ان کا کئی سال کا ساتھ چھوٹ گیا۔

مگر علم کی جو شمع حامد شاہ، نصیر کے دل میں جلا گیا تھا وہ نہ بجھی اور نصیر اس شمع کی روشنی میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہا اور اسے اس طرح سزا میں معافیاں ملتی رہیں۔

واقعی اب نصیر کا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ ملک خان محمد سے انتقام لے۔ بلکہ اس کا دل دکھتا تھا کہ آخر ہم اپنے بڑوں کے غلط نقش قدم پر کیوں چل رہے ہیں۔ ہم درگزر کیوں نہیں کرتے۔

علم جوں جوں بڑھتا گیا نصیر کے خیالات وسیع تو ہوتے گئے۔

نصیر کے ایم اے پرپولیس کے امتحان تھے۔ وہ ہمیشہ کی طرح پولیس کی نگرانی میں سینٹر پہنچا۔ انہی دنوں تعلیمی سرگرمیوں کی وجہ سے کچھ بھی گرفتار کیے گئے تھے وہ بھی پولیس کی نگرانی میں امتحان دے رہے تھے۔ طلبہ نے اپنے ساتھیوں کو چھڑانے کے لیے ہنگامے کا پروگرام بنایا اور وہ سمجھے کہ نصیر بھی انہی کا ساتھی ہے۔ پیپر کے بعد وہ اپنے ساتھیوں کو ہنگامہ کر کے چھڑا لے گئے۔ نصیر کو بھی لے جانا چاہا مگر اس نے جانے سے انکار کر دیا تب انھوں نے اس کی خوب درگت بنائی اور مزید پولیس آنے پر بھاگ گئے۔ تب دوسرے پرچے اس سے جیل ہی میں دلوائے گئے۔

کئی سال بعد اس نے دیکھا صغراں اس سے ملنے آئی اپنے گھر کی خواتین میں صغراں پہلی عورت تھی جو اس سے ملنے آئی آخر وہ اس کی ماں جائی تھی، بہن تھی مگر پھر بھی نصیر کو بہت غصہ آیا کہ وہ جیل کیوں آئی ہے۔ اس کے اندر کا جاٹ جاگ اٹھا تھا۔

''ویر'' صغراں سسک پڑی۔

''تو کیوں آئی ہے صغراں؟''

''ویر۔ میں پردیس جا رہی ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''تجھے نہیں پتا میری شادی ہو گئی ہے نا۔''

''اوہ۔ مجھے تو کسی نے نہیں بتایا۔'' نصیر کو عجیب

سا دکھ کا احساس ہوا۔

"ویر۔" صغراں سلاخوں کو تھام کر رو دی۔

"رومت صغراں۔ خدا تجھے ہمیشہ خوش رکھے تُو اکیلی آئی ہے؟"

"لالہ منیر آئے ہیں۔ مگر اندر نہیں آئے کہنے لگے تو ناراض ہوگا۔" صغراں نے بتایا۔

"اچھا اب تُو جا۔" نصیر نے کہا۔ اس نے تو بہن سے اور کچھ بھی نہ پوچھا۔

"ویر۔"

"ارے۔ ہاں ریشماں کیسی ہے اب تو بڑی ساری ہوگی۔" نجانے کیوں ایک دم ہی نصیر نے پوچھ لیا۔

اصل میں صغراں کے بدلے میں اسے نصیر کی ہونا تھا نا۔ مگر اب۔

"ہاں وہ بڑی بھی ہوگئی ہے اور خوب صورت بھی۔ تیری منتظر ہے وہ۔" صغراں نے انکشاف کیا۔

"کیا مطلب؟" نصیر کو اچنبھا ہوا۔

"ماما نے بہت چاہا کہ اس کی شادی کر دی جائے مگر وہ نہیں مانی۔ ہمارے خاندان میں بھی کسی لڑکی نے کوئی بات نہیں ٹالی۔ اللہ میاں کی گائے رہی ہیں۔ مگر وہ ماما کے سامنے بول پڑی کہ اگر خلاف مرضی اس کے کوئی بات ہوئی تو وہ خود کو ختم کر لے گی۔"

"پھر۔" نصیر کا دل چڑی چھاتی میں پھڑپھڑانے لگا۔

"ماما اس کی ضد کے آگے مجبور ہوگئے۔ وہ ریاض کی طرح اسے کھونا نہ چاہتے تھے۔" صغراں کی آواز بھرا گئی۔

"اوہ۔" نصیر نے اطمینان کا سانس لیا۔

نجانے اب بھی کیوں وہ ننھی سی ریشماں اس کے خیالوں میں بسی ہوئی تھی۔ اگر کوئی جیل میں سب سے زیادہ یاد آتا تو وہ صرف ریشماں تھی۔ حالانکہ نصیر سوچتا کہ پتا نہیں وہ بھی مجھے یاد کرتی ہو یا نہیں۔

"ماما بھلا اتنے عرصے کیسے انتظار کرے گا اور ہمارے ہاں لڑکیاں پندرہ برس کی ہوں تو بیاہ دی جاتی ہیں اس سے زیادہ عمر کی لڑکیاں بوڑھی سمجھی جاتی ہیں۔"

مگر صغراں نے جو کچھ بتایا تھا ایک انجانا سا جذبہ اس کی روح کو سرشار کر رہا تھا وہ بہت خوش ہوا تھا۔

دل کو دل سے راہ تھی۔

دونوں طرف ایک ہی جذبہ کارفرما تھا۔

اب انجانے سپنے نصیر کی پلکوں پر سج گئے تھے۔ وہ بہت خوش رہنے لگا تھا۔

تنہا ہوتا تو خیالوں میں چھم سے ریشماں آجاتی، اس نے ایک خیالی تصویر اس کی بنالی تھی اور اسے پوجتا رہتا۔

محبوب کی قربت سے زیادہ اس کا خیال حسین تھا۔ وقت کا پہیا اپنی مخصوص رفتار سے چلتا رہا۔

نصیر نے ایم اے کیا پھر ڈبل ایم اے کیا...... مگر علم کی پیاس تھی کہ بجھتی ہی نہ تھی۔ وہ خود کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنا چاہتا تھا۔

مگر ہوا یہ کہ اس کے شریفانہ رویے اور دیگر معافیوں کی وجہ سے اس کی سزا میں خاصی کمی ہوگئی تھی اور ایک روز جیلر نے اسے خوشخبری سنائی کہ ایک ہفتے کے بعد اسے رہا کر دیا جائے گا۔

"ابھی تو میری سزا باقی ہے۔"

"یار۔ تم عجیب آدمی ہو۔ چودہ سال کی جیل تو کاٹ چکے ساری زندگی یہیں رہنا چاہتے ہو۔"

جیلر نے مزاحیہ لہجے میں کہا تو اسے یقین ہی نہ آیا کہ وہ اپنی زندگی کے چودہ سال جیل کی کوٹھڑی میں گزار چکا ہے۔ جب وہ جیل آیا تھا تو اکیس سال کا بھرپور نوجوان تھا۔ شوخ کھلنڈرا، کمینی صفات کا، جس کا رواں رواں انتقام کی آگ میں جھلس رہا تھا۔

مگر اب تو یہ نصیر گئے دنوں کے نصیر سے بہت مختلف تھا۔ سنجیدہ باوقار، ہر ایک کا دکھ دل میں رکھنے والا۔ اچھے برے کا شعور آ گیا تھا اسے۔

اور پھر وہ رہا کر دیا گیا۔
بابا جی اور بھائی اسے لینے آئے تھے۔
گاؤں میں خوب خوشیوں کی برات اتر آئی۔
پھولوں سے نصیر کو لاد دیا گیا تھا۔ جیسے وہ جیل سے نہیں بلکہ حج کر کے آیا ہو۔
مگر وہ تو صرف ایک ہی ہستی کا منتظر تھا، ریشماں کا۔ ریشماں جو کہ اس کی خوابوں کی رانی تھی۔ جس کے وہ سوتے جاگتے سپنے دیکھتا تھا۔
مگر وہ نہ آئی۔
ابھی وہ لوگ اتنے ایڈوانس نہیں ہوئے تھے کہ لڑکیاں بے دھڑک اپنے منگیتر سے مل سکیں۔
سب ہنگامے سو گئے تو نصیر حویلی سے نکل آیا۔
طویل اور اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر وہ چلا جا رہا تھا۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی اور ہر شے چاندنی میں نہائی ہوئی تھی۔ اتنے عرصے بعد اس نے تازہ ہوا لی تھی۔ آزادی بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کا احساس اب ہوا تھا اسے۔
''نصیر۔'' کہیں قریب ہی سرگوشی اُبھری۔
نصیر نے ایک دم پلٹ کر دیکھا۔ وہ ایک لمحہ کے لیے بھونچکا رہ گیا۔
وہ نازک سی لڑکی۔ جس نے آسمانی رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا اور آسمانی دوپٹے نے اس کے چہرے کے گرد ہالہ کیا ہوا تھا۔ وہ اپنی سیاہ ہرنی جیسی آنکھوں میں محبتوں کے اَن گنت جگنو جگمگائے نصیر کو دیکھ رہی تھی۔
''نصیر۔ میں ریشماں ہوں۔'' ریشماں نے اس کی مدہوشی کو توڑا۔
''مجھے یقین تھا کہ تم ہی ہو گی۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ تم ریشماں ہو۔'' نصیر کے لب کپکپائے۔
''ہاں۔'' وہ ہنسی اور اس کی گھنٹیوں جیسی ہنسی کھیتوں میں گونج رہی تھی۔ اور نصیر بے خود سا اسے دیکھے گیا۔
''میں بہت خوش ہوں نصیر کہ تم آ گئے ہو۔ میں نے ایک ایک لمحہ تمہاری رہائی کا انتظار کر کے گزارا۔ اب مجھے اس بات کا انتظار ہے کہ کب میرے بھائی کے خون کا بدلہ لیا جائے گا۔ کب ملک خان محمد کی خون میں لت پت لاش میرے سامنے پڑی ہو گی۔ اور میرے دل کے بھڑکتے الاؤ میں کب ٹھنڈک پڑے گی۔''
''کیا کہہ رہی ہو ریشماں؟'' ریشماں حیران و ششدر اسے دیکھنے لگا۔
''ہاں نصیر۔ میں نے انتظار کیا تم آ گئے اور اب میں اس وقت کی منتظر ہوں جب۔'' ریشماں کہتے کہتے رک گئی۔
قریب ہی کوئی گنگناتا ہوا دوسری پگڈنڈی پر آ رہا تھا۔
''میں چلتی ہوں نصیر۔ کوئی دیکھ نہ لے۔'' ریشماں اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر کھیتوں میں غائب ہو گئی۔ تب ہی وہ گنگنانے والا آدمی نصیر کو نظر آ گیا۔ وہ نصیر کے قریب آیا اور بولا۔
''سلام مالک۔ مبارک ہو جی۔''
''کیا حال ہے کون ہو تم؟'' نصیر نے نرمی سے پوچھا۔
''جی میرا نام لتھو ہے۔ آج زمینوں کو پانی لگانا تھا اس لیے اِدھر آیا تھا۔'' وہ بولا۔
''اوہ اچھا۔'' نصیر ہنس دیا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ اس کے ذہن میں ریشماں کے الفاظ گونج رہے تھے۔
''مجھے انتظار ہے کہ کب میرے بھائی کے خون کا بدلہ لیا جائے گا۔''
نصیر پریشان ہو گیا۔ وہ اب پھر کوئی خونی ہولی نہیں کھیلنا چاہتا تھا اور ریشماں۔
اس کی منگیتر۔
اس کی محبت۔
اس کے خوب صورت سپنوں کی تعبیر اسے کہہ رہی تھی کہ بدلہ لیا جائے۔ وہ تو اس وقت کی منتظر تھی جب اس کے بھائی کا بدلہ لیا جاتا۔
''نہیں...... میں یہ سب نہیں کروں گا میں اسے سمجھاؤں گا کہ یہ بدلے انتقام اچھی چیز نہیں ہے۔

عظمت درگزر اور معاف کردینے میں ہے۔"

اور دو روز بعد ہی چوہدری اللہ نواز اور شمشیر نے بھی وہی بات کہہ دی تھی جو ریشماں نے کہی تھی اور اب نصیر مسلسل کمرے میں ٹہلتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وہ سب کو کس طرح سمجھائے۔

کتنی ہی دیر تک وہ چوہدری اللہ نواز سے بحث کرتا رہا تھا۔ مگر انھوں نے بھی اس شخص کو بُرا بھلا کہنا شروع کردیا تھا۔ جس نے نصیر کو تعلیم کا شوق دلایا تھا۔

☆☆☆

پھر یہ بات پورے خاندان میں جنگل کی آگ کی پھیل گئی کہ نصیر انتقام لینے کے خلاف ہے۔ سب نصیر کو بُرا بھلا کہنے لگے مگر اس نے کسی کی نہ سنی۔

اس روز وہ اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا سوچ رہا تھا۔

"کیا میں غلطی پر ہوں۔"

"نہیں تم غلطی پر نہیں ہو۔" اس کے ضمیر نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

اور نصیر نے اپنے ضمیر کی بات مان لی تھی کہ وہ واقعی غلطی پر نہیں ہے۔

تب ہی...... کھٹکے کی آواز پر وہ چونک گیا، دروازے کی طرف دیکھا تو دروازے کے بیچوں بیچ ریشماں پر وہ تھا۔ بڑے کڑے تیوروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس رات جن آنکھوں میں نصیر کے لیے محبت کے ان گنت جگنو تھے۔ آج وہاں حقارت تھی۔ تمسخر تھا۔ شعلے تھے۔

"اوہ۔ آؤ ریشماں۔" نصیر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"آ تو میں گئی ہوں نصیر۔ مگر مجھے یہ علم نہیں تھا کہ میرے دل میں بسنے والا شخص اتنا بزدل ہے۔ میں تو تمہیں بہت بہادر سمجھتی تھی۔ جس نے قاتل نہ سمجھتے ہوئے بھی خود کو قاتل بنالیا تھا۔ تم بہت بزدل ہو نصیر۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اتنے سال ایک بزدل آدمی کا انتظار کیا۔" ریشماں کے لہجے میں حقارت ہی حقارت تھی۔

"ریشماں۔ میری بھی تو سنو۔" نصیر تڑپ کر بولا اور اس کے قریب پہنچ گیا۔

"کیا سنوں۔ یہی کہ تم موت سے ڈرتے ہو۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔" نصیر چیخ پڑا۔

"مجھے بتاؤ اگر ملک خان محمد کو میں قتل کردوں تو کیا تمہارا بھائی ریاض واپس آجائے گا۔" نصیر نے اسے شانوں سے پکڑلیا۔

"کچھ بھی ہو۔" ریشماں اپنا آپ چھڑاتے ہوئے بولی۔

"اگر ملک خان محمد کے قتل ہونے سے تمہارا بھائی زندہ ہوسکتا ہے تو میں ابھی اسے قتل کرنے کو تیار ہوں۔"

"میں کچھ نہیں جانتی۔ اگر تم مجھے اپنانا چاہتے ہو تو میری شرط یہی ہے کہ ملک خان محمد کو قتل کردو تاکہ میرے انتقام کی آگ ٹھنڈی ہوجائے۔" ریشماں کچھ سننے کو تیار نہ تھی۔

"یہ میں نہیں کرسکتا۔ میں کسی بے گناہ کے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا۔" نصیر نہایت بے پروائی سے بولا۔

"تو ٹھیک ہے پھر تمہارا اور میرا وہ جذباتی تعلق ختم ہوجانا چاہیے۔" ریشماں بولی۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" نصیر نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ مگر اس کا دل مچل مچل کر دہائی دینے لگا۔

"نہیں...... نہیں...... اس تعلق کو ختم نہیں ہونا چاہیے۔"

مگر نصیر نے دل کی ایک نہ سنی۔ وہی کیا جو اس کے دماغ نے سمجھایا تھا۔ ریشماں اسے بزدل اور نجانے کیا کیا کہتی ہوئی چلی گئی۔ اور نصیر کے لبوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ کی لکیر کھنچ گئی۔

خاندان کے تمام افراد نصیر کے اس طرح پیچھے پڑے کہ وہ اپنا دفاع کرتے کرتے پریشان ہوگیا اور پھر اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ یہ گاؤں ہی چھوڑ دے گا۔ یہ زمینیں جن کی تہوں میں نجانے کتنے بے گناہوں کا خون ہوگا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



اور پھر ایک روز اس نے چپکے سے گاؤں چھوڑ دیا۔ کسی کو پتا بھی نہ چلا۔

☆☆☆

نصیر کے پاس اب صرف ایم اے کی ڈگری اور کچھ رقم اور وسیع دنیا تھی۔ لاہور آ کر وہ دفتروں کی خاک چھانتا پھرتا رہتا۔ مگر کوئی بھی اسے سروس دینے پر راضی نہ تھا۔

پھر اس نے کراچی میں قسمت آزمائی کرنی چاہی اور کراچی آ گیا۔ اس عروس البلاد شہر میں وہ طویل سڑکوں پر مارا مارا پھرتا رہتا۔ مگر سروس نہ ملتی۔ ایم اے کی ڈگری اسے فضول سا کاغذ کا پُرزہ لگتی تھی۔ اور وہ بھلا کوئی کیوں ایک سزا یافتہ قاتل کو ملازمت پر رکھتا۔

اس روز وہ ایک سستے سے ہوٹل میں بیٹھا ہوا چائے پی رہا تھا اور جیب میں اس کی صرف پانچ ہزار روپے تھے۔ مالک مکان کو کرایہ بھی دینا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ ان پیسوں میں سے دو ہزار روپے تو اس ایک کمرے کے چلے جائیں گے اور اگر مجھے نوکری نہ ملی تو کہاں سے کھاؤں گا، پانچ ماہ سے میں دفتروں کے چکر کاٹ کاٹ کر پریشان ہو گیا ہوں۔

اخبار میں ضرورت ہے کا اشتہار پڑھتے ہوئے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ ایک جگہ بچوں کو پڑھانے کے لیے ٹیوٹر کی ضرورت تھی۔ نصیر نے جلدی جلدی اخبار میں لکھا ہوا پتا نوٹ کیا۔ گرم چائے کو جلدی سے حلق سے اتارا اور ہوٹل سے نکل آیا۔

بہت تلاش کے بعد وہ مطلوبہ پتے پر پہنچ سکا تھا۔ گیٹ پر لگی سنہری پلیٹ اور اپنے پاس لکھے ہوئے ایڈریس کو کئی بار اس نے پڑھا اور آخرکار کال بیل بجا دی۔ ملازم نے دروازہ کھولا۔

''مجھے بھٹی صاحب سے ملنا ہے۔''

''وہ جی آپ اشتہار کے سلسلے میں آئے ہیں؟''

''جی۔''

''تو آ جائیے۔'' ملازم نے نصیر کو راستہ دیا۔ اور پھر اسے ڈرائنگ روم میں لا بٹھایا۔

''میں صاحب کو بھیجتا ہوں جی۔'' ملازم چلا گیا اور نصیر کمرے کی سجاوٹ دیکھنے میں منہمک ہو گیا۔ تب ہی بھٹی صاحب آ گئے۔

''آداب!'' نصیر کھڑا ہو گیا۔

''جیتے رہو۔'' انھوں نے نہایت محبت سے کہا۔

''بیٹھو۔'' نصیر نے دیکھا وہ تقریباً اسی کے ہم عمر تھے یا دو چار سال بڑے ہوں گے۔ مگر اس سے بالکل ایسے پیش آ رہے تھے جیسے کہ وہ بچہ ہو۔

''ہوں تو آپ میرے بچوں کو پڑھائیں گے؟''

''جی کوشش کروں گا۔''

''بہت شریر ہیں تینوں۔ ایک سکس میں ہے ایک ففتھ میں اور...... تیسرا تھرڈ میں۔'' بھٹی صاحب بولے۔

''جی میں سنبھال لوں گا۔'' نصیر بولا۔

''دیکھیں گے۔ کوالیفکیشن کیا ہے؟''

''ڈبل ایم اے۔''

''کوئی اور نوکری کیوں نہیں کی۔''

''پانچ ماہ سے دفتروں کے چکر لگا رہا ہوں۔ سروس ملتی ہی نہیں۔''

''کیوں؟''

''وہ جی؟''

''دیکھو مجھ سے کچھ نہیں چھپانا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم ہی میرے بچوں کے ٹیوٹر ہو گے۔'' بھٹی صاحب بولے۔

''اصل میں بات یہ ہے سر کہ''

نصیر نے ہولے ہولے سب کچھ بتا دیا۔

''یعنی تم نے اپنے باپ کا جرم اپنے سر لے لیا۔'' بھٹی صاحب نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔

''جی۔ محض اس لیے کہ ہمارے گھر کا وہ ستون تھے۔ اور یہ میرے لیے اچھا ہی ہوا کہ میں نے جیل میں پڑھ لیا ورنہ آج میں بھی وہی سوچ رکھتا جو میرے باپ اور بھائیوں کی ہے۔ تعلیم نے تو آگہی دی ہے مجھے۔ اچھے اور بُرے کی پہچان ہوئی ہے

میں ان کی بات نہیں مان سکتا۔" نصیر بولا۔
"ٹھیک ہے تم یہیں رہو۔ میری انیکسی خالی ہے تم یہاں شفٹ ہو جاؤ۔ صبح تم میرے ساتھ مل جایا کرو۔ اور شام میں بچوں کو پڑھایا کرو۔ اس طرح تمہارا وقت بھی پاس ہوگا اور فضول خیال بھی نہیں آئیں گے۔" بھٹی صاحب نہایت شفقت سے بولے۔
احساسِ تشکر کے طور پر نصیر کی پلکیں بھیگ گئیں۔ ان پانچ ماہ میں اس نے جتنی بھی تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ قدرت نے بھٹی صاحب کی صورت میں ان کا ازالہ کر دیا تھا۔

☆☆☆

اسرار، ابرار اور انوار تینوں ہی بہت ذہین اور شریر بچے تھے۔ یہ حقیقت تھی کہ نصیر انھیں بڑی مشکل سے تعلیم کی طرف متوجہ کر پایا تھا اور اب وہ بڑی دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ ذہین تھے مگر لاپروا بہت تھے۔ بیگم بھٹی بھی بہت خوش رہتی تھیں۔ اور نصیر تو بس گھر کا ہی ایک فرد بن چکا تھا۔
بھٹی صاحب نے اپنی ٹیکسٹائل مل میں نصیر کو منیجر کی پوسٹ دے دی تھی اور نصیر بڑی دلجمعی سے کام کرتا تھا۔ یونہی تین برس بیت گئے۔
کبھی کبھی نصیر کو اپنے بہت یاد آتے تھے۔ مگر وہ وہاں جانا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ ایک بار اس کا بھائی اسے لاہور میں ملا تھا جب نصیر ضروری کام کے سلسلے میں لاہور گیا تھا۔ ظہیر نے کہا تھا۔
"بابا کہتا ہے اگر تم واپس آنا چاہو تو یہ تہیہ کر کے آنا ہوگا کہ ملک خان محمد کو ہمارے ساتھ مل کر تلاش کرنا ہے تم نے۔"
"کیا وہ کہیں غائب ہے؟"
"ہاں۔ پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے مگر ہم اسے پاتال کی گہرائیوں میں سے نکال لائیں گے۔" ظہیر نے تُرش لہجے میں کہا۔
"اس کی زمینیں؟" نصیر نے کہا۔
"وہ اس نے مزارعوں کو کھیتی باڑی کے لیے دی ہوئی ہیں اور سنا ہے کہ سال، چھ ماہ بعد آ کر منافع لے جاتا ہے۔" ظہیر بولا۔
"بہت اچھا کیا ہے اس نے۔" نصیر نے کہا۔
"تو آنا نہیں چاہتا۔"
"نہیں آنا تو چاہتا ہوں مگر لالہ! جو کچھ آپ لوگ کہتے ہیں وہ میں نہیں مان سکتا۔ میں ان دیکھے آدمی کے لیے اپنے دل میں نفرتوں کے بیج نہیں بو سکتا۔" نصیر نے مضبوط لہجے میں کہا۔
"تو مرد ہی نہیں نصیر۔ ورنہ یہ نہ کہتا، اپنی ٹھیکرے کی منگ کو نہ چھوڑتا۔ اب ریشماں کی شادی شمشیر سے ہوگئی ہے۔" ظہیر نے کہا۔
"مجھے کوئی دکھ نہیں ہے۔" نصیر نے ڈوبتے دل کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔
پھر وہ کبھی اپنے بھائیوں سے نہ ملا، کبھی بابا کی صورت نہ دیکھی۔ اب وہ گاؤں جا کر کرتا بھی کیا۔ جب ریشماں ہی پرائی ہوگئی تھی۔ اس نے ذہن سے تمام باتوں کو کھرچ ڈالا۔ سب یادوں کو دل سے مٹا ڈالا۔

☆☆☆

موسم نہایت خوشگوار تھا۔ تب نصیر نے سوچا کہ آؤٹنگ کی جائے۔ وہ ڈریس اپ ہو کر باہر آیا تاکہ اسرار اور ابرار کو بھی ساتھ لے جائے کہ پھولوں کی کنج میں کین کی چیئر پر بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔
"یہ کون ہے؟" نصیر کے ذہن میں جھما کا ہوا۔
"بھابی جی کی سہیلی ہوگی۔" نصیر نے بے پروائی سے سوچا۔ وہ بیگم بھٹی کو بھابی جی کہتا تھا۔
وہ اندر آ گیا۔ تب ہی انوار دوڑا ہوا آیا۔
"نصیر بھائی۔ ہماری نیلما آپی آئی ہیں۔"
"نیلما۔ تو باہر نیلما ہے۔"
"ہاں جی صبح آئی ہیں۔" انوار بولا۔
"آپ کہیں جا رہے ہیں؟"
"ہاں۔ چلتے ہو۔؟"
"کہاں؟"
"جہاں چاہو۔"

''کون کھلائیں گے؟''

''ضرور۔''

''تو پھر چلیے۔ آئیں، آپ کو نیلما آپی سے بھی ملواؤں۔'' انوار نصیر کی انگلی پکڑ کر باہر آ گیا۔

وہ اب بھی اسی پوزیشن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ نصیر نے دیکھا وہ کوئی رسالہ پڑھ رہی ہے۔

''نیلی آپی۔ نصیر بھائی سے ملیے۔''

''آداب۔'' وہ ماتھے پر ہاتھ لے جا کر نہایت ادب سے بولی اور نصیر تو کھو سا گیا۔ اس کی نیلی آنکھوں کی مناسبت کی وجہ سے شاید اس کا نام نیلما رکھا گیا تھا۔

وہ جو سمجھتا کہ بھٹی صاحب کی بیٹی چھوٹی سی ہوگی جو ان کی سالی کے پاس پشاور رہتی تھی۔ مگر یہ تو بیس بائیس برس کی مکمل دوشیزہ تھی۔

''آپ اکیلی آئی ہیں۔'' نصیر نے بات بڑھائی۔

''ظاہر ہے۔''

''اب نیلی آپا مستقل آ گئی ہیں۔'' انوار نے بتایا۔

''واقعی۔'' نصیر بولا۔

''ہاں۔ وہ خالہ جان فوت ہو گئی ہیں نا۔ تو بھلا کس کے پاس رہتیں؟'' انوار نے نہایت سیتے کی بات بتائی۔

''اوہ۔ کب انتقال ہوا؟'' نصیر نے پوچھا۔

''تین چار روز ہوئے۔'' انوار بولا۔

''مجھے تو نہیں بتایا تم نے۔'' نصیر نے انوار سے کہا۔

''آپ تو آج کل رات کو دیر سے آتے ہیں اور انیکسی سے نکلتے نہیں پھر کیسے بتاتا۔'' انوار نے منہ بنا کر کہا۔

''مجھے بہت دکھ ہوا۔'' نصیر واقعی دکھی ہو گیا۔

نیلما کچھ نہ بولی۔ بس ہونٹوں کو دانتوں سے کچل کچل کر آنسو روکنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر نصیر بھی وہاں نہ بیٹھا۔ کیا فائدہ تھا کہ وہ بے چاری رو نہ سکتی۔ وہ انوار کے ساتھ گاڑی لے کر لونگ ڈرائیو پر نکل گیا۔ وہ سوچ رہا تھا۔

''میں تو سمجھتا تھا نیلما ننھی بچی ہوگی مگر یہ تو سب سے بڑی ہے۔ بھٹی صاحب نے بتایا تھا کہ جب وہ سترہ برس کے تھے تو ان کے والد نے ان کی شادی کر دی تھی۔ کیونکہ وہ اکلوتے تھے یوں شادی کے بعد بھی وہ شہر آ کر پڑھتے رہے۔'' انوار بتا رہا تھا۔

''نصیر بھائی۔ نیلی آپا نے اس سال بی اے کا امتحان دیا ہے۔''

''اچھا۔'' نصیر چونک کر بولے۔

''ہوں۔'' انوار بولا۔

☆☆☆

پھر جب وہ رات کو گھر آئے تو بھٹی صاحب بھی آ چکے تھے۔

''نصیر! تم ابھی سوؤ گے تو نہیں؟'' بھٹی صاحب نے پوچھا۔

''نہیں! کوئی کام ہے؟'' نصیر نے کہا۔

''ہاں۔ میں تمہارے پاس ہی آ جاؤں گا۔'' انھوں نے کہا۔

نصیر انیکسی میں آ کر پریشانی سے ٹہلتا رہا کہ شاید بھٹی صاحب کہہ دیں کہ اب تمہاری ضرورت نہیں ہے، نیلما بچوں کو پڑھا دیا کرے گی۔ اور آخر ٹھیک ہے آخر وہ جوان بچی کے باپ ہیں، انھیں یہ کرنا بھی چاہیے۔''

نصیر نے خود کو مطمئن کیا۔ تب ہی بھٹی صاحب آ گئے۔ وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر دونوں خاموش تھے۔ بھٹی صاحب کو شاید الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ جو کہ وہ بات شروع کرتے۔ دو بشر کمرے میں موجود تھے مگر سناٹا بول رہا تھا۔

نصیر نے ہمت کی اور بولا۔

''آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟''

''ہاں۔''

''میں ہمہ تن گوش ہوں۔'' نصیر نے کہا۔

''نصیر۔ میں چاہتا ہوں اب تم بھی شادی کرلو۔''

''جی؟'' خلاف توقع بات سن کر نصیر کے اوسان خطا ہو گئے۔

''کیوں۔ تم شادی کرنا نہیں چاہتے؟'' بھٹی صاحب مسکرائے۔

''کیا فائدہ۔ اور ویسے بھی کون کرے گا مجھ سے شادی۔'' نصیر بھی مسکرایا۔

''شادی کے فائدے تو بہت ہیں۔ اور کون کرے گا تو یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔'' بھٹی صاحب نے نصیر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرم لہجے میں کہا۔

''میں آپ کا بہت احسان مند ہوں اور۔''

''بھئی احسان کو چھوڑو۔ انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ میں جہاں چاہوں گا تمھیں منظور ہوگا؟''

''جیسا آپ چاہیں۔'' نصیر سعادت مندی سے بولا۔

''مجھے تم سے یہی امید تھی۔ یہ تو تم نے پوچھا نہیں کہ کس سے تمہاری شادی ہو رہی ہے۔'' وہ بولے۔

''مجھے آپ کی پسند دل وجان سے عزیز ہوگی۔''

''میری بیٹی! میری نیلما تمہاری آئندہ زندگی کی ساتھی ہوگی۔'' بھٹی صاحب بولے۔ تو نصیر کو یوں لگا جیسے اس کے ارد گرد دھماکے ہو رہے ہوں۔ وہ حیرت سے انھیں تکنے لگا۔

''کیا تمھیں میرا فیصلہ منظور نہیں؟'' بھٹی صاحب دکھی ہو گئے۔

''نہیں۔ نہیں۔'' نصیر نے زور زور سے سر ہلایا۔

''کیا تم کسی کو پسند کرتے ہو؟'' بھٹی صاحب بولے۔

''نہیں۔''

''پھر کیا وجہ ہے؟''

''مجھے آپ اتنے احسانوں کے بوجھ تلے مت دبایئے۔ نیلما اور میری عمروں میں میں فرق ہے۔ نہیں میں آپ کی بات نہیں مان سکتا۔ آپ کیوں اپنی بیٹی سے دشمنی کر رہے ہیں۔'' نصیر نے ان کے ہاتھ تھام کر نہایت لجی لہجے میں کہا۔

''میں تو دشمنیوں کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔'' بھٹی صاحب بڑبڑائے۔

''کیا مطلب؟'' نصیر چونک گیا۔

''ہاں نصیر۔ میں ان دشمنیوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ اپنے گاؤں والوں سے دور آ گیا ہوں، میں جو کہتا تھا کہ میں تعلیم حاصل کر کے گاؤں میں رہوں گا۔ اپنے گاؤں کو آئیڈیل بناؤں گا۔ مگر سارے خواب دھرے رہ گئے۔ اور مجھے اپنا آپ اور بچوں کو بچا کر یہاں لانا پڑا۔ سنو نصیر میں ملک خان محمد بھٹی ہوں۔ جسے قتل کرنے کے لیے تمہارا باپ پورے ملک کی خاک چھنوا رہا ہے مگر وہ جو بندے بھیجتا ہے انھوں نے مجھے دیکھا ہوا نہیں ہے وہ میرے قریب سے گزر جاتے ہیں مگر پہچان نہیں پاتے۔ آخر کب تک میں اپنا نام چھپا کر کاسٹ سے پہچانا جاؤں گا۔'' ان کا لہجہ نہایت دکھی تھا۔

''آپ..... آپ ملک محمد خان ہیں۔ پھر بھی آپ نے مجھے رکھا۔ آپ کو پتا نہیں تھا۔'' نصیر بولا۔

''ہاں۔ پتا تھا مجھے۔ تمہاری ڈگری پر ولدیت اللہ نواز لکھی ہوئی تھی۔ میں نے معلومات کروائیں اور پتا چلا کہ تم اپنے باپ کو محض اس لیے چھوڑ آئے ہو کہ تم مجھے قتل کرنے کے لیے ان کا ساتھ نہیں دے سکتے۔'' ملک خان محمد بولتے گئے۔

''آپ اپنے باپ کے قاتل کے بیٹے کو اپنی لختِ جگر دیں گے۔'' نصیر اب بھی حیران تھا۔

''کیا حرج ہے دشمنی تو ختم ہو...... ایک دفعہ میرا باپ یہی دشمنی ختم کرنے تمہارے ہاں گیا تھا اور زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا اور اب میں ختم کرنا چاہتا ہوں وہ برسوں پرانی دشمنی۔ شاید میں کامیاب ہو جاؤں۔ نیلی کو کچھ علم نہیں اور نہ تم اسے بتانا۔ نیلی کی ماں بھی راضی ہے اس رشتے پر۔ وہ بھی گاؤں میں رہنا چاہتی ہے کیونکہ اس کے والدین وہیں ہیں۔'' ملک خان محمد بولے۔

"ٹھیک ہے مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہے۔ ہم گاؤں ہی میں رہیں گے۔" نصیر نے ایک عزم سے کہا اور ملک خان محمد نے اسے سینے سے لگا لیا۔

☆☆☆

پورے چار ماہ بعد نہایت دھوم دھام سے نصیر اور نیلما کی شادی ہو گئی۔ وہ پیاری سی لڑکی جو اسے بہت اچھی لگی تھی۔ قدرت نے اس کے حوالے کر دی تھی۔

پھر ملک خان محمد نے اسرار، انوار اور ابرار کو ہاسٹل میں داخل کروا دیا اور پھر وہ سب گاؤں شفٹ ہو گئے۔ ملک خان محمد شہر ہی میں رہ گئے۔ بھلا مل کا انتظام کون سنبھالتا۔

ادھر ملک اللہ نواز کو بھی پتا چل گیا کہ خان محمد بمعہ اپنے داماد کے آ گیا ہے۔ وہ بہت خوش ہوئے کہ چلو اس طرح میں اس کو داماد کو مار کر اپنے داماد کا بدلہ لے لوں گا۔

انھیں آئے ابھی صرف ایک ہی ہفتہ ہوا تھا۔ نصیر اپنی بیوی اور ساس کو حویلی کی بالائی منزل سے نیچے ہی نہ آنے دیتا تھا۔ خود نیچے ہی سوتا تھا۔ اس کے کمرے میں پوری رات روشنی رہتی تھی۔

اس رات اپنے کمرے میں سویا ہوا تھا کہ تیز تیز قدموں کی آواز نے اسے جاگنے پر مجبور کر دیا۔ مگر وہ یونہی کروٹ لیے پڑا رہا۔

کمرے میں روشنی دیکھ کر وہ سب اس کمرے میں آ گئے۔ قدموں کی چاپ نصیر کے بیڈ کے قریب آ کر رک گئی۔ اور پھر کسی نے رائفل کا بٹ اتنی زور سے اس کی پیٹھ پر مارا کہ نصیر کراہ کر رہ گیا۔ مگر پھر نہایت اطمینان سے بولا۔

"کون ہو؟"

"اٹھو ملک خان محمد...... آج تمہاری موت تمہارے سامنے ہے۔ بہت چھپے ہو تم سے۔" چوہدری اللہ نواز تمسخر سے بولے۔

"اور اپنے داماد کو بھی بلا لے۔"

نصیر نے اپنے باپ کی آواز پہچان لی۔ اور ایک دم بولا۔

"ملک خان محمد تو نہیں ہیں۔ میں ان کا داماد ہوں۔" اس نے فوراً کروٹ لے لی۔

"نصیر!" سب حیرت سے نصیر کو تکنے لگے۔

"حیرت کی کیا بات ہے بھئی...... واقعی میں ملک خان محمد کا داماد ہوں۔" نصیر ہنس دیا۔

"تجھے شرم نہ آئی دشمنوں سے رشتے جوڑتے ہوئے۔" ظہیر غصے سے دھاڑا۔

"میں نے کبھی ملک خان محمد کو دشمن نہیں سمجھا۔ اور اس شخص کا ظرف دیکھیں چوہدری اللہ نواز۔"

"میں اب چوہدری بن گیا۔ تجھے بولنے کی تمیز نہیں رہی۔ میں تیرا باپ ہوں۔" چوہدری اللہ نواز پھنکارے۔

"اس وقت تو آپ چوہدری بن کر آئے ہیں باپ تو نہیں۔" نصیر نے کہا۔

"ہمیں علم نہیں تھا کہ ملک خان محمد اتنا بزدل ہو گا۔" شمشیر ہنسا۔

"وہ بزدل نہیں ہے۔ تعلیم نے اسے یہ آگہی دی ہے۔ یہ دشمنیاں کچھ نہیں دیتیں۔ گھروں کے گھر اجڑ جاتے ہیں۔ ایک دوسرے سے نفرتیں بڑھتی ہیں اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ملک خان محمد دشمنی ختم کرنا چاہتا تھا۔

اس نے ساڑھے تین برس تک مجھے اپنے پاس رکھا۔ اسے علم تھا کہ میں اس کے باپ کے قاتل کا بیٹا ہوں۔ مگر اس نے مجھ پر کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اور آخر میں اس نے اپنی بیٹی سے میری شادی کر دی، یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر میں بدل جاؤں تو...... وہ تو کسی نہ کسی طرح دشمنی ختم کرنا چاہتا تھا۔ بابا جی۔" نصیر نے چوہدری اللہ نواز کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کیا دیا ہے ہمیں دشمنیوں نے۔ ہر وقت کا خوف، ایک دوسرے سے انتقام لینے کے منصوبے بناتے رہنا۔ سہاگنوں کی مانگ اجاڑنا، ہنستے بچوں کو یتیم کرنا۔ آخر کیا ملتا ہے ہمیں۔ بابا جی خدا کے لیے یہ دشمن بازی ختم کر دیں۔ زندگی چند روزہ ہے کیوں اسے برباد کیا جائے۔

''زیادہ سبق نہ پڑھا'' لالہ منیر اس کی بات کاٹ کر بولے۔

''بتا تیرا سسر کہاں ہے؟''

''وہ میرا سسر ہی نہیں میرے باپ کے برابر ہے۔ اس لیے کہ وہ میری بیوی کا باپ ہے۔ ہم دونوں ایک ہیں۔ اس کا دکھ میرا...... اور میرا دکھ اس کا ہے۔

باباجی اپنے بیٹوں کو سمجھالیں۔ اگر انھوں نے میرے عظیم سسر کے بارے میں کوئی غلط لفظ زبان سے نکالا تو میں ان کی زبان کھینچ لوں گا۔'' نصیر کو بھی غصہ آگیا۔

''او کمینے تو۔'' لالہ ظہیر طیش میں آگے بڑھے۔

''رکو۔'' چوہدری اللہ نواز نے ظہیر کا بازو پکڑ لیا۔

''دیکھیں یہ کیا کہہ رہا ہے۔'' ظہیر بولا۔

''وہ صحیح کہہ رہا ہے۔'' چوہدری اللہ نواز بولے۔

سب حیرت سے انھیں تکنے لگے۔

''چار سال پہلے بھی یہ ہمیں سمجھاتا رہا۔ مگر ہماری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔ سچ تو کہتا ہے اگر ہم اپنا ذہن نت نئے انتقامی منصوبوں پر ضائع کرنے کی بجائے اپنے ملک وقوم کے بارے میں سوچیں تو کتنا اچھا ہوگا۔ کیا دیا ہے ان انتقامی کارروائیوں نے، ہمارے بزرگوں کی دشمنیوں نے ہمیں دیا ہی کیا ہے۔ وہ مر گئے ہم نے بھی مر جانا ہے۔ پھر کیوں فضول میں ہم اپنے ہی جیسے بھائیوں کے خون سے ہاتھ رنگیں۔ مجھے نصیر کا فیصلہ منظور ہے۔ آج ہماری تمام دشمنیاں اس کمرے میں دفن ہو جانی چاہئیں۔''

چوہدری اللہ نواز نے اپنے تینوں بیٹوں کی طرف دیکھا اور انھوں نے سر جھکا لیا کہ انھیں ان کی اس بات سے اتفاق ہے۔

اور نصیر اپنے باباجی سے لپٹ گیا۔

''تو روشنی کا مینار ہے میرے لعل۔ تو ٹھیک کہتا ہے۔ [illegible] میری بہو کہاں ہے؟'' چوہدری اللہ نواز نہایت محبت سے بولے۔

''ابھی تو وہ اوپر ہے سوئی ہوئی ہے۔ صبح مل لیجیے گا۔'' نصیر بولا۔

''بابا۔ ہم نے اس کی خوشی تو دیکھی نہیں۔ اس کے سسر سے کہو کہ ہم دھوم دھام سے برات لائیں گے اور نصیر کی ووہٹی لے کر جائیں گے۔'' نصیر کا بڑا بھائی ظہیر خوشی سے بولا۔

''اور بابا میرا خیال ہے ہم بھی ملک خان محمد کی طرح کریں۔'' منیر نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' چوہدری اللہ نواز نے کہا۔

''باباجی۔ میری بیٹی حمیدہ کو ہم کیوں نہ ملک خان محمد کے بیٹے سے بیاہ دیں۔'' منیر نے کہا تو نصیر نے چونک کر کہا۔

''او کیوں؟''

''اس لیے کہ فرض کریں کبھی ہماری نیت بدل جائے تو یہ تو ہوگا کہ ہمیں اپنی بیٹی کا بھی گھر اجڑنے کا احساس تو رہے گا۔'' منیر بولا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔'' چوہدری اللہ نواز بولے۔

اور پھر وہ کتنی دیر تک منصوبے بتاتے رہے۔

☆☆☆

ملک خان محمد بہت خوش تھے۔ برسوں پرانی دشمنی کا قلع قمع ہو گیا تھا۔ ان کی وسیع وعریض حویلی میں چوہدری اللہ نواز اپنے بیٹے نصیر کی برات لے کر آئے تھے۔ نصیر دوسری بار دولہا بنا تھا۔ سب بہت خوش تھے۔

اور رخصتی سے پہلے ہی اسرار کا نکاح بارہ سالہ حمیدہ سے کر دیا گیا اور رخصتی اسرار کی تعلیم کے بعد رکھی گئی۔

نیلما رخصت ہو کر سسرال آ گئی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

اور یہ پہلی رات تھی جو چوہدری اللہ نواز اس کے بیٹوں اور ملک خان محمد نے سکون کی نیند سو کر گزاری تھی۔ ذہن پر کوئی بوجھ نہ تھا۔ اب کوئی خوف نہ رہا تھا۔ کسی طرف سے دھڑکا نہ تھا۔

☆☆ ☆☆

دنیا
میں کس جگہ
سچی کہانیاں
کے چرچے نہیں

آپ سچی کہانیاں کے خریدار بن کر ملک کو
زرِ مبادلہ بھیجیے

اندرون ملک =/890 روپے

ہر ملک، ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

زرِ سالانہ

کویت	155 امریکی ڈالرز	ایران	155 امریکی ڈالرز
سعودی عرب	155 امریکی ڈالرز	سری لنکا	155 امریکی ڈالرز
یو اے ای	155 امریکی ڈالرز	جاپان	155 امریکی ڈالرز
مصر	155 امریکی ڈالرز	لیبیا	155 امریکی ڈالرز
یونان	155 امریکی ڈالرز	ڈنمارک	155 امریکی ڈالرز
فرانس	155 امریکی ڈالرز	جرمنی	155 امریکی ڈالرز
برطانیہ	155 امریکی ڈالرز	ہالینڈ	155 امریکی ڈالرز
ناروے	155 امریکی ڈالرز	پولینڈ	155 امریکی ڈالرز
امریکہ	165 امریکی ڈالرز	کینیڈا	165 امریکی ڈالرز
افریقہ	165 امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	165 امریکی ڈالرز

آج ہی رابطہ کیجیے
C-88 II ۔ فرسٹ فلور ۔ خیابانِ جامی کمرشل ۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی ۔ فیز ۔7، کراچی
فون نمبر: 35893122 - 021-35893121

رشتے ناتے... سب مایا ہے

عرفان حسین آصف

اُن خونی رشتوں کی داستان، جو صرف مایا کے پرستار ہوتے ہیں

میرے والد صاحب کا نام منظور حسین اور والدہ صاحبہ کا نام زینب بی بی تھا۔ بڑی بہن کا نام طاہرہ بی بی تھا، جبکہ میری چھوٹی بہن کا نام میسرہ بی بی تھا۔

میرا نام واجد شی ہے۔ جب میں نے آنکھ کھولی تو ہر طرف مایوسی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ یعنی ہم بہت غریب تھے۔ سب سے بڑا میں تھا۔ میرے بعد میری دو بہنیں اس دنیا میں آئیں۔ میرے والد محنت مزدوری کرتے تھے جس سے گھر کی دال روٹی چل رہی تھی۔ اسی طرح وقت چلتا رہا تو جب میں سات سال کا ہوا میرے والد نے مجھے ایک سرکاری اسکول میں داخل کرا دیا۔ اور میں بھی دل لگا کر پڑھنے لگا۔ ہم جھنگ شہر سے پچاس کلو میٹر دور قصبہ شاہ نکڈر کے رہنے والے ہیں۔ ہمارے رشتہ دار بھی ہم سے دور دور رہتے تھے کہ کہیں ہم اُن سے کچھ مانگ نہ لیں لیکن میری والدہ صاحبہ صبر والی خاتون تھیں۔ وہ دو دو دن بھوکی رہ لیتی تھیں۔ مگر کسی سے اُدھار بھی نہیں مانگتی تھیں۔ انھیں پتا تھا کہ دوسروں کے آگے کیسی عزت رکھنی ہے اس لیے وہ جب بھی کہیں جاتیں یا کوئی ہمارے گھر آتا تو وہ انھیں ایسا تاثر دیتی تھیں کہ جیسے ہم بہت خوش حال زندگی گزار رہے ہوں۔

میرے والد صاحب بھی بہت حساس طبیعت کے مالک تھے وہ بھی ہر حال میں اللہ پاک کا شکر کرتے تھے۔ اُس وقت میرے والد صاحب کی کوئی لگی بندھی تنخواہ نہیں تھی۔ بس جس دن مزدوری مل جاتی کر لیتے تھے اور جس دن نہ لگتی تو صبر سے گھر میں رہتے اور پانچ وقت کی نماز پڑھتے تھے۔

وہ کہتے ہیں نا کہ اگر اللہ پاک کسی کو کسی چیز سے محروم رکھتا ہے تو اس کے بدلے وہ اس انسان کو کوئی نہ کوئی خوبی ضرور دیتا ہے۔ اللہ پاک نے ہمیں بھی دولت سے تو محروم رکھا تھا مگر ہمیں ذہن بہت اچھا دیا تھا میری بڑی بہن اور میں ہم دونوں اسکول جاتے تھے وہ مجھ سے تو چھوٹی تھی لیکن بہنوں میں بڑی تھی۔ میں اس وقت پانچویں کلاس میں تھا جبکہ میری بہن کلاس چہارم میں تھی۔ ہمارے اسکول تو علیحدہ تھے مگر راستہ ایک ہی تھا۔ میری بہن کا اسکول پہلے آتا تھا اور میرا تھوڑا سا آگے تھا۔ صبح ہم اکٹھے نکلتے اور پہلے میں بہن کو اسکول چھوڑتا پھر میں آگے اپنے اسکول چلا جاتا اور پھر چھٹی کے وقت بھی اپنے اسکول سے نکلتا اور پھر بہن کو اسکول سے لیتا اور سیدھا گھر چلا جاتا تھا۔ ہم دونوں بہن بھائی بہت ذہین تھے ہمیں نہیں یاد پڑتا کہ

ہم نے کبھی سبق یاد نہ ہونے پر مار کھائی ہو سب اساتذہ بھی ہمیں بہت پیار کرتے تھے۔

جب پانچویں کے امتحان ہوئے تو میں نے مزید محنت کی اور دل لگا کر پیپر دیے جب رزلٹ آیا تو پورے اسکول میں فرسٹ پوزیشن لی اور ہمارے علاقے کے آس پاس تقریباً پانچ سے چھ اسکول تھے ان کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ مگر بدقسمتی سے بورڈ میں پہلی پوزیشن نہ لے سکا۔ بورڈ میں میری تیسری پوزیشن آئی تھیں میرے تین نمبر کم تھے اگر ان تین نمبروں میں سے ایک نمبر بھی زیادہ آ جاتا تو میری دوسری پوزیشن ہوتی پر یہ بھی اللہ پاک کی مہربانی تھی۔ پانچویں کلاس کے بعد بھی میں نے اپنی پڑھائی پر خصوصی توجہ دی اور دل لگا کر پڑھائی کرتا رہا۔

میری بہن نے بھی بہت محنت کی لیکن وہ بورڈ میں تو کوئی پوزیشن نہ لے سکی مگر اپنے اسکول سے اور اپنے علاقے کے دوسرے اسکولوں سے سب کو پیچھے چھوڑ دیا۔ سب اساتذہ اور کلاس فیلوز نے مبارک باد دی۔

اس سے آگے تو میں جیسے تیسے کر کے پڑھ رہا تھا مگر والدین میری بہن کو پڑھانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ جب میرے والدین نے میری بہن کو اسکول نہ جانے دیا تو اس کی انچارج جو اس کی کلاس انچارج تھیں وہ ہمارے گھر آ گئیں اور اصرار کرنے لگیں کہ میں طاہرہ کو لازمی اسکول لے جاؤں گی مگر جب میری بہن نے ساری صورت حال بتائی تو مس نے کہا کہ آپ فکر نہ کریں آپ کا سارا خرچہ میں خود اٹھاؤں گی۔ تو میری والدہ کو جب انھوں نے بہت زور دیا تو انھوں نے طاہرہ کو بھیج دیا۔

اللہ پاک کا لاکھ شکر تھا کہ ہمیں دل بہت بڑا دیا تھا ورنہ جتنی غریبی کے دن ہم نے کاٹے تھے اگر کوئی اور ہوتا تو کب کی خودکشی کر لیتا۔ آپ اس بات سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں نے مہینے کے بعد دو روپے اسکول فیس دینی ہوتی تھی پر وہ بھی میرے پاس نہیں ہوتی تھی۔ پر میں مانگتا کسی سے نہیں تھا۔ اور والدین کو بھی مجبور نہیں کرتا تھا مجھے پتا تھا کہ اگر ان کے پاس



ہوتے تو وہ مانگنے سے پہلے دے دیتے۔ اس لیے ہمارے محلے کے زمین دار نے سبزی وغیرہ لگائی ہوئی تھی وہ ہر ہفتے ان کی کانٹ چھانٹ اور پانی وغیرہ لگواتا تھا۔ محلے کے تین چار لڑکے اور بھی ہوتے تھے ہم تقریباً دو گھنٹے ان کے ہاں کام کرتے جس کے بدلے وہ ہمیں دس، دس روپے دیتا تھا۔ جس سے میں فیس بھی ادا کرتا تھا اور باقی کے آئندہ کے خرچے کے لیے رکھ لیتا تھا کیونکہ کبھی پنسل، یا کاپی وغیرہ خریدنی پڑ جاتی تھی۔

میری والدہ بہت دکھی ہوئے میری حالت دیکھ کر میں ان کو کہتا کہ امی جان آپ پریشان کیوں ہوتی ہو۔ اگر اللہ پاک نے پیدا کیا ہے تو کسی نہ کسی طریقے ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی سبب بھی بنا دیتا ہے۔''

اسی طرح زندگی گزرتی رہی اور میں آٹھویں کلاس میں آ گیا۔ میری بہن اس وقت ساتویں کلاس میں تھی کہ میرے والد صاحب کو ایک فارم ہاؤس پر نوکری مل گئی۔ اور اس وقت کے لحاظ سے 2500 سو روپے مہینہ تھی۔ تنخواہ تو بہت تھوڑی تھی جیسے اونٹ کے منہ میں زیرے والی بات تھی مگر ایک بات تھی کہ گئی جندڑی بھی اگر مزدوری کرتے تو ڈیڑھ سو ڈیلی کے ملتے تھے پر وہ پندرہ دن بنتی تھی اور باقی کے پندرہ دن گھر رہتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ بھی ہمارے لیے غنیمت تھی۔

ہمارے رشتہ دار سب ہمارا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ میرے تین انکل تھے اور دو آنٹیاں تھیں۔ جو دونوں ابو سے چھوٹی تھیں۔ ابو جی سب بہن بھائیوں سے بڑے تھے۔ باقی سب اپنی اپنی زندگی میں مگن تھے میرے ایک انکل فوج میں تھے جبکہ ایک درزی تھے اور تیسرا ایک کمپنی کی گاڑی چلاتا تھا۔ ان کا گزر بسر بہت اچھے طریقے سے ہو رہا تھا اس لیے وہ کبھی آتے بھی تو ایسے رعب سے آتے کہ ہم پر احسان کرنے آ گئے ہوں۔ وہ دونوں جو انکل ابو سے چھوٹے تھے وہ فیصل آباد میں رہتے تھے اور جو سب سے چھوٹا تھا وہ جوہر آباد میں رہتا تھا۔ پھر کچھ نہ کچھ امی جان نے بچت کرنی شروع کر دی جو ابو کی تنخواہ سے گھر کا نظام بھی چلاتی تھیں اور کچھ نہ کچھ اچھے برے وقت کے لیے بھی بچا کر رکھ لیتی تھیں وہ تو شکر تھا کہ گھر ہمارا اپنا تھا ورنہ ہمیں تو سر چھپانے کا بھی مسئلہ بن جاتا۔

اب میں نویں کلاس میں تھا اس وقت میری عمر سترہ سال تھی۔ وہ کہتے ہیں نہ یہ وہ عمر ہوتی ہے یا تو انسان کچھ بن جاتا ہے اور نہیں تو سب کچھ ختم کر بیٹھتا ہے۔

ایک دن ہمارے ہاں انکل آئے جو جوہر آباد میں رہتے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی فیملی بھی تھی ان کی ایک بیٹی بھی ہمارے ساتھ تھی۔ ہم سب کھیتوں کی سیر کو جا رہے تھے۔ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو کچھ عجیب سا احساس ہوا میں نے بہت کوشش کی مگر اس کی شربتی آنکھوں سے نظریں نہ ہٹا سکا۔ جب بھی وہ بھی میری طرف دیکھتی تو ہماری نظریں آپس میں ٹکراتیں تو میں جلدی سے نگاہیں نیچی کر لیتا۔ پتا نہیں مجھے کیا ہوا جا رہا تھا۔ میرا دل کرتا کہ میں بس اسی کو دیکھتا رہوں۔ میں نے خود کو بہت روکا کہ یہ ہم غریبوں کے لیے نہیں بنی۔ پر دل ہی کیا جو کسی کی مانے یہ میرے بس میں نہیں تھا کہ میں دل کو روک پاتا اور وہ میرے بس میں نہیں تھی کہ میں اسے پانے کے استطاعت رکھتا۔ وہ تو ہمیں دیکھ کر بھی خوش نہیں تھے پتا نہیں کہ وہ یہاں رہنے کے لیے کیسے آ گئے تھے۔ اس کے بعد میں اس کے سامنے آنے سے بھی گریز کرنے لگا۔

میں جب بھی اسکول سے واپس آتا یا تو کمرے میں ہی رہتا یا پھر دوستوں وغیرہ سے ملنے چلا جاتا۔ دو دن تو گزر گئے لیکن جب تیسرے دن میں اسکول سے واپس آیا تو وہ میرے کمرے میں آ گئی جب میں نے اسے دیکھا تو پوچھا۔

''خیریت امبر!'' تو وہ کہنے لگی۔

''ماجد آپ کو ہو کیا گیا ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تم دو دن سے میرے سامنے آنے سے گریز کر رہے ہو اور جب میں تم سے بات کرنے کی کوشش کرتی ہوں تو تم کسی کام کا بہانہ بنا کر باہر چلے جاتے

ہو آخر تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔"
میں نے اس سے کہا کہ نہیں ایسے تو کوئی بات نہیں تو وہ کہنے لگی کہ کوئی نہ کوئی تو بات ضرور ہے۔ جو آپ مجھ سے دور دور رہنے لگے ہو۔" اور پھر کہنے لگی۔

"واجد مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

تو میں نے اس سے کہا کہ جی حکم کریں۔

"تو اس نے کہا کہ واجد میں تمھیں جب بھی دیکھتی ہوں تو مجھے ایسے لگتا ہے کہ تم ہی میرے خوابوں کے شہزادے ہو۔ مجھے تمہاری ہی تلاش تھی۔ واجد میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔ پلیز میری محبت کو مت ٹھکرانا ورنہ میں بکھر جاؤں گی۔ میں ہمیشہ تمہارا ساتھ دوں گی۔ تم جس موڑ پر بھی مجھے آواز دو گے میں تمہارے پاس ہوں گی۔" مجھے یہ سن کر بہت ہی اچھا لگا کہ جس کو میں پسند کرتا ہوں وہ مجھے بھی دل و جان سے چاہتی ہے۔ میں نے امبر سے کہا کہ میں بھی تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔ لیکن میں ڈرتا تھا کہ کہیں آپ کے ابو برا نہ مان جائیں اور تم بھی کیونکہ ہم تو ٹھہرے غریب لوگ۔ بھلا ہمارا اور تمہارا کیا جوڑ بس یہی سوچ کر تم سے دور رہنے لگا تھا۔" تو امبر کہنے لگی کہ واجد آج یہ بات تمہارے منہ سے نکلی ہے اگر پھر کبھی نکلی تو میں تم سے بات بھی نہیں کروں گی اور پھر کہنے لگی۔ واجد تم نہیں جانتے جب یہ عشق کسی کو ہوتا ہے نہ تو پھر یہ نہیں دیکھتا کہ کون غریب ہے اور کون امیر، کون گورا ہے اور کون کالا، کون اپنا ہے اور کون پرایا۔ بس یہ تو ہو جاتا ہے محبت، جائداد، پراپرٹی، یا پھر حسن دیکھ کر نہیں کی جاتی بلکہ یہ کسی کے دل میں سما جاتی ہے تو پھر سب فرق مٹا دیتی ہے اور میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں تم سے آخری سانس تک نبھاؤں گی۔"

میں نے بھی اسے یقین دلایا اور پھر ہم ہنسی خوشی ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ وہ میری بہنوں کے کمرے میں چلی گئی اور میں وہیں بیڈ پر دراز ہو کر مستقبل کے خواب دیکھنے لگا۔

وہ تقریباً ایک ہفتہ ہمارے گھر رہے پھر واپس جانے کی تیاری کرنے لگے۔ جب وہ تیاری کر رہے تھے تو میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ میں باہر سے تو بظاہر ہنس رہا تھا مگر اندر سے میرا دل ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ میں زیادہ دیر ان کے پاس نہ بیٹھ سکا اور واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرے پیچھے امبر بھی میرے کمرے میں آ گئی وہ بھی رو رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"واجد میں جا رہی ہوں پر یہ نہ سمجھنا کہ میں تم کو بھول جاؤں گی۔ میں تو جا رہی ہوں پر میرا دل تمہارے پاس امانت ہے، اس کی حفاظت کرنا، اگر اللہ پاک نے چاہا تو ہم پھر بہت جلد ملیں گے۔ تم صرف میرے ہو۔ میں تمھیں کسی صورت بھی کھونا نہیں چاہتی۔ پلیز میری محبت کی لاج رکھنا۔ اگر جس دن تم مجھے بھول گئے تو ایسا سمجھنا کہ وہ میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔

میں نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور کہا کہ امبر پھر کبھی یہ مت کہنا ورنہ تم سے پہلے میں اس دنیا سے چلا جاؤں گا۔ میں تمھیں کیسے بھول سکتا ہوں۔ تم تو میری دھڑکن ہو، بھلا دھڑکن کے بغیر بھی کوئی زندہ رہ سکتا ہے۔ جس دن میں تم کو بھولوں گا اس دن یہ دھڑکن بھی دھڑکنا چھوڑ دے گی۔"

ادھر انکل سب کو جلدی آنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ بڑی مشکل سے ہم نے اپنے آنسو روکے جب وہ کمرے سے باہر جانے لگی تو بولی۔

"واجد جی کیا آپ ہمیں باہر تک بھی چھوڑنے نہیں آؤ گے۔" دل تو نہیں کر رہا تھا کہ انھیں چھوڑنے جاؤں کیونکہ مجھے پتا تھا کہ میں اسے جاتا ہوا نہیں دیکھ سکوں گا پر مجبوراً مجھے جانا پڑا بھلا میں امبر کی بات کیسے ٹال سکتا تھا۔ بڑی مشکل سے خود پر کنٹرول کیا اور انھیں گاڑی تک چھوڑنے ساتھ گیا۔ جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے میں انھیں دیکھتا رہا۔

جب وہ نظروں سے دور ہو گئے تو میں بھی مردہ قدموں سے چلتا ہوا گھر واپس آ گیا۔

☆☆☆

اس رات میں بہت بے چین رہا، نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی باہر صبح پرندے ہنس کھیل رہے تھے گیت گا رہے تھے پر میرا دل ویران تھا۔ صرف میری

سانسوں کی آواز آرہی تھی مجھے اتنا تیز بخار ہوا کہ میں ایک ہفتے تک اسکول بھی نہ جا سکا۔ بخار تھا کہ اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ گھر والے بھی سب پریشان تھے کہ مجھے کیا ہوگیا ہے۔ ایک ہفتے بعد جب امبر کا فون آیا تو سب گھر والوں سے بات کرنے کے بعد اس نے میری بہن کو کہا کہ واجد سے بھی بات کرادو۔ تو میری بہن نے بتایا کہ وہ اپنے کمرے میں ہے۔ جب سے تم گئی ہو اس وقت سے اُسے بخار ہے اور وہ اسکول بھی نہیں گیا۔ میں آپ کی بات کرواتی ہوں اس سے۔''

جب امبر نے مجھ سے بات کی تو میری بہن مجھے فون دے کر باہر چلی گئی تو میں بات کرتے ہوئے بھی رو رہا تھا۔

امبر مجھ سے کہنے لگی کہ واجد یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ آنٹی کہہ رہی تھیں کہ تمہیں ایک ہفتے سے بخار ہے اور نہ ہی تم اسکول گئے ہو اور نہ ہی کمرے سے باہر نکلتے ہو۔ تو میں نے کہا کہ امبر تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں جب بھی تم یاد آتی ہو تو میں تڑپ سا جاتا ہوں مجھے جب تمہارے ساتھ گزرا ہوا وقت یاد آتا ہے۔ میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑتیں تو میں کیا کروں۔ تو وہ کہنے لگی۔

پلیز واجد اپنے آپ کو سنبھالو۔ یہ محبت ہی ایسی ہے اگر اس میں درد نہ ہوں تو بھلا اس کا نام کون محبت رکھتا۔ میرا بھی یہی حال ہے مگر وقت کے ساتھ ہمیں سمجھوتا کرنا پڑے گا۔ یہ وقت بہت ظالم چیز ہے جو کوئی اس کے ساتھ سمجھوتا کر لیتا ہے وہ ہی فائدے میں رہتا ہے۔ ورنہ یہ وقت اسے اتنے زخم دیتا ہے کہ وہ موت آنے سے پہلے ہی یہ دنیا چھوڑ جاتا ہے۔ پلیز واجد تمہیں میری قسم تمہیں جلدی ٹھیک ہونا ہوگا۔ پھر سے وہی واجد بننا ہوگا جو ہماری ملاقات سے پہلے تھا۔ پھر سے وہی زندگی گزارنی ہوگی۔ پاگل یہ جدائی تو عارضی ہے یہ تو ایک دن ختم ہو جائے گی مگر جو وقت گزر گیا وہ واپس نہیں آئے گا اس لیے جب میں دو دن بعد فون کروں تو تم مجھے پہلے والے واجد ملو، شرارتی، ہنس مکھ، ورنہ میں تم سے کبھی بھی بات نہیں کروں گی۔

میں نے امبر سے وعدہ کیا کہ میں جلد ہی ٹھیک ہو جاؤں گا اور پھر فون بند ہو گیا۔

مجھے بہت خوشی ہوئی کہ امبر نے اپنا وعدہ نبھایا اور مجھے بھولی نہیں۔

ایک دن بعد ہی میرا بخار اتر گیا اور میں نے اسکول بھی جانا شروع کر دیا۔ گھر والے حیران تھے کہ ایک ہی دن میں یہ کایا کیسے پلٹ گئی جو ایک ہفتہ میں نہ پلٹ سکی۔ میری بہن طاہرہ مجھے چھیڑتی رہتی تھی کہ لگتا ہے کہ میرے بھائی پر کسی لڑکی کا سایا پڑ گیا ہے۔'' اور میں صرف مسکرا کر اِدھر اُدھر ہو جاتا تھا۔

اسی طرح دن گزرتے رہے اور ہمارے پیار میں بھی اضافہ ہوتا گیا اس بات کو تقریباً ڈیڑھ سال گزر گیا لیکن ہمارے پیار میں کوئی فرق نہ آیا۔

☆☆☆

اب میں دسویں کلاس میں تھا۔ عنقریب ہمارے پیپر ہونے والے تھے وہ دن بہت خوش گوار تھے لیکن پھر نہ جانے ہمارے پیار کو کس کی نظر لگ گئی۔ کہ امبر مجھ سے دور ہوتی چلی گئی پہلے وہ تین دن بعد کال کرتی تھی۔ پھر ایک ہفتہ بعد کرنا شروع کر دیا اور پھر شاید پندرہ بیس دن بعد کرتی لیکن اب پورا ایک ماہ ہو گیا تھا کہ اس نے کوئی کال نہ کی۔ اِدھر میں بہت بے چین تھا کہ پتا نہیں کیا ہوا ہے۔ کال کیوں نہیں کی۔ میں کال اس لیے نہیں کر سکتا تھا کہ موبائل آنٹی کے پاس ہوتا تھا۔ یعنی امبر کی امی کے پاس اور وہ تو ہمیں پہلے بھی غریب ہونے کی وجہ سے اچھا نہیں سمجھتی تھیں۔ بات کیا خاک کرتیں۔ پھر میں نے خود کو سمجھایا کہ ہو سکتا ہے ایگزام قریب آگئے ہوں اور وہ پڑھائی میں محنت کر رہی ہو۔ یہی سوچ کر میں نے بھی ساری توجہ پڑھائی پر مرکوز کر دی اور بہت اچھے پیپر دیے اور رزلٹ کا انتظار کرنے لگا۔ میری بہن نے بھی بہت محنت سے پیپر دیے۔ وہ 9th میں تھی اور اب دسویں کلاس میں داخل ہونا تھا جبکہ میں نے دسویں کے پیپر دے دیے تھے اور اب رزلٹ آنے کے بعد مستقبل کے بارے میں کچھ سوچنا تھا۔

☆☆☆

تین مہینے گزر گئے تھے مگر امبر کی کوئی کال وغیرہ نہ آئی تھی۔ میں نے دو، تین بار کی بھی تھی تو آنٹی نے فون اٹھایا تھا بس یہی پوچھا کہ۔

''خیریت تھی، کال کیوں کی۔''

تو میں نے کہا بس ویسے ہی کی کہ آپ کی خیر خیریت پوچھ لوں۔ تو کہنے لگی کہ اچھا ٹھیک ہے ہم سب خیریت سے ہیں اور میں ابھی بزی ہوں پھر کال کرتی ہوں میں انتظار کرتا رہتا تھا مگر پھر کال نہیں آئی تھی۔ میں بہت بے چین رہنے لگا تھا۔

جب رزلٹ آیا تو میں نے بہت اچھے نمبر لیے تھے۔ سب دوستوں اور اساتذہ نے بہت حوصلہ افزائی کی اور مبارک باد بھی دی جس پر میرے گھر والے بھی بہت خوش تھے۔ اِدھر میری بہن نے بھی بہت اچھے نمبر لیے تھے جس کی وجہ سے سب محلے والے میرے والدین کو مبارک باد دے رہے تھے۔

میرے والد صاحب جس سیٹھ کے ہاں کام کرتے تھے وہ بہت ہی ہمدرد اور خدا ترس انسان تھا۔ اس کے سب بیٹے شادی شدہ تھے اور وہ یہاں دیہاتی ماحول میں رہنا پسند نہیں کرتے تھے اور نہ ہی ان کی بیوی بچے اس لیے انھوں نے اپنے والدین سے جائیداد میں سے حصہ لینے کے بعد پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا اور اپنی فیملیوں سمیت دبئی میں جا بسے۔ کتنے ہی سال ہو گئے تھے وہ واپس نہیں آئے تھے۔ پہلے پہل جانے کے بعد وہ فون وغیرہ کر لیتے تھے مگر آہستہ آہستہ وہ بھی آنا بند ہو گئے تھے اب تقریباً چھ سال ہو گئے تھے کہ اُن کی کوئی خیر خبر نہیں آئی تھی اگر ان کا والد بھی ان کے دفتر کے نمبر پر کال کرتا تو آگے سے جواب آتا کہ صاحب ابھی میٹنگ میں مصروف ہیں بعد میں کال کرنا اور پھر جب بعد میں کال کرتے تو کوئی بھی نہ اٹھاتا اس لیے اب انھوں نے بھی کال کرنا بند کر دیا تھا۔

پہلے پہل تو وہ ابو کو ایک نوکر کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔ مگر جب انھوں نے میرے ابو کی وفاداری کو دیکھا تو انھیں اپنے بیٹوں جیسا رکھتے تھے۔ ہر بات وہ ابو جی سے شیئر کرتے تھے۔ اور جیسا ابو نے ان کو مشورہ دیتے تو وہ ویسا ہی کرتے۔ اُن کی ساڑھے چھ مربعے زمین تھی اور ان کے دو بیٹے تھے۔ بیٹی کوئی نہیں تھی اس لیے انھوں نے اس زمین کے تین حصے کیے دو بیٹوں کے اور ایک اپنا حصہ۔ اس لحاظ سے ساڑھے چار مربعے انھوں نے اپنے بیٹوں کے نام کر دیے تھے جو وہ بیچ کر دبئی قیام پذیر ہو گئے تھے اور اب ان کے پاس دو مربع اراضی بچی تھی جو انھوں نے دس ایکٹر پر اپنا فارم ہاؤس بنایا ہوا تھا اور اپنی کوٹھی بھی وہیں بنائی ہوئی تھی جس میں وہ قیام پذیر تھے باقی کی زمین انھوں نے ٹھیکے پر دی ہوئی تھی اور فارم ہاؤس پر انھوں نے ہر قسم کے پرندے پال رکھے تھے۔ جن کی دیکھ بھال کے لیے انھوں نے میرے والد صاحب کو رکھا تھا۔

اب میرا دل کر رہا تھا کہ میں امبر کے گھر جوہر آباد جاؤں اور اس سے ملاقات کروں لیکن گھر والوں سے اجازت لینا مشکل تھا۔ کیوں کہ میرے والد صاحب سارا سارا دن فارم ہاؤس پر ہی رہتے تھے اور ہفتہ میں دو بار گھر آتے تھے اس لیے مجھے صبح دونوں بہنوں کو اسکول چھوڑنے جانا ہوتا تھا اور چھٹی کے وقت ان کو اسکول سے جا کر لانا ہوتا تھا۔ میری چھوٹی بہن گھر میں باجی سے پڑھتی رہتی تھی جب ابو کام پر لگے اور گھر کے کچھ حالات بہتر ہوئے تو میری بہن نے بھی امی سے کہا کہ وہ چھوٹی کو ساتھ اسکول لے جائے گی۔ جب اسکول کی ٹیچر نے اس سے سبق کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے پانچویں کلاس کی کتاب اٹھا کر سبق سنانا شروع کر دیا جس سے میری بہن کی ٹیچر بہت خوش ہوئی اور انھوں نے میری چھوٹی بہن کو پانچویں کلاس میں داخل کر لیا۔

میں نے امی جان سے بات کی تو انھوں نے کہا کہ میں تمھیں روکتی نہیں ہوں پر اپنے ابو سے بات کر لو اگر وہ گھر آ جاتے ہیں چھٹی لے کر تو تم چلے جانا۔

میں نے سائیکل نکالی اور ابو کے پاس فارم ہاؤس پہنچ گیا۔ اس وقت ابو اور حاجی صاحب اکٹھے

بیٹھے ہوئے تھے میں پہلی بار ابو کے پاس فارم ہاؤس پر گیا تھا۔ جب حاجی صاحب نے ابو سے پوچھا کہ یہ نوجوان کون ہے تو ابو نے بتایا کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ میٹرک کلیئر کرلی ہے اور نمبر بھی ماشاء اللہ بہت اچھے لیے ہیں تو حاجی صاحب نے کہا۔

''برخوردار کیا خیال ہے آگے پڑھنے کا ارادہ ہے کہ شوق پورا ہو گیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''جی حاجی صاحب شوق بہت ہے مگر...... اس مگر کے لفظ پر ابو جی نے میری طرف دیکھا تو میں نے جلدی سے بات گھمائی کہ ابھی میں تھوڑا ریسٹ کرنا چاہتا ہوں۔''

حاجی صاحب نے کہا کہ بیٹا تم ریسٹ کرنا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی پر اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بے دھڑک بتا دینا۔ شرم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''جی دادا جان ضرور۔'' پتا نہیں میرے منہ سے کیسے دادا جان نکل گیا کہ حاجی صاحب اٹھے اور مجھے گلے سے لگا لیا۔ کافی دیر روتے رہے پھر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور ابو سے کہا کہ۔

''منظور حسین میرے کان ترس گئے تھے یہ ایک لفظ سننے کو مگر آج وہ کمی بھی پوری ہو گئی ہے۔ یہ بیٹا مجھے دے دو بس۔'' ابو نے کہا کہ۔

''پر حاجی صاحب......'' لیکن حاجی صاحب نے ابو کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''منظور حسین میں نے تمھیں بھی اپنے بیٹوں کی طرح رکھا ہے کیا تو بھی میرے دوسرے بیٹوں کی طرح نکلے گا۔'' تو میرے ابو نے کہا۔

''حاجی صاحب نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔''

تو پھر حاجی صاحب نے کہا کہ ٹھیک ہے یہ میرے پاس ہی رہے گا۔ اور اگر آپ اس کو یہاں نہیں رہنے دیتے تو آپ کی مرضی۔''

ابو نے کہا کہ حاجی صاحب جیسے آپ کی مرضی میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' تو حاجی صاحب مسکرانے لگے۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''بتاؤ بیٹا تم یہاں آئے کس کام سے تھے۔'' میں ابو کی طرف دیکھنے لگا تو حاجی صاحب نے کہا۔

''بیٹا اپنے والد کی طرف کیا دیکھتا ہے۔ تجھ سے میں نے پوچھا ہے یا تمہارے والد نے۔'' تو ابو نے مجھے اشارہ کیا تو میں نے کہا کہ حاجی صاحب دراصل میں یہاں اس لیے آیا تھا کہ مجھے اپنے انکل کے گھر جوہر آباد جانا ہے اور مشکل یہ ہے کہ صبح بہنوں کو اسکول چھوڑنا ہوتا ہے اور پھر واپس بھی لانا ہوتا ہے پھر ابو بھی یہاں ہوتے ہیں تو بہنوں کے اسکول جانے میں اور آنے میں دشواری ہوگی۔'' یہ سن کر حاجی صاحب بولے۔

''بیٹا پہلی بات تو یہ ہے کہ تم مجھے حاجی صاحب نہیں بلکہ دادا جان کہو گے اور رہی دوسری بات تو جب تک تم واپس نہیں آجاتے تب تک منظور حسین اپنے گھر میں رہیں گے۔'' میں نے ان کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولے۔

''بیٹا اپنوں کا شکریہ ادا نہیں کرتے۔ تم تو مجھے اپنے پوتوں جیسے ہو اگر وہ آج یہاں ہوتے تو آپ کے برابر ہوتے۔'' اور پھر انھوں نے اپنی جیب سے مجھے کچھ روپے دیے میں نے لینے سے انکار کر دیا مگر انھوں نے زبردستی میری جیب میں ڈال دیے تھے۔ پھر ہم دونوں باپ بیٹا واپس گھر آگئے تھے۔

میں نے جب اپنی والدہ کو بتایا کہ حاجی صاحب کتنے نیک آدمی ہیں تو وہ بھی انھیں دعائیں دینے لگی جب میں نے پیسے گنے تو وہ پورے پانچ ہزار روپے تھے ان میں سے میں نے ایک ہزار روپے رکھ لیے اور باقی کے اپنی والدہ کو دیے اور پھر تیاری کرنے لگا۔ میری بہن سمیرہ کمرے میں کوئی چیز لینے آئی تو پیچھے سے طاہرہ بھی آ گئی پھر دونوں بہنیں مل کر مجھے تنگ کرنے لگیں بڑی مشکل سے میں اُن سے پیچھا چھڑا کر نکلا اور جوہر آباد جانے والی بس میں بیٹھ گیا۔

جب میں یہاں سے جا رہا تھا تو بہت خوش تھا کہ میں اپنی جان، اپنے پیار کو ملنے جا رہا ہوں۔ میں تقریباً چار گھنٹے بعد وہاں پہنچا۔ وہاں سے میں نے فروٹ لیا کہ پہلی بار اُن کے گھر جا رہا ہوں وہ یہ نہ کہیں کہ پہلی

بار بھی خالی ہاتھ آ گیا۔ پھر مسئلہ یہ تھا کہ مجھے تو ان کو گھر کا بھی پتا نہیں تھا۔ میں نے انکل کا نمبر ملایا اور انھیں بتایا کہ میں جوہر آباد اڈے پر کھڑا ہوں مگر آپ کے گھر کا پتا نہیں ہے تو پہلے تو وہ حیران ہوئے کہ میں اور جوہر آباد مگر پھر انھوں نے کہا کہ کسی آٹو رکشے والے سے بات کراؤ۔ میں نے ایک رکشے والے کو کہا کہ میں یہاں کسی عزیز کے گھر آیا ہوں مگر مجھے راستے کا نہیں پتا یہ بات کرلو اور پتا اچھی طرح ذہن میں رکھ لینا تو اس نے میرے انکل سے بات کی تو انکل نے اسے اپنے گھر کا پتا بتا دیا تو رکشے والے نے کہا کہ بیٹھ جاؤ میں بیٹھ گیا وہ رکشے کو مختلف گلیوں میں سے گھماتا ہوا ایک گھر کے سامنے جا کر رک گیا۔ اور مجھے کہا کہ یہ دروازہ نمبر 36 والا ہی تمہارے انکل کا گھر ہے۔''

میں نے اسے کرایہ دیا اور گھر کی بیل بجائی تو آنٹی نے دروازہ کھولا پہلے تو حیرانی سے مجھے دیکھتی رہی پھر مجھے اندر آنے کو کہا۔ میں چپ چاپ گھر کے اندر چلا گیا۔ گھر کوئی بہت بڑا تو نہیں تھا مگر ہمارے گھر سے تو بہت اچھا تھا۔ آنٹی نے خلاف توقع پہلے میری خیریت پوچھی پھر سب گھر والوں کے بارے میں پوچھا پھر کہنے لگی تم بیٹھو میں تمہارے لیے ٹھنڈا لاتی ہوں۔

کیونکہ ان دنوں گرمیاں عروج پر تھیں۔ آنٹی اندر چلی گئیں جبکہ میں ان کے گھر کو دیکھنے لگا۔ گھر میں چار کمرے تھے ایک بیٹھک تھی سب کمروں کے آگے برآمدہ تھا۔ نیچے صحن میں ماربل کی اینٹیں لگی ہوئی تھیں سارا گھر سیمنٹ سے پختہ بنایا گیا تھا۔ میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ آنٹی نے گلاس میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ جب میں نے مشروب پی لیا تو آنٹی نے کہا کہ خیریت تو تھی جو یوں اچانک آ گئے۔''

میں نے کہا کہ نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں بس ویسے ہی آ گیا ہوں۔ اسکول سے تو چھٹیاں تھیں۔ اس لیے سوچا کیوں نہ آپ لوگوں سے مل آؤں۔''

آنٹی نے منہ سکیڑتے ہوئے کہا کہ ہاں کیوں نہیں یہ بھی تمہارے انکل کا گھر ہے۔'' پھر وہ انھیں اور کام وغیرہ کرنے لگیں۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ یہ جب ہمارے ہاں آئے تھے تو ہم نے کتنے پیار سے اپنے گھر رکھا جتنی ہو سکی حیثیت کے مطابق ان کی خدمت کی مگر جب میں دو دن رہنے آ گیا ہوں تو کیسے منہ بنا رہی ہیں مگر میں کون سا یہاں رہنے کے لیے آیا تھا۔ مجھے تو امبر سے ملنا تھا اس کو دیکھنا تھا۔ مگر نہ تو امبر نظر آ رہی تھی اور نہ ہی اس کی چھوٹی بہن۔ جب میں سے رہا نہ گیا تو میں نے آنٹی سے کہا کہ آنٹی یہ امبر اور آرزو نظر نہیں آ رہیں کہیں گئی ہوئی ہیں کیا۔'' تو آنٹی نے کہا کہ نہیں بیٹا وہ اسکول ہیں ابھی آتی ہوں گی۔ وہ کیا ہے کہ پیپر نزدیک آ گئے ہیں نا تو ان کی چھٹی لیٹ ہوتی ہے۔ امبر کے دسویں کے پیپر ہیں تو محنت بھی زیادہ کرنی پڑتی ہے اور چھوٹی اس کی بہن آرزو بھی اسی کے ساتھ آتی ہے۔''

ابھی ہم یہی بات کر رہے تھے کہ وہ دونوں اندر داخل ہوئیں جب میں نے امبر کو دیکھا تو مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ آرزو آ کر میرے پاس بیٹھ گئی پوچھنے لگی'' بھائی آپ کیسے ہو۔ انکل آنٹی کیسے ہیں میری دونوں کزنز کیسی ہیں۔'' میں نے اس کے سوالوں کے جواب دیتا رہا مگر میرا سارا دھیان امبر کی طرف تھا۔ وہ سیدھی کمرے میں چلی گئی تھی تھوڑی دیر بعد آئی مجھے سلام کیا پھر گھر والوں کے بارے میں پوچھا کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور پھر اٹھ کر اندر چلی گئی۔ میرا دل اس کے رویے پر چھلنی ہو گیا میں اتنی دور سے اس کو ملنے آیا تھا اور ایک وہ تھی جس کو میری ذرا بھی پروا نہیں تھی۔

صبح اسکول سے چھٹی تھی۔ انکل ہفتے میں دو تین بار گھر آتے تھے آنٹی بھی کسی دوست کے ہاں دعوت پر گئی ہوئی تھیں۔ گھر میں، میں اور وہ دونوں بہنیں رہ گئی تھیں تو میں امبر کے کمرے میں چلا آیا۔ وہ اس وقت موبائل پر کسی کو میسج کر رہی تھی۔ جب اس نے مجھے دیکھا تو جلدی سے موبائل چھپا لیا۔ میں نے پوچھا تو وہ ٹال مٹول سے کام لینے لگی۔ میں نے کہا۔

''امبر دیکھو میں اتنی دور صرف تمہارے لیے آیا ہوں لیکن تم ہو کہ مجھ سے بات تک نہیں کرتی ہو۔ آخر مسئلہ کیا ہے۔ اگر تم مجھ سے تنگ ہو تو بتا دو، میں یہاں

ہے ابھی چلا جاتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میری حالت دیکھ کر آرزو بول پڑی۔

''بھیا میں آپ کو بتاتی ہوں۔ کیونکہ مجھ سے آپ کی یہ حالت نہیں دیکھی جاتی۔''

''ہاں بولو گڑیا کیا بات ہے۔''

تو وہ کہنے لگی کہ بھائی یہ جو امبر ہے نا یہ آپ کو دھوکہ دے رہی ہے۔ یہ فیصل آباد والے انکل رضوان کے بیٹے سے پیار کرتی ہے اور اس سے فون پر بات بھی کرتی ہے اور میسج بھی کرتی ہے۔''

جب میں نے امبر کی طرف دیکھا تو اس نے نظریں جھکا لیں۔ میں نے اسے کہا کہ تم نے ایسا کیوں کیا میرے ساتھ۔ کیا تم وہ وعدے قسمیں بھول سکتی ہو مگر میں نہیں۔ تم نے تو کہا تھا کہ میں مرتے دم تک تمہارا ساتھ دوں گی مگر تم تو بے وفا نکلیں۔ کیا یہی تمہارا پیار تھا۔ کسی کی آنکھوں میں سہانے خواب دکھا کر پھر انہیں مٹانا چاہتی ہو۔ تمہیں پتا ہے امبر میں نے تو اپنی ہر سانس تمہارے نام کر دی تھی۔ تمہیں اپنے دل میں بسایا تھا۔ تم نے میری زندگی کے ساتھ ایسا مذاق...... بولو امبر پلیز کچھ تو بولو ورنہ میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ پلیز کچھ تو بولو کہہ دو کہ یہ سب جھوٹ ہے، مذاق ہے، میں تم سے ہی پیار کرتی ہوں۔ کہو نا کہتی کیوں نہیں ہو۔'' میں جذباتی ہو گیا تھا تھوڑی دیر بعد امبر کی چیختی ہوئی آواز آئی۔

''ہاں ٹھیک سنا تم نے۔ میں تم سے پیار نہیں کرتی بلکہ میں شاہد سے پیار کرتی ہوں۔'' شاہد انکل رضوان کے بیٹے کا نام تھا۔ ''میں تو صرف تم سے مذاق کر رہی تھی اور تم نے اسے پیار سمجھ لیا۔ میں نے تو تم سے پیار کیا ہی نہیں تھا۔ وہ تو بس ٹائم پاس تھا اور میں تم سے پیار کروں بھی کیوں۔ تم مجھے دے ہی کیا سکتے ہو۔ تمہارے پاس ہے ہی کیا۔ تم تو گھر میں دو وقت کی روٹی بھی بڑی مشکل سے پوری کرتے ہو۔ مجھے کیا دو گے، گھر میں ایک واٹر پمپ تو لگوا نہیں سکتے اور یہ صاحب چلے ہیں محبت کرنے۔'' وہ خاموش ہوئی تو میں نے کہا۔

''امبر کیا پیار دولت، جائیداد دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ تم نے ہی تو کہا تھا کہ پیار تو ایک انمول رشتہ ہے اگر یہ کسی کے دل میں سما جائے تو پھر امیری، غریبی کو نہیں دیکھتا۔ کیا تم وہ سب باتیں بھول چکی ہو۔ تو وہ کہنے لگی۔

''ہاں میں سب کچھ بھول چکی ہوں اور پلیز ہاتھ جوڑتی ہوں خدا کے لیے تم بھی وہ سب بھول جاؤ۔''

میں نے اسے تمام وعدے قسمیں یاد دلائیں مگر نہ اس نے ماننا تھا اور نہ وہ مانی۔ وہ اُٹھ کر باہر صحن میں چلی گئی میں کچھ دیر تو بیٹھ کر اس سفاک پر لہو کے آنسو روتا رہا۔ پھر اُٹھا اور واپسی کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ میں نے آرزو کو بتایا کہ میں گھر واپس جا رہا ہوں۔ آنٹی کو بتا دینا۔ آرزو نے بہت روکا مگر میں رکا نہیں رکتا بھی تو کس کے لیے...... اس بے وفا کے لیے جو محض دولت کی خاطر مجھے بھلا بیٹھی تھی اور پھر میں گھر واپس آ گیا۔

گھر والوں نے پوچھا کہ اتنی جلدی کیوں واپس آ گئے۔ تم تو ایک ہفتہ وہاں ٹھہرنے والے تھے تو میں نے کہا کہ میرا وہاں دل نہیں لگا تو اس لیے واپس آ گیا۔

☆☆☆

اسی طرح دن گزرتے گئے اور میری بہنوں نے بھی میٹرک کر لیا۔ وہ تو آگے بھی پڑھنا چاہتی تھیں مگر ابو نے کہا کہ ہم نے کون سا تم سے نوکری کروانی ہے اس لیے تم اب گھر رہو بس۔ میں فارم ہاؤس پر ہی رہتا تھا حاجی صاحب اور بی حاجن وہ بھی مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ میری ہر ضرورت پوری کرتے تھے۔ اُنھوں نے تو ابو سے بہت کہا کہ تم اپنی ساری فیملی یہیں لے آؤ یہ اتنا بڑا گھر ہے اس کو کیا کرنا ہے۔ ہمارا کیا ہے ہم تو میاں بیوی ایک کمرے میں بھی رہ سکتے ہیں لیکن ابو جی نے منع کر دیا۔ وہ جب بھی یہ بات کرتے ابو کسی نہ کسی طریقے سے ٹال دیتے تھے۔

انکل رضوان جو فیصل آباد میں رہتے تھے ان کے پانچ بچے تھے تین بیٹے اور دو بیٹیاں جبکہ انکل نعمان کی بھی دو بیٹیاں اور تین بیٹے تھے۔ جبکہ انکل فرحان کی

دو بیٹیاں تھیں بس اور وہ جوہر آباد میں رہتے تھے۔

ایک دن میرے والدین میرے دونوں انکل کے پاس گئے جو فیصل آباد میں رہتے تھے۔ جب شام کو سب اکٹھے ہوئے تو میری والدہ نے کہا کہ بھائی صاحب ہم اس لیے آئے ہیں کہ بچے بڑے ہو گئے ہیں ان کے بارے میں اب سوچنا چاہیے۔

تو انکل رضوان نے کہا۔

''بھابی جی جو بھی بات ہے وہ صاف، صاف کہو''

''امی نے کہا کہ بھائی میں چاہتی ہوں کہ ہم سب ایک ہو جائیں۔ میرا مطلب ہے کہ تم دونوں بھائی میں سے ایک میری دونوں بیٹیاں اپنی بہویں بنا لے اور اپنی ایک بیٹی مجھے دے دو۔ جبکہ دوسرا بھائی فرحان کی دونوں بیٹیاں اپنی بیٹیاں بنا لے۔ اس طرح ہم چاروں آپس میں مل جاتے ہیں۔''

انکل رضوان نے کہا کہ بھابی تم ناراض نہ ہونا کیوں کہ ہم پہلے ہی سے رشتے طے کیے بیٹھے ہیں اگر تھوڑی سی بھی گنجائش ہوتی تو ہم آپ کو بھی ساتھ ملا لیتے۔

میری والدہ نے انکل نعمان کو بھی کہا مگر انھوں نے بھی یہی جواب دیا۔ میرے والدین دل برداشتہ ہو کر گھر واپس آ گئے۔ کچھ دن بعد میرے والدین نے انکل فرحان کو بھی فون کیا مگر انھوں نے بھی یہی جواب دیا۔

پتا نہیں لوگ کیوں دولت کے پجاری ہو جاتے ہیں۔ سب کو معلوم ہے کہ اپنے ساتھ صرف چند گز کفن کا ٹکڑا ہی لے جانا ہے۔ اس سارے قصے کا میرے والد صاحب نے حاجی صاحب کو نہیں بتایا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب ابو نے حاجی صاحب سے کوئی بات چھپائی تھی۔

☆☆☆

کچھ دن بعد ہمارے گھر کچھ مہمان آئے جو ابو کے کزن لگتے تھے۔ وہ دو دن ہمارے گھر رہے اور پھر چلے گئے جب میں نے امی جان سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ وہ رشتے میں تمہارے انکل لگتے ہیں۔ وہ ساہیوال کے رہنے والے ہیں۔ وہ ہمارے

ہاں تمہاری بہنوں کا رشتہ مانگنے آئے تھے اور پھر ان کی ایک پیاری سی بیٹی بھی ہے۔ جو دسویں کلاس میں پڑھ رہی ہے۔ وہ تمہیں بھی اپنا بیٹا بنانا چاہتے ہیں۔

کچھ دن گزرے تو وہ پھر آئے جب رات کو سب اکٹھے تھے تو میں بھی گھر تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ انکل میں ہوں تو آپ سے عمر میں چھوٹا مگر ایک بات کہوں۔''

انھوں نے کہا کہ بیٹا جو تم کہنا چاہتے ہو کہو، تم بھی ہمارے بیٹوں جیسے ہو۔ یہ تمہارا حق بھی ہے۔''

میں نے کہا۔

''انکل جی اگر آپ ہم سے رشتہ کرنا چاہتے ہیں تو یہ ذہن میں رکھ لینا کہ ہم غریب لوگ ہیں۔ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے یہ آپ پہلے سوچ لینا۔ یہ نہ ہو کہ بعد میں آپ کہو کہ ہم آپ کی غربت کی وجہ سے آپ سے رشتہ توڑتے ہیں کیونکہ تمہارے پاس تو جائیداد، پراپرٹی، بینک بیلنس کچھ بھی نہیں ہے۔'' یہ سب کہتے ہوئے میں آبدیدہ ہو گیا تھا۔ یہ سب سن کر انکل نے اور ان کی بیوی نے جو رشتے میں میری چچی لگتی تھیں نے کہا کہ بیٹا ہم اس پر یقین نہیں رکھتے یہ امیری، غریبی سب اللہ پاک کی دین ہے اور ہمیں صرف عزت چاہیے ہمیں دولت کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اللہ پاک کا دیا ہوا سب کچھ ہے۔

ان کی اپنی 18 ایکڑ زمین تھی اور وہ نہایت ہی شریف اور مخلص لوگ تھے پھر حاجی صاحب کی رضا مندی سے یہ رشتے طے پا گئے۔ میری بہنوں کی شادی کرنی تھی جبکہ میری تقریباً ایک سال بعد ہونی تھی جب میری منگیتر (سہانا) دسویں کلاس کے پیپر دے دیتی۔ میری منگیتر کا نام سہانا تھا۔ مگر ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا کبھی نہ تھا۔

☆☆☆

میری بہنوں کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی کیونکہ میری بہنوں کی شادی کا سب خرچہ حاجی صاحب نے خود کیا تھا اور اُن کو اس طرح رخصت کیا تھا جیسے کوئی اپنی سگی بیٹیوں کو رخصت کرتا ہے۔ دو ٹرک سامان کے تھے اور انھوں نے میرے بہنوئیوں کو ایک کار بھی تحفے میں دی تھی۔ جس کا ہمیں اس وقت پتا چلا جب حاجی صاحب نے سب کے سامنے ان کو گلے سے لگایا اور سب کے سامنے گاڑی کی چابی ان کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا کہ یہ گاڑی میری طرف سے میرے بیٹوں کے لیے تحفہ ہے۔ سب ہی حیران تھے۔ میرے تینوں انکل اور ان کی مکمل فیملیاں آئی ہوئی تھیں۔ وہ بھی بار بار اس گاڑی کو اور سامان کو دیکھ رہے تھے جو حاجی صاحب نے دیا تھا۔ مگر نام ہمارا تھا۔

اس شادی میں میری منگیتر بھی بارات کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ جب میں نے اُسے دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ اتنی خوب صورت لڑکی ہماری پوری برادری میں نہیں تھی۔ وہ بھی مجھ سے بڑی گرمجوشی سے ملی۔ جب اسے پتا چلا کہ میری کزن نے مجھے ٹھکرا دیا تھا تو اس نے جان بوجھ کر مجھے بازو سے پکڑا اور جہاں میری سب کزنز بیٹھی ہوئی تھیں اور اس کی سہیلیاں بھی تھیں وہاں لے گئی اور اپنی سہیلیوں سے میرا تعارف کروانے لگی کہ یہ میرے ہونے والے شوہر ہیں۔ میری سب کزنز عجیب نظروں سے میری منگیتر کو دیکھنے لگیں اور اندر ہی اندر جل بھن بھی رہی تھیں۔ مگر پیار خوب صورتی دیکھ کر نہیں کیا جاتا بلکہ یہ تو خود بخود ہو جاتا ہے۔ اگرچہ میری کزن نے مجھے ٹھکرا دیا تھا مگر پھر بھی اس کی یاد میرے دل میں روز اول کی طرح تازہ تھی وہ چاہے مجھے پیار نہ کرتی ہو مگر میں آج بھی اسے دل و جان سے چاہتا تھا لیکن اسے اپنانے کے بارے میں میری سوچ مختلف تھی۔ میں نے پھر بھی اپنی کزن کی بہت منتیں کیں مگر وہ پھر بھی نہ بدلی۔ اس کی روش برقرار تھی اس لیے اب میں نے بھی اسے کچھ نہ کہنے کا فیصلہ کر لیا۔

جب میری بہنوں کو وہ دوبارہ لینے آئے تو ان کے ساتھ میری منگیتر سہانا بھی تھی۔ وہ مجھے کہنے لگی۔

''واجد میری بات غور سے سنو، جو لوگ محبت کو دولت کے ترازو میں تولتے ہیں، ان کے پیچھے بھاگنا فضول ہے۔ شاید آپ کو میری بات سمجھ آ گئی ہو گی۔ اس لیے تم بھی اس کے پیچھے بھاگنا بند کر دو۔ پلیز یہ نہ

سمجھنا کہ میں حسد کر رہی ہوں۔ اگر وہ تم سے وفا کرتی تو قسم سے مجھے بھی خوشی ہوتی لیکن وہ تمہاری خواہش مند نہیں۔ وہ تو دولت کی پجاری ہے اور پلیز میں نے تو آپ کو کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ جب گھر والوں نے مجھ سے بات کی تو میں نے خوشی سے ہاں کر دی اور آپ کو انجانے میں دل میں بسا لیا۔

اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ۔ یقین مانو اگر آج بھی آپ کے پاس دولت آ جائے تو وہ پھر سے آپ کو چاہنے لگ جائے گی۔ اللہ پاک آپ کو جلد کامیابی عطا فرمائے اور پھر جب آپ کے پاس دولت آ جائے تو اس کو ضرور آزمانا۔ دیکھنا وہ کیسا آپ کی طرف کھینچی چلی آئے گی۔"

پھر وہ لوگ چلے گئے اور میں سہانا کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ جب میری بہنوں کی شادی ہو گئی تو حاجی صاحب زبردستی ہم سب کو اپنے پاس لے گئے۔ ہم سب بھی حاجی صاحب کی بہت خدمت کرتے تھے اور وہ بھی ہمیں اپنے بچوں جیسا پیار کرتے تھے۔

ایک دن ہم سب اکٹھے بیٹھ کر چائے پی رہے تھے کہ ایک ٹیلی فون آیا۔ بی حاجن نے فون اٹھایا ایک منٹ ہی بات کی ہوگی کہ وہ لڑکھڑا کر گریں اور بے ہوش ہو گئیں۔

ہم سب بھاگ کر گئے' انھیں اٹھایا اور بیڈ پر لٹایا۔ ابو نے جلدی سے ڈاکٹر کو فون کیا پھر ہم سب دادی جان کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔ ادھر دادا جان نے جب سنا تو فون سے آواز آ رہی تھی دادا جان نے فون اٹھا کر کان سے لگایا تو کسی لڑکی کی آواز تھی جو کہہ رہی تھی۔

"پلیز اپنے آپ کو سنبھالیں یہ تو اللہ تعالیٰ کی مرضی تھی ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

دادا جان نے سنبھل کر کہا کہ پلیز جو بھی بات ہے وہ صاف، صاف بتائیں تو لڑکی نے کہا کہ میں دبئی سے بات کر رہی ہوں میں آپ کے بیٹوں کی سیکریٹری ہوں۔ آج صبح صبح پکنک منانے کے لیے ساری فیملی جا رہی تھی کہ راستے میں دھند کی وجہ سے دونوں گاڑیاں بہت گہری کھائی میں جا گریں جس کی وجہ سے گاڑیاں تو مکمل تباہ ہو گئیں مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ ان میں موجود تمام افراد بھی اس دنیا میں نہیں رہے۔ پلیز اگر آپ آ جائیں میں آپ کو ائیر پورٹ سے لے لوں گی۔"

تو دادا جان نے کہا کہ ٹھیک ہے میں جلد آنے کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ لوگ میرا انتظار ضرور کریں کیا لائن کٹ گئی۔ اتنی دیر میں ڈاکٹر بھی پہنچ گیا انھوں نے دادی جان کو چیک کرنے کے بعد کہا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں یہ کسی گہرے صدمے سے بے ہوش ہوئی ہیں۔ میں نے انجکشن لگا دیا ہے ان کو جتنا ہو سکے سونے دیا جائے۔ میں شام کو پھر چیک کرنے آؤں گا۔"

وہ دادا جان کا فیملی ڈاکٹر تھا جب انھوں نے پوچھا کہ یہ کس ٹینشن کی وجہ سے بے ہوش ہوئی ہیں تو دادا جان نے پوری بات بتا دی۔

☆☆☆

دادا جان جب دبئی پہنچے تو وہ لڑکی جس نے فون پر اطلاع دی تھی موجود تھی۔ وہ لڑکی دادا جان کو لے کر سیدھا ان کے بیٹوں کے گھر پہنچی دادا جان نے اپنے مرنے والے خاندان کا منہ دیکھا اور بس...... کچھ ہی دیر بعد تدفین کا مرحلہ طے ہوا۔ کیونکہ نعشیں بہت بری حالت میں تھیں بس یہ یقین کافی تھا کہ یہ ان کے اپنے ہیں۔ ان کا آخری دیدار کر لیا گیا تھا۔

دادا جان بیٹوں کی تمام پراپرٹی فروخت کرکے پاکستان چلے آئے اور وہ تمام رقم فلاحی اداروں کو عطیہ کر دی۔

☆☆☆

دادا جان ایک ہی ہفتہ میں بہت کمزور ہو گئے تھے مگر ہم سب نے دادا جان اور دادی جان کو سنبھال لیا تھا۔ انھیں کبھی بھی یہ احساس نہ ہونے دیا کہ وہ اکیلے ہیں۔ دادا جان نے بھی خود کو کسی حد تک سنبھال لیا تھا مگر دادی جان اکثر روتی رہتی تھیں۔ ماں تو ماں ہوتی ہے۔ ابو نے اُن سے کہا کہ امی جان کیا ہم آپ کے کچھ نہیں لگتے ہیں۔ ہم سب آپ کے پاس ہیں آپ کے پوتے بھی ہیں پوتیاں بھی ہیں آپ کو اور کیا

چاہیے۔''

دادا جان نے بھی انھیں سمجھایا کہ تم کس کے لیے روتی ہو جن کو ہم نے کتنی حسرتوں سے پال پوس کے اُن کی شادی کی ہمیشہ ان کی خوشی کو ترجیح دی اُن کی ہر خواہش پوری کی۔

مگر جب اُن کا وقت آیا کہ وہ ہماری خدمت کریں تو وہ بیویوں کے کہنے پر ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر پردیس میں جا بسے۔ اور ایک یہ ہیں جن کا ہمارے ساتھ خونی رشتہ بھی نہیں ہے۔ مگر پھر بھی انھوں نے ہماری خدمت میں دن رات ایک کر دی۔ ہماری ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ جب تک ہم سو نہ جائیں یہ جاگتے رہتے ہیں۔

ہم پر تھوڑا سا مشکل وقت آیا تو میری پوتیاں ایک ہفتے سے اپنا گھر بار چھوڑ کر ہماری خدمت میں لگی ہوئی ہیں۔ اب تم یہ رونا بند کر دو جو چلے گئے ہیں ان کو بھول جاؤ کیونکہ ایک دن سب نے جانا ہے اور جو ہمارے پاس ہیں ان کو دیکھو، ان کو اپنا سمجھو یہ قسمت کے فیصلے ہیں ان کو نا تو کوئی آج تک بدل سکا ہے اور نہ بدل سکے گا۔''

دادا جی کے سمجھانے کا کچھ اثر دادی جان پر ہوا اور نارمل زندگی کی طرف لوٹنے لگیں۔ میری منگیتر بھی آئی ہوئی تھی۔ مگر ٹینشن کی وجہ سے اُس سے زیادہ بات نہ ہو سکی تھوڑی بہت گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ کسی کام وغیرہ کی حد تک۔

پھر تقریباً ایک مہینہ رہنے کے بعد میری بہنیں اور میری منگیتر سہانا واپس چلی گئیں۔

دادا جان نے اپنے کاروبار کا سارا انتظام ابو کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ اب وہ صرف گھر میں رہتے تھے کبھی کبھار وہ کسی ضروری کام کی وجہ سے نکلتے تھے۔ ابو جان بھی دل سے تمام امور انجام دیتے اب یتیم خانے بھی اشیاء وغیرہ دینے کے لیے ابو ہی جاتے تھے۔

☆☆☆

تقریباً چھ مہینے بعد دادا جان نے اپنے فارم ہاؤس پر ایک پارٹی رکھی۔ جس میں ہمارے فیملی کے تمام افراد بشمول انکل، پھوپیاں اور وسیب کے چھوٹے موٹے زمین دار اور کچھ معزز آدمی شریک تھے۔ پہلے تو سمجھ نہ آیا کہ دادا جان نے یہ تقریب کیوں ترتیب دی۔ لیکن جلد ہی سب کو پتا چل گیا۔

دادا جان نے سب کے سامنے اعلان کیا کہ منظور حسین آج سے میرا بیٹا ہے اور میں اپنی خوشی اپنی تمام جائیداد اور بینک بیلنس اپنے بیٹے منظور حسین کے نام کرتا ہوں۔

آج سے یہی اس زمین جائیداد اور میرے تمام بینک بیلنس کا مالک ہے۔ یہ جس طریقے سے چاہے اس کو خرچ کرے، میں نے آپ سب کو اس لیے اکٹھا کر کے آپ کے سامنے یہ فیصلہ سنایا ہے کہ پتا نہیں میری سانسیں کب تک ہیں، اور بعد میں میرے بیٹے کو کوئی تنگ نہ کرے۔''

جب دادا جی خاموش ہوئے تو پھر دادی جان نے کہا کہ یہ صرف حاجی صاحب کا ہی نہیں بلکہ ہم دونوں کا فیصلہ ہے۔ ہمارے گزر جانے کے بعد ہمارے بیٹے اور پوتے کو بھی کچھ نہ کہا جائے کیونکہ ہم نے اپنی مرضی سے سب وسیب کے سامنے اپنی ساری جمع پونجی اپنے بیٹے منظور حسین کے نام کر دی ہے۔ قانونی کارروائی کے لیے ہم نے وکیل صاحب کو بھی بلایا ہے۔

آپ سب کا شکریہ کہ آپ نے اپنے قیمتی وقت سے کچھ وقت ہمارے لیے بھی نکالا۔ اب تھوڑی دیر میں کھانا لگ جائے گا۔ ہماری آپ سب لوگوں سے گزارش ہے کہ پلیز کھانا کھا کر جائیے گا۔''

اور وکیل صاحب کے آنے کے بعد دادا جان اور دادی جان اسے اندر لے گئے۔ کچھ ضروری کارروائی کر لی گئی۔ اور پھر کچھ ضروری کارروائی کے لیے عدالت میں بلایا گیا۔ پھر دادا جان نے عدالت میں بھی وہی بیان دیا جو تقریب میں دے چکے تھے اس کے بعد کاغذات وغیرہ بنانے میں کچھ دن لگے اور پھر دادا جان کی دو مربع زمین، بینک بیلنس اور فارم ہاؤس ابو کے نام ہو گئے۔

جب ہمارے خونی رشتوں نے دیکھا کہ منظور حسین تو کروڑ پتی بن گیا ہے تو آہستہ آہستہ ہمارے

قریب ہونے لگے۔ پہلے تو وہ ہمیں پوچھتے بھی نہیں تھے۔ مگر اب وہ ہر مہینے بعد کسی نہ کسی بہانے آجاتے۔ کوئی مشورہ بھی کرنا ہوتا تو ابو سے لازمی صلاح لیتے۔ ابو سب سمجھتے تھے مگر وہ تو اپنے بھائیوں کی محبت کو ترسنے ہوئے تھے اس لیے وہ بھی درگزر کر جاتے تھے۔

دادا جان نے جب مجھے اسمارٹ فون بھی لے کر دیا تو میں نے پہلی کال اپنی بہنوں کو کی، اس کے بعد سہانا سے بات کی پھر میں نے امبر کے ہاں کال ملائی آنٹی کے نمبر پر امبر نے کال پک کی۔ بڑی اچھی طرح حال وغیرہ پوچھا۔ جب میں بند کرنے لگا تو کہنے لگی کہ یہ نمبر تمہارا اپنا ہے۔ تو میں نے کہا کہ ہاں یہ میرا نمبر ہے۔ پھر میں نے فون بند کر دیا۔

دادا، دادی اپنے حقیقی بیٹوں کا غم بھول گئی تھے۔ دادا جان کی اور میری خوب بنتی تھی ہم ہفتے میں دو تین بار ضرور کہیں باہر گھومنے جاتے تھے۔ ہماری محبت دیکھ کر دادی جان بھی بہت خوش ہوتی تھیں۔ ایک بار میرے فون پر انجان نمبر سے کال آئی میں نے اٹینڈ کی تو پہلے تو خاموشی رہی مگر پھر جب میں بند کرنے لگا تو امبر کی آواز آئی۔

''اچھا ہم اب اتنے فضول ہو گئے ہیں کہ تم ہماری کال بھی سننا گوارہ نہیں کرتے۔'' میں نے کہا نہیں سوری امبر میں نے پہچانا نہیں تھا۔ پھر میں نے کہا کہ سناؤ امبر کیسے دن گزر رہے ہیں۔''

تو وہ کہنے لگی کہ تمہارے بغیر کیسے گزرنے ہیں۔

''دیکھو امبر یہ راستہ تم نے خود چنا تھا۔ اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نے تو تمہاری بہت منتیں کی تھیں مگر تم پر تو دولت کی دھن سوار تھی۔ تمہیں تو پیار نہیں گاڑی، کوٹھی چاہیے تھی۔ اب تو تمہاری مرضی سے تمہارا رشتہ ہو گیا ہے۔ اگر ابھی نہیں ہوا تو دو چار دن میں ہو جائے گا۔ پھر تو تم خوش ہو جاؤ گی نا۔'' پھر امبر کہنے لگی۔

''نہیں واجد میں تو صرف تم سے پیار کرتی ہوں۔ میں تو صرف تم سے مذاق کر رہی تھی کہ تم مجھ سے کتنا پیار کرتے ہو میں تو آزما رہی تھی تم کو اور تم اس کو بے وفائی سمجھ بیٹھے۔ میں تو آج بھی صرف تم سے پیار کرتی ہوں۔ پلیز واجد میری محبت کو قبول کر لو تم جیسا کہو گے میں ویسا کروں گی۔''

''اچھا تو یہ تمہارا مذاق تھا۔ مجھے گھر سے بے عزت کر کے نکلنے پر مجبور کر دیا یہ تمہارا مذاق تھا۔ میرے پیار کو دولت کے ترازو میں تولا یہ تمہارا مذاق تھا۔ ہماری غریبی کو دیکھ کر ہم سے ناتا توڑ لیا۔ یہ تمہارا مذاق تھا۔ میں نے تو تمہیں دل و جان سے چاہا تھا۔ پیار کیا تھا۔ مگر تم نے مجھے سرعام رسوا کیا......

یہ تمہارا مذاق تھا۔ میرے والدین باری باری سب بھائیوں کے دروازوں پر سوالی بن کر گئے مگر تم نے کیا کیا۔ اُن کو رسوا کر کے گھروں سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ یہ تمہارا مذاق تھا اور میں پاگلوں کی طرح پانچ سال تمہارا انتظار کرتا رہا، پر تم نے ایک بار بھی مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ بھی تمہارا مذاق تھا۔ امبر بیگم یہ تم بھول سکتی ہو مگر میں بھی نہیں بھول سکتا۔ جب تم سب نے ہمیں دھتکار دیا تھا تو سہانا کے والدین نے ہمیں گلے سے لگایا یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم بہت غریب ہیں۔

ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تو پھر آج ہم کیسے انھیں چھوڑ سکتے ہیں۔ امبر میں بھی تمہیں بہت پیار کرتا ہوں مگر کاش کہ تم مجھے اس وقت یاد کرتیں جب ہم غریب تھے۔ ہمارے پاس کچھ نہیں تھا مگر افسوس کہ تمہیں دولت چاہیے تھی پلیز اب یہ ممکن نہیں جو تم کہہ رہی ہو۔ اور ہاں...... پلیز آج کے بعد مجھے کبھی کال نہ کرنا۔ تمہاری بہت مہربانی ہوگی۔''

مجھے سہانا کی وہ بات یاد آگئی جو اس نے کہی تھی کہ واجد دیکھ لینا جب بھی اللہ پاک تم کو دولت دے گا تو یہ سب تمہارے رشتے دار جو آج تم سے دور بھاگ رہے ہیں۔ تمہارے سب سے قریب ہونے کی کوشش کریں گے۔

آج سہانا کی وہ بات سچ ہو گئی تھی۔ اب میری منزل سہانا ہے۔ بہت جلد ہم ایک ہوں گے۔ ہماری خوشیوں کے لیے آپ دعا کریں گے نا......

☆☆......☆☆

تیسری سچ بیانی

کون سنے فریاد

نجمہ ناز اصغر

اُس غریب کا قصہ دل دوز، جسے زندگی نے کبھی سکھ کا سانس لینے نہ دیا تھا

''امی پلیز جلدی کریں دیر ہو رہی ہے۔'' ابھی نے کرسی پر بیٹھ کر میز کو چمچے سے بجاتے ہوئے کہا۔ یہ اُس کی عادت تھی، جب دیر ہوتی تو اسی طرح احتجاج کرتا تھا۔ سلائس پر مکھن لگا کر، میں نے چائے کا کپ آگے رکھا۔

''ارے آج پھر......'' اُس نے سلائس دیکھ کر منہ بنایا۔

''آج ماسی نہیں آئی؟''

''ہاں بیٹا آج پورا ایک ہفتہ ہو گیا ہے۔ نہ جانے کیا بات ہے۔ آج تم آفس سے واپسی پر پتا کرنا۔''

''امی آپ نے سجاد صاحب کے گھر معلوم کیا؟''

''ارے بیٹا انہیں تو کوئٹہ گئے دو ہفتے ہو گئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے امی آج آفس سے واپسی پر کوشش کروں گا کہ اُدھر ہوتا آؤں۔'' اُس نے کپ رکھتے ہوئے کہا۔

''ارے ایک سلائس تو اور کھالو۔''

''بس امی جی نہیں چاہ رہا ہے۔ آپ جلدی سے دم کر دیں۔'' اُس کی عادت تھی گھر سے نکلنے سے پہلے ماں سے دم ضرور کرواتا۔ اُس نے میز پر سے کی چین اٹھائی بائیک اسٹارٹ کی اور یہ جا وہ جا۔

☆......☆......☆

ماسی نوری میرے گھر کام ضرور کرتی تھی مگر وہ میرے گھر کے فرد کی طرح تھی۔ صبح سات بجے آ کر ناشتا بناتی، جھاڑو پونچھا کرتی، دونوں ٹائم کا سالن بناتی روٹیاں بنا کر ہاٹ پاٹ میں رکھتی۔ کپڑے دھوتی، 2 بجے کام سے فارغ ہو کر سجاد صاحب کے گھر چلی جاتی۔ بس دو ہی گھروں میں کام کرتی تھی۔ اُس کی محنت سے اُسے اچھی خاصی تنخواہ مل جاتی تھی۔ ماسی نوری بہت ایماندار صاف ستھری اور اپنے کام سے کام رکھنے والی عورت تھی۔ میرے شوہر تین سال سے دبئی میں بزنس کے سلسلے میں مقیم تھے۔ گھر میں ہم ماں بیٹے کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ میں ہارٹ پیشنٹ ہوں اور ایسے میں ماسی نوری میرے لیے رحمت خداوندی ہے۔ اسے میرے پاس کام کرتے ہوئے دو سال ہو گئے اور اِن دو سالوں میں اس نے بتائے بغیر اور وہ بھی اتنے دنوں کی چھٹی کبھی نہ کی تھی۔ اب وہ ایک ہفتے سے نہیں آ رہی تھی تو یہ فکر کی بات تھی۔

☆......☆......☆

میرا بیٹا حسیب جسے میں پیار سے ابی کہتی ہوں

اُس نے جرنلزم میں ماسٹرز کیا ہے۔ ٹی وی جاب ہے بہت مصروف رہتا ہے مگر مجھے دن میں دو بار فون ضرور کرتا ہے مگر آج چار بج گئے ہیں اُس کا ایک مرتبہ بھی فون نہیں آیا میں فون کر رہی ہوں تو موبائل بند ہے میں پریشان ہوں۔ باہر کے حالات تو ویسے ہی خراب رہتے ہیں اور میڈیا سے منسلک رہنے والوں کی زندگی تو یوں بھی خطرات میں گھری رہتی ہے۔ میں خیر کی دعا میں کر رہی ہوں۔

☆......☆......☆

''یار کاشف کام تو تقریباً سب مکمل ہو گیا ہے باقی جو ہے وہ تم سنبھال لو میں اب چلتا ہوں۔'' ہنی نے اپنی ٹیبل کی دراز بند کرتے ہوئے کہا۔

''کہاں چلے ابھی تو 3 ہی بجے ہیں خیریت ہے۔ کہاں کے ارادے ہیں؟'' کاشف نے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یار وہ کام والی ماسی ایک ہفتے سے نہیں آ رہی ہے اور تجھے پتا ہے امی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی گھر میں کام کا مسئلہ ہے تو معلوم کرنا ہے کہ وہ کیوں نہیں آ رہی ہے۔'' اس نے تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے پھر تم جاؤ میں دیکھ لوں گا۔''

☆......☆......☆

ایک طرف امیروں کے بنگلے، بیچ میں سڑک اور سڑک کے دوسری طرف غریبوں کی بستی اور اس بستی میں ماسی نوری کی چٹائیوں سے بنی جھونپڑی ہوا کرتی تھی کبھی۔ مگر اب یہاں کچھ کچے اور کچھ پکے مکان بن گئے تھے۔ اُسے ماسی کا گھر ڈھونڈنے میں دشواری ہو رہی تھی وہ گلی میں کھیلنے والے بچوں سے پوچھنے لگا کہ ماسی نوری کا گھر کون سا ہے۔ بچے اُسے غور سے دیکھنے لگے۔ ایک بچہ جو تھوڑا بڑا تھا کہنے لگا۔

''اچھا وہ نوری جس کے بیٹے احمد کو گولی مار کے مار ڈالا اور ماسی نوری تو گاڑی کے نیچے آ کر مر گئی۔'' بچے نے تفصیل سے بتایا۔

''ارے تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

اتنے میں ایک عورت جو تھوڑی دور کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی اُٹھ کر آئی اور کہنے لگی۔

''اے بیٹا کس کو پوچھ رہے ہو؟''



''ماسی نوری ہمارے گھر کام کرتی ہے۔ ایک ہفتے سے نہیں آ رہی ہے تو معلوم کرنے آیا ہوں۔'' وہ عورت افسردگی سے بولی۔

''اے بیٹا! نوری تو اب اس دنیا میں نہیں رہی ایک ہفتے پہلے اُس کے بیٹے کو بھتہ خور دہشت گردوں نے فائرنگ کر کے مار ڈالا یہ سن کر نوری جو بھاگی تو سامنے سے آتی ہوئی ویگن نے اسے کچل ڈالا۔''

اچانک ایسی اندوہناک خبر سن کر میں گنگ رہ گیا۔

''ماسی نوری کا گھر کہاں ہے۔'' میں نے افسردگی سے پوچھا۔

''آؤ بیٹا میں تمہیں لے چلتی ہوں۔'' وہ عورت آگے آگے اور میں اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

ایک گلی چھوڑ کر نوری کا گھر تھا گھر کے دروازے کے آگے ایک شخص پلنگ پر چادر اوڑھے لیٹا تھا۔

''یہ نوری کا میاں مشتاق ہے۔'' اُس عورت نے سوئے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کیا۔ آوازیں سن کر سوتا ہوا شخص منہ پر سے چادر ہٹا کر ہمیں دیکھنے لگا۔ وہ عورت بولی۔

''یہ نوری کا معلوم کرنے آئے ہیں۔ وہ ان کے گھر کام کرتی تھی۔'' مشتاق افسردگی سے بولا۔

''ہمیں تو زندگی بھر کبھی کسی نے نہیں پوچھا اب تو کچھ بھی نہیں بچا آپ اب کیا کرو گے پوچھ کر۔ آپ چلے جاؤ یہاں سے۔'' وہ اٹھا اور پائنتی رکھی بیساکھی کے سہارے اُٹھ کر گھر کے اندر چلا گیا۔ وہ ایک ٹانگ سے معذور تھا۔ وہ عورت بھی اُس کے پیچھے اندر چلی گئی۔

''مجھے تمہارے دکھوں کا اندازہ ہے مشتاق، مگر گھر آنے والے کے ساتھ ایسا نہیں کرو۔ اس میں اُس کا کیا قصور۔'' وہ عورت بولی اور مشتاق تو جیسے پھٹ پڑا۔

''ہمارا کیا قصور تھا خورشید آپا..... کب تلک ان دکھوں سے لڑیں اور کس کس کے جنازے اٹھائیں۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ وہ عورت جس کا نام خورشید تھا میرے پاس آ کر کہنے لگی۔

''بیٹا برا نہ ماننا بیوی اور جوان بیٹے کی موت نے صدمے سے نڈھال کر دیا ہے ورنہ مشتاق بڑی عزت اور محبت کرنے والا انسان ہے۔'' اور میں دل پر بوجھ لیے وہاں سے چل پڑا۔

☆......☆......☆

''کیا بات ہے بیٹا؟ میں نے تمہاری پسند کی کڑاہی بنائی مگر تم نے تو ایک روٹی بھی پوری نہیں کھائی۔'' اُسے سوچ میں گم دیکھ کر ماں نے تشویش سے پوچھا۔

''امی وہ...... ماسی نوری اور اُس کا بیٹا ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے ہیں۔ اُس نے اٹکتے اٹکتے بتایا۔

''کیا کہہ رہے ہو۔'' میں اس بات کے لیے ذہنی طور سے تیار نہیں تھی۔

''امی خود کو سنبھالیں اور دعا کریں خدا انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آپ پلیز اپنی دوا کھا لیں اور آرام کریں۔''

☆......☆......☆

میرے دل پر بوجھ سا آپڑا تھا۔ معذور مشتاق سے اُس کی کہانی جاننے کے لیے میرا دل مجھے اُس کچی بستی میں دوبارہ لے گیا۔ میں پھر سے مشتاق کے سامنے تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بولا۔ ''بیٹا تم وہی ہو نا جو ایک ہفتے پہلے آئے تھے۔''

''جی یہ کچھ رقم میری والدہ نے بھجوائی ہے کہ آپ کو دے دوں۔'' میں نے لفافہ آگے بڑھایا۔

''ٹھہرو بیٹا اُسے بلاتی ہوں۔ اپنے ہاتھ سے دینا۔'' آپا خورشید اندر چلی گئیں میں آس پاس کا جائزہ لینے لگا۔ واپسی میں چاچا مشتاق اُس کے ساتھ تھا۔ میرے سلام کے جواب میں بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ اور پچھلے رویے کی معافی مانگی میں نے کہا۔

''کوئی بات نہیں اگر آپ کا کوئی کام ہو اور میں کر سکتا ہوں تو ضرور کروں گا میرا تعلق میڈیا سے ہے۔''

''بیٹا تمہارا بہت شکریہ مجھے کسی سے کچھ لینا نہیں ہے بس ارباب اقتدار سے اور اپنے ہم وطنوں سے

کچھ کہنا چاہوں گا کہ پوچھنے کی میری اوقات نہیں ہے
میں نے آج تک یہ باتیں کسی کو نہیں بتائیں آج میں
تمہیں اپنی کہانی ضرور سناؤں گا۔" چاچا مشتاق مجھے
لے کر صحن میں بچھے پلنگ پر بیٹھ گئے۔

"ہم بھرت پور کے رہنے والے ہیں۔ زندگی
مزے میں گزر رہی تھی۔ میرے والد کی کپڑے کی
دکان تھی۔ خدا کا دیا سب کچھ تھا ہمارے ساتھ دادی،
دو چچا ایک پھوپی میرا چھوٹا بھائی اور مجھ سے بڑی بہن
ابا جی اور اماں یہ ہمارا گھرانہ تھا۔ چچا ابا جی کے ساتھ
دکان سنبھالتے تھے۔ ہمارے گھر میں اصلی دودھ اور
مکھن کے لیے گھر میں گائے پالی تھی جو ہمارے صحن
میں بندھی رہتی تھی۔ ہمارا صحن بہت بڑا تھا ایک طرف
بڑے سے دڑبے میں دادی نے مرغیاں پالی تھیں۔
گھر میں خوش حالی ہی خوش حالی تھی۔ میں آٹھویں
کلاس میں پڑھتا تھا تحریک پاکستان زوروں پر
تھی۔ ہم سب بڑے پُرجوش تھے قائداعظم کی آمد پر
ہم سب لڑکے اپنے کلاس ٹیچر کے ساتھ اسٹیشن جاتے
اُن کے استقبال کے لیے اپنے محبوب قائد کی ایک
جھلک دیکھنے والوں کا جم غفیر ہوتا اور "لے کے رہیں
گے پاکستان" کے فلک شگاف نعروں سے اسٹیشن گونج
اٹھتا۔

مجھے یاد ہے جب میں نے پہلی مرتبہ قائداعظم کو
دیکھا تو حیران رہ گیا تھا۔ اتنے دبلے پتلے اور اتنی
ہمت والے اتنے بہادر، ہم مسلمانوں کے لیے ایک
الگ ملک بنا رہے تھے۔ بڑا خوبصورت اور بڑی
خوبیوں والا تھا ہمارا لیڈر......" چاچا مشتاق پرانی
یادوں میں کھو گیا۔

"پھر کیا ہوا چاچا۔" ہمنی نے انہیں یاد دلایا کہ وہ
کچھ بتا رہے تھے۔

"ہاں ہاں بیٹا بتاتا ہوں۔ دور دور سے خبریں
آتی تھیں کہ آج ہندوؤں نے مسلمانوں کے فلاں
محلے میں آگ لگا دی، فلاں علاقے کی دکانیں لوٹ
لیں لیکن ابھی ہمارا علاقہ بچا ہوا تھا پھر بھی رات کو تمام
مرد مل کر پہرہ دیتے تھے ہر طرف خوف و ہراس کا عالم
تھا مسلمانوں کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھے، سوائے
سبزی بنانے والی یا پھر عید قرباں میں کام آنے والی
چھریوں کے جس پر سال کے سال دھار لگوائی جاتی
تھی جس دن پاکستان بنا ہم نے اپنے پیاروں کے لہو
سے آزادی کے چراغ جلائے رات کا سناٹا فضاؤں
میں پھیلی ایک عجیب سی بے چینی اور جیسا کہ میں نے
تمہیں بتایا کہ ہمارے لوگوں کے پاس سوائے
چھریوں اور ڈنڈوں کے کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر اچانک
ہندوؤں اور سکھوں نے مل کر ہمارے علاقے پر حملہ
کر دیا۔ کچھ لوگوں نے ڈنڈوں سے مقابلہ کیا لیکن وہ
تعداد میں زیادہ تھے ان کے پاس اسلحہ بھی تھا جب
آگے والے مارے گئے تو لوگوں نے مجبوراً خود کو گھر
میں مقید کر لیا کیونکہ مقابلے کے لیے نہ اسلحہ تھا نہ
ہتھیار......

جب ہندو غنڈے اور سکھ بلوائیوں نے گھروں
میں آگ لگا دی۔ بلوائی انسانیت کا قتل کر کے چلے
گئے تو بچے کچھے لوگ جو خود زخموں سے چور تھے، اپنے
زندہ بچ جانے والوں کی مدد کے لیے آ گئے۔ ایک
قیامت کا سماں تھا۔ ہر طرف لاشیں، جلتے ہوئے
گھروں سے اٹھتے ہوئے شعلے کچھ لوگ ہمارے صحن
کے دروازے سے جو جل کر گر چکا تھا اندر داخل
ہوئے میں نے دیکھا۔ وہ ہمارے ہی محلے کے لوگ
تھے جو بری طرح زخمی تھے مگر پھر بھی زخمیوں کو اٹھا رہے
تھے۔ میں معجزانہ طور سے بچ گیا تھا۔ ہمارے گھر میں
میلے کپڑے رکھنے کا ایک بڑا ڈرم تھا میں اُس کے پیچھے
چھپ گیا تھا۔ سب اپنے پیاروں کو ڈھونڈ رہے تھے
میں بھی ہمت کر کے باہر نکلا، صحن کے ایک کونے میں
ابا جی اور میرے دو کڑیل جوان چچا اکبر اور قیصر کی
خون میں لت پت لاشیں پڑی تھیں۔ سکھوں کی چمکتی
کرپانیں میری نظروں میں لہرا گئیں۔ میں تیزی سے
کمرے کی طرف بھاگا سامنے دل دہلا دینے والا منظر
تھا۔ میری بوڑھی دادی کے بے سر کی لاش میرے
سامنے پڑی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے آخری مرتبہ
اپنی ماں کو دیکھا تھا جو میری پھوپی اور میری بہن کا
ہاتھ پکڑ کر اسٹور کی طرف بھاگی تھیں۔ میں بھاگ کر
گیا مگر اسٹور کے پاس جا کر جیسے میری بصارت اور

شاعت دونوں جل گئی تھیں۔ اسٹور میں رکھی لکڑیاں جو ہم بارش سے بچانے کے لیے رکھتے تھے جل کر ختم ہوگئی تھیں۔ بس زمین پر ایک سوختہ لاش پڑی تھی۔ ہندو بلوائی میری بہن اور پھوپی کو اغواء کر کے لے گئے تھے اور وہ جلی ہوئی لاش یقیناً میری پیاری ماں کی تھی۔ ہندو جو گائے کا بڑا احترام کرتے ہیں گئو ماتا کہتے ہیں۔ وہ گئو ماتا بھی صحن کے ایک کونے میں جلی پڑی تھی مرغیوں کے ڈربے میں بھی آگ لگا دی تھی۔

اپنے خاندان میں صرف میں بچا تھا اپنے پیاروں کو رونے کے لیے۔ رات کا سناٹا ہر طرف زخمیوں کے کراہنے کی آوازیں اور اپنے پیاروں کی لاشوں کو دیکھ کر رونے والوں کی آہ وزاریاں، اپنی بہن بیٹیوں کے اغواء ہو جانے کے غم وغصہ سے چیخ وپکار کرتے ہوئے لوگوں کے دل دہلا دینے والے بین..... ایک قیامت تھی جو ہر طرف مچی تھی۔ پھر قافلے پاکستان آنے لگے۔ میں بھی اُس میں شامل ہو گیا۔ اب یہاں تھا بھی کیا۔ راستے میں بھی ہمیں کئی جگہ لوٹا گیا، کئی لوگوں نے جانوں کا نذرانہ دیا۔

"یہ لٹا پٹا قافلہ جب پاکستان کی سرزمین پر پہنچا تو خوشی کے باوجود آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اپنے گھر اور گھر والے بہت یاد آئے۔ دل میں ان کی یادیں چٹکیاں لینے لگیں۔ ہندوستان سے لٹ پٹ کر آنے والے مہاجروں کو فوری طور پر رہنے کے لیے مہاجر کیمپ میں جگہ دی گئی۔ اللہ اُس میمن سیٹھ کا بھلا کرے، جس کی طرف سے تمام مہاجرین کو تینوں ٹائم کا کھانا ملتا تھا۔ پھر میں نے مزدوری تلاش کرنا شروع کر دی۔ جلد ہی ایک صاحب نے مجھے مل میں نوکری دلا دی۔ میں صبح چلا جاتا شام کو آتا اِدھر اُدھر پھرتا پھر جہاں جگہ ملتی پڑ کر سو جاتا کیمپ میں تو ویسے بھی لوگوں نے چادریں باندھ کر چار دیواری بنائی تھی ہمارے قافلے میں ایک ایسی لڑکی بھی تھی جس کا اس دنیا میں کوئی نہیں بچا تھا۔ جو اپنے محلے والوں کے رحم وکرم پر تھی۔ یہ ہمارے محلے کے پیش امام کی دس سال کی بیٹی تھی، جس کے دو جوان بھائی اور نیک نمازی ماں اور پیش امام منور علی شہید ہو چکے تھے۔ پاکستان بنے ایک سال ہو رہا تھا۔ کافی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ لوگوں نے کلیم وغیرہ داخل کروا دیے تھے کچھ لوگوں کو مکان مل گئے تھے۔ میں نے کچھ نہیں لیا تھا نہ مکان نہ دکان حالانکہ ہم اپنا بہت بڑا گھر اور کپڑے کی دکان چھوڑ کر آئے تھے۔ میرا کسی چیز کو دل نہیں چاہتا تھا۔ بھلا گھر بار کیا کرنا جب گھر والے ہی نہیں رہے۔ زندگی بے حس سی گزر رہی تھی۔ جہانگیر آباد کے نالے پر میں نے چھوٹی سی جھگی بنالی تھی۔

ایک روز کیمپ کے ساتھیوں نے کہا کہ مشتاق تم بھی اکیلے ہو اور پیش امام کی بیٹی کا بھی اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ ہم سب نے اس کے باپ کے پیچھے نمازیں پڑھی ہیں۔ اس لڑکی کا خیال رکھنا ہم سب کا فرض ہے اور تم سے اچھا لڑکا اور کوئی نہیں ہوگا۔ ہم سب چاہتے ہیں کہ امام صاحب کی بیٹی سے تمہاری شادی کر دیں۔"

پہلے تو میں نہیں مانا پھر یہ بات مجھے سمجھ آ گئی کہ مجھے بھی اور اُسے بھی کسی ہمدرد اور مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔ پھر بڑی سادگی سے میری نوری کے ساتھ شادی ہوگئی۔

زندگی متوازن ڈگر پر چلنے لگی۔

شادی کے چار سال بعد خدا نے ہمیں ایک بیٹا دیا۔ ہماری زندگی میں جیسے بہار آ گئی لیکن اس خوشی کے موقع پر بھی ہم اپنے پیاروں کو نہیں بھولے، بلکہ اس رات میں اور نوری بہت روئے۔

ہمارا بیٹا جس کا نام ہم نے مراد رکھا تھا اب دو سال کا ہو گیا تھا۔ زندگی رواں دواں تھی کہ اچانک ایک بار پھر ہمارے گھر بار لٹ گئے۔ نہ جانے کس کی سازش تھی کہ ہمارے ہم وطنوں نے ہمیں لوٹ لیا۔ میں اور نوری لالٹین کی روشنی میں کھانا کھا رہے تھے، پاس ہی ہمارا بیٹا سو رہا تھا کہ اچانک باہر سے شور کی آوازیں آنے لگیں۔ میں اور نوری بھاگ کر باہر آئے کہ دیکھیں کہ کیا معاملہ ہے۔ دیکھا تو چاروں طرف آگ لگی ہوئی تھی۔ ہماری جھگیاں تو چٹائی اور بانسوں سے بنی تھیں دھڑ دھڑ جلنے لگیں۔ نوری اور میں تیزی سے اندر بھاگے اپنے بیٹے مراد کو بچانے کے

لیے مگر آگ اتنی تیزی سے پھیل چکی تھی کہ سب کچھ جل کر خاکستر ہو گیا۔ ہم ایک بار پھر لٹ گئے تب ہندوؤں نے لوٹا تھا اب اپنے ہی ملک میں، اپنے ہی مسلمان بھائیوں نے ہمیں برباد کر دیا تھا۔ ہم ایک بار پھر بے آسرا ہو کر اپنے گھر بار بنانے لگے، اس کے سوا چارہ بھی تو کوئی نہیں تھا۔

اب ہماری زندگی میں کوئی خوشی نہیں تھی۔ ہمیں ڈاکٹر نے مراد کی پیدائش پر بتا دیا تھا کہ نوری اب کبھی ماں نہیں بن سکے گی اور ہمارے دل کا چین ہمارا مراد ہم سے ہمیشہ کے لیے دور جا چکا تھا۔ اب ہم دونوں جیسے زندگی کو گھسیٹ رہے تھے۔ ہم زندگی کو نہیں زندگی ہمیں گزار رہی تھی۔ ہم مہاجرین کو تو جیسے دکھ اور صدمے اٹھانے کی عادت سی ہو گئی تھی۔

اور پھر بہت سارے سال گزر گئے۔ حکومت نے نئی بستیاں بسائیں، مہاجر کیمپ کے کچھ ساتھی قصبہ کچھ اور نئی ٹاؤن، کوئی کہیں اور کوئی کہیں بس گئے۔ اشرف بھائی کی فیملی سے ہمارے گھریلو تعلقات تھے، اشرف بھائی کے والدین بھی ہماری شادی کے مشورے میں شامل تھے، کافی دنوں سے ہم ان کے گھر جانے کا سوچ رہے تھے مگر موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ ایک دن ہم نے اشرف بھائی کے گھر جانے کا پکا ارادہ کر لیا۔ میں نوری کو خوش رکھنے کی پوری کوشش کرتا۔ مراد کے جانے کے بعد تو نوری ہنسنا تو دور کی بات مسکرانا بھول گئی تھی۔ اشرف بھائی کی والدہ نوری سے بڑا پیار کرتی تھیں اور اشرف بھائی کی بیوی عطیہ بھابی کہتی تھیں کہ نوری تو میری چھوٹی بہن ہے۔

میں اور نوری جب اچانک ان کے گھر گئے تو وہ سب بہت خوش ہوئے۔ ہم سب نے باتوں کے دوران دوپہر کا کھانا کھایا۔ ہم ہندوستان کی باتیں کرتے رہے، سب اپنے پیاروں کو یاد کر کے افسردہ ہو گئے تھے اور نوری کا غم تو بہت بڑا تھا کہ مراد کے بعد اولاد کی کوئی خوشی اس کے نصیب میں نہ تھی۔

عطیہ بھابی کا دو سال کا بیٹا نوری کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ شام کو جب ہم دونوں گھر آنے لگے تو وہ بچہ نوری سے اتنا مانوس ہو گیا کہ اسے چھوڑ ہی نہیں رہا تھا اور شاید نوری بھی اسے چھوڑنا نہیں چاہ رہی تھی۔ اشرف بھائی کی والدہ کہنے لگیں۔

''بیٹا آج رات ہمارے پاس رہ جاؤ، اتنے برسوں کے بعد آئے ہو۔ ابھی تو باتیں کر کے دل بھی نہیں بھرا ہے۔'' نوری جو کبھی ایک دن کے لیے بھی اپنا گھر نہیں چھوڑتی تھی فوراً مان گئی۔ میں بھی خوش تھا کہ چلو برسوں کے بعد نوری خوش تھی، ہنس بول رہی تھی۔

رات ہم سب دیر تلک باتیں کرتے رہے، عطیہ بھابی کا بیٹا احمد نوری کی ہی گود میں سویا۔ عطیہ بھابی نے ہنس کر کہا تھا۔

''نوری اسے تم لے جاؤ یہ تو تمہارا ہی بیٹا لگتا ہے۔'' اور نوری ہنس دی تھی۔

صبح عطیہ بھابی اور نوری نے مل کر ناشتا بنایا۔ اشرف بھائی کہنے لگے کہ بھئی آج میں بھی چھٹی کر رہا ہوں اور تم بھی چھٹی کر لو اب تم لوگ شام کو جانا۔'' اس سے پہلے میں کچھ بولتا نوری بولی۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔''

احمد اب بھی نوری کی گود میں تھا۔ صبح دس بجے کا وقت تھا۔ عطیہ بھابی اور نوری کچن میں اور اماں، اشرف بھائی اور میں ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم نے چھت پر سے دیکھا تو گھروں میں آگ لگی ہوئی تھی اور کچھ لوگ جن کے پاس اسلحہ تھا وہ فائرنگ کر رہے تھے۔ ہم سب نیچے آ کر بیٹھ گئے۔ ابھی ہم صورتِ حال سمجھنے بھی نہ پائے تھے کہ دروازے پر ضربیں پڑنے لگیں۔ پھر بے تحاشا گولیاں چلائی گئیں۔ دروازہ ایک دھماکے سے گر گیا، کچھ لوگ گھر میں داخل ہوئے اور لوٹ مار شروع کر دی۔ ان میں سے کچھ نے پیٹرول چھڑک کر گھر کو آگ لگا دی۔ ہم سب دروازے کی طرف بھاگے ان لوگوں نے فائرنگ کر دی۔ اشرف بھائی کی والدہ جو بوڑھی بھی تھیں اور کمزور بھی گر کر اٹھ نہ سکیں۔ عطیہ بھابی کے سر میں گولیاں لگیں۔ ایک گولی نوری کے بازو میں لگی مگر اس نے احمد کو نہ چھوڑا۔ میرے بھی پاؤں میں گولیاں

لگیں۔

میرے سامنے میرا دوست آگ کی لپیٹ میں آ گیا اور میں کچھ بھی نہ کر سکا۔

میری ٹانگ میں گولیاں لگی تھیں۔ میں چل نہیں سکتا تھا آس پاس کے علاقے کو گھیرے میں لے کر یہ واردات ہوئی تھی۔ بستی فائرنگ کی آواز سے گونج رہی تھی۔ ہر گھر سے شعلے نکل رہے تھے۔ چاروں طرف سے عورتوں اور بچوں کے رونے اور چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں، کیوں کہ مرد اپنے کام پر جا چکے تھے، کچھ ہی آدمی گھر پر تھے۔ ظلم و بربریت کی انتہا تھی۔ شیطان ہنستا رہا انسانیت پکار پکار کر احتجاج کرتی رہی۔

پورے چار گھنٹے بعد پولیس آئی۔ تب تک شرپسند آرام سے بھاگ چکے تھے اور ایک بار پھر ہم اپنے لوگوں کی لاشیں اٹھا رہے تھے۔ میرے دوست کا ہی نہیں بستی کا ہر گھر تباہ ہو چکا تھا۔

زخمیوں کو اسپتال پہنچایا گیا۔ عطیہ بھابی زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے جانبر نہ ہو سکی تھیں۔ میرا دوست میرے سامنے جل چکا تھا۔

نوری کی زندگی تھی، وہ پھر ایک بار شدید زخمی ہونے کے بعد بھی بچ گئی تھی۔ میری ٹانگ ہمیشہ کے لیے بے کار ہو گئی۔

میرے دوست کا کوئی قریبی عزیز نہیں تھا۔ عطیہ بھابی کے سگے بہن بھائی نہیں تھے، رشتے دار فسادات میں مارے جا چکے تھے۔ وہ بھی نوری کی طرح لاوارث تھیں۔

محلے والوں نے کہا تم اس بچے کو لے لو، ورنہ یہ معصوم غلط ہاتھوں میں چلا جائے گا۔ اور یوں احمد کو ہم اپنے گھر لے آئے۔ ہمیں نہیں معلوم کے میرے دوست کا مکان کس نے لیا، ہم پھر کبھی اس طرف نہیں گئے اور کسی نے ملنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

☆......☆......☆

نوری تو سائے کی طرح احمد کے ساتھ رہتی۔ میں کہتا اسے اسکول میں داخل کرا دیں تو تڑپ کر منع کر دیتی وہ بہت ڈر گئی تھی ایسے حالات دیکھنے کے بعد......

وقت اڑتا رہا احمد اٹھارہ سال کا ہو گیا۔ میں نے بھی نوکری چھوڑ دی بلکہ نوکری نے مجھے چھوڑ دیا۔

میں چھولے کا ٹھیلا لگانے لگا۔ مہنگائی بڑھ گئی تو اخراجات بھی بڑھ گئے۔ نوری نے گھروں میں کام کرنا شروع کر دیا مگر احمد کو کہیں کام نہیں کرنے دیتی تھی۔ میں سڑک کے کنارے چھولے چاٹ کا ٹھیلا لگاتا تھا پھر میری طبیعت خراب رہنے لگی۔ احمد ضد کرنے لگا کہ ابو یہ کام میں بھی کر سکتا ہوں، اب آپ آرام کریں۔''

احمد کو آج تک پتا نہیں چلا کہ وہ ہمارا بیٹا نہیں تھا۔ اب میری جگہ احمد ٹھیلا لگانے لگا تھا۔

میرے ساتھ بھی ایسا ہوتا تھا کہ اکثر پولیس والے چاٹ کی پلیٹ بنوا کر کھا لیتے مگر پیسے نہیں دیتے تھے۔ میں خاموش رہتا کیا کر سکتا تھا۔ احمد کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا اُس نے ہمیں کبھی نہیں بتایا۔

کبھی پولیس والے اور کبھی بھتہ لینے والے لڑکے، سو دو سو روپے مانگتے۔ وہ خاموشی سے دیتا، کبھی وہ چھین کر لے جاتے۔ یہ سب ہمیں اُس کے مرنے کے بعد آس پاس کے دکان داروں نے بتائیں کیوں کہ اُن کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا تھا بلکہ ہوتا ہے۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب آٹا بہت مہنگا ہو گیا تھا۔ غریبوں کی پہنچ سے بھی دور۔ دو لڑکے بائیک پر آئے اور احمد سے بولے دو ہزار روپے دو۔'' احمد نے کہا دو ہزار کہاں سے دوں۔ اتنی تو میری بکری بھی نہیں ہوئی ہے۔ پھر وہ احمد سے زبردستی کرنے لگے۔ وہ بھی جوان بچہ تھا ڈٹ گیا کہ تم لوگ ہمیشہ مجھ سے پیسے چھین کر لے جاتے ہو مگر آج میں نہیں دوں گا۔ میرے ابو کی طبیعت خراب ہے کیا تمہیں نہیں معلوم کہ آٹا کتنا مہنگا ہو گیا ہے۔''

اِن میں سے ایک ہنس کر بولا۔

''دیتا ہے یا......''

''احمد نے کہا کہ ایک پیسہ بھی نہیں دوں گا۔ ہم خود پریشان ہیں۔'' اتنا سننا تھا کہ ایک بدبخت نے

پستول نکالا اور احمد کو تڑا تڑ گولیاں ماردیں اور کہنے لگا۔
''جب تم پریشان ہو تو جی کر کیا کرو گے۔'' اور وہ ڈبہ جس میں وہ پیسے رکھتا تھا اٹھا کر لے گئے۔
میرا بچہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا اور وہ لوگ بائیک اسٹارٹ کر کے فائرنگ کرتے ہوئے چلے گئے۔ موقع پر موجود کوئی شخص نہیں بولا۔ آخر سب کو اپنی جان پیاری تھی۔
تھوڑی دیر بعد کچھ لوگ ہمارے گھر آئے اور انہوں نے بتایا کہ بھتہ خوروں نے احمد کو گولیاں ماردی ہیں اور پولیس لاش لے گئی ہے۔''
یہ سنتے ہی نوری نے نہ چپل پہنی نہ چادر اوڑھی اس سے پہلے کہ میں اُسے پکڑتا وہ باہر کی طرف بھاگی۔ تمہیں تو پتا ہے ہمارا گھر بالکل سڑک کے ساتھ ہیں۔ نوری اندھا دھند بھاگ رہی تھی کہ سامنے سے آنے والی ویگن نے اُسے ٹکر ماری۔ نوری کچل کر بے شناخت ہوگئی۔ پولیس آئی اور پوسٹ مارٹم کے لیے لاش لے گئی۔
''بس بیٹا یہ کہانی ہے مشتاق مہاجر کی۔ محلے والوں نے دفنا دیا میری نوری اور احمد کو۔ نہ جانے میں کیوں زندہ ہوں۔ احمد کے باپ کا گھر اگر میں چاہتا تو احمد کو پل سکتا تھا مگر میں نے سوچا یہ چیزیں فتنہ پیدا کرتی ہیں، کچھ نہیں لوں گا۔ یہ چھوٹی سی جھگی میرے احمد کے لیے کافی ہوگی۔ وہ بڑا سادہ مزاج بچہ تھا۔ مجھے بتاؤ ہمیں اور ہماری اولادوں کو اس سادگی اور قربانی نے کیا دیا۔ میری طرف سے سارے پاکستان میں رہنے والوں سے سوال ہے کہ ہم لٹے پٹے لوگ تحفظ سے کیوں محروم ہیں؟ ہم سے کسی کو کیا خطرہ ہے؟ کیا حشر کے دن حساب لینے والا پروردگار امیروں کا الگ اور غریبوں کا الگ ہوگا؟ کیا لوگوں کو یوم آخرت کی فکر نہیں؟ کیا بگاڑا ہے ہمارے معصوم بچوں نے؟ کیوں وقت سے پہلے زمین کا رزق بنا دیے جاتے ہیں۔''
چاچا مشتاق پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں شرمندہ اور پشیمان بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کیا جواب دوں۔ کیونکہ کچھ سوال ہمیں سوائے شرمندگی کے کچھ نہیں دیتے۔ ہماری فریاد اس زمین پر بھلا کون سُنے.....

☆☆......☆☆

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ،
سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم



فیصل ندیم بھٹی



اُس دوشیزہ کی داستانِ عبرت، جس کے جذبات نے اُسے دارالامان کی مکین بنا دیا

میرا نام شازیہ ہے۔ میرا تعلق فیصل آباد کے ایک نواحی گاؤں سے ہے۔ میں نے گاؤں کے ایک امیر گھرانے میں آنکھ کھولی۔ بچپن سے ہی گھر میں میری ہر خواہش کو پورا کیا جاتا تھا۔ میری والدہ میرا بہت خیال رکھتی تھیں کیونکہ میں اپنے والدین کی شادی کے سات سال بعد پیدا ہوئی تھی۔ گھر میں دولت کی ریل پیل تھی گھر میں کام کرنے کے لیے نوکرانی تھی جو گھر کا سارا کام کرتی تھی۔

میں نے اپنی ابتدائی تعلیم گاؤں کے ایلیمنٹری اسکول سے حاصل کی اور قرآن پاک کی تعلیم گھر کے ساتھ اماں حاجن سے حاصل کی۔ اماں حاجن کی زندگی بچوں اور بچیوں کو قرآن کی تعلیم سے پڑھاتے ہوئے گزرتے ہوئے میں نے دیکھی۔ ہمارا گھر ایک مذہبی گھرانہ تھا۔ صبح سویرے فجر کی نماز پڑھنے کے بعد قرآن پاک پڑھا جاتا تھا۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ ابو کی کافی زمینیں تھیں گاؤں میں جہاں سے رزق کی فراوانی تھی اس کے ساتھ ساتھ ابو کا کاروبار بھی تھا۔ وہاں سے بھی خوب آمدن آتی تھی۔

میرے گھر سے کچھ دور ہی ہمارے چچا کا گھر تھا۔ میرے چچا کا ایک ہی بیٹا تھا جس کا نام شعیب تھا۔ وہ اکثر ہمارے گھر آیا کرتا تھا۔ میں بھی چھٹی والے دن اپنے چچا کے گھر جاتی تھی۔ جہاں پر میرا ہورا دن گزرتا تھا۔ ہم بچپن میں (شعیب اور میں) اکٹھے کھیلتے تھے۔ چودہ سال کی عمر میں میں نے مڈل کا امتحان اپنے ہی گاؤں کے اسکول سے پاس کیا۔ اس کے بعد میں نے میٹرک کرنے کے لیے داخلے کا اپنے والدین سے کہا تو ابو نے مجھے فیصل آباد شہر کے ہائی اسکول مجھے داخل کر دیا۔ ہمارا گاؤں فیصل آباد شہر سے کافی فاصلے پر تھا۔ روزانہ میں نہیں آ جا سکتی تھی۔ ابو نے مجھے اسکول کے ساتھ ہی ایک ہاسٹل تھا جس میں میری رہائش کا بندوبست کیا گیا۔

جب میں نہم کلاس میں فیصل آباد پڑھنے کے لیے آئی تو میں اپنے اندر کچھ تبدیلیاں محسوس کیے جا رہی تھی۔ وہاں پر لڑکیاں میرے حسن کی بہت تعریف کرتی تھیں۔ کیونکہ میں تھی بھی بہت حسین۔ پانچ فٹ قد، لمبے کالے بال۔ اونچی ناک باریک گلابی ہونٹ۔ لڑکیاں مجھے کہتی تھی کہ شازیہ تم پر تو غضب کی جوانی آئی ہے۔

ایک ماہ کے بعد جب میں گھر آئی تو میرا کزن شعیب اب بھی ہمارے گھر ضرور آتا تھا۔ میں بھی کئی

ماہ سے یہ بات نوٹ کر رہی تھی کہ وہ امی سے چھپ کر مجھے دیکھا کرتا تھا۔ اور مجھ میں بہت دلچسپی لینے لگا تھا۔
ایک بار جب میں ہاسٹل سے عید پر گھر آئی۔ عید کی ایک ہفتہ کی چھٹیاں ہوئی تھیں۔ ایک دن شعیب ہمارے گھر آیا تو جب امی واش روم میں گئیں تو شعیب نے مجھے ایک تہہ کاغذ مجھے پکڑا دیا اور ساتھ کہا کہ اسے امی سے چھپا کر پڑھنا۔''
جب وہ کاغذ اس نے مجھے دیا تو میرے جسم کی کیفیت عجیب تھی میرا سارا وجود بے جان ہوئے جا رہا تھا۔ لیکن ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ اتنے میں کچھ دیر کے بعد امی بھی باہر آئیں میں نے وہ کاغذ کا ٹکڑا چھپا لیا تھا۔
جب امی ہمارے پاس آ کر بیٹھیں تو شعیب نے کہا کہ خالہ جان میں چلتا ہوں'' اب میں بہت بے چینی سے انتظار کر رہی تھی کہ کب مجھے موقع میں وہ شعیب کا دیا ہوا کاغذ کا ٹکڑا پڑھوں۔ خیر دن گزر گیا۔ جب رات کو میں اپنے کمرے میں سونے کے لیے گئی تو میں نے وہ کاغذ ٹکڑا باہر نکال کر پڑھنا شروع کیا جس میں لکھا تھا۔

جان سے پیاری شازیہ!
تم بہت خوب صورت ہو۔ مجھے تم بہت اچھی لگتی ہو۔ میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔ میں پہلے بہت ڈرتا تھا تم سے یہ بات کہنے سے لیکن آج میرے دل نے ساتھ دیا تو کاغذ کا سہارا لے کر آپ سے بات کر رہا ہوں میں تو ہر وقت تمہارے ہی خیالوں میں گم سم رہتا ہوں۔ والسلام۔
خیر اندیش
شعیب

شعیب کا یہ محبت نامہ پڑھ کر میں رات کو سو نہ سکی۔ میں رات بھر شعیب کے بارے میں ہی سوچتی رہی۔ بلاشبہ میں بھی تو بہت ہی حسین ہوں لیکن میرا شعیب مجھ سے بھی زیادہ حسین ہے۔ خاص طور پر شعیب کی چھوٹی چھوٹی داڑھی مجھے بہت زیادہ اچھی لگتی تھی۔ خود بھی شعیب کا بھی گورا رنگ، چوڑا سینہ، صحت مند، خوب صورت بال۔ گویا میرے خوابوں کا شہزادہ...... میرے لیے وہ ایک ہیرو تھا۔
میرے اندر کے جذبات بھڑکنے شروع ہو گئے۔ کیونکہ اب میں بھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہی تھی۔



لوگ سچ کہتے ہیں کہ جوانی تو ستاتی ہوتی ہے۔ اسی طرح مجھ پر بھی جوانی ٹھاٹھیں مارنے لگی تھی۔ میں بھی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر شعیب کو دل دے بیٹھی اس سے اب روز ملاقات ہونے لگی تھی۔

میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں نے گورنمنٹ کالج میں ایف اے میں داخلہ لے لیا۔ اب میں نے ہاسٹل میں رہنا چھوڑ دیا تھا کیونکہ اب کچھ گاؤں میں بھی پڑھائی کا رجحان زیادہ ہونے لگا تھا لوگوں نے گاؤں سے بچوں اور بچیوں کو شہر میں پڑھانے کے لیے کیری ڈبے لگا لیے تھے اب میرے ابو نے بھی میرے لیے کیری ڈبے میں جانے کے لیے بات کر لی تھی اب میں روزانہ کالج سے گھر آ جایا کرتی تھی۔

جب میں کالج میں گئی تو ابو نے مجھے ایک موبائل بھی لے کر دیا کہ اگر شہر یا کالج میں کوئی مسئلہ ہو تو رابطہ ہو سکے۔ خیر شعیب نے بھی موبائل لے لیا اب روزانہ کئی گھنٹے شعیب اور میں فون پر باتیں کرتے تھے کسی کو کوئی کچھ شبہ نہ تھا۔ ہم پیار میں اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ ہم نے زندگی بھر ساتھ رہنے کی قسمیں اٹھا رکھی تھیں۔ اور یہاں تک کہ ہم نے شادی کرنے کا فیصلہ بھی اپنی جگہ پر کر لیا تھا۔

☆☆☆

جب میں نے ایف اے کا امتحان فرسٹ پوزیشن میں پاس کیا تو گھر میں ایک دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ میری امی نے اپنے تمام رشتہ داروں کو دعوت پر مدعو کیا۔ میری امی کا یہ خواب تھا کہ میں بی اے کرنے کے بعد وکالت کا امتحان دوں۔ انسان تو سوچتا بہت کچھ ہے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد امی کی طبیعت خراب ہو گئی۔ فیصل آباد کے الائیڈ ہسپتال میں امی کو علاج کے لیے لے جایا گیا۔ ہسپتال میں تین دن تو ٹیسٹ کیے گئے۔ تمام ٹیسٹ ہونے کے بعد جب ڈاکٹر نے یہ منحوس خبر دی کہ میری امی کو کینسر ہے۔ جو آخری اسٹیج پر ہے۔ یہ خبر سنتے ہی گویا میرے پاؤں تلے زمین نکل گئی۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کروں لیکن انسان خدا کے فیصلوں کے آگے کر بھی تو کچھ نہیں سکتا۔ آخر کار ایک ہفتہ کے بعد میری امی ہمیں اکیلا چھوڑ کر اس دارِ فانی سے کوچ کر گئیں۔

جب امی کی میت کو گھر میں لایا گیا تو گھر میں کہرام مچ گیا گویا میری ساری دنیا اُجڑ گئی تھی۔ مجھ پر بے ہوشی کی کیفیت طاری ہو گئی نجانے کب میری امی کا جنازہ اٹھایا گیا۔ لیکن سچ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب زخم دیتا ہے تو خود ہی اسے بھر بھی دیتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان صبر کر لیتا ہے اور خدا کی رضا پر ہی اتفاق کرتا ہے۔

میری امی کی وفات کے بعد شعیب چند ماہ پاکستان میں رہا پھر وہ دبئی چلا گیا۔ جب شعیب دبئی گیا تو ہم دونوں نے شادی کی قسمیں کھائیں۔ کچھ عرصہ تو وہاں سے شعیب نے فون پر رابطہ کیا لیکن پھر یہ سلسلہ کم ہوتے ہوتے نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔

امی کی وفات کے ایک سال بعد ابو نے دوسری شادی کر لی۔ سوتیلی ماں تو آخر سوتیلی ہی ہوتی ہے اور دوسرا میری سوتیلی ماں ہمارے خاندان کی نہیں تھی۔ سوتیلی ماں کا رویہ میرے ساتھ بہت سخت تھا۔ بات بات پر مجھے ڈانٹتی، سارے گھر کا کام مجھ سے کرواتی، حتیٰ کہ اپنے کپڑے بھی مجھ سے استری کرواتی تھی۔ بات بات پہ مجھے ذلیل کرنا، برا بھلا کہنا، اگر جب بھی میں اپنے ابو سے ان کی شکایت کرتی تو ابو کہتے۔

''بیٹی صبر تیری ماں ہے۔''

میں چپ ہو کر بس تکالیف سہنے کی عادی ہو گئی تھی۔ سوتیلی ماں کے آنے سے میری تعلیم بھی ادھوری رہ گئی۔ مجھے پڑھنے کی اجازت نہ ملی۔

☆☆☆

ایک دن ابو دوسری امی کو لے کر شہر خریداری کرنے کے لیے گئے تو میں گھر میں اکیلی تھی۔ اچانک میرے موبائل کی گھنٹی بجی جس کی اسکرین پر ایک انجان نمبر تھا۔ میں نے کال کو ریسیو کی تو آگے سے ایک مرد کی آواز آئی۔ ''ہیلو۔'' تو میں نے کہا۔ جی آپ کون؟'' اس نے بتایا کہ میں اسد ہوں۔

میں نے پوچھا کہ مجھے کیوں کال کی۔ تو اس نے

بتایا کہ میں نے تو اندازے سے نمبر ملایا ہے اور آپ محترمہ کا نمبر مل گیا۔

مجھے اسد کی آواز بہت اچھی لگی گویا اسد کی آواز کال پر سننے کے بعد نجانے کب تک میرے کانوں میں سرگوشی کرتی رہی۔

اسد نے مجھے بتایا کہ وہ سرگودھا کے ساتھ ایک گاؤں میں رہتا ہے اور وکیل کے پاس منشی (کلرک) کا کام کرتا ہے۔ اس نے مجھے اپنی ساری فیملی کے بارے میں بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ غیر شادی شدہ ہے۔

خیر وقت گزرتا گیا۔ ہم ہر روز کئی کئی گھنٹے فون پر باتیں کرنے لگے کیونکہ رات کو میں کمرے میں اکیلی سوتی تھی۔ فون سننے کی کوئی دشواری نہ تھی۔ دوستی سے بات محبت تک پہنچ گئی۔ اب تو ہماری محبت میں بے پناہ اضافہ تھا۔ ساتھ میں ہم دونوں نے ہمیشہ ایک ساتھ رہنے کا وعدہ بھی کرلیا۔

میں نے اسد کو بتایا کہ میری ماں اس دنیا سے چلی گئی ہے اور میرے ابو نے دوسری شادی کرلی ہے۔ میری سوتیلی ماں مجھ سے بہت برا سلوک کرتی ہے۔ بات بات پر مجھے بے عزت کرتی ہے۔''

اسد نے مجھے کہا کہ میں اگر گھر میں شادی کی بات کروں تو میرے ابو کبھی بھی نہیں مانیں گے کیونکہ ہمارے خاندان کی شادیاں خاندان میں ہی ہوتی ہیں۔

اب میں بھی انہی سوچوں میں گم تھی کہ کیا کروں کیا نہ کروں۔ اس نے مجھے بہت سہارا اور حوصلہ دیا کہ تم میرے پاس سرگودھا آجاؤ ہم شادی کرلیں گے۔ آخر کار سوتیلی ماں کے رویے سے تنگ آکر میں نے گھر سے بھاگنے کا حتمی فیصلہ کرلیا۔

☆☆☆

ایک دن میری سوتیلی ماں اپنے سسرال میں گئی تو میں نے موقع غنیمت جانا اور پانچ تولہ سونے کے زیورات اور پچاس ہزار روپے نقدی اپنے رکھ لی۔ اگلے دن جب میری سوتیلی ماں آگئی تو میں دن کو موقع پاکر وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہوگئی۔ تین

چار سوٹ ساتھ لیے اور جب فیصل آباد سے سرگودھا والی بس میں بیٹھی تو میں نے اسد کو فون پر بتایا کہ میں سرگودھا آرہی ہوں۔ سرگودھا لاری اڈے پر تم میرا انتظار کرنا۔ فون کرنے کے بعد میں نے اپنا نمبر بند کردیا۔

جب میں سرگودھا لاری اڈے پر اتری تو رات 8 بجے کا ٹائم تھا۔ اسد کو میں نے پہچان لیا جو کہ میرے ہی انتظار میں کھڑا تھا۔

اسد مجھے اپنے ایک دوست کے گھر لے کر گیا اور اس نے کہا کہ یہاں پر دو دن رہنے کے بعد ہم نکاح کرلیں گے۔ پھر نکاح کرنے کے بعد ہم گھر جائیں گے۔

اگلے دن اسد مجھے عدالت میں لے کر گیا جہاں پر ہم نے جج کو بیانات قلمبند کروائے اور نکاح کے بندھن میں بھی بندھ گئے۔

اس کے بعد اسد مجھے گاؤں میں اپنے گھر میں لے کر گیا۔ گاؤں میں اسد کا گھر ایک کچا مکان تھا۔ کچے مکانوں کو دیکھ کر مجھے بہت عجیب سا لگا حتی کہ گھر میں بیت الخلاء تک نہ تھا۔ رفع حاجت کے لیے صبح سویرے جلدی اٹھ کر باہر کھیتوں میں جانا پڑتا تھا۔ اس کے گھر والوں نے پہلے تو میرے ساتھ اتنا اچھا سلوک نہ کیا لیکن بعد میں سب کچھ ٹھیک ہوگیا۔ میری ساس مجھ سے بہت اچھا سلوک کرنے لگی تھی۔

وقت گزرتا گیا ایک سال کے عرصہ کے بعد مجھے اللہ تعالیٰ نے میری گود ہری کردی تھی اور مجھے چاند سا بیٹا دیا۔ میرا شوہر اور میرے سسرال والے بہت خوش تھے۔ پھر دو سال گزرنے کے بعد میرا دوسرا بیٹا پیدا ہوا۔

اب شعیب پانچ سال کا ایک طویل عرصہ گزارنے کے بعد دبئی سے واپس پاکستان آیا۔ میں نے ایک دن اچانک گھر میں کوئی نہ تھا۔ میں اکیلی تھی۔ مجھے اپنے ابو کی بہت یاد آئی میں نے ابو کو موبائل نمبر ملایا تو بات ہوئی۔ ابو نے کہا کہ تم میرے لیے مرگئی ہو۔ آئندہ کبھی مجھ سے رابطہ نہ کرنا۔ میں بہت کرب سے گزر رہی تھی۔ اپنے تو اپنے ہی ہوتے ہیں

پھر مجھے اپنے کزن شعیب کا خیال آیا۔ میں نے وہی پرانا نمبر شعیب کا ڈائل کیا۔

تو شعیب کا نمبر مل گیا شعیب نے پوچھا ''کون؟

''میں نے اسے بتایا کہ میں شازیہ بول رہی ہوں تو اس نے کہا کہ میں تو تمہاری محبت میں آج بھی تڑپتا ہوں، سسکتا ہوں۔''

مجھے شعیب کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات یاد آرہے تھے۔ میرے اندر گزری ہوئی محبت پھر سے زندہ ہوگئی۔ اب ہر روز ہم دونوں دن کو پیار بھری باتیں کرتے تھے مجھے شعیب کی باتوں نے اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔

شعیب نے مجھے بتایا کہ میں اب بھی تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن میں جب بچوں کو دیکھتی تو میرے قدم تھم جاتے۔

☆☆☆

ایک رات میں باہر صحن میں شعیب سے باتیں کررہی تھی موبائل پر تو اسد نے مجھے باتیں کرتے ہوئے سن لیا اس نے مجھے کہا کہ کس سے باتیں کررہی ہو۔ میں نے تم سے محبت کی ہے اور تم محبت میں بے وفائی کررہی ہو۔

مجھے بہت عجیب لگا گویا میرے پاؤں تلے زمین نکل گئی۔ اسد نے مجھے صبح ڈیوٹی پر جاتے ہوئے بھی نہ بلایا۔ جب صبح سے شام ہوگئی نا جانے کب رات گزری۔ میرے شوہر نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ میں نے بہت معافیاں بھی مانگیں لیکن وہ نہ مانا۔

اگلی صبح جب وہ دفتر سے روانہ ہوا تو اس کے ہاتھ میں کاغذات تھے اور اس نے کہا کہ میں تم کو طلاق دیتا ہوں۔ تم میری طرف سے آزاد ہو اور میرے بچے میرے پاس رہیں گے۔

جاؤ اکیلی جہاں جی کرے۔''

مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میری ساس بھی حیران تھی کیونکہ وہ بھی ایک ماں تھی۔ خیر میں دھیرے دھیرے اپنے آپ کو سنبھالنے لگی۔ میں بوجھل قدموں کے ساتھ گاؤں سے شہر آگئی۔

شہر آکر میں نے اپنے کزن شعیب کو فون کیا اور بتایا کہ اس کی وجہ سے مجھے میرے شوہر نے طلاق دے دی ہے۔ اب مجھے آکر لے جاؤ۔''

لیکن وقت کتنا بے رحم ہوتا ہے مجھے آج اندازہ ہوا شعیب نے کہا کہ شازیہ میں تم کو نہیں اپنا سکتا۔ تم بے وفا ہو۔''

''میں ڈر گئی میں نے ہر پل تمہاری محبت کو اپنے سینے سے لگا رکھا۔ لیکن شازیہ تم نے میرے ساتھ بے وفائی کی ہے اور آج میں نے تمہارا گھر تباہ کر کے تم سے تمہاری بے وفائی کا بدلہ لیا ہے۔ جاؤ بے وفا مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

آج میرے لیے دنیا میں کوئی بھی اپنا، اپنا نہ رہا تھا سب بیگانے ہوگئے تھے۔ میں تو لٹ گئی۔

شام ہونے والی تھی مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔

بس اڈے پر سے نکلتے ہوئے ایک بورڈ پڑھا جہاں پر دارالامان پہنچ گئی۔

گزشتہ پانچ ماہ سے میں دارالامان اس طرف کا اشارہ تھا۔ میں چپ چاپ بہتی آنکھوں اور ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ اپنے بے جان ہوتے جسم کو گھسیٹ کر دارالامان میں زندگی گزار رہی ہوں۔

کچھ دن پہلے مجھے اپنے والد کی بہت یاد ستائی اور میں نے اپنے والد کو خط لکھا ہے اور ساری تفصیلات سے آگاہ کیا ہے اور ان سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگی ہے پتا نہیں والد صاحب کب مجھے معاف کریں گے۔ اب میں اپنے والد کے خط یا ان کی آمد کا انتظار کررہی ہوں۔ آپ بھی دعا کیجیے کہ میرے والد مجھے لینے آجائیں۔

بس آخر میں یہی کہوں گی کہ جذبات کے فیصلے ہمیشہ پائیدار نہیں ہوتے۔ جذبات کے فیصلے نقصان دہ ہوتے اور تمام عمر اذیت کا باعث بنتے ہیں۔ آج جذباتیت مجھے اس موڑ پر لے آئی ہیں۔

میری اس کہانی سے ہر وہ لڑکی سبق سیکھے جو اندھے عشق کی کھائی میں کھونے کی پوری پوری تیاری کرچکی ہے۔ اس عشق کے کھیل میں نہ خدا ملتا ہے اور نہ ہی صنم۔

☆☆......☆☆

پانچویں سچ بیانی

منزل کہاں تھی!

تحسین جونیجو

اُس لالچ کی ماری دوشیزہ کی عبرت ناک کتھا، جسے صرف دولت سے پیار تھا

''سنیے میں تو کہتی ہوں یہ یتیم بچے ہیں، کوئی سہارا تو ہے نہیں ان کا۔ اپنے ہی گھر لے آئیں۔ دعا ملے گی اور ثواب بھی۔'' مسز حماد نے اپنے شوہر حماد صدیقی کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔



''مریم بھابی کے انتقال کے بعد بچے بالکل تنہا اور بے سہارا ہو کر رہ گئے ہیں۔'' مسز حماد کے اکلوتے بھائی کا انتقال ایک حادثے میں کئی سال پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اب بھابی کی اچانک موت سے وہ بہت رنجیدہ تھیں۔ حماد صدیقی سے بیگم کا دکھ دیکھا نہیں جا رہا تھا تو وہ تینوں بچے ثانیہ، بسمہ اور چھوٹے روحان کو اپنے ساتھ گھر میں رکھنے کو تیار ہو گئے۔

حماد صدیقی محکمہ پولیس میں ایس ایچ او کے عہدے پر فائز تھے۔ بہت ایماندار قول کے پابند آفیسر تھے، رزق حلال کمایا، رشوت کا پیسا، خود کھایا نہ اولاد کو کھلایا۔ مگر ان پر ایک جھوٹا الزام لگایا گیا۔ وہ ایک اسسٹنٹ کے ساتھ ڈیوٹی سے گھر آ رہے تھے۔ سرکاری گاڑی میں اپنے تو ایک لڑکا اور لڑکی کو غلیظ حرکتیں کرتے دیکھ لیا اور انھیں اریسٹ کر کے تھانے پہنچ گئے۔ وہ ان دونوں کو جیل میں ڈال کر گھر روانہ ہوئے کہ صبح مزید کارروائی کی جائے گی۔

صبح جب وہ ڈیوٹی پر پہنچے تو انھیں اس خبر نے ہلا کر رکھ دیا کہ وہ دونوں خودکشی کر چکے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ الزام بھی ان کی سر پر تھوپا گیا تھا کہ ایس ایچ او حماد صدیقی نے ہماری جان لی ہے۔ یہ صدمہ حماد صدیقی کے لیے ناقابل برداشت تھا، سو انھوں نے اس نوکری سے ہی استعفیٰ دے دیا اور پھر اپنا ذاتی ریسٹورنٹ کھول لیا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ریسٹورنٹ خوب چلنے لگا۔

اب انھیں اپنی اولاد کے مستقبل کی فکر تھی۔ سب سے بڑا بیٹا ہادی اس کے بعد سونیا، نمرہ اور چھوٹا مدثر۔ تین بچے مسز حماد کے بھائی کے، ان سب بچوں کی پرورش مسز حماد نے بہت بہتر انداز میں کی۔ کسی چیز کی کمی نہ ہونے دی۔ روپے پیسے کی فراوانی، نہ روک ٹوک۔ آزاد ماحول میں سارے بچے پل رہے تھے۔

وہ اب یہی سوچ رہے تھے کہ بچے جوان ہوں تو ہادی کی نوکری لگتے ہی اس کی شادی بھی کر دیں تا کہ اپنے کاندھوں سے کچھ بوجھ ہلکا کر پائیں۔

ثانیہ کا آج تو اپنی آنکھوں کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ جس کو دیکھو ان آنکھوں پر مرمٹتا تھا۔ سیاہ بھنورا سی ان آنکھوں کی خوب صورتی میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا تھا۔ اس کے حسن کی واضح اور مستند علامت یہ آنکھیں آج اسے بہت بُری لگ رہی تھی۔

ہادی چپ چاپ لیٹا ہوا چھت کو گھور رہا تھا۔ اس کے اندر جنگ ہو رہی تھی۔ یہ مخمل چھن چھن بجتی چوڑیاں، ہونٹوں پر لالی اس نے حیران ہو کر آج پہلی بار اسے غور سے دیکھا تھا۔ اور اس کا من چاہ رہا تھا بے تابی سے چیخ چیخ کر کہے، ہاں ثانیہ واقعی مجھے تم سے محبت ہے۔

دوسری جانب ثانیہ کی محبتیں بھی سمندر کی لہروں کی طرح موجیں مار رہی تھیں۔ معلوم نہیں کب یہ محبت پروان چڑھی اور سر چڑھ کر بولنے لگی۔

''ہادی! آپ نے آج کل شاعری کی کتابیں پڑھنا شروع کر دی ہیں؟''

''یوں سمجھ لو میرا شوق بدل گیا ہے، حیران کن بات یہ کہ اب مجھے سارے شعر سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔'' ہادی نے ایک بھرپور نظر اس کے وجود پر ڈالی اور سر جھکا لیا جبکہ ثانیہ اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

لڑکیاں جس عمر میں روپ لیں اور رنگین خواب آنکھوں میں سجا کر دن رات خیالوں میں کھوئی رہتی ہیں۔ اس عمر میں زمانے کی تلخیاں اور کڑوے سچ چپکے چپکے اپنے اندر اتارتی ہوتی ہیں۔ اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔

ہادی جاننا چاہتا تھا اس کی چمکدار، روشن آنکھیں یک دم کیوں دھندلی ہو جاتی ہیں۔ اس کی گالوں کے شہابی رنگ سرسوں میں کیسے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس کے لبوں کی دھیمی اور پاکیزہ مسکراہٹ لمحوں میں کہاں غائب ہو جاتی ہے۔ وہ بڑی الجھن میں پڑ گیا تھا۔ وہ کیا کرے کیسے ثانیہ کو کھوجے اسے خود سمجھ نہ آتا!!

☆☆☆

''سنیے اللہ کا شکر ہے یا شاید ہماری کسی نیکی کا اجر کہ اپنی اولاد بہت فرمانبردار ہے۔ کبھی ہمارے آگے زبان درازی نہیں کرتی ایسا کوئی کام نہیں کیا جس

سے مجھے اپنی محنت و محبت کے ضائع ہو جانے کا خدشہ لاحق ہوا ہو۔'' مسز حماد اب سنجیدگی سے اپنی سوچ سے حماد صدیقی کو آگاہ کر رہی تھیں۔

''ثانیہ ایک بہترین لڑکی ہے۔ بہت سلجھی ہوئی عقل مند، ذہین اور خوب صورت بھی۔'' انھوں نے نپے تلے لفظوں میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ لیکن لگ رہا تھا اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیں گی۔ بڑی خوشی اور فخر سے سر تان لیتی ہر آنے والے کو انکار کر دیا جاتا کہ میرے ہادی کے لیے دلہن تو گھر میں ہی موجود ہے۔''

ہادی تو ابھی شادی کے موڈ میں ہی نہیں تھا اسے بس فکر تھی تو اپنی جاب کی، شادی تو بعد میں بھی ہو جاتی بھی۔ مگر ماں کی ضد کے آگے۔ وہ مجبور تھا۔

اب بہانے سے ثانیہ ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنے دل کا حال سناتی، جواب طلب کر رہی تھی۔ ہادی نے ایک لمحے کے لیے اسے دیکھا جس کی آنکھوں میں، لہجوں میں اس کے لیے خلوص ہی خلوص تھا۔ اور اس خلوص کے ہاتھوں ہادی لمحوں میں ہار گیا۔

''جی جی بیگم صاحبہ بجا فرمایا۔ آپ کی کوئی بات غلط ہو سکتی ہے۔'' حماد صدیقی بیگم کے مزاج کو سمجھتے ہوئے اسی میں بہتری جانی تھی۔

☆☆☆

میرون کلر کے لباس میں ملبوس وہ بڑے آرام سے بیٹھی دلہن کے روپ میں ثانیہ خوب صورتی کا شاہ کار دکھ رہی تھی۔ تازہ پھولوں کی مہک سے سجا بیڈ روم ہادی کا استقبال کر رہا تھا۔

''آداب عرض ہے مسز ہادی! آخر کو ہم نے منزل پا ہی لی۔ وہ بھی اتنی جلدی کہ خواب کا سا گماں ہوتا ہے۔ پتا ہے ثانیہ آج تک میں یہ جان ہی نہیں پایا کہ تمہارے کتنے روپ ہیں۔'' ہادی ایک جذب کے عالم میں اسے تکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''یہ تعریف ہے کہ تنقید!'' ثانیہ نے ایک بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''جو بھی سمجھ لو کیونکہ کوئی الفاظ اس وقت میرا ساتھ دینے سے انکاری ہیں۔''

ہادی پڑھائی میں کوئی خاص نہ تھا۔ اس کی وجہ بے جا لاڈ، پیار، باپ کا پیسہ اور سفارش تھی۔ جس کا نشہ سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اور ہادی نے جی بھر کر اس آزادی کا فائدہ اٹھایا۔ کہنے کو تو وہ ریگولر ہی پڑھا مگر ایک دن بھی اس نے کالج، یونیورسٹی کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اور اسی طرح گریجویشن میں سیکنڈ پوزیشن بھی حاصل کر لی تھی۔ ساتھ ہی اس نے کمپیوٹر میں ڈپلومہ کیا مگر حیرت انگیز طور پر اس نے کمپیوٹر کلاسز بھی مس نہیں کیں کہ کمپیوٹر چیز ہی ایسی ہے، اُسے کیمرہ مین بننے کا بڑا شوق تھا اس شعبے میں بھی کئی کورسز کیے اور مہارت حاصل کر لی۔

مسز حماد کو فکر لاحق ہوتی کہ کسی طرح ہادی کی جاب لگ جائے تو وہ خود اپنی ذمہ داری نبھائے گا۔ حماد صدیقی کے آگے یہ کوئی سنگین مسئلہ نہیں تھا۔ ایک فون کال کی دیر تھی۔

دوسرے دن ہی ہادی کے لیے ایک جاب کال آ گئی۔

زیل پاک سیمنٹ فیکٹری میں آپریٹر کی پوسٹ ہادی کو مل گئی جہاں ہر چیز وہی آپریٹ کرتا۔ حیدر آباد کی یہ فیکٹری براعظم ایشیا کی نمبر ون اور دنیا کی پانچویں بڑی فیکٹری ہے۔ اس کے مالک سکندر علی جتوئی ہیں۔ ہادی کو تنخواہ بھی ٹھیک ٹھاک مل رہی تھی۔ دوسری طرف ہادی نے مختلف نیوز چینلز پر اپنا کیمرہ مین کا شوق بھی جاری رکھا۔ وہاں اس کے بہت سے دوست بھی بن گئے تھے۔ ان ہی میں سے ایک حمزہ تھا جو ایک چینل پر ہوسٹ کے فرائض انجام دیتا تھا۔ وہ ہر پروگرام میں ہادی کو ضرور انوائٹ کرتا اور وہ دونوں میاں بیوی پروگرام میں شرکت کرتے بحث ومباحثے کا پروگرام ہوتا تھا جس میں اکثر منسٹرز اور بڑے بڑے سیاستدان شریک ہوتے تھے۔

ایک سندھی پروگرام (عوام آرزو) کی گولڈن جوبلی بھی اس میں قائم علی شاہ، نوید قمر، سسی پلیجو اور کچھ منسٹرز کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ لائیو پروگرام تھا اس میں آڈینس کو بھی بولنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ پھر جب ثانیہ کو بولنے کا موقع ملا تو اس نے منسٹر کو لاجواب

کر دیا۔ وہ لائیو پروگرام تھا جو سب دیکھ رہے تھے۔ شہر کا ایک بڑا جاگیر دار رئیس سیٹھ نعمان بھی یہ پروگرام دیکھ رہا تھا۔ جو کہ ایک حاکم جماعت سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا دل ثانیہ پر آ گیا، حالانکہ اس کی اپنی تین بیٹیاں ثانیہ کی ہم عمر تھیں۔ وہ چاہتا تھا کس طرح ثانیہ کو اپنا لے۔ پھر اس نے ثانیہ کے بھائی رو حان سے دوستی کا آغاز کیا اور اپنی طرف سے زبردست جال پھینک کر اس کے بھائی کو جاب کا لالچ دیا۔ ثانیہ کو ہتھیانے کے منصوبے تیار کیے جا رہے تھے، جن سے ہادی لاعلم ہی رہا۔

اچانک ایک ہارٹ اٹیک سے حماد صدیقی کی موت واقع ہو گئی۔ اس صدمے نے مسز حماد کو توڑ کر رکھ دیا۔ وہ بالکل تنہا ہو گئیں اور انھوں نے خود کو کمرے تک محدود کر لیا۔ کون آتا ہے، جاتا ہے، کیا لاتا ہے، ہر بات سے وہ غافل ہو چکی تھیں۔

☆☆☆

ہادی سنبھلا تو ڈیوٹی پر جانے لگا۔ سونیا اور نمرہ ہی گھر بھر کا کام دیکھتی تھیں۔ ثانیہ اپنے کمرے کی ہو کر رہ گئی تھی۔ کوئی کام تو وہ کرتی نہیں تھی، بیٹھے بیٹھے بور ہو جاتی تو موبائل سے کھیلنے لگتی۔

''ہادی میں گھر میں تمہارہ رہ کر تنگ آ گئی ہوں۔ میں جاب کرنا چاہتی ہوں۔ ابو کی موت کے بعد امی بھی تنہا ہو گئی ہیں، میرے جاب کرنے سے وقت بھی کچھ اچھا گزرے گا۔''

''اچھا میں امی سے مشورہ کر کے تمھیں بتاؤں گا۔ اگر وہ مان جاتی ہیں تو۔'' اتنا کہہ کر ہادی باہر چلا گیا۔

☆☆☆

''ثانیہ ذرا اپنا موبائل تو دینا۔'' مسز حماد نے اس سے کہا۔ تو وہ سوچ کر رہ گئی کہ یہ ساسو ماں کو کیا ہو گیا ہے۔ میرا موبائل کیوں مانگ رہی ہیں۔

مسز حماد نے آگے بڑھ کر موبائل جھپٹ لیا۔ جو کہ ثانیہ کو بہت گراں گزرا۔

''امی آپ کو میرا موبائل کیوں چاہیے؟ اگر آپ کو ضرورت ہے تو میں ہادی سے کہہ کر آپ کو نیا موبائل دلواتی ہوں۔''

''خاموش بڑی آئی موبائل دلوانے والی..... مجھے کوئی سروکار نہیں موبائل لینے سے۔ یہ جو آج کل ہر وقت موبائل پر لگی رہتی ہونا، ہادی کی غیر موجودگی میں۔ اسے تو کچھ ہوش نہیں، لیکن میں تمہارے سارے کارنامے دیکھ رہی ہوں۔ مت بھولو کہ میں کمرے میں ہوں تو بے خبر ہوں۔ تم ہر وقت تو کمرے میں پڑی رہتی ہو۔ آخر کرتی کیا ہو؟ دن بھر تو کوئی کام تو کرتی نہیں ہو کہ تمہارا وقت اچھا گزرے اب مہارانیوں کی طرح ناشتا اور کھانے کے لیے باہر نکلتی ہو۔ کوئی ہوش بھی ہے تمھیں کہ گھر کے کام کیسے ہوتے ہیں۔ کون کرتا ہے؟ میری بیٹیاں تمہاری نوکرانیاں نہیں جو تمہاری خدمت کرتی رہیں۔ آخر کو انھیں بھی میں نے بیاہنا ہے۔ ساری عمر بٹھا کر نہیں رکھنا۔ بہت برداشت کر لی تمہاری من مانیاں، اٹھو گھر کی صفائی میں نمرہ کا ہاتھ بٹاؤ۔ ارے ہاں یہ تو میں بھول ہی گئی کہ مہارانی نے تو کبھی کسی کام کو ہاتھ تک لگایا نہیں۔ یہ جو تمہارے نازک سے ہاتھ ہیں اور بڑے بڑے ناخن جانوروں جیسے جن پر ہر وقت تم نیل پالش لگائے رکھتی ہو۔ انھیں تو میں کاٹ کے رکھ دوں گی۔ کبھی نماز بھی ادا کی ہوتی تو پتا لگتا نا، کہ نیل پالش سے تمہارا وضو کیسے ہوگا۔''

''اُف! اب بس بھی کریں امی! آپ میری خاموشی کا فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ میرے منہ میں بھی زبان ہے اگر بولنا شروع کیا تو......''

''تو تو کیا مطلب ہے تمہارا کیا کرو گی؟ بڑی آئی بولنے والی۔ اری کم بخت مجھے نہیں تھا پتا کہ شوہر کی غیر موجودگی میں کیا گل کھلا رہی ہے۔ اتنا ہی شوق تھا تو میرے آنگن میں ہی گل کھلاتی ایک سال ہونے کو ہے کتنے ارمان تھے میرے کہ پوتے پوتیوں کی قلکاریاں گونجیں اس گھر میں۔ مگر تمھیں عاشقی معشوقی سے فرصت ملے تب نہ۔ اندھی نہیں ہوں میں میرے گھر میں بھی جوان بچیاں ہیں۔ ان کے سائے سے بھی دور رہنا بتا رہی ہوں میں۔''

''اب بہت ہو گیا۔ کیا کیا ہے میں نے جو آنچ

اتنی ہمتیں لگا رہی ہیں۔'' ثانیہ کی ہمت اب جواب دینے لگی تھی۔

''بی بی یہ ڈھنگ میرے ہاں نہیں چلتے۔ کیا کیا ہے میں نے...... بے غیرت کہیں کی۔'' مسز حماد نے آج جی بھر کے بھڑاس نکالی۔

''پلیز امی میرا موبائل واپس کریں۔'' ثانیہ بھی ڈھٹائی پر اتر آئی۔

''اری او بے حیا۔ خوابوں کی دنیا سے واپس آ جا ورنہ اس دنیا میں چین سے رہنے نہیں دوں گی، کیا سمجھیں۔'' مسز حماد اس کا موبائل لے کر کمرے سے نکل آئیں۔

☆☆☆

مسز حماد ہادی کی راہ دیکھ رہی تھیں۔ گھر پہنچتے ہی ہادی کا راستہ روک لیا۔

''ایک منٹ ذرا ادھر تو آنا میرے لعل!''

''جی امی! میں فریش ہو کر ابھی آیا۔''

''جیتا رہ میرے بچے!'' کچھ دیر بعد ہادی کمرے میں پہنچا تو ماں کا بجھا چہرہ دیکھ کر پریشان سا ہو گیا کہ ضرور کوئی بات ہوئی ہے۔

''جی امی آپ نے بلایا کوئی کام ہے۔''

''ہاں بیٹا! آج تیری بیوی سے تو تو میں میں ہوئی ہے اور میں نے اسے کھری کھری سنائی ہیں۔ بیٹا میں تھک گئی ہوں اس کے ناز اٹھاتے اٹھاتے۔ سال بھر ہونے کو ہے تم خود سوچو، کبھی بھی میں نے یا تمہاری بہنوں نے اُف تک نہیں کیا نہ ہی کبھی کہا کہ ذرا کام میں ہاتھ بٹاؤ۔ میرا خیال تھا کہ اسے خود احساس ہو گا مگر نہیں اس کے تو تیور ہی نرالے ہیں۔''

''جی امی آپ بالکل صحیح کہہ رہی ہیں۔ میں سب دیکھ رہا ہوں۔ مگر کیا کروں۔ ایک لفظ بھی کہتا ہوں تو ناراض ہو جاتی ہے۔ اور آپ جانتی ہیں میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ وہ ناراض ہو کر چلی جائے۔'' ہادی نے اپنی پریشانی ظاہر کی۔

''چلی جائے گی؟ کہاں؟ نہ میرا بچہ لگتا ہے تو ابھی بچہ ہی ہے۔'' مسز حماد اسے سمجھاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''کہاں جائے گی کوئی ٹھکانہ ہے اس کا؟ کتنے برسوں سے وہ اور اس کے اور بہن بھائی ہمارے ہی گھر میں مقیم ہیں۔ آج سوچتی ہوں یہ نیک کام کر کے میں نے اچھا نہیں کیا۔ اس نیکی کا ہمیں کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اور مجھے کیا دیا ہے اس نے۔ ایک اولاد تک تو دی نہیں اس نے۔ کتنے ارمان ہوتے ہیں ماؤں کے کہ وہ اولاد کی خوشیاں دیکھیں اور ایک یہ منحوس ہے، جسے ابھی تک فکر نہیں کہ اولاد ہو۔ یا کسی ڈاکٹر کو دکھاؤں؟''

''ہاں امی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' ہادی افسردگی سے بولا۔

''میرا بچہ! تم اسے سمجھاؤ کہ یہ سب طور طریقے عزت دار لڑکیوں کے کسی کام کے نہیں ہوتے۔ پوتے پوتیاں تو ایک طرح کا سود ہی ہوتا ہے۔ جو ہر کر اولاد کی صورت والدین کو ملتا ہے۔''

''جی امی میں بھی شدت سے منتظر ہوں کہ کب اللہ کی طرف سے اپنا کرم اور اولاد کا سکھ نصیب ہو۔'' ہادی سوچ میں ڈوب کر کہنے لگا۔

''اداس نہ ہو انشاء اللہ ضرور کرم ہو گا۔''

☆☆☆

جونہی ہادی اپنے کمرے میں آیا ثانیہ برس پڑی۔

''سمجھ کیا رکھا ہے آپ کی ماں نے مجھے۔ گھر سے بھاگ کر نہیں آئی ہوں میں بیاہ کر لائی گئی ہوں۔ افراد ہی کتنے ہیں گھر میں، کون سا اتنا کام ہوتا ہے۔ اور پھر آپ کی لاڈلی بہنیں کسی کام کو ہاتھ لگانے دیتی نہیں ہیں۔ میں کیا کروں۔''

''اچھا اچھا...... اب بس کرو ایک تو میں تھکا ہارا آیا ہوں اوپر سے یہ نیا تماشا میں خود پریشان ہوں۔ مزید کچھ کہا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔'' ہادی چلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ بات بگڑتے دیکھ کر ثانیہ کو خاموش ہی ہونا پڑا۔

اس بے عزتی کا بدلہ کس طرح لیا جائے، وہ اپنے دماغ میں منصوبے تیار کرتی رہی۔

رات گئے جب ہادی سو جاتا تو چھپ چھپا کے ثانیہ کا بھائی اسے اپنا موبائل دے جاتا پھر وہ گھنٹوں

موبائل پر باتیں کرتی رہتی۔

ماہ دسمبر کی سرد ترین رات کھانے سے فارغ ہو کر سب لاؤنج میں ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ ہادی کے موبائل پر سیٹھ نعمان کی کال آ گئی۔

''ہیلو! ہادی میں آپ کے گھر کے قریب کھڑا آپ کا انتظار کر رہا ہوں، جلدی آؤ۔''

''ارے یار! اس وقت میں نہیں آ سکتا۔ ایک تو سردی بہت ہے اور پھر میں تھک بھی گیا ہوں۔'' ہادی نے جان چھڑائی۔

''نہیں یار بس دو منٹ کے لیے تو آؤ ضروری کام ہے۔'' اس کے اصرار پر نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے جانا ہی پڑا۔

''یہ کیا طریقہ ہے نعمان۔ اس سردی میں باہر نکلنا کتنا محال ہے۔ آخر ایسی بھی کیا آفت پڑ گئی تھی۔ جو زبردستی بلوایا ہے۔''

''غصہ کیوں کرتے ہو پیارے، یہ دیکھو تمہارے لیے ایک اسپیشل چیز لایا ہوں، دونوں کہیں بیٹھ کر مزے کرتے ہیں۔'' وہ وسکی کی بوتل نکال کر کچھ زیادہ ہی چہک کر کہنے لگا۔

''اسے تم اسپیشل چیز کہتے ہو؟ میں تمہارا لحاظ کر رہا ہوں اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو تم کہو گے میں کروں گا۔ ہمیں اس حرام چیز کو ہاتھ لگانا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔'' ہادی، سیٹھ نعمان کے ہاتھ میں شراب کی بوتل دیکھ کر۔ غصے سے بولا تھا۔

''ارے بات تو سُن۔''

''میں نے کوئی بات نہیں سُننی۔ ہم شریف لوگ ہیں ایسے بے ہودہ کام نہیں کرتے۔ اگر پہلے بتایا ہوتا تم نے تو میں ہرگز تمہارے پاس نہیں آتا۔'' ہادی نے سختی سے کہا۔ ''اور ہاں اگر کبھی بھی ایسی کوئی چیز یہاں لے کر نظر بھی آئے تو میں لحاظ بھول جاؤں گا۔''

یہ سنتے ہی سیٹھ نعمان وہ اپنا سا منہ لے کر وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

آخر کار ثانیہ نے ہادی کو اپنی جاب کے لیے راضی کر ہی لیا۔ اس نے اُسے بتایا کہ وہ ایک اسکول میں ٹیچنگ کرے گی۔ ہادی اس کی طرف سے مطمئن ہو گیا۔ اسکول کے بہانے ثانیہ گھر سے نکلتی اور سیدھا رئیس نعمان کی اوطاق میں چلی جاتی۔ پھر چھٹی کے وقت وہاں سے گھر پہنچ جاتی۔

کئی ماہ تک یہ کھیل چلتا رہا اور ہادی بے خبر رہا۔

مسز حماد کی شروع سے عادت تھی کہ سب بچوں کو فجر کی نماز کے لیے ضرور جگاتی تھیں۔ نماز پڑھ کر ناشتے کے بعد ہادی ڈیوٹی کے لیے نکل جاتا اور ثانیہ اسکول کے لیے۔ اچانک ہادی کی طبیعت ایک دن کچھ بوجھل بوجھل سی تھی۔ سر بھاری ہو گیا تو ڈیوٹی پر جانے کے بجائے وہ کمرے میں لیٹ گیا۔ دوپہر کو اس کی آنکھ کھلی۔ مسز حماد سمجھ رہی تھیں کہ وہ ڈیوٹی کے لیے نکل گیا ہے۔ لیکن وہ یوں ہی بے سدھ پڑا رہا۔ چھوٹی بہن نمرہ کمرے کی صفائی کرنے آئی تو اُسے سوتا دیکھ کر جگانے لگی۔

''ادا آپ ابھی تک سو رہے ہیں۔ ہم تو سمجھے کہ آپ آفس چلے گئے ہیں۔''

''ہاں گڈی! میری طبیعت بہتر نہیں تھی تو لیٹ گیا پھر آنکھ لگ گئی۔'' ان کی آواز سن کر مسز حماد بھی وہیں آ گئی تھیں۔

''ارے بیٹا تم اس وقت گھر پر؟''

''جی امی ڈیوٹی پر گیا ہی نہیں۔''

''یہ اچانک ہوا کیا بیٹا کسی ڈاکٹر کو دکھاؤ؟''

''ارے نہیں امی! ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔ میں ٹھیک ہوں اب۔''

مسلسل دو دن تک ہادی کے ساتھ یہی ہوتا رہا۔ پھر تیسری رات کو ثانیہ دودھ کا گلاس اُسے تھما کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ لیکن اس نے دودھ نہیں پیا۔ سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دیا۔ ثانیہ کمرے میں آتے ہی بولی۔

ہادی! ابھی تک تم نے دودھ ختم نہیں کیا؟''

''میرا دل نہیں چاہ رہا۔ ایسا کرو آج یہ دودھ تم پی لو۔ میرا قطعاً دل نہیں چاہ رہا۔'' ہادی نے دودھ پینے کے لیے اصرار کیا مگر ثانیہ دودھ پینے کو تیار نہیں تھی۔ یہ دیکھ کر ہادی چوکنا ہو گیا۔

ابن بطوطہ



ابن بطوطہ چودہویں صدی عیسوی کا ایک مشہور سیاح اور مورخ تھا۔ وہ 24 فروری 1304ء کو پیدا ہوا۔ 22 برس کی عمر میں اس نے حج کی غرض سے اپنے سفر کا آغاز کیا اور پھر اسے سیر و سیاحت کا ایسا شوق ہوا کہ اس نے اگلے 28 برس اسی شوق کی نذر کر دیے۔ اس دوران اس نے 75 ہزار میل کا سفر کیا اور افریقہ، روس، ترکی، جزائر مشرق الہند، چین، عرب، ایران، شام، فلسطین، افغانستان اور ہندوستان کی سیر کی۔ وہ محمد تغلق کے عہد میں ہندوستان آیا تھا۔ سلطان نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی اور اسے قاضی کے عہدے پر سرفراز کیا۔ 1354ء میں وہ واپس اپنے وطن مراکش گیا جہاں اس کی سیاحت کا ہنگامہ خیز دور ختم ہوا۔ سیاحت کے خاتمے کے بعد اس نے سلطان ابو عنان کے حکم پر اپنے سفر کے حالات عالم فاضل شخص محمد بن محمد ابن جزی کلبی سے لکھوائے۔ اس سفرنامہ کا جو 1355ء میں مکمل ہوا، مکمل نام ''تحفۃ النظار فی غرائب الامصار و عجائب الاسفار'' ہے۔ یہ چودہویں صدی کے مسلمانوں کی اجتماعی تاریخ کی ایک مفید، دلچسپ اور حیرت انگیز دستاویز ہے۔

''نہیں ہادی میں نے ابھی کھانا کھایا ہے اب دودھ کی گنجائش نہیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی ہر روز تم مجھے دودھ پلاتی ہو۔ شہد ملا کر آج تم پیو گی تو کیا ہو جائے گا۔'' ثانیہ نے گھور کر اسے دیکھا اور پھر لاچار ہو کر اسے دودھ پینا ہی پڑا۔ پھر ثانیہ کی صبح آنکھ نہ کھلی یہ دیکھ کر ہادی نے اپنا ڈیوٹی پر جانا ملتوی کر دیا۔ وہ کھوج میں پڑ گیا کہ آخر پتا تو چلے کہ یہ چکر کیا ہے۔

پھر دوپہر کو ثانیہ کی آنکھ کھلی۔

''گڈ آفٹرنون میڈم! میں تو جیسے منتظر ہی تھا کہ کب آپ خوب صورت آنکھیں کھولتی ہیں۔'' ہادی نے مصنوعی مسکراہٹ سجا کر اسے دیکھا۔

''کیا دوپہر ہو گئی ہے؟''

''ہاں جی۔''

''اوہو پتا ہی نہیں چلا آج بہت گہری نیند آئی تھی۔''

''آئی تھی نہیں نیند بلائی گئی تھی۔'' ہادی نے اسے احساس دلانے کی کوشش کی۔

''بلائی گئی تھی؟ مطلب!'' اب وہ پریشان سی ہو گئی تھی۔

''مطلب یہ کہ جو کئی دن سے آپ شہد ملا دودھ مجھے پلا رہی تھیں۔ وہ کل رات آپ نے ہی پی لیا۔ اور میرے خیال سے مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہے ناں؟''

''پلیز ہادی مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ اب ایسا کچھ بھی نہیں ہو گا۔'' ثانیہ ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

''کسی معافی کی مجھے ضرورت نہیں بس اتنا بتا دو کہ آخر تم چاہتی کیا ہو۔ کیوں مجھے اذیت میں رکھا ہوا ہے۔ ساتھ میں اپنا اور میرا گھر بھر کا سکون برباد کرنے پر تلی ہوئی ہو؟'' ہادی نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''ہادی وہ رئیس ہے نا، نعمان! اس نے مجھے بہت تنگ کر کے رکھا ہوا ہے کہتا ہے کہ مجھ سے شادی کر لو۔ میں نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی ہے

مگر وہ کچھ سننے کو تیار نہیں۔ یہ نیند کی گولیاں بھی اس نے ہی مجھے دی ہیں کہ اپنے شوہر کو دے کر ہر رات مجھ سے فون پر بات کرو ورنہ تمہارے پورے خاندان کو گولیوں سے اڑا دوں گا۔ بس ہادی میں بہت مجبور ہو کر یہ کر رہی تھی۔ تم اور سب گھر والے مجھے بہت عزیز ہو اور میں کسی کو کھونا نہیں چاہتی اس لیے میں نے یہ سب......"

"اب رونا بند کرو۔" ہادی دھاڑا۔

"اکیلے کمرے میں رہ کر تمہارا دماغ تو پورا ہی شیطان کا کارخانہ بن گیا ہے۔ پاگل ہو گئی ہو تم۔ کہہ نہیں سکتی تھیں مجھ سے۔ ہم دونوں مل کر کوئی نہ کوئی حل ضرور نکالتے۔ اب پانی سر سے اونچا ہونے کو ہے تب بتا رہی ہو؟" وہ کچھ دھیما ہوا پھر بولا۔

"اب تم اس سے بات مت کرنا، سوچتے ہیں کچھ۔" یہ کہہ کر ہادی گھر سے باہر چلا آیا۔

☆☆☆

باہر بھی اس کا دل بے چین ہی رہا۔ یوں ہی ٹہلتے ہوئے سندھو دریا المنظر کے ساحل پر پہنچ گیا۔ ٹھنڈی ہوائیں پانی کا شور یہ سب کتنا اچھا اور فرحت بخش لگتا ہے۔ مگر اس وقت اس کی نگاہیں کسی اور منظر میں کھوئی ہوئی تھیں۔

کافی دیر تک فون کی گھنٹی بجتی رہی۔ جیب سے فون نکال کر دیکھا تو اس کی والدہ کی کال آ رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے فون اٹینڈ کرنا پڑا۔

"جی امی بولیں۔"

"کہاں ہو ہادی؟"

"امی میں ذرا باہر ہوں دوستوں کے ساتھ کوئی کام ہے۔؟" اس نے بات بنائی۔

"اچھا بیٹا! وہ ثانیہ کی بہن صبا آئی ہے، اپنے شوہر کے ساتھ۔ تم سے ملنا چاہتے ہیں وہ۔ تم۔ تو جلدی گھر آ جاؤ۔"

"جی امی بس تھوڑی دیر میں پہنچتا ہوں۔" کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

"اسلام علیکم!" اس نے لٹھ مار انداز میں سلام جھاڑا۔

"لو میاں ہم نے تمہارے لیے ایک تحفہ تیار کر لیا ہے۔ ثانیہ کے بہنوئی نے جیب سے پستول نکال کر دکھائی۔ جسے دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ سوچ نے رہی سہی قوت بھی سلب کر لی۔

"ثانیہ یہ سب کیا ہے؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا تو قیر بھائی کو ہوا کیا ہے؟" مگر ثانیہ خاموش ہی رہی۔

"ابے اس سے کیا بات کرتا ہے، مجھ سے کر۔ بول ثانیہ کو طلاق دیتا ہے یا...... دو چار بندوں کو ٹھکانے لگانا پڑے گا۔ جلدی بول ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے کہ تجھ سے مغز ماری کرتے رہیں۔" اس نے پستول عین ہادی کی کھوپڑی کے درمیان میں رکھ کر کہا۔

ثانیہ کا مطمئن چہرہ صاف بتا رہا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے اسی کی ایماء پر ہو رہا ہے۔ اس کی آنکھوں کے آگے نازک سی عینک دھری ہوئی تھی جو اس کی آنکھیں چھپا نہیں سکتی تھی۔ ہادی جانتا تھا کہ اس عورت کو اس راستے پر جانا ہے جو ہرگز ہموار نہیں۔ ثانیہ کا شمار ان لوگوں میں سے تھا جو جاتے جاتے بھی پلٹتے نہیں ہیں۔ سو اسے روکنا ایک فضول ہی تھا۔

"آپی پلیز اسے سمجھائیں آپ جانتی ہیں، اس کی یہ ضد بالکل فضول اور بے معنی ہے۔" صبا نے ایک نظر اٹھا کر ہادی کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

بڑے کمرے میں تمام اہل خانہ کی عدالت لگی ہوئی تھی اور کٹہرے میں کھڑا تھا، ہادی، جس کا کوئی جرم ہی نہیں تھا۔ بظاہر جج اس عدالت میں مسز حماد تھیں مگر سارے وکلا اور گواہان جوش میں آ کر ان کی حیثیت اور مرتبے کو یکسر فراموش کر گئے تھے۔ لیکن اب جب ثانیہ اور اس کے میکے والے ہی بضد تھے تو کوئی وجہ باقی نہیں رہتی تھی کہ ہادی انکار کر پاتا۔ اس کی نگاہیں اب ثانیہ کے جواب کی منتظر تھیں۔ جو بُت بنی کھڑی رہی۔

"بولو ثانیہ! کیا واقعی تم طلاق چاہتی ہو؟ کیا دکھ دیا ہے میں نے تمہیں۔ کسی چیز کی کمی ہے مجھ میں یا گھر میں۔ ایسی کوئی فرمائش جو میں پوری نہیں کر پایا۔ بولو

مجھے جواب چاہیے۔" ہادی نے معصومیت سے اس کی جانب دیکھا۔ مگر وہ خود سے بے نیاز پتا نہیں کن سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اچانک بول پڑی۔

"ہاں ہاں ہادی میں پورے ہوش و حواس میں ہوں اور اب مجھے طلاق ہی چاہیے۔ میں نہیں رہ سکتی تمہارے ساتھ تم لوگوں نے ہمیں پال پوس کے بڑا کیا۔ صبا باجی کی چھوٹی سی عمر میں شادی کروا دی۔ یہ تمہارا احسان ہے۔ ہر چیز دلوائی مگر تم میرے آئیڈیل کبھی نہیں تھے۔ پسند تو میں تمہیں اس شاندار بنگلے کی وجہ سے کرتی تھی۔ مجھے حصہ اسی صورت میں مل سکتا تھا۔ بڑی جدوجہد کے بعد بھی میں بس گھر سے باہر والا خالی پلاٹ ہی اپنے نام کر پائی کہ کچھ عرصے کے بعد وہاں گھر تعمیر کروا کے شفٹ ہو جائیں گے۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ تم اپنی ماں اور بہن بھائی سے الگ رہ ہی نہیں سکتے۔ تمہاری ماں تمہاری کمزوری ہے۔ بس پھر مجھے یہ سب کرنا ہی تھا۔ اب سن لو اس بنگلے کی بھی اب مجھے اب کوئی ضرورت نہیں۔ رئیس نعمان لاکھوں کی زمین و جائیداد کا اکلوتا وارث ہے۔ کیوں کہ اس کے بھائی کے پاس کروڑوں کی جائیداد ہے۔ اس نے اپنا حصہ بھی نعمان سے نہیں لیا۔ اب ہمارے راستے الگ الگ ہیں۔"

مزید کچھ سننے کی ہادی ہمت جواب دے گئی۔

سامنے پڑے طلاق کے کاغذات پر اس نے دستخط کر دیے۔ اپنا سارا زیور بھی ثانیہ ساتھ لے گئی۔

ہادی بت بنا گھور اندھیرے میں اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ ایک پل میں وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرے چھانے لگا۔

☆☆☆

"بیٹا کب تک اس کا سوگ مناؤ گے؟" نکلو اس اندھیرے کمرے سے، یہ دیکھو کیسی ہے؟"

"پلیز امی سونے دیں نا۔ کچھ نہیں دیکھنا مجھے۔"

"میں کہہ رہی ہوں ناں دیکھ لو ایک نظر۔"

"کیا مصیبت ہے۔ کیا ہے؟"

"یہ دیکھو نمرہ کی دوست ہے۔ میں خود مل کر آئی ہوں۔ بڑے ہی اچھے اور شریف خاندان ہے۔ خاص کر یہ لڑکی بڑی پیاری ہے۔ نہ صرف صورت بلکہ سیرت میں بھی پیاری ہے۔ سگھڑ، سلیقہ مند، اور سب سے اچھی بات اخلاق تو بہت ہی پسند آیا مجھے اس کا۔"

"امی آپ بھی نہ کن چکروں میں پڑ گئی ہیں۔ میں نے کوئی شادی وادی نہیں کرنی۔"

"کیوں شادی نہیں کرنی۔ زندگی بھر کیا میں تمہارے ساتھ رہوں گی؟ میرا بچہ کیا پتا کب بلاوا آ جائے۔ مان جاؤ ناں۔ بس یہ میری فرمائش پوری کر دو، پھر تمہیں کچھ بھی نہیں کہوں گی۔" ماں کے اصرار پر ہادی مناہل کو دلہن بنا کر گھر لے آیا۔

مناہل واقعی ایک بہترین شریک حیات ثابت ہوئی کہ وہ اپنا دکھ بھول کر اس کی خوشی کے لیے جینے لگا۔ کبھی اس نے نہ سوچا تھا یک دم مناہل یوں بہار بن کر اس کی زندگی میں آئے گی۔ اس کی سمجھداری اور سگھڑ پن نے جلد ہی سب گھر والوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ وہ سوچتا کہ ایک لڑکی میں ایک ساتھ اتنی خوبیاں کیسے ہو سکتی ہیں؟ سچ میں ثانیہ اور مناہل میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ جتنا رب کا شکر ادا کروں کم ہے۔

☆☆☆

رئیس نعمان کے باپ کو جب بیٹے کی اس حرکت کا علم ہوا تو اس نے اسے جائیداد سے عاق کر دیا۔

اور جائیداد سے عاق ہونے کی دھمکی نے کام کر دکھایا اور نعمان رئیس نے ثانیہ کو دودھ کی مکھی کی طرح اپنی زندگی سے بے دخل کر دیا۔ صبا اور اس کے شوہر بھی نعمان سیٹھ کی دولت جو ثانیہ کی صورت ان کو بھی ملتی پر آنکھ لگائے بیٹھے تھے۔ بازی پلٹی تو انھوں نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ یوں ثانیہ نے اپنی جنت کو اپنے ہاتھوں آگ لگا لی۔

اب دونوں بہن بھائی ثانیہ اور روحان ہادی کے گھر کے سامنے پڑے ہوئے اپنے نام کرائے پلاٹ پر ایک جھونپڑہ نما کمرہ بنا کر رہ رہے ہیں۔ اپنے نام کی جائیداد ان کے ہاتھ میں ہے مگر اپنے نام کا مقدر وہ گنوا چکی ہے۔

☆☆......☆☆



ریحانہ آفتاب عمران

اُس مرد کی کتھا، جو پردیس میں تنہائی کا شکار تھا مگر......

''ایہا، میں نے فیصلہ کرلیا، میں شادی کرلوں گا۔'' حیات کی بہت جھنجھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ایہا جس نے رات کی ہنڈیا جلدی جلدی وقت سے پہلے بنائی تھی۔ بچوں کو دس منٹ پہلے ٹیوشن سینٹر چھوڑ آئی تھی۔ ساس کو شام کی چائے کے ساتھ گھر کے سموسے بھی دس منٹ پہلے دے چکی تھی۔ اس نے کئی گھنٹوں سے گھڑی پہ نظر جما رکھی تھی کہ کب سات بجیں اور وہ اپنے سرتاج سے بات کرے۔ سات بجنے سے پہلے اس نے ذہن میں تمام کام کی تفصیل دہرائی کہ کچھ رہ تو نہیں گیا۔ مگر وہ تمام امور نپٹا چکی تھی۔ حیات کا میسج آچکا تھا کہ وہ سات بجے اسکائپ پہ آن لائن ہوگا۔

ایہا نے جس گرم جوشی اور محبت سے سلام کیا تھا جواب اتنی ہی بے دلی سے آیا تھا۔ وہ ابھی اس کے تاثرات سمجھنے کی کوشش ہی کررہی تھی جب اس نے اپنا مدعا بیان کردیا۔ وہ کئی لمحے تک کچھ بول نہ سکی۔

حیات بہت جھنجھلایا ہوا لگ رہا تھا۔

حیات شادی کے تین سال بعد ہی ابوظہبی چلے گئے تھے۔ اور اب انھیں وہاں رہتے چودہ سال ہوچکے تھے۔ وہ ایک سال کی عفیرا، اور ڈھائی سال کے شہروز کو چھوڑ کر گئے تھے۔ وہ ہر سال پاکستان کا چکر لگاتے تھے۔ چھٹیوں میں آتے تو بچوں کو ہر سال بڑھتا دیکھ کر خوش ہوتے۔ ان ادوار کی کتنی ہی خوبصورت ساعتیں انھوں نے مس کردی تھی۔

''ابوظہبی جانے کا فیصلہ بھی آپ کا ہی تھا۔'' ایہا نے ہولے سے کہا۔ وہ چڑ گیا۔

''ہاں میرا تھا اور بالکل صحیح تھا۔ پاکستان میں رہ کر کیا ملتا مجھے۔ آج بھی بیس ہزار کی نوکری کررہا ہوتا۔ اگر ابوظہبی نہیں آتا تو تین تین بہنوں کی شادی پاکستان کی کمائی سے کرسکتا تھا؟ اماں، ابا کے ہاسپٹل، اور دواؤں کا خرچہ پورا کرسکتا تھا۔؟ بچوں کو اچھی تعلیم دلا سکتا تھا؟ میرے بن باس کاٹنے کی وجہ سے آج تم پوش علاقے کے چھوٹے سہی لیکن بنگلے میں بیٹھی ہو۔''

وہ اچھا خاصا چڑ کر اک اک چیز گنوانے لگا۔

''اب تو آپ کے تمام مسائل حل ہوگئے لوٹ آیئے۔'' ایہا نے کئی بار کی کہی بات دہرائی۔

''کیا کروں، آکر...... کیا وہاں کی کمائی سے میں عفیرا کو لاکھوں کا جہیز دے سکوں گا؟ شہروز کو لندن میں پڑھانے کا خواب پورا کرسکوں گا؟ بچوں جیسی باتیں کرتی ہو۔'' ایہا کو پتا تھا ایسا ہی کوئی جواب آئے

گا۔ حیات اُن لوگوں میں سے تھا جن کے سر پہ ملک سے باہر جا کر کمانے اور کچھ بننے کا بھوت سوار رہتا ہے۔ وہ پاکستان میں محنت کرنے یا پیسہ لگانے کو بے وقوفی سمجھتے تھے۔

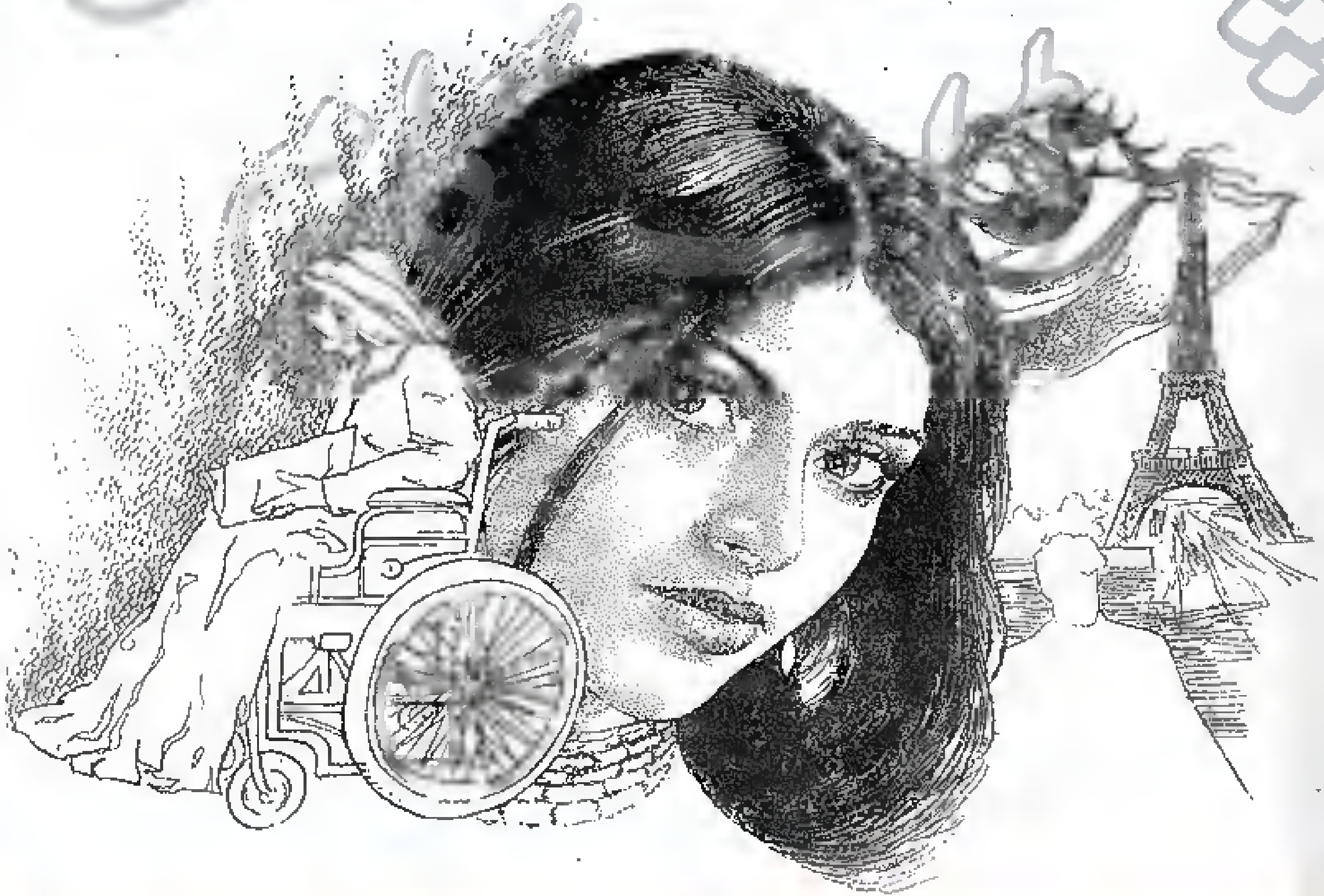
''تم سب کو عیش و عشرت کی زندگی دیتے دیتے میں خود کو اذیت دیتا رہا۔ پہلے تو سال میں اک چکر لگ جاتا تھا۔ مگر اس بار سے ہر دو سال میں پاکستان آسکوں گا۔ ان چند دنوں کی چھٹیوں میں، میں دو سال تو نہیں نکال سکتا۔ بجائے اس کے کہ حرام کاری کروں، زنا کروں۔ اس سے بہتر ہیں کہ میں دائرہ اسلام میں رہ کر نکاح پڑھا کے اپنا انتظام کرلوں۔'' حیات خود غرضی سے بول رہا تھا اور ایبہا کئی لمحے تک کچھ بول نہ سکی۔

''یہاں قدم قدم پہ مواقع ہیں لیکن اللہ کا شکر ہے میں نے آج تک خود کو کبیرہ گناہ سے بچائے رکھا۔ لیکن کب تک؟''

''آپ صرف اپنا ہی ذکر کر رہے ہیں۔ چودہ سال سے میں بھی آپ کے بغیر بن باس کاٹ رہی ہوں۔ میں بھی پورا سال انگلیوں پہ دن گن گن کر گزارتی ہوں۔ جتنی کالی راتیں آپ کے حصے میں آئیں اتنی ہی میرے حصے میں بھی۔ آپ کو تو اللہ نے آپشن دیا ہے۔ آپ نے اپنی بشری تقاضوں کا عمدہ حل پیش کیا ہے۔ لیکن یہ فیصلہ کرتے ہوئے آپ نے اک پل کے لیے بھی میرے لیے سوچا کہ میں کیا کروں؟ میرے پاس تو کوئی آپشن ہی نہیں۔'' ایبہا کے دل سے آہ نکلی۔

''اللہ نے عورت کو بہت مضبوط بنایا ہے۔ مرد کو خود پہ کنٹرول نہیں ہوتا۔'' حیات ان مردوں میں سے تھا جنہیں لگتا تھا عورت صرف قربانی دینے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ ایبہا کے درد کو سمجھے بغیر وہ اپنا راگ الاپ رہا تھا۔ صاف ظاہر ہے وہ فیصلہ کر چکا ہے۔ اور اب صرف ''فارمیلٹی'' نبھا رہا تھا۔ کئی گھنٹے تسلی سے باتیں کرنے کا ارادہ رکھنے والی ایبہا دس منٹ میں تھک گئی تھی۔ اس نے لیپ ٹاپ بند کر کے رابطہ منقطع کر دیا۔ ایبہا کو چودہ سالہ قربانی بے ثمر لگنے لگی۔

ان کی ارینج میرج تھی مگر شادی کے بعد دونوں



ایک جان دو قالب بن گئے تھے۔ حیات تین بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ والد سرکاری ملازم تھے۔ ابیہا اور بچوں کے ساتھ اس کی پندرہ ہزار کی سیلری کہاں جاتی تھی پتا نہیں چلتا تھا۔ اس نے باہر جانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ دوستوں سے قرض لے کر ابوظہبی چلا گیا۔ وہاں بوتیک میں سیلز مین تھا۔ مگر تنخواہ اتنی تھی کہ دن بہ دن ان کے گھر کے حالات بہتر ہو رہے تھے۔ چودہ سال سے ایک ہی جگہ کام کرنے سے اب اس کی سیلری میں کئی گناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ سال میں پندرہ دن کی چھٹی تھی اور وہ دن ابیہا کی زندگی میں بہار لے کر آتے تھے۔ لیکن پچھلے سال کمپنی نے کانٹریکٹ میں تبدیلی کر دی تھی اب وہ دو سال بعد آتا۔ حیات اب اکیلے رہ کر تھکنے لگا تھا۔ ابیہا کو بھی اس کے نہ آنے کا افسوس تھا۔ لیکن آج حیات نے جو فیصلہ سنایا اس سے ابیہا کو زندگی ریورس ہوتی محسوس ہوئی۔

تینوں نندوں کو رخصت کر کے، آئے دن ان کی دعوتیں کر کے ساس، سسر کے ساتھ ہاسپٹل کے چکر لگا کے عفیرا، شہروز کو ماں باپ دونوں کو پال کر اسے کیا صلہ ملا تھا؟ حیات اپنی کمزوری کا ذکر کرتے اس کی عظمت کو بھول گیا تھا۔ جو سالوں سے اس کے گھر، ماں باپ اور بچوں کو پال رہی تھی۔ ان کی ہر ضد، ناز نخرے اٹھا رہی ہے۔ وہ جانے کتنی ہی دیر ساکت بیٹھی رہتی۔ جب اس کی ساس نے اسے پکارنا شروع کر دیا۔ وہ سست قدموں سے اٹھی۔

''حیات سے بات ہو گئی کیا؟'' ساس اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگیں۔

''جی!'' وہ تھکے تھکے انداز میں ان کے بستر پہ بیٹھ کر پیر دبانے لگی کہ یہ روز کا معمول تھا۔

''میری بات کیوں نہ کروائی؟'' وہ خفگی سے اس کے بجھے بجھے چہرے کو دیکھنے لگیں۔

''لائن کٹ گئی کل کر لیجیے گا۔'' اس نے بہانہ کیا۔

''اتنی روتی شکل کیوں بنائی ہوئی ہے۔ حیات تو ٹھیک ہے؟'' انھیں فکر ہوئی۔ ابیہا کو بہت رونا آ رہا تھا۔ مگر خود پہ ضبط بٹھائے رکھا۔

''حیات شادی کر رہے ہیں۔'' بالآخر اس نے بول ہی دیا۔

''اچھا..... چلو اچھی بات ہے۔ کب تک اکیلا رہے گا پردیس میں، سو مسائل ہوتے ہیں اکیلے مرد کے۔'' ساس اک لمحے کو حیرت کا اظہار کر کے جانے کس کو سنا رہی تھیں۔

''تو تُو نے اس لیے روتی شکل بنا رکھی ہے؟''

ساس کو شاید اس کا انداز پسند نہیں آیا تھا۔ ابیہا سے آنسو روکنا محال ہو گیا تھا۔ وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ پیچھے ساس پیر نہ دبانے پہ کتنی دیر بڑبڑا کر اسے برا بھلا بولتی رہیں۔

''ہزاروں مرد سال دو سال میں شادی کر لیتے ہیں۔ میرے بیٹے نے تو چودہ سال نکال دیے۔ پھر بھی میسنی کسوے بہا رہی ہیں۔''

☆☆☆

اگلے روز حیات نے ثنا کی تصویر بھیجی تھی۔ ابیہا اک نظر تصویر پہ ڈال کر اپنے کام میں لگ گئی۔ شہروز اور عفیرا نے تصویر کے متعلق پوچھا تھا۔ اور حیات کے دوسری مما کے تعارف کرانے پہ وہ دونوں کئی لمحے حیرانی سے اپنے ماں، باپ کو دیکھنا بھول گئے کہ انھیں اپنے پپا سے کیا فرمائش کرنی تھی۔ پھر وہ دونوں بھی حیات سے زیادہ دیر بات نہیں کر سکے تھے۔ ساس سسر ہی گھنٹوں لگے رہے۔

حیات اسی ہفتے شادی کر رہا تھا۔ یہ نیوز اسے ساس سے ملی تھی۔ دونوں بچے بہت خاموش ہو گئے تھے۔ ابیہا انھیں چیئر اپ کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

''پپا کے والدین کی خدمت آپ کرتی ہیں۔ ہر ہفتے کسی نہ کسی پھوپو کے آنے پہ دعوت کا اہتمام کرتی ہیں۔ ہمارے اسکول، اکیڈمی کے پرابلمز دور کرتی ہیں۔ گھر کا راشن، بل، چیزوں کی مرمت سب آپ دیکھتی ہیں۔ اور پپا آپ کی سوکن لا رہے ہیں۔ آپ کو دکھ نہیں ہو رہا۔'' چودہ سالہ عفیرا نے بہت دکھ سے ابیہا کو دیکھتے سوال کیا تھا۔ بچے کم عمر ضرور تھے۔ مگر انھیں ہر بات کی سمجھ تھی۔ ابیہا نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر کسی کام میں لگ گئی۔ عفیرا اور شہروز نے اک

دوسرے کو خاموشی سے دیکھا تھا۔

☆☆☆

حیات نے شادی کر لی تھی۔ بشری تقاضے پورے کرنے کے لیے انھیں اک ساتھ مل گئی تھی۔ وہ اور ثناء اسکائپ پہ آن لائن تھے۔ ثناء بہت مسکرا کر مسکرا کر بات کر رہی تھی۔ شہروز اور عفیر اسلام دعا کے بعد ہٹ گئے تھے۔ حیات کے بلانے پر بھی نہیں آئے۔ ایبہا کے سسر، ساس ہی باتیں کرتے رہے۔ جب وہ بھی تھک کر سائیڈ ہو گئے تو مجبوراً ایبہا کو سامنے آنا پڑا۔

''شادی مبارک ہو!'' اس نے دونوں کو دمکتے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے اپنے سیل فون پہ چل رہے تھے۔ لیپ ٹاپ پہ وہ آن لائن ہے۔

''بچوں کو سمجھاؤ، دھیرے دھیرے وہ سمجھ جائیں گے۔'' حیات اک اور ذمہ داری ڈالنے لگا۔ اس نے سر ہلایا۔

''آپ کو اک ای میل کیا ہے چیک کر لیں۔'' ایبہا ثناء کو دیکھ کر مسکرائی۔ حیات سے گویا تھی۔

''خیریت۔ چلو بعد میں دیکھ لوں گا۔'' حیات نے اپنا سیل فون اٹھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں ابھی دیکھ لیں۔'' اصرار پر اس نے ای میل چیک کیا۔ اگلے پل اس کے چہرے پہ حیرانگی تھی۔

''خلع کا نوٹس!''

''جی، میں آپ سے خلع چاہتی ہوں۔ بچوں نے میرے ساتھ رہنے کی خواہش کی ہے۔ جب بھی آپ مستقل پاکستان آجائیں گے تب آپ خود ان سے پوچھ لیجیے گا اگر وہ آپ کے ساتھ رہنا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' ایبہا بہت سکون سے کہہ رہی تھی۔ حیات غصہ ہونے لگا۔

''تم یہ کیوں کر رہی ہو۔ میں نے شادی کر لی اس لیے؟''

''آپ کی تمام باتوں سے اتفاق ہے۔ آپ کو چار شادیوں کی اجازت ہے۔ اگر آپ نے عمر رسیدہ، بیوہ، مطلقہ سے شادی کی ہوتی تو شاید میں صبر کر لیتی لیکن آپ نے مجھ سے بھی آٹھ سال چھوٹی کنواری لڑکی سے شادی کر کے خود کو میری نظروں سے گرا لیا ہے۔

میں جو کل تک بن باس کاٹ رہی تھی کہ آپ اپنی بہنوں، ماں باپ کی ذمہ داریوں سے فارغ ہو کر آخر میں میرے اور میرے بچوں کے پاس آئیں گے مگر آپ نے خود غرضی سے صرف اپنے لیے سوچا...... اور میں مزید ایک خود غرض انسان سے جڑی نہیں رہ سکتی۔ جسے صرف اپنی طلب کی پڑی ہے۔ وہ کسی کی پیاس محسوس نہیں کر سکتا۔ میں ابھی بچوں کو لے کر اپنی سہیلی کے گھر چلی جاؤں گی۔ پھر جلد اپنا ٹھکانہ کر لوں گی۔''

حالِ دل نہ کہنا

حالِ دل نہ کہنا
سکھیو! اپنا حالِ دل نہ کہنا
خاموشی سے
چپکے چپکے
سارے دکھ تو سہنا
لیکن اپنا حالِ دل نہ کہنا
کوئی نہیں ہے سننے والا
اور اگر سن لے گا کوئی
پھر کیا ہوگا
اپنا دکھ تو آپ اٹھانا پڑتا ہے
اپنے آنسو خود ہی رونے پڑتے ہیں
تنہائی میں آنکھوں آنسو بہنا
لیکن اپنا حالِ دل نہ کہنا
سکھیو! اپنا حالِ دل نہ کہنا

شاعرہ: سعدیہ سیٹھی۔ لندن

ایبہا نے آئینہ دکھانے کے بعد آئندہ کا لائحہ عمل سے بھی آگاہ کیا۔

''اور میرے ماں باپ کو کس کے سہارے چھوڑ ے جا رہی ہو۔'' حیات غرایا شاء خاموش تماشائی بنی ہوئی تھی۔

''جب آپ سے ہی تعلق نہیں رہے گا تو ان سے کیسے رکھوں گی۔ ماشاء اللہ ان کی چار اولادیں ہیں وہ دیکھیں۔'' ایبہا کہہ رہی تھی۔ ساس اور سسر اسے بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ حیات تلملا رہا تھا۔

ایبہا کا میکہ ماں باپ کے مرتے ہی ختم ہو گیا تھا۔ ایسے میں اتنے بڑے فیصلے کا حیات کا گمان بھی نہ تھا۔

اسے لگا تھا وہ رو دھو کر صبر کر لے گی مگر جب وہ اس کے سامنے بچوں کا ہاتھ پکڑ کر گھر کی دہلیز پار کر گئی تو اسے اس کے فیصلے کی مضبوطی کا احساس ہوا۔ باہر کی کمائی کی دھن میں خود غرض ہوتے حیات نے اس کی قربانیوں کو فراموش کر دیا تھا۔

☆☆☆

زندگی کے کتنے ناکامی محاذوں پر اسے حیات کی کمی محسوس ہوئی تھی مگر وہ خود کو بہلاتی رہی۔ گھر چھوڑنے کا فیصلہ آسان نہیں تھا۔ آگے ایک لمبی زندگی پڑی تھی۔ بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا تھا۔ مگر اسے یقین تھا اس نے جو قدم اٹھایا وہ درست تھا۔ قربانی ہر بار وہ ہی کیوں دے؟ جن مسائل کا تقاضوں کا حیات کو سامنا تھا وہ بھی تو اسی کرب سے گزر رہی تھی۔ فرق اتنا تھا کہ حیات جان بوجھ کر پیسوں کے ہوس میں اس سے دور رہنا چاہتا تھا۔ اور وہ اس کے فیصلے کو مانتی رہی۔

اک مناسب جاب ڈھونڈنے میں اسے کئی ماہ لگ گئے۔ حیات نے اسے طلاق دے دی تھی۔ اس کے والدین کی زندگی قابل رحم ہو گئی تھی۔ دیکھ بھال کرنے والی ملازمہ جو چلی گئی تھی۔ بیٹیاں کبھی آتی تھیں اور جو پکا کر جاتیں وہ پورا ہفتہ کھاتے۔

حیات نے بچوں کے اخراجات دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ایبہا قانونی پیچیدگیوں میں الجھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے پاس ہمت، حوصلہ تھا۔ اس کی اصل دولت اس کی اولاد اس کے ساتھ تھی۔ جس نے حیات کے لاکھ چاہنے پہ بھی اس کی طرف رجوع نہیں کیا تھا۔

آنے والے کئی سال کٹھن تھے۔ جب تک بچے تعلیم مکمل کر کے اپنے پیروں پہ کھڑے نہ ہو جاتے۔ ایبہا ڈٹی ہوئی تھی۔ وہ تھکی ہاری کام پر سے آئی تھی۔ گھر بچوں سے بھرا ہوا تھا۔ شہروز عمر سے زیادہ میچور اور سمجھ دار ہو گیا تھا۔ وہ او لیول کر رہا تھا۔ محلے کے بچے اس کے پاس پڑھنے آتے تھے۔ اور اس کی آمدنی اس کی تعلیم پہ خرچ ہو رہی تھی۔

عفیرا بھی تمام بچوں کے ساتھ شہروز سے ہی پڑھتی تھی۔ ان سب کو پڑھا کر شہروز خود بھی پڑھتا تھا۔

''بھائی! ہیرو کی کیا ڈیفی نیشن ہوتی ہے؟'' ٹیچر نے کہا ہے ہیرو پہ مضمون لکھنے کو...... مگر یہ ہیرو کون سا ٹائپ کا ہو۔'' عفیرا نے رجسٹر نکال کو شہروز کو تھمایا۔

ایبہا قریب ہی بیٹھی کنپٹی دبا رہی تھی۔

''بھیڑ میں ہزاروں لوگ ہوتے ہیں۔ ہیرو بھی وہی ہوتا ہے مگر ہیرو نمایاں نظر آتا ہے۔ اپنی انفرادیت کا باعث وہ بھیڑ میں ضرور ہوتا ہے مگر اس کا حصہ نہیں بنتا۔ اب یہ تمہیں سوچنا ہے۔ ہیرو کون ہے۔ ہو سکتا ہے، ہیرو سڑک پہ جھاڑو لگانے والا بھی ہو۔''

شہروز بہت آسان لفظوں میں عفیرا کو سمجھا رہا تھا۔ ایبہا کے ہاتھ کنپٹی پہ ساکت رہ گئے تھے۔

کتنی خوب صورت بات کہی تھی شہروز نے۔ ہیرو بھیڑ میں ضرور ہوتا ہے مگر ان کا حصہ نہیں بنتا۔ اور حیات جسے وہ دنیا کا سب سے حسین انسان سمجھتی تھی وہ بھی بھیڑ کا حصہ نکلا تھا۔

جس نے اپنی انفرادیت کھو دی تھی اپنی طلب میں کسی کا خسارہ نہیں دیکھا۔ پردیس میں کمانے جانے کا مطلب یہ نہیں تو نہیں کہ آپ بیماریاں خرید لائیں۔ یا شادیاں کریں۔ جب عورت مرد کے بغیر جی رہی ہے تو مرد کیوں نہیں؟

☆☆......☆☆

نام بھی نہ رہے گا



شاہد محمود مغل

اُس عورت کا قصۂ الم جو زندگی میں صرف دکھ پاٹنے آئی تھی

دھند نے چاروں طرف دھواں دار سفیدی کی دبیز چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اور لوگ گرم بستروں میں دبکے گہری نیند میں گم تھے۔ فضا میں ایک گہری چپ کا راج تھا۔ فجر کی اذان سے کچھ لمحے پہلے ہی کنول کی آنکھ اچانک کھل گئی تو چھٹی حس کی پکار پر اُس کے قدم اُسے اپنی بیٹی گوہر کے بیڈ روم کی طرف لے گئے اور اس کا خالی بستر دیکھ کر

اس کے پاؤں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔ کنول حواس باختہ اپنے بیڈروم کی طرف بھاگی۔

"گوہر کے پاپا۔ دیکھو گوہر اپنے کمرے میں نہیں ہے۔"

"اوں، ہوں۔ سونے دو۔ یہیں کہیں ہوگی۔"

"انھیں جلدی کریں۔" کنول نے لرزتی آواز سے کہا تو اس کے گھمبیر اور خوف زدہ لب و لہجے کو دیکھ کر وہ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا اور کنول کے ساتھ مل کر سارا گھر چھان مارا مگر گوہر گھر میں نہیں تھی۔

دونوں میاں بیوی گھبرا گئے۔ کنول کے تو پاؤں تلے سے جیسے زمین ہی نکل گئی تھی۔ عامر محلے میں اُسے اِدھر اُدھر تلاش کرنے لگا مگر وہ کہیں بھی نظر نہ آئی۔ اتنے میں محلے کی مسجد میں فجر کی اذان ہونے لگی۔ نمازی نماز پڑھنے کی غرض سے گلی سے گزرے تو عامر کو پریشان حال دیکھ کر ماجرا پوچھنے لگے...... اور پھر تو جیسے دیکھتے ہی دیکھتے وہاں اِک ہجوم ہی جمع ہوگیا۔

سارے محلے میں گوہر کی گمشدگی کی خبر پھیل گئی۔ ایک شور سا مچ گیا۔ کنول اس بری طرح رو رہی تھی کہ جیسے آج روزِ حشر آن پہنچا ہو۔ اُسے یکدم ہی اپنی زندگی کے گزرے ماہ و سال یاد آنے لگے تھے۔ باہر کی دھند نے اندر یادوں کا سورج روشن کردیا تھا۔

کنول سات سال کی تھی کہ ماں نے دنیا سے آنکھیں موند لیں۔ یہ بھی نہ سوچا کہ وہ اپنی لاڈلی بیٹی پر کتنی بڑی ذمہ داری ڈال کر جارہی ہے۔ جسے خود اپنا خیال رکھنا بھی نہیں آتا تھا۔ تین بہن بھائی تھے سب سے بڑی کنول پھر صنوبر اور سب سے چھوٹا سمیر تھا۔ فقط دو سال بچوں کی دیکھ بھال کے لیے رشتہ داروں نے کنول کے باپ کو دوسری شادی کا مشورہ دیا۔ یوں کنول کی ماں اقصیٰ کی وفات کے چھ ماہ بعد ہی اس کے باپ عباس نے شکیلہ بیگم سے دوسری شادی کرلی۔ مگر شکیلہ بیگم بجائے چھوٹے بچوں کی اچھے طریقے سے دیکھ بھال کرنے کے بچوں کی روایتی سوتیلی ماں بن گئی۔ یہی وجہ تھی کہ عباس کی دلی خواہش کے باوجود بچے ناخواندہ رہے۔ کنول کے چھوٹے بہن بھائی مشکل سے پرائمری پاس کرسکے۔ حالانکہ کنول کی پڑھائی کی حسرت دل میں ہی رہ گئی۔ اور شکیلہ بیگم نے اُسے گھر کے کاموں میں الجھا دیا۔ چھوٹی سی عمر میں اُس نے بہت سے گھریلو کام سیکھ لیے تھے۔ اور بڑی مہارت سے کم وقت میں بہت سارے کام سمیٹ لیتی۔ ابھی بچپن کی آخری حدود میں ہی تھی کہ محلے کے لوگ اس کے سلیقے کی تعریف کرتے نہ تھکتے تھے جو شکیلہ بیگم کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ اس سے بک بک جھک جھک کرتی رہتی۔ وہ سر جھکائے سنتی رہتی۔ بابا سے بھی شکایت نہ کرتی۔ وہ جانتی تھی۔ بن ماؤں کی بیٹیوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ انھیں اندر ہی اندر جلتے کڑھتے رہنا ہوتا ہے اور جیے جانا ہے۔ وقت کو کون قید کرسکا ہے۔ اس آزاد پنچھی کو اڑتے جانا ہے۔ بس گزرہی جاتا ہے۔

صنوبر بھی کنول کے بعد جب جوانی کی سرحدوں کو چھونے لگی تو شکیلہ کے مناسب رشتے دیکھ کر دونوں کی شادیاں کردیں۔

شادی کے ابتدائی دنوں میں اُن کے میکے میں دو چار چکر لگے تو سوتیلی ماں کا رد یہ دیکھ کر ان کے شوہروں نے ان کو والدین کے گھر جانے سے منع کردیا۔ اور وہ بھی چپ کرکے بیٹھ گئیں۔ میکے سے کون سا کوئی روز چلا آتا تھا۔ کنول کے شوہر نے کہا کہ جب تمہارے والدین ہمارے گھر نہیں آتے تو تم بھی مت جایا کرو وہاں۔"

مگر کنول کا دل جب اپنے باپ کے لیے تڑپ اٹھتا تو وہ عامر کی منت سماجت کرکے چھ، آٹھ ماہ بعد باپ کو دیکھ آتی۔ اور ان سے اپنے دل کی باتیں کرکے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتی اور اگر باپ گھر نہ ہوتا تو بوجھل دل کے ساتھ گھر لوٹ آتی۔ رفتہ رفتہ عامر نے اس کا والدین کے گھر جانا بند کردیا۔ اب بے چاری کنول کس کا ندھے پر سر رکھ کر روتی۔ وہ اندر ہی اندر کڑھتی رہتی۔ بیٹی کی پیدائش بھی عامر کے دل میں کنول کے لیے نرم گوشہ نہ پیدا کرسکی۔ بلکہ وہ بیٹی کو نظر انداز نہ کرتا۔

گوہر کے ساتھ اچھا نہ تھا۔ اوپر سے گوہر کے گھر سے بھاگ جانے سے سارا ملبہ اس نے کنول پہ ڈال دیا تھا۔ اب وہ کنول پر پہلے سے بھی زیادہ تشدد کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

"تو کیسی ماں ہے؟ جسے اپنی بیٹی کے کردار کا پتہ نہیں چلا۔"

اب تو عامر کنول کے کردار پر بھی مشکوک رہنے لگا تھا۔ گوہر کا اپنے استاد کے ساتھ محبت والا رشتہ قائم ہوا۔

کنول کو پتا ہی نہ چل سکا۔ چونکہ گوہر اپنے باپ کی لاڈلی تھی۔ میٹرک کے بعد بیٹی کی خوشی کے لیے اتنے وسائل نہ ہونے کے باوجود باپ نے کالج میں ایڈمیشن کروا دیا اور کالج کے اخراجات کی زیادتی کی وجہ سے پہلے کی نسبت زیادہ محنت کرنے لگا۔

گوہر کے کالج جوائن کرتے ہی محلے کی چوتھی گلی میں رہنے والے سر اختر کے پاس ٹیوشن رکھوا دی تا کہ وہ آگے بھی اچھی پوزیشن لے سکے۔ گوہر کو سر اختر کے پاس ٹیوشن پڑھتے چھ ماہ ہی ہوئے تھے کہ محبت کا کھیل شروع ہو گیا۔ جس کا ذکر ابھی تک اس نے کسی سے نہیں کیا تھا۔

گھر میں 11 مارچ کو اس کی برتھ ڈے تھی اور کالج سے چھٹی کر کے وہ گھر سجانے لگی تھی۔ گوہر کے پاپا بھی جلدی گھر واپس آگئے کیونکہ بیٹی کو ساتھ لے کر بازار سے گفٹ لانا تھا۔ آج سے پہلے گوہر نے اپنی اس طرح کی بھرپور برتھ ڈے نہیں منائی تھی۔ شام کو اس نے مزے کے پکوان تیار کیے اور انوائیٹ کون تھے دو لوگ۔ صرف دو لوگ۔ ایک اس کی بیسٹ فرینڈ اور دوسرے سر اختر جن کی آمد سے گوہر کے چہرے پر سات رنگ بکھر گئے تھے۔

باپ نے نوٹ کیا کہ بیٹی اپنے سر اختر کے ساتھ کچھ زیادہ ہی فری ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ سالگرہ کا کیک کٹنے کے بعد شاندار کھانا تھا اور پھر سب اپنے گھروں کو سدھارے، دوسرے دن گوہر نے اپنی ماں کو اپنے اور سر اختر کے بارے میں بتایا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں اور سنڈے کو ان کے گھر والے ہمارے گھر آئیں گے رشتہ لینے۔ امی آپ ابو کو بتا دینا۔“

”دیکھو بیٹی تم ان لوگوں کو یہاں آنے سے منع کر دو اور ایسا سوچنا بھی مت۔ اگر تمہارے باپ کو پتا چل گیا تو وہ تمہارے ساتھ ساتھ مجھے بھی مار دے گا۔“

”کیوں امی؟ میں نے ایسا کیا کر دیا جو ابو ایسا کریں گے۔“ ”گوہر ہم نے تمہاری تربیت ایسی تو نہیں کی تھی جو تم اس طرح عشق لڑاتی پھرو۔ تیرے باپ کو تجھے پڑھانے کی خاطر اضافی محنت کرنی پڑ رہی ہے۔ اور تو ان کے اعتبار کو ٹھیس پہنچانے کے چکر میں ہے۔ برسوں سے ہمارے خاندان میں ایسا نہیں ہوا کہ لڑکی تو کیا لڑکے نے بھی اپنی مرضی کی شادی کی ہو اور تو کیوں اپنی محبت کی خاطر ہماری عزت کا جنازہ نکالنے پر تلی ہے۔ خبردار اگر تو نے ایسا سوچا بھی۔“

وقتی طور پر تو وہ ماں کی بات سن کر چپ ہو گئی۔ مگر اس کے سر پر جو عشق کا بھوت سوار تھا۔ اُس نے ان دونوں کو گھر سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

کراچی جا کر سر اختر کے جاننے والوں کی موجودگی میں دونوں نے نکاح کر لیا۔ گوہر جو گھر سے اپنی ماں کا زیور ساتھ لائی تھی اور سر اختر جو پیسے لایا تھا۔ رفتہ رفتہ ہوٹل میں رہنے اور گھومنے پھرنے سے پیسے ختم ہو رہے تھے تو انھوں نے واپسی کی راہ لی۔ تقریباً 15 دن بعد واپس اپنے شہر آگئے تو گوہر اور اختر کے واپس آنے کی خبر لوگوں نے گوہر کے والدین کو دے دی تھی۔ مگر انھوں نے پلٹ کر نہ دیکھا اور اپنی بیٹی سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کر لیا۔

شام کے تعاقب میں رات اور رات کے اندھیرے کے بعد صبح کا اجالا ہوتا رہا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے تین برس بیت گئے۔ گوہر تو اپنے شوہر کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہی تھی مگر یہ نہ سوچا کہ اُس دن سے عامر نے کنول پر تشدد کرنا روز کا معمول بنا لیا تھا۔ کنول کا گھر سے باہر جانا بند کر دیا تھا۔ اور گوہر کے چھوٹے بہن بھائیوں کو اسکول خود پک اینڈ ڈراپ کرتا۔ ضروریات زندگی کی ہر چیز کنول کو گھر میں مہیا کرتا۔ اگر کوئی رہ جاتی تو کنول کی دوست اور ہمسائی بتول کو کہہ دیتا۔

عامر دن بدن کنول کو زیادہ بُرا بھلا کہنے لگا تھا۔ وہ اس کے آگے ہاتھ جوڑتی۔ منتیں کرتی مگر اس کے دل میں نرمی نہ آتی۔ وہ غریب بڑی بے بسی اور لاچاری کی زندگی گزار رہی تھی۔ جاتی تو جاتی کہاں۔ باپ تو اب بیمار رہتا تھا اور سوتیلی ماں کی زبان اور بھی تیز ہو گئی تھی۔ کبھی بھولے سے باپ کی شکل دیکھنے چلی جاتی تو وہ اس کا اتنا کلیجہ جلاتی کہ وہ کتنے ہی دن ملول رہتی۔ وہ تو اپنے گھر میں پہلے ہی بہت دکھی تھی۔

ایک دن عجب ستم ہو گیا۔ کنول رات سے بخار میں پھنک رہی تھی۔ صبح جیسے تیسے ناشتا بنا کر شوہر اور بچوں کو رخصت کیا تو دوپہر اسکول کی واپسی پر بچوں نے صبح کا بچا ہوا کھانا کھا لیا۔ مگر شام کو جب عامر گھر میں داخل ہوا تو اُسے سر باندھے بخار میں دیکھا اور کچن میں کھانا ندارد نے غصے میں اس ڈنڈے سے کنول کی اتنی پٹائی کی کہ اس

کا بازو توڑ دیا۔ اور وہ تکلیف سے مچھلی کی طرح ساری رات تڑپتی رہی اور عامر دوسرے کمرے میں مزے کی نیند سوتا رہا۔ کنول کے لیے یہ رات کسی قیامت سے کم نہ گزری۔ صبح وہ کام پر چلا گیا اور کنول نے بیٹے کو ساتھ بتول کو بھیجا تو وہ اور اس کا شوہر کنول کی حالت دیکھ کر ہاسپٹل لے گئے جہاں دو دن میں اُس کی کچھ حالت سنبھلی تو وہ گھر آئی تو عامر نے ایک بار بھی نہ پوچھا تھا۔ عامر کی نفرت اس حد تک تھی کہ کنول خون کے آنسو پی کر رہ جاتی۔ سب محلے والے کنول کو ایک صابر اور نیک عورت اور رشتہ داروں سے ملنے ملانے والی مانتے تھے۔ اس کی تعریف کرتے تھے۔ اور یہ بھی جانتے تھے کہ عامر کے ظلم و ستم کو وہ اپنے مقدر کا لکھا سمجھ کر خندہ پیشانی سے سہہ رہی تھی اور دعا گو رہتی کہ عامر کو خدا ہدایت دے اور اس کی خدمت میں جتی رہتی۔

گوہر نے تین سال تک اپنے گھر والوں سے رابطہ نہ کیا۔ باپ تو گھر میں گوہر کا نام بھی سننا پسند نہ کرتا تھا۔ مگر ماں کی تڑپ تھی کہ وہ بیٹی سے ملے۔ جب بھی وہ ڈرتے ڈرتے گوہر کی بات کرتی تو عامر کو بے تحاشا غصہ آ جاتا۔ اور ہر بار یہی کہتا۔ تم ملنا چاہتی ہو نا تو اس کے پاس دفع ہو جاؤ۔''

ان باتوں نے عامر کی نظر میں کنول کو اور قابل نفرت بنا دیا تھا۔ پہلے ہی وہ کون سا اچھا رویہ رکھتا تھا۔ ایک طرف شوہر کی بدسلوکی اور دوسری جانب بیٹی کی جدائی کا غم۔ کنول ذہنی مریضہ بن گئی تھی۔ کنول کے بھاگ تھے کہ اس نے اپنی زندگی میں بھی سکھ کا سانس نہیں لیا تھا۔ رہی سہی کسر گوہر نے پوری کر دی۔ آخر ایک دن حسب سابق وہ کنول کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا کہ وہ آگے سے بول پڑی۔ آج اُس کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ بس پھر کیا تھا کنول کی شامت آ گئی۔ عامر نے ڈنڈا جو پکڑا۔ کنول کی ایسی دُھلائی کی وہ دل برداشتہ ہو گئی۔ اسی لمحے اُس نے سوچا کہ ایسی اذیت پسند اور ذلت بھری زندگی گزارنی سے موت بہتر ہے۔ پہلے بھی کئی بار اُس کی سوچ کے افق پر یہ بات ابھری کہ گندم میں رکھنے والی زہریلی گولیاں نگل کر اپنی بے مایا زندگی کا اختتام کر لے۔ مگر سوچنا آسان اور اس سوچ پر عمل کرنا مشکل خود سے موت کو گلے لگانا بہت مشکل کام ہے۔ اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا چراغ بجھانا بہت ہمت اور دل گردے کا کام ہے۔ عورت تو پھر کمزور ہوتی ہے۔ کئی گھنٹے زندگی اور موت کے فیصلہ کرنے میں لگ گئے۔ کبھی سوچتی اگر وہ خودکشی کر لے تو عامر کے مظالم سے تو جان چھوٹ جائے گی۔ مگر بچوں کا کیا ہوگا۔ سوچتے سوچتے کئی گھنٹے گزر گئے۔

موذن نے فجر کی اذان دی تو کنول کا سارا وجود تھکن سے چور چور ہو چکا تھا۔ رات بھر جاگنے اور سوچنے نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ ہمت کر کے اٹھی اور باوضو ہو کر خدا کی بارگاہ میں سر جھکایا اور کچن میں ناشتا تیار کرنے لگی۔ جب ناشتا کر کے عامر کام پر اور بچی اسکول جا چکے تو اس نے زہریلی گولیاں کھا لیں۔

تھوڑی دیر بعد حسب معمول بتول گپ شپ لگانے آئی تو وہ زمین پر گری پڑی تھی اور اس کے منہ سے جھاگ جاری تھا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ کوئی زہریلی چیز کھائی ہے۔ محلے کے کچھ اور لوگوں کے ساتھ مل کر اُسے ہاسپٹل لے گئے۔ جہاں ڈاکٹروں کی سرتوڑ کوششوں کے بعد بھی وہ جان کی بازی ہار گئی۔

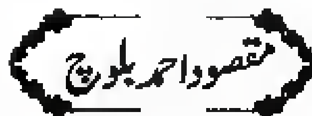
کنول کی موت بتول کو آزردہ کر گئی۔ اِن کا آپس میں خونی رشتہ تو نہ تھا مگر اس کے باوجود وہ اپنا ہر دکھ سکھ بتول سے شیئر کرتی اور بتول کنول کے لیے ایک مسیحا تھی جو اس کے زخموں پر مرہم کا باعث بنتی مرتے وقت کوئی دل کی بات نہ کر سکی بس خود بھی کلمہ پڑھا اور بتول کو بھی پڑھنے کو کہا اور ابدی نیند سو گئی۔ کنول کی موت کی اطلاع پاتے ہی عامر ہاسپٹل آیا اور اس کی میت لے کر گھر آ گیا۔ کنول کی موت پر بظاہر تو عامر کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر اندر اُسے کوئی ملال نہ تھا۔ اس کو کنول کی موت کا کوئی صدمہ نہ تھا۔ میت پر بین کرتی بتول دیکھی نہیں جاتی تھی۔

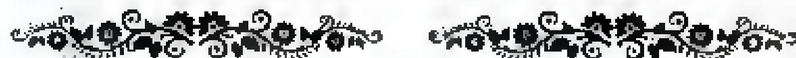
جب کنول کے باپ کو اطلاع ملی تو وہ بڑی مشکل سے بیماری کی حالت میں آیا اور کنول کے دونوں بچوں 7 سالہ ہاشم اور 9 سالہ تتلی کو اپنے ساتھ لے آیا۔ عامر کا گھر اُجڑ گیا۔ کنول دنیا سے کوچ کر گئی۔ بڑی بیٹی نے مرضی کی شادی کر لی۔ نانا بچوں کو اپنے گھر لے گیا۔ عامر نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ آٹھ مرلے کا چمکتا ہوا گھر جسے کنول شیشے کی طرح صاف شفاف رکھتی تھی۔ ویرانیوں کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ اور عامر نے خود اس گھر کو کھنڈر میں تبدیل کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔ گھر جو محبتوں کے امین ہوتے ہیں۔

☆☆......☆☆









ملتان شریف کے مزار پہ بیٹھی نازو احمد پور سیال کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئی۔ نازو کی پیدائش پر گھر میں خوشیاں منائی گئیں۔ نازو اپنے والدین کی پہلی اولاد تھی۔ نازو کا باپ ایک امیر ترین شخص تھا۔ بہت ساری جائیداد تھی نوکر چاکر تھے۔ نازو کے باپ کو گاؤں کے لوگ نواب کہتے تھے۔ گھر میں سب لوگ نازو سے بہت پیار کرتے تھے۔ نازو ایک بھولی بھالی بہت ہی خوب صورت لڑکی تھی۔ نازو کی عمر ابھی کوئی تین سال ہی تھی کہ نازو کی ایک اور بہن پیدا ہوئی جس کا نام چاندنی رکھا گیا۔ نازو کے والدین اپنی دونوں بیٹیوں سے بہت

زیادہ محبت کرتے تھے اور دونوں کی پرورش بھی بہت اچھے طریقے سے ہو رہی تھی۔ وقت کبھی ایک جیسا نہیں رہتا۔ دن رات میں بدلتا ہے۔ مہینے سالوں میں بدلتے ہیں۔ سال صدیوں میں بدل جاتے ہیں۔ سیکنڈ منٹوں میں منٹ گھنٹوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ نازو کے گھر میں بھی وہی ہوا جس بات کا اس کے والدین کو ہمیشہ سے ڈر رہتا تھا۔ کیونکہ نازو کا باپ اتنی زیادہ جائیداد کا مالک تھا۔ اور باقی جو اس کے رشتے دار تھے وہ اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھے۔ وہ نازو کے باپ سے جلتے تھے۔

سردیوں کے دن تھے رات کے وقت نازو اور اس کی چھوٹی بہن چاندنی الگ کمرے میں سو رہی تھیں اور والدین الگ کمرے میں تھے۔ رات کی تاریکی میں کسی ظالم نے آ کر اُن دونوں میاں بیوی کو قتل کر دیا۔ اور پھر قاتل وہاں سے فرار ہو گیا۔ اس وقت نازو کی عمر تقریباً چھ سال اور اس کی چھوٹی بہن کی عمر تقریباً چار سال تھی۔ جب صبح کے وقت دونوں بہنیں اپنے کمرے سے اُٹھ کر اپنے والدین کے کمرے میں گئیں تو انہیں اپنے والدین کی خون میں لت پت لاشیں نظر آئیں۔ والدین کی لاشوں کو دیکھ کر دونوں بہنیں حواس باختہ ہو گئیں۔ اتنے میں گھر کا پرانا ملازم کرموں بھی وہاں پہنچ گیا اور اس نے شور مچانا شروع کر دیا۔

کرموں کا شور سن کر لوگ اکٹھا ہو گئے۔ گاؤں کے کچھ لوگوں نے تھانے جا کر رپورٹ درج کروائی۔ اور کچھ دیر بعد جائے وقوعہ پر پولیس آ گئی۔ اور جائے وقوعہ کا معائنہ کیا۔ اس کے بعد لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری ہسپتال بھیج دیا گیا۔ رشتے داروں کو خبر مل گئی تھی کہ نازو کے والدین اس دنیائے فانی سے گزر چکے ہیں۔ وہ سب لوگ بھی آ گئے۔ پوسٹ مارٹم کرنے کے بعد لاشیں ورثاء کے حوالے کر دی گئیں۔ اور پھر دونوں میاں بیوی کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ ماں باپ کی جدائی میں رو رو کر دونوں بہنوں کو بخار ہو گیا۔ نصیب کا لکھا کون ٹال سکتا ہے۔ کبھی وہ دن بھی تھے کہ نازو اور چاندنی راج کرتی تھیں اور آج کا دن تھا کہ سب نام کے رشتے پاس تھے۔

دو سے تین دن گزر جانے کے بعد دونوں بہنوں کو ہر کوئی سنبھالنے کی فکر میں لگ گیا۔ وجہ صرف اور صرف اُن دونوں کی دولت اور زمین تھی۔ کیونکہ اس دنیا میں ہر انسان لالچی ہے۔ سب رشتے دار وہاں پر موجود تھے۔ نازو کی خالہ نے کہا کہ میری بہن کی نشانی ہے اس لیے نازو کو میں اپنے گھر لے جاؤں گی اور چاندنی کو اس کا ماموں اپنے گھر لے گیا۔ اللہ پاک نے چھوٹی سی عمر میں دونوں بہنوں کے درمیان جدائی کی دیوار کھڑی کر دی۔

نازو بہت ہی خوب صورت اور نخرے والی لڑکی تھی۔ نازو کو اس کی خالہ اپنے گھر لے آئی۔ نازو کی خالہ کے چار بیٹے اور چار ہی بیٹیاں تھیں۔ نازو ہر وقت اس بھرے پرے گھر میں بھی اُداس اُداس سی رہتی تھی۔ کیونکہ نازو کو وقت نے بادشاہ سے فقیر بنا دیا تھا۔

سات سال کی عمر میں نازو کو گاؤں کے پرائمری اسکول میں داخلہ کروایا گیا۔ وقت گزرتا رہا نازو نے میٹرک تک تعلیم حاصل کر لی۔ اسی دوران نازو کو ایک بیماری لاحق ہو گئی۔ غم انسان کو اندر ہی اندر سے دیمک کی طرح چاٹ رہا ہوتا ہے۔ نازو کو جو غم ملے تھے انھوں نے اُسے کھوکھلا کر دیا تھا اور باقی جو کسر رہ گئی تھی۔ وہ بیماری نے پوری کر دی۔ گھر والے علاج تو کرواتے تھے۔ لیکن نہ ہونے کے برابر۔ آج کل کے اس جدید دور میں وہ نازو کا علاج نیم حکیموں سے کرواتے رہے۔ کیونکہ نیم حکیم پانچ روپے کی ایک پڑیا دیتا تھا اور ڈاکٹر تو صرف پانچ سو روپے فیس ہی لے لیتا تھا اس لیے نازو کا علاج حکیم سے ہوتا رہا تاکہ پیسے خرچ نہ ہوں۔

میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد نازو نے گھر میں ہی رہ کر پڑھنا شروع کر دیا اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے گریجویشن کر لیا تھا۔ گھر میں رہتے ہوئی نازو نے ہر وہ کام کیا۔ جس کا اس نے کبھی سوچا تک نہیں تھا۔ اس کے باوجود بھی نازو کی خالہ اس کے کاموں سے کبھی بھی خوش نہیں ہوتی تھی۔ ہمیشہ یہی کہتی تھی کہ بس یہ لڑکی تو سارا دن بیٹھی رہتی ہے۔ کوئی بھی کام نہیں کرتی۔ نازو کو ایک کیبن نما کمرہ دیا گیا تھا۔ جس میں نازو سوتی تھی۔ اس روم میں جون جولائی میں بھی کوئی فین وغیرہ نہیں ہوتا تھا۔ ایک دن نازو نے اپنی خالہ ماں سے کہا کہ مجھے بہت گرمی لگتی ہے اس روم میں کوئی فین وغیرہ لگوا دیں۔ تو خالہ نے جھٹ کہا۔

"فین نہیں لگ سکتا۔ فین کے استعمال سے بجلی کا بل زیادہ آتا ہے۔"

جس کمرے میں خالہ کی اپنی سگی بیٹیاں سوتی تھیں وہاں پر ایک نہیں دو دو فین تھے۔ اس گھر میں رہتے ہوئے سب سے چھپ چھپ کر نازو اپنی قسمت پر روتی تھی۔ اس کو اپنی بہن چاندنی سے بچھڑے بھی بہت سال بیت گئے تھے۔ لیکن اس سے بھی بچھڑنے کے بعد کبھی دوبارہ ملن نہیں ہوا تھا۔

نازو پانچ وقت کی نماز پڑھتی تھی ہر وقت اس کی زبان پر اللہ کا نام رہتا تھا۔ اب نازو کی اس گھر میں رہتے ہوئے صرف ایک ہی خواہش تھی کہ بس اب تو اللہ تعالیٰ مجھے بھی اپنے پاس بلالے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کو اس بات کا بھی خیال آجاتا تھا کہ مایوسی گناہ ہے۔ اور مجھے بھی زندگی سے مایوس نہیں ہونا۔ خیر وقت گزرتا رہا۔

کچھ دنوں کے بعد خالہ کی بڑی بیٹی کی شادی تھی۔ پورے گھر کو رنگ روغن کر کے چمکا دیا گیا تھا۔ اور پوری گرم جوشی سے شادی کی تیاریاں عروج پہ تھیں۔ ابھی شادی کو دو دن رہتے تھے کہ گھر میں مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ آخر کار وہ دن بھی آ گیا۔ جس دن نازو کی بڑی بہن دلہن کے روپ میں اس گھر سے رخصت کیا گیا۔ شادی میں جو مہمان آئے ہوئے تھے اُن مہمانوں میں ارباز نام کا ایک لڑکا بھی شامل تھا۔ وہ بار بار نازو کی طرف دیکھتا تھا۔ اور نازو بھی یہ بات محسوس کی تھی۔ کہ کوئی اس کی طرف بڑے غور سے دیکھتا ہے۔ شادی ختم ہونے کے بعد سب مہمان اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹ رہے تھے۔ ارباز نے بھی موقع پا کر نازو کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ لیکن نازو نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ نہیں رکھا۔ بلکہ جلدی سے ایک مہمان خاتون کے گلے ملی اور واپس چلی گئی۔ اور پھر معمول کے مطابق وہی گھر اور ڈھیر سارے گھر کے کام۔

شادی ختم ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ لیکن نازو کے من میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ لڑکا کون تھا۔ اور بار بار کیوں دیکھتا تھا۔

نازو نے اس گھر میں رہتے ہوئے گھر والوں سے چھپ کر ایک موبائل فون رکھا ہوا تھا۔ موبائل فون پر وہ کسی کو کال نہیں کرتی تھی۔ بلکہ جب وہ بھی کبھی زیادہ اُداس ہوتی تھی تو موبائل میں کوئی گانا وغیرہ سن لیا کرتی تھی۔ اس کا نمبر کسی کے پاس تھا اور نہ ہی کبھی کسی نے اُسے کال کی تھی۔ اس گھر میں اس کی خالہ کی بیٹی ارم کو نازو کے موبائل کا علم تھا۔ کیونکہ نازو اور ارم دونوں مل کر کبھی کبھی گانے وغیرہ سنتی تھیں۔ دن رات کی سیاہی میں بدلتے رہے۔ معمول کے مطابق نازو نے رات کے کھانے کے بعد برتن وغیرہ واش کیے اور اس کے بعد عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر اپنے روم میں چلی گئی۔

الماری میں رکھا ہوا موبائل جب نکالا تو دیکھا بہت ساری کالیں آئی ہوئی تھیں۔ نازو نے جب مس کالز دیکھیں تو کچھ پریشان ہو گئی اور دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ میرا تو نمبر بھی کسی کے پاس نہیں ہے اور یہ کالیں کون کرتا رہا ہے۔" ابھی تو وہ ابھی سوچوں میں گم تھی کہ عین اسی وقت اس کے موبائل پر کال آنے لگی۔ نازو گھبراتے ہوئے کال اٹینڈ کی۔

"السلام علیکم! میں ارباز بات کر رہا ہوں۔ نازو آپ سارا دن کہاں تھیں۔ کم از کم آپ میری کال تو اٹینڈ کرتیں۔"

ارباز مسلسل بول رہا تھا۔ اور نازو اس وقت بت بن کر اس کی باتیں سن رہی تھی۔ جب ارباز نے اپنی ساری باتیں ختم کر لیں تو اس وقت اس نے کہا۔

"نازو آپ بھی کچھ بولو گی یا صرف میں ہی بولتا رہوں گا۔"

نازو نے بس اتنا پوچھا کہ آپ کو میرا نمبر کس نے دیا۔ بس اتنا بتا دو مجھے۔

ارباز نے کہا کہ آپ کا نمبر مجھے ارم نے دیا تھا"

ارم کا نام سنتے ہی نازو نے کال ڈراپ کر دی۔ اب نازو کو ارم پر بے حد غصہ آرہا تھا کہ اس نے میرا نمبر کیوں دیا اس لڑکے کو۔ خیر رات تو کسی نہ کسی طرح کٹ گئی۔

صبح ہوتے ہی نازو نے ارم سے پوچھا کہ تم نے میرا نمبر کس کو دیا ہے۔ اور اگر دیا تو کیوں دیا ہے۔"

ارم نے کہا کہ ارباز جب شادی پر آیا تھا اس نے مجھ سے آپ کا نمبر مانگا اور میں نے دے دیا۔

نازو ارم سے اس بات پر کافی دن خفا رہی۔ ارباز

رات کے وقت نازو کو کال کرتا تھا۔ شروع شروع میں تو نازو کو یہ سب کچھ بالکل اچھا نہیں لگا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ارباز نازو کے دل میں اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ اب نازو کو بھی اُس سے بات کرنے کی عادت ہو گئی تھی وہ بھی سونے سے پہلے جب تک ارباز سے بات نہ کر لیتی اسے نیند نہیں آتی تھی۔ دل ہی دل میں نازو ارباز سے پیار کرنے لگی تھی۔ لیکن اس طرح کی بات اس نے کبھی بھی ارباز سے نہیں کی تھی۔

معمول کے مطابق ایک رات وہ دونوں موبائل پر باتیں کر رہے تھے۔ ارباز نے نازو سے ملنے کی خواہش ظاہر کر دی کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں اور وہ بھی گھر سے باہر مطلب کسی پارک وغیرہ میں۔

لیکن نازو نے کہا میں آپ سے کبھی نہیں مل سکتی کیونکہ میرا گھر سے نکلنا بہت مشکل ہے۔ اس بات پر ارباز نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ٹھیک ہے آپ مت آؤ ملنے میں آج کے بعد کبھی آپ سے بات نہیں کروں گا۔ اور ساتھ ہی کال ڈراپ کر دی۔

اس طرح دو، تین دن گزر گئے ارباز نے نازو کو کوئی بھی کال میسج نہ کیا۔ آخر کار نازو نے ایک رات ارباز کو خود کال کر لی اور اُسے کہا آپ ناراض نہ ہوں میں کوشش کروں گی آپ سے ملنے کی۔ اس کے بعد ڈھیروں باتیں ہوئیں۔ ارباز جب بھی نازو کو کال کرتا تھا تو اسے یہی کہتا تھا کہ میں نے جب سے تمہیں دیکھا ہے مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اور تمہارے سارے دکھ ختم کرنا چاہتا ہوں۔ جب کہ ارباز کے دل میں محبت نام کی کوئی چیز نہیں تھی بلکہ وہ تو اس محبت کے نام سے بھی بہت ساری لڑکیوں کو دھوکہ دے چکا تھا۔ وہ تو بس حسن کا پجاری تھا۔ انتہائی لالچی قسم کا انسان تھا خوب صورت ہونے کی وجہ سے بہت ساری لڑکیاں اُس سے دھوکہ کھا چکی تھیں۔ اُن لڑکیوں میں سے ایک لڑکی نازو بھی تھی جو اس کے جال میں بُری طرح پھنس چکی تھی۔ ارباز نے نازو کو بہت سبز باغ دکھائے تھے۔ جب کہ نازو اس سے سچا پیار کرنے لگی تھی اور اس کے من میں بس ایک ہی بات تھی کہ چلو ساری زندگی دُکھوں میں گزری ہے۔ اب کوئی تو ہے جو مجھ سے سچا پیار کرتا ہے اور مجھ سے شادی کرنے کا کہتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ دھوکہ تھا۔ جو کہ نازو کو سمجھ نہ آسکا اور وہ روز بروز ارباز کی باتوں میں پھنستی چلی گئی۔

ایک رات ارباز نے نازو کو کال کر کے کہا آپ کل دن گیارہ بجے مجھے پارک میں ملنے آنا ہے۔ نازو پہلے تو خاموش ہو گئی پھر کچھ لمحے بعد جواب دیا کہ ٹھیک ہے میں آنے کی کوشش ضرور کروں گی۔ ہاں اگر نہ آسکی تو پلیز ناراض مت ہونا۔''

نازو نے ملنے کا وعدہ تو کر لیا تھا۔ لیکن ساری رات انہی سوچوں میں گزر گئی کہ وہ کل کیسے گھر سے نکلے گی۔ خیر جب صبح ہوئی تو نازو نے اپنی خالہ ماں سے کہا ماں جی میں نے کچھ ضروری چیزیں لینی ہیں۔ میں ارم کے ساتھ بازار چلی جاتی ہوں۔ ارم کے اسکول ٹائم تک میں اپنی چیزیں بازار سے خرید لوں گی پھر ہم دونوں واپس آ جائیں گے۔ ارم میٹرک کی طالبہ تھی۔ پہلے تو خالہ جی نے صاف انکار کر دیا کہ یہ گھر کے کام کون کرے گا۔ لیکن ارم کے اصرار کرنے پر وہ مان گئی کیونکہ ارم اس کی سگی بیٹی ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی لاڈلی بھی تھی۔ ارم کو گھر سے لینے کے لیے صبح سویرے رکشہ آتا تھا۔ اس دن نازو بھی ارم کے ساتھ چلی گئی۔ ارم اپنے اسکول کے سامنے اتر گئی اور نازو بازار کا بہانہ بنا کر اس پارک کی طرف چلی گئی جس پارک میں ملنے کا ارباز نے کہا تھا۔ کچھ ٹائم گزرنے کے بعد وہ دونوں مل چکے تھے۔ پہلے تو فون پر جو پیار محبت کے جھوٹے دعوے ارباز کر چکا تھا آج اس سے مل کر بھی کرنا چاہتا تھا۔

ارباز نے نازو سے پوچھا کہ کیا آپ مجھ سے شادی کے لیے رضامند ہو یا نہیں۔ نازو نے صرف اتنا ہی جواب دیا کہ وقت آنے پر سب کچھ بتا دوں گی۔ اب نازو کے دل و دماغ پر ارباز مکمل طور پر حاوی ہو چکا تھا۔ نازو ہر وقت اس کے خیالوں میں گم رہنے لگی تھی۔ اور گھر میں بھی ہر وقت اُداس اُداس رہنے لگی تھی۔ گھر والوں نے بھی اُداسی کی وجہ نہ پوچھی۔

☆☆☆

ایک دن ارباز نے نازو کو کال کر کے اپنے دل کی بات بتا دی ارباز خان نے نازو سے کہا دیکھو نازو

تمہارے گھر والے کبھی بھی آپ کی شادی کسی اچھے گھر میں نہیں کریں گے۔ اس سے بہتر ہے آپ یہ گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دو ہم دونوں مل کے شادی کر لیں گے۔ میں ساری زندگی اپنی ناز و کو خوش رکھوں گا۔ کوئی بھی دُکھ تمہارے نزدیک نہیں آنے دوں گا۔ بس تم کسی نہ کسی طرح یہ گھر چھوڑ دو ہم دونوں یہاں سے دور جا کر نکاح کر لیں گے اور اپنی الگ دنیا بسا ئیں گے۔'' ناز و ارباز کی یہ باتیں سن کر بہت پریشان ہوئی کہ پتا نہیں میری زندگی میں کون کون آئے گا۔ پتا نہیں یہ شخص مجھے خوش رکھے گا یا پھر پہلے سے بھی کہیں زیادہ دکھ ملیں گے۔ ناز و کافی دن انہی سوچوں میں گم رہی۔ کافی دن پریشان رہنے کے بعد ناز و اس نتیجہ پہ پہنچی کہ اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ارباز کے لیے یہ گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے گی۔ اس کے دل میں تو یہ بات تھی کہ چلو کوئی تو ہے جو مجھے سچے دل سے چاہتا ہے۔ اس سے شادی کرنے کے بعد باقی کی زندگی شاید سکون سے گزر جائے۔

ایک رات ناز و نے ارباز کو کال کی اور اُسے کہا کہ میں تمہاری خاطر یہ گھر چھوڑنا چاہتی ہوں۔ لیکن پلیز مجھے کبھی دھوکہ مت دینا ارباز خان نے کہا۔

''ٹھیک ہے میری جان آپ کل رات یہاں سے نکلنے کا پروگرام بنالو میں کل رات لاری اڈے پر آپ کا انتظار کروں گا۔''

پروگرام کے مطابق رات کے ٹائم جب سب گھر والے سو گئے تو ناز و نے کچھ تھوڑا بہت سامان ایک بیگ میں رکھا اور وہ گھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر ارباز کے پاس دیے ہوئے وقت کے مطابق لاری اڈے پہنچ گئی۔

ارباز، ناز و کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں ایک بس میں سوار ہو گئے۔ اور کچھ گھنٹوں کی مسافت کے بعد وہ دونوں اپنی منزل پر پہنچ گئے۔

ارباز اسے ایک گھر میں لے گیا اور ناز و سے کہا کہ یہ گھر میرے ایک دوست کا ہے۔ میں نے دوست کو اپنے اور تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ ہم دو سے تین دن یہاں دوست کے پاس رہیں گے اور اس کے بعد ہم نکاح کر لیں گے۔ میں تمہارے اور اپنے رہنے کے لیے کرائے پر گھر لوں گا۔''

ناز و کو اب مکمل یقین ہو گیا تھا کہ اب اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں اس گھر میں داخل ہوئے۔ ایک بڑی عمر کی خاتون اس گھر میں تھی وہ ان دونوں کو آ کر ملی۔ ناز و کو نجانے اس عورت جس کا نام فردوس تھا اسے دیکھ کر دل میں ایک خوف سا پیدا ہو گیا۔ خیر تھوڑی دیر کے بعد وہ عورت دونوں کے لیے کھانا لے کر آئی۔ دونوں کھانا کھا کر آرام کی غرض سے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ ارباز نے تو پہلے دن سے ہی ناز و کے ساتھ دھوکہ دینے کا سوچ رکھا تھا۔ اس نے ناز و سے کہا تم یہاں آرام کرو میں ابھی آتا ہوں۔ اس نے فردوس بائی کو کہا آپ دو کپ چائے بنا کر لے آئیں اور ناز و کے کپ میں نشہ آور گولیاں ڈال دینا تا کہ میں یہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہو جاؤں۔''

اس نے کہا ٹھیک ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد فردوس بائی ٹرے میں دو کپ چائے رکھ کر لے کر آ گئی۔ بس چائے پینے کی دیر تھی۔ ناز و نیند میں ڈوب گئی۔ ارباز اسے اس حالت میں چھوڑ کر فردوس بائی سے منہ مانگی رقم لے کر وہاں سے چلتا بنا۔

جب گولیوں کا نشہ ختم ہوا اور ناز و کی آنکھ کھلی۔ تو ناز و کے سامنے فردوس بائی کھڑی تھی، ناز و نے ارباز کو پوچھا کہ وہ کہاں ہے تو فردوس بائی نے کہا کون سا ارباز تم کس ارباز کی بات کر رہی ہو۔ دیکھو لڑکی زیادہ ہوشیاری دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تمہیں میرے ہاتھ مہنگے داموں فروخت کر گیا ہے۔ اب تم میری قید میں رہو گی اور جو کچھ میں کہوں گی وہ تمہیں کرنا اور ماننا پڑے گا۔ اگر زیادہ چالاکی دکھائی تو چوری کا الزام لگا کر پولیس کے حوالے کر دوں گی۔''

یہ الفاظ سن کر ناز و کے پاؤں تلے زمین نکل گئی۔ سر چکرانے لگا ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ وہ بے چاری اپنی بدنصیبی پر بین کرنے لگی۔

رات کے ٹائم فردوس بائی پرویز نامی ایک شخص کو لے کر ناز و کے روم میں آ گئی۔ اس نے ناز و کو جب دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ پرویز اسے دیکھ کر واپس فردوس بھائی کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اور اُسے کہا فردوس باجی تمہیں

پیسے چاہیے میں آپ کو دے سکتا ہوں۔ لیکن میری ایک شرط ہے کہ تم نازو کے پاس کسی اور کو نہیں جانے دو گی۔''

اس نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ مجھے آپ کی یہ شرط منظور ہے۔''

اس طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پرویز فردوس بائی کے کوٹھے پہ آتا رہا۔ اور اُسے پیسے دے کر نازو کے پاس جب بھی جاتا۔ اس کے ساتھ ڈھیروں باتیں کرتا۔ اس نے کبھی بھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جس سے نازو کی عزت پر کوئی حرف آئے۔ وہ جب بھی نازو کے پاس جاتا تو نازو اُسے ہر بار یہی بات کرتی کہ پلیز مجھے یہاں سے آزاد کروا دو میں ساری زندگی تمہاری احسان مند رہوں گی۔''

پرویز نے نازو کی یہ بات سن کر اُسے کہا کہ نازو اگر میں یہ کہوں کہ آپ میرے ساتھ شادی کر لو گی۔ نازو پرویز کی یہ بات سن کر زار و قطار رونے لگی۔ اور اُس نے کہا کہ اب تو مجھے شادی نام سے بھی نفرت ہو گئی ہے کیونکہ پہلے بھی ایک سے شادی کرنے کا خواب دیکھا تھا اور اسی وجہ سے آج اتنی رسوائی اور ذلت اٹھا رہی ہوں۔''

پرویز نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا دیکھو نازو ہر انسان اچھا بھی نہیں ہوتا اور ہر انسان بُرا بھی نہیں ہوتا۔ میں نے تو آپ سے شادی کی اس لیے بات کی کہ میرا بھی اس دنیا میں کوئی نہیں ہے اور نہ ہی آپ کا اس لیے ہم دونوں ایک دوسرے کا سہارا بن جائیں گے۔ نازو نے کہا ٹھیک ہے میں تم سے شادی ضرور کروں گی لیکن مجھے جتنا جلدی ہو سکے یہاں سے لے چلو۔ کیونکہ میرا اس جگہ من گھبراتا ہے فردوس بائی سے مجھے خوف آتا ہے۔ پرویز نے کہا ٹھیک ہے میں اس قید سے بہت جلدی نجات دلاؤں گا۔

جب یہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے ان کی تمام باتیں فردوس بائی نے سن لیں۔ اور پرویز سے کہا میری بات کان کھول کر سنو یہ کوٹھا ہے یہاں پر جسموں کے سودے ہوتے ہیں دلوں کے سودے نہیں۔ پرویز نے فردوس بائی سے کہا میں نازو سے پیار کرنے لگا ہوں اور اُس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے اگر ایک لفظ بھی نازو کے بارے میں غلط کہا تو آپ کے لیے اچھا نہ ہو گا۔ تم کیا جانو کہ ہیرا کیا موتی کیا۔''

فردوس غصیلے بولی۔ جاؤ یہاں سے میں نے تمہارے جیسے عاشق بڑے دیکھے ہیں۔ پرویز نے کہا یہ سچ ہے کہ نازو مجھے اچھی لگتی ہے اور میں اُسے پیار کرنے لگا ہوں۔ فردوس بائی نے کہا اگر تم اس سے پیار کرتے ہو تو اس کے پیار کی قیمت مجھے دے پاؤ گے۔ پیار کی کوئی قیمت نہیں ہوتی آپ بولو کتنے پیسے آپ کو چاہیے ہیں۔ فردوس بائی نے کہا اگر تو اتنا سچا اور پکا عاشق ہے تو پھر پانچ لاکھ میرے حوالے کرو۔ اور لے جاؤ اس لڑکی کو۔''

پرویز نے کہا ٹھیک ہے نازو آپ کے پاس اب میری امانت ہے اگر میری اس امانت میں ذرا بھی خیانت کی تو پھر اچھا نہیں ہو گا۔ میں کل نازو کو یہاں سے لے جاؤں گا۔

پرویز نے راتوں رات رقم کا بندوبست کیا اور اپنے وعدے کے مطابق دوسرے دن فردوس بائی کو رقم دے کر نازو کو وہاں سے آزاد کروا کر اپنے ساتھ گھر لے آیا۔

پرویز کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ نازو نے پرویز کا شکریہ ادا کیا۔ پرویز نے کہا نازو میں نے تو اپنا وعدہ نبھایا اب آپ کی باری ہے۔ نازو نے کہا ٹھیک ہے۔ میں آپ سے شادی کرانے کے لیے رضامند ہوں۔ پرویز نازو کی بات سن کر بہت خوش ہوا اس نے کہا ٹھیک ہے میں ابھی مولوی کو لے کر آتا ہوں وہ ہمارا نکاح کروائے گا۔''

''ٹھیک ہے آپ جائیں۔''

پرویز نے جب نازو کے لیے کپڑے وغیرہ خرید لیے تھے اور اب واپس آنے کے لیے روڈ کراس کر رہا تھا کہ اُسے ایک تیز رفتار کار نے ٹکر مار دی۔ پرویز کار کی ٹکر لگنے سے سر کے بل روڈ پر گر گیا اور سر پہ اس قدر چوٹ لگی کہ پرویز موقع پر ہی یہ دنیا چھوڑ گیا۔

پرویز کی لاش گھر لائی گئی تو نازو کو سکتہ ہو گیا اور پھر نازو کو کئی دن بعد ہوش آیا تو وہ ہوش و حواس کھو چکی تھی اور اسی دیوانگی میں زندگی گزار رہی ہے۔ اب ملتان شریف میں ایک مشہور دربار پہ بیٹھی اللہ اللہ کر رہی ہے اور لوگوں سے پوچھتی ہے کہ میں کون ہوں۔''

☆☆……☆☆

نویں سچ بیانی

آپا بیگم

فصیحہ آصف خان

اُس بہن کی کہانی، زندگی جس کے لیے صرف ایک انتظار بن کر رہ گئی تھی

آپا بیگم کے ہاتھوں میں آج پھر دھاگہ اور سفید کرتا تھا، جسے وہ بڑے پیار سے ٹانک رہی تھیں۔ یہ ٹانکے وہ دل سے لگا رہی تھیں نفاست ایسی کہ ایک ایک دانہ موتیوں کی مانند دمک رہا تھا۔ ان کے ہاتھ میں صفائی ہی اتنی تھی۔ پھر چاہت سے جو کام کر رہی تھیں اس کی بات ہی اور تھی۔ اماں رفیقہ انہیں مسلسل دیکھ رہی تھیں اور ان کے چہرے پر اداسی کی دبیز تہہ تھی۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر آپا بیگم کی خفگی کے خوف سے چپ رہیں۔

دھاگہ ختم ہوا تو آپا بیگم نے مزید دھاگہ ڈالا اور نظروں سے قدرے قریب کرتے کڑھائی شروع کردی۔ موٹے موٹے شیشوں والی عینک بھی اب لگتا تھا ساتھ چھوڑتی جارہی ہے مگر آپا بیگم کا جنون تھا کہ کم ہوتا نہ ختم ہوتا۔

آپا بیگم کا اصل نام سطوت جہاں تھا۔ ایک بھائی ارشاد جوان سے بہت چھوٹے تھے آپا بیگم ان کی بڑی رعب دار بہن، ابا، اماں کی بے حد لاڈلی، نازک سی لچکدار ڈال والی آپا بیگم۔ یوں پورے حویلی میں آپا بیگم کی ڈھنڈیا پکار رہتی۔ حویلی جو ''جہاں آباد'' کے نام سے موسوم تھی۔ قدیم طرز تعمیر کا نادر شاہکار، دلفریب نمونہ، بڑے بڑے برآمدے، راہداریاں، بالکونیاں، طویل و عریض صحن میں آم، امرود اور کینو کے درخت انار کے پھولوں جیسی رنگت نازک نین نقش والی سطوت جہاں انگور کی بیلوں پر لگے بڑے بڑے پتوں کو چبائیں اور آنکھیں میچ لیتیں۔ پھر اماں کی ڈانٹ۔ وہ تھی ہی کھٹی چیزوں کی دیوانی۔ گلا دکھنے پر کڑوا کسیلا شربت نہ پینے پر جب اماں آنکھیں نکالتیں تو ابا اسے میٹھی گولیوں سے بہلا لیتے۔

''آپ بھی ناں! اس کو بگاڑ کے دم لیں گے۔''

اماں گھورتیں تو آپا بیگم ابا کی چوڑی چھاتی میں سما جاتیں۔ ارشاد مسکراتا تو وہ اسے ایک ہاتھ جڑ دیتی۔ سطوت کا رعب بھی خوب تھا اس پر۔

آم کی مضبوط شاخوں پر لگا جھولا ان کا دوست، ساتھی، سہیلی سبھی کچھ تھا۔ اس سے آپا بیگم کے راز و نیاز چلتے رہتے۔ فرصت کے اوقات میں وہ یہیں پائی جاتیں۔ یہ اور بات کہ تپتی دوپہر میں اماں اور رفیقہ کی نظریں بچا کر خس لگے ٹھنڈے کمرے سے نکل کر وہ جھولے سے باتیں کر رہی ہوتیں۔ ابا میاں اپنی زمین داری میں الجھے رہتے کوئی اور رشتہ دار نہ تھا۔ سطوت بعض اوقات تنہائی کا شکوہ کرتی تو اماں مسکرا

دیتیں۔

''جو اوپر والے نے نصیب میں لکھ دیا۔ دے دیا صبر شکر کرو۔''

اماں اپنے گھر کے کاموں، سلائی کڑھائی میں طاق کر رہی تھیں اور آپا بیگم نہ چاہتے ہوئے بھی کیریاں کھاتے ہوئے ان کی بات ماننے پر مجبور تھیں۔

☆......☆......☆

دسویں کا امتحان کیا دیا، جوانی بہار بن کر سطوت پر ٹوٹ پڑی۔ گلاب کی ادھ کھلی کلی یا کسی منہ بند شگوفے کی طرح، نازک اندام ایسی کہ آئینہ بھی شرما جاتا۔ رنگت میدہ و شہد سے گھلی، گلابیوں کی گلابیت اور موتیے کی ملائمت لیے۔ اس کی خوشبو اِدھر اُدھر بکھری تو سینکڑوں پیام آنے لگے۔

''میں اپنی سطوت کو کہیں نہ جانے دوں گا۔'' ابا کہتے تو اماں ان کی نفسیات پر مسکرا دیتیں۔

''بھلا بادشاہوں کی بیٹیاں بھی گھر بیٹھیں، ضیا جی یہ تو چڑیاں ہیں۔ آج اس ڈال کل سسرال کی ڈال پر۔ بس اس کے روشن مقدر کی دعائیں کریں۔''

''ہاں...... ہاں میں دعائیں نہیں کروں تو اور کون کرے گا۔'' ضیاء الدین صالحہ کو مسکرا کر مطمئن کرتے ہوئے کہتے۔ تو وہ ''آمین'' کہتیں۔ سطوت سے انہیں بھی جی جان سے محبت تھی۔

سطوت کی الہڑ جوانی میں اس وقت بھونچال آیا جب ابا میاں کی اکلوتی بہن نزہت جہاں برسوں بعد بھائی سے ملنے آ گئیں۔

آتیں بھی کیسے، اپنی پسند سے شادی کر کے دوسرے شہر میلوں دور جا بسی تھیں۔ ابا کا وقار مسلا، اماں کا کلیجہ جلایا، بھائی کے ناموس پر حرف آیا۔ گھر کے دروازے ان کی رخصتی کے ساتھ ہی ان پر بند ہو گئے۔ اماں، ابا کے گزر جانے کے بعد بھائی نے رسم نبھائی مگر اندر ہی اندر نزہت جہاں کے لیے دل تڑپتا رہتا۔ انا اور خودداری کا علم بلند کیے وہ بیٹھے تھے کہ نزہت جہاں نے آ کر علم کو نہ صرف ہلا دیا بلکہ گرا بھی دیا۔ دونوں بھائی بہن یوں ٹوٹ کے روئے کہ ساون کو بھی مات دے ڈالی۔

نزہت جہاں کا اکلوتا بیٹا خلیل احمد بھی ہمراہ تھا۔ باپ کے گزر جانے کے بعد اس نے ماں کی خواہش کو پورا کیا۔ خلیل احمد کو دیکھ کر ابا اماں حیران ہی تو رہ گئے۔ کیسا بانکا سجیلا نوجوان تھا۔ چودھویں کے امتحان



میں اول آیا تھا۔ ایم اے کر کے باپ کا کاروبار سنبھالنا تھا۔ اکلوتا تھا تو آنکھوں کا تارا بھی تو تھا۔
سطوت جہاں سے مل کر نزہت کو اپنا بچپن یاد آ گیا۔ وہ بھی ایسی لچکدار شاخ کی مانند تھیں۔ جب ایک پردیسی کلاس فیلو ان کو دیکھ کر دل ہار بیٹھا۔ نہ ذات سے میل کھاتا تھا نہ ان کی برابری کا تھا مگر اس کا دل محبت سے بھرا تھا۔ اماں، ابا کب مانتے۔ انہوں نے خودکشی کی دھمکی دی تو اس شرط پر دل پسیجا کہ رخصتی کے بعد وہ اس دہلیز کو پار نہ کرے گی۔ واپسی کے لیے۔ منہ زور جوانی تھی۔ نزہت بھی ضد کی پکی نکلی۔ مڑ کے نہ دیکھا اور پرائی ہو گئی۔
اس سے شادی کے بعد جمیل احمد کی قسمت جاگ اٹھی۔ مٹی کو ہاتھ لگاتے تو سونا بن جاتی۔ نزہت ان کے لیے بھاگوان ثابت ہوئی تھی۔ خلیل آیا تو خوشی دو چند ہو گئی۔ نزہت نے بارہا سوچا کہ جہاں آباد جائے مگر ضد آڑے آئی۔ پھر جس باپ کا شملہ وہ گرا آئی تھی کیسے اٹھاتی، اتنی ہمت کہاں سے لاتی کہ ان بے بس نظروں کا سامنا کر پاتی۔ خلیل نے ماں کو اکثر روتے پایا۔ اسے معلوم تھا وجہ کیا ہے؟ جب ایک رات جمیل احمد چپکے سے انہیں چھوڑ گئے تو نزہت نے خود کو بے حد ٹوٹا ہوا پایا۔
عدت گزرتے ہی خلیل ماں کو لے آیا۔ اب اس نے کاروبار بھی سنبھال لیا تھا۔ اماں، ابا کے جانے کا سنا تو آنکھوں سے غموں کا تسلسل رواں جاری ہو گیا۔
''موت پر کس کا اختیار ہے، موت تو برحق ہے۔ آپ کو ابا اماں نے معاف کر دیا تھا۔'' ضیاء الدین نے بہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ ہچکیاں لینے لگیں۔
''میں تو ان کے پاؤں پڑ کر معافی طلب کر لیتی، آخری پل ان کے ساتھ بتانا چاہتی تھی ضیاء۔'' ان کا وجود زلزلے کی زد میں تھا۔ تب صالحہ نے انہیں سنبھالا اور تسلی دی۔ اماں، ابا ان کے لیے جائیداد میں حصہ بھی مقرر کر گئے تھے مگر نزہت کو کسی پل چین نہ پڑ رہا تھا۔ ان کے لیے بند کیے گئے دروازے انہی کی دی ہوئی سزا تھی۔ نزہت بار بار آہیں بھرتی۔ اماں ابا کو یاد کرتی، اب تو پچھتاوے تھے۔



خلیل احمد اس نازک اندام تتلی کو دیکھ کر دم بخود ہی تو رہ گئے تھے۔ لمبے سنہری بالوں کی گندھی ہوئی کشمیری سیب جیسے دہکتے گال، آواز ایسی کہ کوئل کوک رہی ہو، چال ایسی کہ ہرنی قلانچیں بھر رہی ہو اور آنکھیں صد ہزار جگنو کی چمک کو بھی ماند کر دیں۔ ستاروں کی طرح جگر جگر کرتی۔ دل کے آر پار ہو جاتیں۔ سرو قد لمبا سراپا۔ وہ آکاس بیل کی طرح خلیل احمد کے حواسوں پر سوار ہو رہی تھی۔ دل تھا کہ اس کے نام کی مالا جپتے نہ تھکتا۔
کئی دنوں کی کشمکش کے بعد وہ ماں کے سامنے، دستِ سوال کرتے کرتے حالِ دل عیاں کر بیٹھے۔
''اماں بس مجھے سطوت چاہیے۔'' بیٹے کی مراد سن کر نزہت سوچوں میں ڈوب گئیں۔ ضیاء الدین اور صالحہ بھی ان کی خواہش پر گومگو کی کیفیت میں تھے ابھی سولہ سترہ کا سن تھا۔
''ہمیں سوچنے کا موقع دیں۔'' ضیاء الدین فکر انگیز لہجے میں بولے۔ کس سے مشورہ کریں، دونوں آپس میں الجھتے رہے۔ نزہت کو جلدی ہی جلدی تھی کہ بھائی انکار کر کے جی برا نہ کرے۔
''ابھی سطوت بہت کم عمر ہے۔ کچھ گھر داری سیکھ لے۔'' ضیاء الدین کچھ نہ سمجھتے ہوئے بہن سے کہہ بیٹھے تو نزہت ہنس کر بولیں۔
''ارے بھیا میں کون سا ابھی بارات لیے بیٹھی ہوں۔ تم ہاں کر کے مجھے تسلی تو دے دو، برسوں بعد دل پھر سے جی اٹھے گا۔'' نزہت بھرائے لہجے میں بولیں تو ضیاء الدین چپ ہو گئے۔



موسم کی بےقراریاں تھیں کہ تھمنے میں نہ آ رہی تھیں۔ برسات اپنے جوبن پر تھی۔ آم پر کوکتی کوئل من بہلا رہی تھی۔ دھواں دھار برستی بارش میں رفیقہ نے پکوڑوں کی کڑھائی چڑھا دی۔ ساتھ میں املی کی کھٹی میٹھی چٹنی۔ اماں گلگلوں کی تیاری میں لگ گئیں۔ بالکنی میں کھڑی سطوت بارش کی بوندوں کو ہاتھ میں لیتی اور ہنستی کہ خلیل نے آ کر اس کے ہاتھوں

پر ہاتھ رکھ دیئے۔

سطوت کا سانس رکنے لگا۔ ہاتھ خلیل کی مضبوط گرفت میں تھے۔ اس نے ہاتھ چھڑانا چاہے مگر وہ تو جیسے کسی مقناطیس کی طرح ایک دوسرے سے پیوست تھے۔ چپکے ہوئے تھے۔

''چھڑانا چاہتی ہو؟ چھڑا کے دیکھ لو۔'' خلیل کی جذبوں کی یورش میں گندھی آواز، سطوت کو بے خود کر گئی۔

''محبت کی پہلی بارش میں دونوں بھیگ رہے تھے۔ مست بے پروا...... چاہتوں کا جھولا اونچے سے اونچا ہوتا جا رہا تھا۔ دونوں کے کپڑے بھیگ گئے تھے۔ کب پروا تھی کہ اس بھیگتی بارش میں ان جذبوں سے نگاہ چرائیں، دامن بچائیں۔

''میں نے اماں بیگم سے تمہارے ساتھ کی بات کی ہے۔ تم نے ہمارے دل و دماغ پر قبضہ کرلیا ہے۔'' وہ ہنسے۔ ''سطوت اب ہم تمہارے بنا جی نہ پائیں گے۔''

خلیل آج گویا سارے جذبے انڈیل رہے تھے اور سطوت دل کی ہلچل چھپائے خود پر قابو پانے میں ناکام ہو رہی تھی۔ سطوت نے گھنی پلکیں کیا اٹھائیں، خلیل نے اپنا عکس دیکھا تو مبہوت ہی تو رہ گیا۔ دونوں کے معصوم، الہڑ جذبے اور گواہ بارش......

سطوت جلدی سے ہاتھ چھڑا کر اندر بھاگ گئی۔

بارش نے گویا سماں ہی باندھ دیا تھا۔ پکوڑے، گلگلے، آم، کوئل کی کوک، مٹی کی خوشبو.....! لاہور کی بارش نے کراچی والوں کے دل جیت لیے تھے۔

نزہت کو ضیاء الدین نے ہاں کی تو ان کو جہان بھر کے خزانے مل گئے۔ ان کے جانے کے دن قریب آ گئے تھے۔ ضیاء الدین کا دل کہاں بھرا تھا۔ خود نزہت بھی پیاسی تھی۔ سیراب کہاں ہوتا ہے دل میکے کی محبت سے۔ سطوت کا دل بھر بھر آ رہا تھا۔ گویا ساون آنکھوں میں ہی آن بسا ہو اور جھڑی کی صورت اختیار کر گیا ہو۔

''ہم بہت جلد آئیں گے جان خلیل۔ ہمارا انتظار کرنا۔'' خلیل احمد کے وعدوں کے سنہری دھاگے اس کی سوچوں کے گرد حصار باندھ گئے۔

نزہت نے جاتے سے خوب صورت دوپٹہ سطوت کو اوڑھایا اور گلے لگا کر بولیں۔

''اب یہ میری امانت ہے ضیاء الدین۔''

سطوت شرما گئی۔ ضیاء الدین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بھیگی آنکھوں وہ رخصت ہو گئیں۔

☆......☆......☆

سطوت کے رات دن خلیل کے خیالوں میں گزرتے۔ آنے والے دنوں کے خوشگوار تانے بانے بنتی رہتی۔ خطوط کے ذریعے رابطہ رہتا۔ نزہت نے آنے میں جلدی کروی جانے کیوں وہم لاحق تھا۔ نزہت نے سیدھا سیدھا نکاح کا کہہ دیا۔ ضیاء الدین اور صالحہ کو بھی اعتراض نہ ہوا۔ سو ایجاب و قبول کے بعد دونوں ایک ہو گئے رخصتی سال بعد قرار پائی۔

نزہت بے شمار چیزیں لائی تھیں۔ سب کے سوٹ، سطوت کا خاص طور پر دولہن والا جوڑا، بڑا سا سونے کا سیٹ، جوتے وغیرہ۔ خلیل نے نکاح کے بعد سطوت کو بے حد قیمتی اور خوب صورت انگوٹھی پہنائی۔

''اسے کبھی خود سے جدا مت کرنا۔'' خلیل نے پیار بھری سرگوشی کی اور سطوت نے اسے دل کے پلو سے باندھ لیا اور مضبوط گرہ کر لی۔

مزید دو دن رکنے کے بعد نزہت نے واپسی کا قصد کیا اور کہا کہ اب خلیل کی ساری توجہ کاروبار پر ہو گی تو وہ کچھ عرصے بعد اپنی امانت واپس لینے جائیں گی آ کر۔'' بھینچ بھینچ کر سطوت کو پیار کر کے وہ رخصت ہو گئیں۔

یوں رابطے میں رہتے چار ماہ گزر گئے۔ صالحہ جہیز کا سامان تیار کرتی دکھائی دیتیں اور سطوت جھولے پر بیٹھی خیالوں میں خلیل سے باتیں کرتی۔ مسکراتی رہتی۔ صالحہ اسے زیادہ تر کاموں میں الجھائے رکھتیں کہ وہ ہر ہنر سیکھ لے۔ خود وہ بھی شوق سے کام کرتی۔ دس جماعتیں ہی پڑھ سکی۔ ضیاء الدین کالج بھیجنے کے حق میں نہ تھے۔

☆......☆......☆

اچانک نزہت کی طرف سے خاموشی چھا گئی۔

خط کا جواب نہ آتا۔ فون کرتے تو لائن نہ ملتی۔ ضیاء الدین کا دل دھڑکا۔ دل وسوسوں کا شکار ہو چلا تھا۔

انہیں دل کا پہلا دورہ پڑا۔ صالحہ کی روح تک کانپ گئی۔ کیسے جاتے معلوم کرتے کیسے بھیجتے فشار خون بلند رہنے لگا۔ ڈاکٹر سوچوں سے پرہیز کو کہتے مگر وہ تو اوپری سطح بھی چھوڑتی جارہی تھیں۔

دو ماہ اور گزرے۔ ایک رات دماغ کی نس پھٹی اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ گھر پر اداسیوں کا راج ہو گیا۔ کسی انہونی کا اشارہ سا دکھتا تھا۔ صالحہ نے بھی ایک روز چپ چاپ سفرِ آخرت کی تیاری کر لی۔

سطوت تو جیسے بوکھلا سی گئی۔ ارشد وہ سرے شہر پڑھتا تھا مہینے بعد چکر لگاتا۔ ایسے میں رفیقہ کا ساتھ کسی رفیق سے کم نہ تھا۔ رفیقہ جو ملازمہ کم اور ساتھی زیادہ تھی۔ ادھیڑ عمر بیوہ نہ کوئی بچہ۔ دور پار کے چند عزیز کسی گاؤں میں رہتے تھے۔ رفیقہ برسوں سے یہیں تھی نمک خوار تھی۔ سطوت کو تنہا کیسے چھوڑتی اور جاتی بھی کہاں؟ اس کا کب کوئی اور ٹھکانہ تھا۔ سطوت قسمت کے اس پھیر پر حیران و ہراساں تھی۔

خلیل اور نزہت کو کوئی خبر نہ تھی۔ انہیں دونوں کے انتقال کی خبر دے دی گئی تھی۔ چار ماہ اور گزرے۔ اس روز سطوت غسل خانے میں تھی جب ڈاکیا آیا۔ کراچی سے خط آیا تھا۔ اُف کس قدر پرانی تاریخ تھی۔ چھ ماہ پہلے کا خط۔ اب ملا۔ رفیقہ نے بد دیانتی کی اور خط کھول لیا۔ نزہت نے کسی سے لکھوایا تھا۔

میں اور خلیل خریداری کر کے آرہے تھے کہ ایک ٹرالر نے انہیں بری طرح کچل دیا۔ خلیل موقع پر جاں بحق ہو گیا اور میں موت و حیات کی کشمکش میں ہوں۔ اگلے خط میں ان کی بھی وفات کی خبر تھی......! سب ملیا میٹ ہو گیا۔

رفیقہ نے دل پر ہاتھ رکھ دیا اور اشکوں کو دل پر گراتی اسے اپنے صندوق میں کپڑوں کے نیچے کسی راز کی طرح دفن کر دیا۔

سطوت کے ہونٹوں پر جامد چپ رہنے لگی تھی۔ خاموش اداس سفید ململ پر کڑھائی کرتی۔ دن بدن کمزور ہوتی جارہی تھی۔ رنگت زرد، آنکھیں ماند پڑتی جارہی تھیں۔ رفیقہ اسے دیکھ دیکھ کر ہولتیں۔ سچ بتانے کی ہمت نہ تھی۔ آس ٹوٹتی تو سانس کی ڈور ٹوٹتی۔ ارشد آتا وہ ایک لاپروا سا نوجوان تھا۔

پھر آپا بیگم کا رعب و دبدبہ ابھی آنے والے حالات سے نابلد لگا۔ اسے موجودہ حالات کا بھی اندازہ نہ تھا۔ سطوت اس کا خیال رکھتی۔ وقت پر رقم تھما دیتی۔

وہ پڑھائی میں اچھا تھا۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والا معاملہ تھا۔ رفیقہ ہی بس اس راز کو محسوس کر کے اشک بہاتی رہتی۔

☆......☆......☆

سالوں پر سال گزرتے گئے۔ ماہ و سال کی گردشیں جاری و ساری تھیں۔ نہ بدلا تو آپا بیگم میں۔ وہی آس، امید اور انتظار۔ گرتے کاڑھتیں، نظریں اتارتیں اور سنبھال کر رکھتی جاتیں۔

رفیقہ تکتی رہ جاتی اسے سطوت عزیز تھی۔ وہ اسے کھونا نہیں چاہتی تھی۔ موسم بدلتے گئے۔ حویلی میں بوسیدگی زور پکڑتی گئی۔ خود سطوت جہاں کون سا دہیں کھڑی تھی۔ عمر کی حدیں پار کرتی کئی برس گزر گئے۔ مگر امید جوان اور توانا تھی۔

رفیقہ نے ایک روز سطوت کو شادی کا مشورہ دے ڈالا۔ وہ بھونچکا ہی تو رہ گئی۔ رفیقہ نے سمجھانا چاہا مگر اس نے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔ ارشاد بار بار کہتا۔ سطوت کی ''ناں'' ''ہاں'' میں نہ بدلی۔

''میں پتا کر آیا ہوں۔ وہاں کوئی نہیں۔ اب ان کا انتظار کرنا فضول ہے۔'' ارشد اب بچہ نہ تھا۔

سطوت کے دل پر گھونسا پڑتا۔ وہ انگوٹھی دیکھتی اور رو پڑتی۔ ارشد تھک ہار کر باہر چلا گیا اور وہیں شادی کر لی۔ سطوت کا لمحہ لمحہ سراپا انتظار رہتا۔ دہلیز کو تکتا رہتا۔

آم کے پیڑ پر اب کوئل کوکتی نہ تھی کہ کرلاتی تھی۔ ساون آتا تو آنکھوں میں جھڑی لگ جاتی۔ سردیوں کی طویل راتوں میں خلیل کے جذبوں کی گرماہٹ اسے بے قرار کرتی۔

برس بیتتے گئے۔ رفیقہ میں دم خم ختم ہو رہا تھا۔

کمزوری تھی کہ بڑھتی جارہی تھی۔ بڑھاپا صدموں کی وجہ سے جلد آن وارد ہوا۔ وہ زیادہ تڑپتی رہتی۔ حویلی میں صفائی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ بہار خزاں میں بدل گئی تھی۔ سطوت آئینہ دیکھتی تو بیتے برسوں کی سختیاں چہرے تو چہرے پورے وجود پر حاوی دکھائی دیتیں۔

تب وہ خلیل احمد کو پکارا تھتیں۔ بے اختیار ہو کر۔

''کس بھنور میں چھوڑ گئے ہو۔ خدارا چلے آؤ۔ موسم بھی پلٹ کر آجاتے ہیں تم نے تو خبر ہی نہ لی۔''

رات بھر وہ سسکتی رہتی۔

☆......☆......☆

''آپا بیگم اتنے برس بعد تو نکاح بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ آپ نے بہت غلطی کی۔ خلیل کے لیے سراپا انتظار بنی جوانی تیاگ دی۔ روپ اجاڑ دیا۔ بہار خزاں میں بدل ڈالی اپنے آپ پر بہت ظلم کیا۔ آپا بیگم آپ نے۔'' رفیقہ تڑپ کر رو پڑتی۔ بوڑھی آنکھوں میں دکھ شکوے سوال گردش کرنے لگتے۔

''میرے بعد آپ کا کیا ہوگا آپا بیگم؟'' وہ اس لمحے سوال کرتی تو ایک سرد آہ بھر کر سطوت جہاں نرمی سے کہتی۔

''اللہ ہے ناں۔ وہی مالک وہی رازق ہے۔''

امید و آس کا پنچھی ابھی بھی وقت کی قید میں تھا۔

☆......☆......☆

یونہی ایک رفیقہ کے دور کے ماموں زاد اپنے بیٹے اور بہو کو لے آئے۔

''انہیں اپنی پناہ میں رکھ لو۔ رفیقہ یہ بہت دکھوں کے مارے ہیں۔'' شبیر بھائی کہتے ہوئے رو پڑے۔

''ایں......کیا......یہ گھر ہے سرائے یا ٹھکانہ نہیں۔'' رفیقہ نے دوٹوک الفاظ میں سختی سے کہا۔ تو آپا بیگم نے حامی بھرلی۔

لڑکی صغریٰ گھر سے بھاگ کر آئی تھی۔ یہاں اس نے نذیر سے نکاح کرلیا۔ اب اس کے گھر والے جان کے دشمن بن گئے تھے۔ سو شبیر انہیں یہاں لے آیا۔ یہاں انہیں کوئی خطرہ نہ تھا۔ آپا بیگم کو بھی سہارا درکار تھا۔ رفیقہ کو شاید اس کا انتظار تھا۔ ہفتہ بھی نہ گزرا کہ اوپر والے نے بلا بھیجا۔

آپا بیگم کا صدموں سے کلیجہ پھٹا جارہا تھا۔ ایسے میں صغریٰ نے انہیں سنبھالا، وہ بہت سادہ اور محبت کرنے والی لڑکی تھی۔

☆......☆......☆

آج دھوپ کھل کے نکلی تو آپا بیگم نے رفیقہ کے کمرے کا سامان نکلوایا۔ کمرہ صاف کروایا۔ صندوق کھولا جارہا تھا کہ کپڑوں کی تہہ سے ایک خط نما کاغذ برآمد ہوا۔ بوسیدہ پرانا مگر حرف صاف پڑھے جارہے تھے۔ صغریٰ ان پڑھ تھی۔ آپا بیگم کو دکھانے چلی آئی۔

''آپا بیگم یہ دیکھیے تو کیا ہے۔'' صغریٰ نے انہیں دیا اور باقی سامان سمیٹنے لگی۔

برسوں پرانا خط زہر کا!!! آپا بیگم کا دل تھم گیا۔ جیسے جیسے خط پڑھتی گئیں اشکوں کا سمندر آنچل میں سمٹنے لگا۔ آخری سطر تک وہ بے دم ہوگئیں۔

''مجھ سے رفیقہ بڑی خبر چھپا گئی۔ ایسا دھوکا۔ ایسی قیامت خبر......اندوہناک خبر! برسوں راز سینے میں دفن کیے خود بھی دفن ہوگئی رفیقہ۔ کس سے جواب مانگوں۔ اب مر تو نہ جاتی میں اس خبر سے۔ اب بھی تو زندہ ہوں رفیقہ تم نے بہت برا کیا میرے ساتھ۔''

خط کیا تھا قیامت کا مژدہ تھا۔

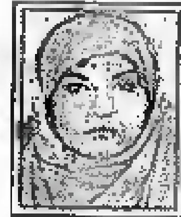
وہ رات آپا بیگم کے لیے سیاہ ترین رات تھی۔ آس، امید کی آخری رات انتظار کی آخری رات۔ خوشیوں، خواہشوں کی مرقد پر اشکوں کے دیپ جلاتی وہ سارے گرتے نکال کر سسکتی رہی اور انہیں دیکھتے ہوئے رات گزرتی رہی۔

☆......☆......☆

صبح ہوئی تو سب گرتے بانٹ دیے اور اب آپا بیگم کے ہاتھ میں سوئی دھاگے کی جگہ سفید دونوں والی تسبیح تھی اور سر پر سفید ململ کا دوپٹہ جس سے انہوں نے خلیل احمد کے لیے گرتا بنانا تھا اب اوڑھنی بنا انہیں سالوں بعد بیوگی کا احساس دلا رہا تھا۔ اب ان کی انگلی دیکھنے والوں نے پہلی بار بنا انگوٹھی کے دیکھی جو خط کے کاغذوں میں لپٹی کپڑوں کی آخری تہہ میں پڑی تھی۔

☆☆......☆☆

ملن



جنجل مینلو

اُس ڈاکٹر کا قصہ ملن، جسے آخر اُس کی محبت مل ہی گئی تھی

''سارنگ...... سارنگ......'' زرین آپی اُسے پکارتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔ سارنگ نے کتاب چہرے کے آگے سے ہٹاتے ہوئے اُن کی طرف دیکھا۔

''سارنگ بھیا ذرا ہمارے ساتھ شاپنگ پر تو چلو......'' آپی نے دُلار سے کہا۔

عید پر کتنا رش ہوتا ہے اور رش میں تو اُسے ویسے ہی گھبراہٹ ہوتی تھی۔ سارنگ کو شاپنگ پر جانے کے تصور سے ہی گھبراہٹ ہونے لگی۔

''آپی وہ ڈرائیور نہیں ہے کیا؟''

''نہیں تم چلو...... دو گھنٹے میں واپس آ جائیں گے۔''

''اچھا چلیں......'' وہ اُٹھ کر کھڑا ہوا۔

سارنگ اور ظفر دو بھائی تھے۔ سارنگ میڈیکل کے آخری سال میں تھا اور آج کل چھٹیاں تھیں اس لیے وہ گھر پر تھا۔ ایڈووکیٹ ظفر شہر کے اچھے وکیل تھے۔ وہ شادی شدہ تھے اور ان کے تین بچے تھے۔ آپی کے دو بچے تھے۔

وہ ان کے ساتھ کوئٹہ سے عید منانے آئی ہوئی تھیں۔ بچوں کی وجہ سے گھر میں خوب رونق لگی ہوئی تھی۔ سارنگ کے والد جاگیردار تھے۔ لیکن اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سلجھے ہوئے۔ والدہ بھی سیدھی سادی محبت کرنے والی تھیں۔

بچپن سے ہی سارنگ نے گھر میں محبت کی فضا دیکھی تھی۔ بھابی بھی بالکل ماں جیسی تھی۔ گھر میں سب ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے۔

☆......☆......☆

بھابی نے اور آپی نے بہت سے شاپر اُسے دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ تم...... گاڑی میں رکھو۔''

''آپی میں بھی وہیں آپ کا گاڑی میں بیٹھ کر انتظار کرتا ہوں...... ہاں ہاں ٹھیک ہے ہم وہیں آ جاتے ہیں ابھی دوپٹوں کو پیکو بھی کروانا ہے اور چوڑیاں بھی خریدنی ہیں۔'' آپی نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا اور وہ شاپر اٹھائے گاڑی میں آ بیٹھا۔

اور تب ہی ماضی کے وہ دن نہ جانے کیوں اُسے یاد آ گئے۔ جب وہ میٹرک یا فرسٹ ایئر میں تھا۔ تب بازار جانے میں کتنا مزہ آتا تھا۔ بائیک پر وہ اور اس کے دوست بس کوئی بازار کا کہے فوراً تیار ہو جاتے تھے۔ اور عید کے دنوں میں تو بہت مزہ آتا تھا۔

خاص کر کے رمضان کے آخری عشرے میں

شاپنگ مالز پر رنگا رنگ آنچل اور حسین چہروں کی بہار آئی ہوئی تھی۔
کبھی کسی سے چھیڑ چھاڑ نہیں کی کیونکہ معزز گھرانوں سے تھے، بس مخصوص پوائنٹ پر کھڑے ہو جاتے اور آتی جاتی لڑکیوں پر جملے کستے اور جوابی شوخ جملوں پر ہنستے محظوظ ہوتے۔ کیا بے فکری کا زمانہ تھا، صبح کی شرارتیں شام تک بھول جاتے تھے۔
ایک دفعہ امی نے ناپ کی چوڑی دیتے ہوئے کہا۔
''اس ناپ کی ست رنگی چوڑیاں اور ساتھ نگ والے کڑے لے آؤ......'' بس ساتھیوں کو ساتھ لیا اور بائیک پر ہوا ہو گئے۔
چوڑیوں والی گلی میں شاپ کے قریب کھڑے ہو گئے۔ گرم گرم چنے پھانکتے ہوئے آتی جاتی لڑکیوں کو دیکھنے لگے۔
سامنے سے چار لڑکیاں آرہی تھیں۔ وہ بھی انہی کی طرح چنچل تھیں۔ قریب سے گزرتے ہوئے ان میں سے ایک بولی۔
''خود کو شان سمجھتے ہیں۔'' بے اختیار سارنگ ہاتھ اپنے بالوں کی طرف اٹھ گیا۔
''ارے ہاں...... بال بھی شاہ رخ خان کی طرح بڑھائے ہوئے ہیں۔'' وہ تو چلی گئیں مگر وہ سب خود کو ہیرو سمجھنے لگے۔ خوب بھٹکنے کے بعد ایک شاپ پر چوڑیاں لینے کو رکے۔ دکاندار ایک لڑکی کو چوڑیاں پہنا رہا تھا۔
''یار ہم بھی چوڑیوں کی شاپ کھول لیں۔'' احمد نے سرگوشی کی جو کہ اس لڑکی نے بخوبی سنی۔ اس کے چہرے پر ایک شرمیلی سی مسکراہٹ آگئی اور لڑکوں کا دل باغ باغ ہو گیا کہ اتنے میں ''ارے...... چھوڑ میری چادر...... موئے......'' کہتی ہوئی ایک بڑی بی، احمد پر پل پڑی۔ جس کا پاؤں بڑی بی کی چادر کے پلو پر آ گیا تھا۔
''ٹھہر ذرا...... میں تجھے چوڑیوں کی شاپ کھلواتی ہوں۔'' بڑی بی شاید ان لڑکیوں کے گروپ کی چوکیدار تھی اور لڑکوں نے وہاں سے بھاگنے میں ہی



عافیت جانی۔ دور تک لڑکیوں کی ہنسی کانوں میں گونجتی رہی۔ کافی دیر ہو چکی تھی اس لیے خالی ہاتھ ہی گھر آئے سارا مزا کرکرا ہو گیا تھا۔ امی کی ڈانٹ الگ سنی۔

"اتنا سا کام نہ ہوا۔ خالی چوڑی واپس لے آیا...... کب اس لڑکے کو عقل آئے گی...... نکما...... کہیں کا۔" اپنے کمرے میں جاتے ہوئے توبہ کر لی کہ پھر ایسا کبھی نہیں کریں گے۔ عزت بچی کروڑوں پائے......اب یہ باتیں سوچتے ہوئے اُسے خود پر ہنسی آئی کہ کتنے بیوقوفوں جیسی حرکتیں تھیں وہ سب، اب وہ بازار آنے سے ہی گھبراتا تھا۔

جب بھی سب دوست اکٹھے ہوتے تھے پرانی شرارتیں یاد کرکے ہنستے تھے۔ اب سب کے سب کسی نہ کسی پروفیشن میں جا چکے تھے۔ بلکہ کچھ کی تو شادی ہو چکی تھی۔ اب سب کو اس کی شادی کی بھی فکر تھی۔ جب بھی گھر آتا امی بھابی ضرور یہ ذکر چھیڑتیں اس سے اس کی پسند پوچھتیں مگر آج تک سارنگ سے ایسی کوئی لڑکی نہ ٹکرائی تھی۔ جسے دیکھ کر اس کے دل کی گھنٹی بجی ہو۔

گھنٹی تو نہ بجی لیکن برابر والی گاڑی کا ہارن ضرور بج رہا تھا۔ شاید ڈرائیور کو گاڑی نکالنی تھی۔ سارنگ نے گاڑی سائیڈ میں کی اور گھڑی دیکھی ابھی تک خواتین آنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ تین گھنٹے ہو رہے تھے، سارنگ کو ان کے ساتھ آئے ہوئے۔ اس نے موبائل پر بھابی کا نمبر ملایا کہ ابھی کتنی دیر لگے گی۔

تو بھابی نے شاپنگ ختم ہونے کی نوید دیتے ہوئے اُسے دکان کا نام بتایا کہ وہ لوگ وہاں کھڑے ہوئے ہیں۔ شاپرز زیادہ ہیں اس لیے وہ وہاں آ جائے۔" سارنگ نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ ان لوگوں کی شاپنگ ختم ہوئی۔

لیکن جب وہ اُن کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچا تو کچھ بور سا ہو گیا۔ یہ دیکھ کر کہ خواتین کچھ شاپر تھامے اور کچھ زمین پر رکھے بڑے اطمینان سے کسی سے محو گفتگو تھیں۔

"سارنگ اِن سے ملو، یہ ڈاکٹر نرگس ہیں، میری بھابی کی کزن۔" اور سامنے والی شخصیت کو دیکھ کر اس کی ساری کوفت اور تھکن دور ہو چکی تھی۔

"اسلام علیکم!" ڈاکٹر نرگس نے سارنگ کو سلام کیا۔ اور سارنگ کی من کی گھنٹی بج چکی تھی اور وہ چاہ رہا تھا کہ وہ اسی طرح کھڑا اُسے دیکھتا رہے۔

"اور یہ اُن کی امی اور بھابی ہیں۔" قریب آتی ہوئی دو خواتین کا اور تعارف کروایا۔

"اچھا آنٹی ضرور ہمارے گھر آیئے گا۔" بھابی نے جلدی جلدی رخصت چاہی کیونکہ افطار کا وقت ہونے والا تھا۔

پھر راستے میں بھابی نے آپی کو تفصیل بتائی کہ ڈاکٹر نرگس نواب شاہ میڈیکل کالج کے آخری سال میں ہے اور کراچی میں اُن کے بھائی بھاوج رہتے ہیں۔ یہ ان کے پاس عید کرنے آئی ہوئی ہیں۔ میں خاموشی سے اُن کی باتیں سنتا رہا۔

آج میرا دل ایک انجانی خوشی سے دوچار ہو رہا تھا۔ آج میری تلاش جو ختم ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب اگر مجھ سے شادی کے لیے کہا گیا تو فوراً لڑکی بتا دوں گا۔ یہ سوچتے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ شاید چاہت اسی کا نام ہے۔

پھر کئی روز اسی طرح خواب دیکھتے گزر گئے۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ اب کوئی بھی میری شادی کا ذکر کیوں نہیں چھیڑ رہا تھا۔ ورنہ یہ گھر والوں کا پسندیدہ موضوع تھا۔ خود سے تو میں بھی نہیں کہہ پا رہا تھا کہ ابھی مجھے ہاؤس جاب کرنی تھی۔ ایسی جلدی بھی نہ تھی۔

"سنو...... سارنگ۔" میں نماز کے لیے جانے کو تھا کہ آپی نے مجھے پکارتے ہوئے کہا۔

"جی۔" وہ جلد آ جانا آج عشاء کے بعد میری سہیلی کا نکاح ہے۔"

تراویح کے بعد میں جلدی جلدی گھر آیا تو خواتین تیار تھیں۔

"آپی کی سہیلی لیلیٰ کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ اس لیے جلد ہی پہنچ گئے خواتین تو خواتین سے گھل مل

گئیں۔ لیکن میں چپ بیٹھا تھا اور نظریں سب کا جائزہ لے رہی تھیں۔ سادہ سی تقریب تھی۔

بہت کم مہمان تھے۔ انہی مہمانوں میں ڈاکٹر نرگس کی بھابی بھی نظر آ گئیں اور میری بے چین نظریں اپنے مہمان کو ڈھونڈنے لگیں۔ دھک دھک...... دھک...... ایک...... دو...... تین دل کی گھنٹی نے بجنا شروع کیا اور پھر وہ آنچل لہراتی مسکراتی آپی کی طرف آتے ہوئے نظر آ ہی گئی۔

میں بھی اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔ آپی نے بتایا کہ یہ میرا بھائی ڈاکٹر سارنگ ہے یہ بھی آخری سال میں ہے۔"

"اچھا......" اس نے مجھے دلچسپی سے دیکھا۔ پھر وہ تقریب مجھے اپنی زندگی کی سب سے حسین تقریب لگنے لگی۔ وہ میرے ساتھ بیٹھی مجھ سے باتیں کر رہی تھی اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ یہ وقت یہیں تھم جائے۔ نرگس کچھ ہی دیر میں ہم سب سے گھل مل گئی تھی۔ نہ جانے کیوں، مجھے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی جھلکتی محسوس ہو رہی تھی۔

"اللہ کرے یہ میری خوش فہمی نہ ہو۔" دل نے دعا مانگی تھی۔

☆......☆......☆

آج چاند رات تھی سب بچے خواتین چھت پر دوربین ہاتھوں میں لیے چاند کو ڈھونڈ رہے تھے۔ اڑوس پڑوس کی چھتوں پر بھی رونق ہی رونق تھی۔ سب کو عید کی خوشی تھی۔ ویسے بھی روزوں کے بعد عید کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ میں بھی دوربین لیے بھتیجوں بھانجوں کے ساتھ چاند کو تلاش کر رہا تھا کہ دوربین گھماتے گھماتے...... دل جیسے تھم سا گیا۔

"نہیں...... نہیں یہ میرا وہم ہے۔" میں نے دوبارہ اس سمت دیکھا۔

"چاند...... چاچو...... چاند......" چھوٹے نے شور مچایا۔

"وہی تو دیکھ رہا ہوں۔" واقعی وہ نرگس ہی تھی۔ جو گردن گھما گھما کر چاند دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں بھی دوربین آنکھوں پر لگائے دل کی آنکھوں سے

عید کا چاند

اب کے برس بھی تم دیکھو گے اکیلے عید کا چاند
میرے بنا پردیس میں کیسا لگے گا عید کا چاند

کیا اس لیے بڑے شوق سے بنایا تھا رشتہ
اتنے دور چلے جاؤ کہ بن جاؤ تم عید کا چاند

سوچتی ہوں چاند دیکھ کر یہ دعا مانگوں گی وہ مانگوں گی
بھول جاتی ہوں میں ہر دعا، جب دیکھتی ہوں عید کا چاند

رات دیکھا تھا آسماں کے ماتھے پہ اک جھومر تھا
تم کہو، تمہارے دیس میں کیسا تھا عید کا چاند

کتنی عیدیں گزر گئی ہیں، تنہا تمہارے بغیر
اگلے برس میں نہ دیکھوں تمہیں تنہا، کہتا ہے یہ عید کا چاند

لوٹ آؤ کہ اب انتظار کی سکت نہیں اس دل بے حال میں
مانگ لینا دعا ملن کی دیکھ کر عید کا چاند

شاعرہ: صائمہ بشیر۔ سرگودھا

اسے دیکھ رہا تھا۔

"چاچو...... چاند تو اس طرف ہے آپ......"

"یار میرا چاند تو اس طرف ہے نا۔" میری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

وہ بیچارا بچہ چپ ہو گیا۔ دو تین گھروں کو چھوڑ کر سامنے لال کوٹھی کی چھت پر وہ نرگس ہی تھی۔ ساتھ میں دو تین لڑکیاں اور بھی تھیں۔

"اچھا تو جناب...... لڑکیوں کو تاک رہے ہیں۔" آپی نے مجھے ٹوکا تو میں جھینپ سا گیا۔ اتنے میں شور مچ گیا۔ چاند نظر آ گیا۔ عید ہو گئی بچے تالیاں

بجانے لگے، بڑے نیا چاند دیکھ کر دعائیں مانگنے لگے۔ میں نے بھی خلوصِ دل سے اللہ سے نرگس اپنے لیے مانگی۔ اور شاید قبولیت کی گھڑی تھی کہ عید کی شام ہی نرگس اپنی بھابی اور کزنز کے ہمراہ ہمارے گھر آ گئی۔ تب اس نے بھابی کو بتایا کہ دو گھر چھوڑ کر ہی اس کے ماموں کا گھر ہے یہاں آئی تو سوچا آپ نے بلایا ہے تو آپ کے یہاں بھی ہو آؤں۔''

امی، بھابی، آپی بہت خوش تھیں اور مجھے تو آج گھر کچھ زیادہ ہی روشن لگ رہا تھا۔ عید کی خوشی دوبالا ہو رہی تھی۔ ہلکے گلابی سوٹ اور میچنگ کی جیولری اور کالے لمبے بالوں میں گلابی پراندہ ڈالے وہ سادگی کی ساری میرے دل میں اُتری جا رہی تھی۔

سارنگ کے بڑے بھائی شہر کے بہترین وکیل تھے اور نرگس کے بھائی بھی مشہور وکیل تھے اور پھر دور پرے کی رشتہ داریاں بھی نکلیں۔ تو دونوں گھرانوں میں جلد ہی قربت ہوگئی اور ایک دوسرے کے گھر آنا جانا ہو گیا۔

☆......☆......☆

بہت جلد میں اور نرگس ایک دوسرے کے نزدیک آتے چلے گئے۔ ہم دونوں نے ہاؤس جاب بھی ایک ہی ہاسپٹل سے شروع کی اور یہ ساتھ ہماری محبت کو مزید گہرا کرتا چلا گیا۔

اور شادی کی بات پر جب میں نے ڈاکٹر نرگس کا نام لیا۔ تو سب بہت خوش ہوئے۔ اور رشتہ مانگنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ظفر بھائی سے مشورے کے بعد نرگس کے گھر آپی امی بھابی نرگس کا رشتہ مانگنے گئی ہوئی تھیں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ 'ہاں' ہوگی۔ اس لیے میں منہ میٹھا کرنے کو بے قرار تھا اور راہوں میں آنکھیں بچھائے خواتین کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ دل تو چاہ رہا تھا میں بھی وہیں موجود ہوتا۔ مگر یہ آج ممکن نہ تھا آپی نے مجھے پیار بھری ڈانٹ پلائی تھی کہ اتنے بے صبرے نہ ہو۔ منگنی والے دن چلنا۔

وقت تھا کہ گزرنے کا نام نہیں لے رہا تھا آخر خدا خدا کر کے گاڑی کی آواز آئی، میں ٹی وی لاؤنج میں آیا۔ لیکن آپی...... مجھے نظر انداز کرتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ میں حیران ہوا! اتنے میں بھابی بھی کچھ مایوس سی اندر آتی ہوئی نظر آئیں۔

''انکار نہیں...... نہیں...... ایسا نہیں ہوسکتا۔'' میں نے دل کو تسلی دی۔ اور بے قراری سے خود ہی بھابی سے پوچھا۔

''کیا ہوا؟'' بھابی نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''رشتہ نہیں ملا۔'' اور منے کو اٹھاتے ہوئے اندر چلی گئیں۔ اور میں وہیں صوفے پر بیٹھتا چلا گیا۔ لیکن دل کو قرار نہیں آ رہا تھا تبھی اٹھا اور سیدھا امی کے کمرے میں آ گیا اور جھنجلا کر پوچھا۔

''امی...... کیا وجہ بتائی انہوں نے انکار کی۔''

''اسی وجہ کا تو ہم سب کو دکھ ہو رہا ہے کہ وہ رئیس نظام الدین کی منگیتر ہے۔''

''کیا......'' اب شاک لگنے کی میری باری تھی۔

''رئیس نظام کی۔''

''اس کی تو پہلے ہی دو بیویاں ہیں ابھی پچھلے دنوں تو اس نے اپنی بیٹی کی شادی کروائی تھی وہی رئیس نظام۔'' مارے صدمے کے اس کا گلا خشک ہو گیا۔

''مجھے رشتہ نہ دیں، مگر نرگس جو کہ خود ایک پڑھی لکھی ڈاکٹر ہے۔ کیا یہ سب اُسے قبول ہوگا؟'' میں بہت اپ سیٹ تھا۔

''حیدر صاحب کو خود بہت افسوس ہے۔ لیکن بڑوں کے فیصلے کے آگے وہ بے بس ہیں۔'' امی نے صورتِ حال بتائی۔

ساری رات میں دکھ سے سو نہ سکا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی مدد کے لیے مجھے پکار رہا ہو۔ سوتے جاگتے آخر رات گزر ہی گئی۔ صبح ناشتے کی میز پر بھی یہی موضوع گفتگو تھا۔

اتنے پڑھے لکھے خوشحال لوگ اور ایسی دقیانوسی رسم و رواج، بھابی بولیں۔

''مجھے تو یہ دکھ ہے کہ ابھی لڑکی پیدا بھی نہیں ہوئی اور منگنی کر دی گئی اب دونوں طرف انا کا مسئلہ ہے نرگس کی زندگی داؤ پر لگا دی بڑوں نے، اچھے بڑے ہیں۔ اندھے فیصلے کرنے والے۔'' آپی نے کہا۔ اور

سب سے بڑی بات کہ نرگس کو بھی یہ بات تفصیل سے معلوم نہیں۔ بس وہ بھی شاک میں آ گئی۔ بالکل زرد سی پڑ گئی یہ سب سن کر۔ تب حیدر صاحب نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ تم فکر مت کرو۔ اللہ بھلا کرے گا۔ تم صرف اپنے کیریئر پر توجہ دو۔ ہم تو چپ چاپ اٹھ کر آ گئے۔'' آپی فکرمندی سے بولیں۔

''اٹھو سارنگ تم نے ناشتا بھی ٹھیک سے نہیں کیا ہے۔ چلو دیر ہو رہی ہے۔'' بھائی نے بات سمیٹتے ہوئے سارنگ کو چلنے کو کہا۔ دونوں بھائی ساتھ صبح کو گھر سے نکلتے تھے۔ اور میں مردہ دلی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ دل تو نہیں چاہ رہا تھا آج کہیں جانے کو مگر میں نرگس سے ملنا چاہتا تھا۔ اُس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جب میں اسپتال آیا تو معلوم ہوا کہ نرگس آٹھ دن کی چھٹی پر ہے۔ میرا دل بجھ سا گیا۔ یہ آٹھ دن آٹھ صدیاں تھیں میرے لیے۔ ایک ایک دن گن گن کر کاٹا تھا میں نے اور جب وہ آٹھویں دن ہاسپٹل آئی تو بہت کمزور اور زرد سی لگ رہی تھی۔

''تم ٹھیک تو ہو؟'' میں نے بے قراری سے پوچھا۔

''ہاں ٹھیک ہوں شکر ہے۔'' وہ پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولی۔

''نرگس یہ سب کیا ہو رہا ہے۔'' میری آواز میں شکستگی در آئی۔

''سارنگ پلیز ہمیں حالات سے سمجھوتہ کرنا پڑے گا۔ میں اپنی وجہ سے اپنے گھر والوں کو مشکل میں نہیں ڈال سکتی۔ اب ہمارے راستے جدا ہیں۔ تمہیں میری مجبوری سمجھنا ہوگی۔'' اُس نے بہت دل گرفتگی کے ساتھ مجھ سے التجا کی۔

''ٹھیک ہے نرگس میں اپنا معاملہ خدا پر چھوڑتا ہوں۔'' میں نے ٹھوڑی سانس بھر کے جیسے اُس کی التجا کی لاج رکھی۔ پھر ایک بے نام سی خلش کے ساتھ ہاؤس جاب مکمل ہوئی اور خوش قسمتی سے کمیشن میں کامیاب ہو کر مجھے اندرونِ سندھ جاب مل گئی اور میں دلجمعی کے ساتھ مریضوں میں مشغول ہو گیا۔

دنیا میں لوگوں کے بے شمار مسائل ہوتے ہیں۔ ہم اپنے چھوٹے سے مسئلے کو بڑا سمجھ کر اس کا غم کرتے رہتے ہیں۔

میں نے یہ بات اس چھوٹے گاؤں میں آ کر محسوس کی تھی۔ جن کے دامن دکھوں اور مسائل سے بھرے ہوئے تھے ایسے میں اگر کوئی خالی ہاتھ ہی اُن کے سر پر رکھ دیتا تو یہ جھولی بھر بھر دعائیں دیتے تھے۔ وقت تو جیسے تیسے گزر ہی جاتا ہے۔ لیکن میرا تو کچھ زیادہ ہی مصروف وقت گزر رہا تھا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا اور رمضان آ گیا۔

☆......☆......☆

عید کی چھٹیوں میں جب میں گھر پہنچا تو سب ہی مجھے دیکھ کر خوش ہو گئے۔ اُس دن میں بچوں میں گھرا ہوا بیٹھا تھا اور وہ مجھے اپنے جوتے اور کپڑے دکھا رہے تھے تبھی ملازم نے ایک عید کارڈ لا کر مجھے دیا۔ اُسے کھولتے ہوئے میں نے سوچا کس کا ہوگا۔

دوستوں کے نام ذہن میں آنے لگے۔ فرنٹ پر ایک حسینہ چاند دیکھتے ہوئے دعا مانگ رہی تھی۔ اندر سے خالی تھا۔ آخری کونے میں لکھا تھا۔

''نرگس۔'' میں بچوں کے درمیان سے اٹھ گیا اور اپنے کمرے میں آ کر دیر تک کارڈ کو دیکھتا رہا پھر ہونٹوں سے لگا لیا۔ من میں گھنٹیاں سی بج رہی تھیں۔ اور آنکھوں میں آنسو آئے جا رہے تھے۔

بھابی نے بتایا تھا کہ اُس نے ایک پرائیویٹ ہاسپٹل میں جاب کر لی ہے۔ میں دل چاہنے کے باوجود اُس سے کبھی ملنے نہیں گیا تھا اور نہ ہی نرگس نے کبھی یہ کوشش کی تھی۔ ایک شہر میں رہتے ہوئے بھی ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن گئے تھے۔ لیکن ہر عید پر اُس کا عید کارڈ میرے نام ضرور آ جاتا تھا۔ جس پر صرف اُس کا نام لکھا ہوتا تھا اور شاید اُس نام میں ہی وہ اپنے سارے جذبے چھپا کر مجھے بھیجتی تھی۔ کتنے ہی سال بیت گئے۔ وقت کا پہیہ گھوم رہا تھا اور اب پھر رمضان کا چاند نظر آ گیا تھا اور حسبِ روایت روزے نمازیں دیگر عبادتیں ہر کوئی خشوع و خضوع سے کر رہا تھا۔ میری زندگی میں بھی ایک ٹھہراؤ آ چکا تھا۔

آج ایک بوڑھی عورت کا بیٹا جس کی جلد ہی شادی تھی۔ اچانک بیمار ہوگیا۔ غربت کی وجہ سے ٹھیک دوائیں اور خوراک نہیں مل رہی تھی۔ میں نے خاص طور سے اس کیس کو لے لیا تھا۔ اور اپنی جیب سے بھی دوائیں پھل لے کر اس کی ہر ممکن مدد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ میری ریکویسٹ پر گاؤں کے کچھ خوش حال لوگ بھی اس کارِ خیر میں شریک تھے۔ کیونکہ سبھی کے دل میں میری بہت عزت تھی۔

میری محبت اور توجہ رنگ لائی اور اس بوڑھی عورت کا بیٹا کچھ عرصے میں صحت یاب ہوگیا۔ بوڑھی عورت میرے پاس مٹھائی لے کر آئی تو خوشی سے بے اختیار رو پڑی۔

''ڈاکٹر صاحب! جس طرح تم نے مجھے میرا بیٹا ٹھیک کر دیا ہے میں اللہ کے بعد تیری بہت شکر گزار ہوں۔ اللہ مجھ غریب کی سنے گا اور تیرے دل کی مراد اس عید کے چاند میں ضرور پوری ہوگی۔'' میں اُس سادہ لوح عورت کی بات پر مسکرا رہا تھا۔

اسی رات تراویح میں دعا مانگتے ہوئے دل کی مراد والی بات یاد آ گئی۔ تو میں نے بے اختیار اپنے اللہ کو پکار کر کہا۔

''میرے رب تجھے میرے دل کی خبر ہے مجھے میری زندگی کی وہ خوشی لوٹا دے جو مجھ سے کھو گئی ہے۔'' اور پھر آمین کہتے ہوئے میں نے نم آنکھوں سے اپنی دعا کو ختم کیا۔

☆......☆......☆

عید کی چھٹیاں ہوئیں اور جن کے گھر گاؤں میں وہ گاؤں کی طرف اور جن کے گھر شہروں میں تھے وہ شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ بس میں مسافروں کا بہت رش تھا۔ میں نے بھی ایک دن پہلے سے سیٹ بک کروائی اور گھر آ گیا۔

سوائے دل کی اُداسی کے سب کچھ ہر عید کی طرح ہی تھا۔ بچوں کے لیے جو تحفے لیے تھے وہ انہیں دے رہا تھا کہ شور مچا...... چاند ہوگیا...... چاند ہوگیا...... کل عید ہوگی۔

''چاند!'' میرے دل میں اِک ہوک سی اٹھی اور میں اُداسی سے مسکرا دیا۔

''آپی میرا کوئی کارڈ آیا ہے کیا؟''

''کارڈ تو سب تمہیں کل دے دیے تھے۔'' آپی کے جواب پر میں خاموش سا ہوگیا۔ آپی نے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیں۔

''ویسے میرے پاس ایک تحفہ ہے۔ تمہارے لیے ٹھہرو...... میں ابھی لے کر آئی۔'' میں گم سم بیٹھا تھا کہ آپی نے ایک کارڈ لا کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

کارڈ دیکھتے ہوئے میرے چہرے پر روشنی بکھرتی جا رہی تھی۔ کارڈ کے فرنٹ پر ایک الھڑ سی دوشیزہ ہاتھوں کی اوک میں گلاب لیے جیسے کسی کو پیش کر رہی تھی۔ اور پہلی بار کارڈ پر کچھ سطریں بھی جگمگا رہی تھیں۔

''عید مبارک کے بعد اب کارڈ پڑھنے والے تمہارا رشتہ قبول ہوا۔''

''نرگس۔''

''یہ کیا ہے یہ کیسے ہوا آپی؟'' خوشی کے بے تحاشا احساس کے ساتھ میں بیٹھتا چلا گیا۔ لگ رہا تھا کہ ہر چیز محوِ رقص ہے دل و دماغ سمیت۔

''اصل میں نرگس نے شرط رکھی تھی کہ جب تک وہ ایک اسپیشلسٹ ڈاکٹر نہیں بن جائے گی فی الحال شادی نہیں کرے گی۔

اِدھر اچانک یہ پتا چلا کہ رئیس نظام کے دماغ میں ٹیومر ہوگیا ہے۔ کچھ عرصے سے اُن کا علاج چل رہا تھا لیکن پھر اُن کا انتقال ہوگیا۔ ہم لوگ تعزیت کے لیے گئے تھے۔ چالیسویں کے بعد ہم لوگوں نے پھر نرگس کے لیے تمہارا رشتہ دیا جو قبول ہوگیا۔''

آپی بہت جھجکتے ہوئے اُسے بتا رہی تھیں اور وہ جیسے ہواؤں میں اُڑ رہا تھا۔

''کیسا لگا تمہیں یہ عید کا تحفہ۔'' بھابی بھی شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ وہاں آ گئیں۔

''یہ میری زندگی کا سب سے حسین تحفہ ہے بھابی۔ میری دعاؤں کا ثمر۔ اس عید کی مٹھاس میں ساری عمر نہیں بھولوں گا۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس دیا تھا۔

☆☆......☆☆

سیر... سوا سیر

ایک تصویر، ایک کہانی



ایک جنگل میں ایک شیر تھا۔ بہت طاقتور...... اپنے آگے کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں تھا۔ ایک دن چوہوں نے ٹھانی کہ ہم شیر کو سبق سکھائیں گے۔ لو جی ہوگئی جنگ کی ابتداء...... اب تو شیر کو پکڑنے کے لیے دھرنے دے دیے چوہوں نے...... شیر نے کہا کہ کچھ بھی کرلو، میں ہاتھ نہیں آنے والا۔ چوہوں کے دھرنے میں آہستہ آہستہ دوسرے جانور بھی شریک ہونے لگے۔ لومڑی، لکڑ بھگا، ہرن، گینڈے، ہاتھی، بندر، بھالو، بارہ سنگھے...... دیکھتے ہی دیکھتے پورا جنگل چوہوں کے دھرنے کا باسی ہوگیا۔ آخر شیر کو سامنے آنا پڑا مگر...... اُس نے جانوروں پر لاٹھی چارج کردیا۔ پورے جنگل کے جانوروں نے بھی اُس پر دل کھول کر ڈنڈے برسائے اور شیر کو لہو لہان کرکے جنگل بدر کردیا۔ اور یوں جنگل میں چوہوں کی بادشاہت قائم ہوگئی۔

زیر نظر تصویر میں جو معرکہ نظر آرہا ہے...... اگر ناانصافی نہ ختم کی گئی تو کہیں انجام...... چوہوں اور شیر جیسا نہ ہوجائے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟



ناول

ایم اے راحت

زرد لومڑی

قسط :03

انتقام کی ایک نئی داستان جو کسی ایک انسان سے نہیں لیا گیا۔

برصغیر کے نامور قلم کار ایم اے راحت کے قلم سے ایک نیا معرکۃ الآرا سلسلہ

پروگرام کے مطابق میں کلب میں داخل ہو گئی۔ بے حد شاندار عمارت تھی اندر کا ماحول بھی لاجواب تھا۔ اسے جدید ترین پیمانے پر آراستہ کیا گیا تھا۔ میں نے اس کے مختلف حصوں کی سیر کی۔ اعلیٰ پیمانے پر جوا ہو رہا



تھا۔ لمبے چوڑے آدمی کے ساتھ ناخوشگوار
اچانک میں نے ایک عورت کو دیکھا جو ایک خطرناک سی شکل کے
انداز میں بات کر رہی تھی۔ سیکرٹ سروس کے ریکارڈ میں اس شخص کی تصویر اور کارڈ بھی موجود تھے۔ یہ جان سیموئل تھا اور اس کلب کا مالک ہی تھا۔ لیکن سب سے زیادہ سنسنی کا شکار میں اس وقت ہوئی جب جان سیموئل نے عورت کو ایشل کہہ کر مخاطب کیا۔ انکل ترمود اوانچی نے مجھے آبدوز اغوا کرنے والوں کے وہ نام جو پاپا نے بھیک کیے تھے ان میں ایشل نارمن کا نام بھی شامل تھا۔ یہ عورت بے پناہ حسین اور پرکشش تھی۔
ابھی میں یہی سوچ رہی تھی کہ اچانک میں نے سیموئل اور ایشل کو چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو برا کہتے ہوئے سنا۔ دونوں شدت، غضبناک انداز سے ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے۔ آس پاس کے تمام لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ کچھ لوگ ان کے درمیان بیچ بچاؤ کے لیے بھی کھڑے ہو گئے۔ میں نے بھی اس بارے میں فوری فیصلہ کیا اور تیزی سے عورت کے قریب پہنچ گئی۔ اسے سہارا دینے والوں میں، میں واحد عورت تھی۔ ورنہ سب اس سے ہمدردی کر رہے تھے۔
میں نے اس کا بازو پکڑ کر ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ''پلیز۔ آپ خود کو سنبھالیں آپ کا چہرہ زرد ہو رہا ہے۔ مجھے وہ شخص انتہائی بدتہذیب معلوم ہوتا ہے۔ آیئے پلیز۔ میرے ساتھ مشروب کا ایک گلاس لیجیے۔''
پھر وہ میرے ساتھ کھنچی چلی آئی۔ اس نے مجھ پر توجہ بھی نہیں دی تھی۔ وہ گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی۔ وہ ابھی تک منہ سے ایک لفظ بھی نہیں بولی۔ پھر اس نے پہلی بار لب کشائی کی اور کہا۔
''وہ اس کلب کا مالک ہے۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے کتنا بڑا خطرہ مول لیا۔''
''آپ کے لیے کیا منگواؤں۔''
''شیری پلیز!'' وہ بولی۔ اور میں نے ویٹر کو اشارہ کر دیا۔
''اس نے مجھے کوئی معمولی شخصیت سمجھا ہے۔ میں امریکی بحریہ کے بہت بڑے افسر کی بیوی ہوں۔''
''یقیناً آپ تو بہت بڑی شخصیت ہیں میڈم۔''
''ایشل نارمن۔'' اس نے کہا لیکن اس نے مجھ سے میرا نام نہیں پوچھا تھا۔
شیری کے کئی پیگ پینے کے بعد اچانک اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔
''میں ذرا واش روم جاؤں گی۔'' میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ وہاں سے آگے بڑھ گئی اور میں اس پر غور کرنے لگی۔ نا جانے کیوں وہ مجھے ایک عام سی عورت لگی۔ ممکن ہے یہ وہ ایشل نارمن نہ ہو جس کا نام آبدوز اغوا کرنے والے گروہ میں شامل ہے۔ اس نام کی کوئی دوسری عورت بھی ہو سکتی ہے۔
میں انتظار کرتی رہی۔ جس طرح اس نے میرے پاس بیٹھ کر دل کی بھڑاس نکالی تھی اور میری پیش کش کو قبول کر کے شیری پی تھی اس کے تحت اسے واش روم سے نکل کر اخلاقاً میرے پاس ہی آنا چاہیے تھا۔ لیکن دس منٹ، پھر بیس منٹ ہو گئے وہ نہیں آئی تو میں نے فیصلہ کیا کہ واش روم کی طرف جا کر اسے دیکھوں۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر آگے بڑھی ہی تھی کہ ایک ویٹر میرے قریب آ کر جھکا۔
''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں میڈم۔ مجھے مسٹر میک منین نے یہاں ڈیوٹی پر لگایا ہے۔''
''اوہ۔ ابھی کچھ وقت پہلے ایشل نارمن واش روم گئی تھی واپس نہیں آئی۔ میں نے کہا۔
''آپ اپنی جگہ رکیں۔ میں چیک کر کے آتا ہوں۔''
اس نے کہا اور تیزی سے واپس مڑ گیا۔ میں واپس کرسی پر بیٹھ گئی۔ میک منین نے مجھ پر کافی توجہ دی تھی ابھی ویٹر کو گئے ہوئے ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ تیز تیز قدموں سے واپس آتا نظر آیا۔ میرے قریب

آ کر اس نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہا۔

''دو افراد اسے سنبھالے ہوئے پچھلے دروازے سے باہر جا رہے تھے۔ ضرور وہ اسے اس کی مرضی کے خلاف لے جا رہے ہیں۔ کیا آپ اس کار کا تعاقب کرنا چاہیں گی۔''

''ہاں۔ لیکن۔''

''لیکن بعد میں...... آپ اس کاریڈور کے باہر نکل جائیے۔ سیکرٹ سروس کی ایک کار سڑک کے دوسری طرف کھڑی ہے۔ اس کار کا رنگ سلور ہے اور اس کے ڈرائیونگ سیٹ پر جوزف براؤن نامی آدمی موجود ہے۔ وہ آپ کو جانتا ہے۔''

''اوکے۔ شکریہ۔'' میں نے کہا اور پھر تیزی سے ویٹر کے بتائے ہوئے راستے سے باہر نکل آئی۔ میں نے صاف دیکھا کہ ایک کار تیزی سے آگے بڑھی اس کی پچھلی سیٹ پر ایشل نارمن موجود تھی۔ اس کار کے آگے بڑھتے ہی میں نے سامنے نگاہ دوڑائی تو مجھے وہ کار نظر آ گئی جس کے بارے میں ویٹر نے مجھے بتایا تھا۔ میں نے برق رفتاری سے سڑک کراس کی اور اس کے قریب پہنچ گئی۔

''اس کار کا تعاقب کرنا ہے۔ میرا نام اینی پارک ہے۔ مسٹر میک مین......''

''میں جانتا ہوں۔ بیٹھیے۔''

ڈرائیور نے میرے بیٹھنے سے پہلے اسٹارٹ کر دی۔ میں بیٹھ گئی تو اس نے کار آگے بڑھا دی۔

''آگے والی کار کو تعاقب کا شبہ نہیں ہونے دینا۔''

''اوکے۔ آپ اطمینان رکھیں۔''

ڈرائیونگ جوزف براؤن واقعی بڑی مہارت سے تعاقب کر رہا تھا۔ آگے والی کار مختلف علاقوں سے گزرتی ہوئی ایک شاندار علاقے میں داخل ہوگئی۔ مزید کچھ فاصلہ طے کر کے وہ ایک خوب صورت بنگلے کے گیٹ کے سامنے رکی پھر گیٹ کھل جانے کے بعد اندر داخل ہوگئی۔

''یس میم!'' جوزف براؤن نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''کسی مناسب جگہ کار روک دو۔''

''اوکے میم!'' ڈرائیور نے کہا اور کار روک دی۔

''میں اندر جا رہی ہوں۔''

''تنہا...... عورت......''

''ہاں۔''

''مناسب سمجھیں تو میں بھی چلوں۔''

''نہیں۔'' میں نے مختصراً کہا۔ اپنا پستول چیک کر کے تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ عمارت میں داخل ہونے کے لیے مجھے مناسب جگہ کی تلاش تھی۔ یہ جگہ عمارت کا عقبی حصہ تھا۔ جہاں بڑے بڑے لوہے کے پائپ لگے ہوئے تھے۔ اوپر کی منزل سے مجھے روشنی نظر آئی یہ روشنی ایک بڑی کھڑکی سے آ رہی تھی۔ ساتھ میں برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی جس سے اندازہ ہوا کہ وہ کچن ہے۔

میں نے پائپ کی مضبوطی کا جائزہ لیا اور جوتے اتار کر اپنے لباس میں لٹکائے اور پائپ سے اوپر چڑھنے لگی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک ایسی نرم و نازک لڑکی جو اپنے بدن، اپنے ہاتھ پاؤں سے چھوئی موئی نظر آتی ہے اس طرح کے کام بھی کر لیتی ہوگی۔ یہاں بھی میں جن لوگوں سے ملی تھی ان کی آنکھوں میں، میں نے ستارے جھلملاتے دیکھے تھے۔

دل کی ایک بات آپ سے شیئر کروں، ایک طرف تو میں مسٹر سارترے کے حوالے سے ان کی عمارت کا د

ایک مضبوط ستون تھی لیکن دوسری طرف میرے اندر بھی ایک عورت موجود تھی۔ مجھے اپنے دلکش نقوش کا احساس تھا۔ میں جانتی تھی کہ میرے وجود کے نشیب و فراز، دل والوں کے دلوں میں ہلچل مچا دیتے ہیں اور جب میں تنہا ہوتی تو کبھی کبھی میرے اندر مدھم مدھم تپش جاگ جاتی، ایک بے نقش چہرہ، ایک انسانی خاکہ میرے قریب آنے لگتا اور میرا سارا جسم اس کی طلب میں سلگنے لگتا۔ لیکن وہ بے نقش چہرہ آج تک اپنے نقوش اجاگر نہیں کر سکا تھا۔

وہ کون ہے۔ کیسا ہے؟ یہ فیصلہ کر نا پاتی۔ اب تک کی زندگی میں بہت سے نوجوان، خوشرو، خوش نما، خوش گفتار، مجھ تک آئے تھے لیکن ان کی شخصیت میرے ذہن میں بنے نقوش مکمل نہیں کر سکی تھی۔ البتہ اپنا تجزیہ کرتی تو دل کہتا کہ مجھے اس کی ضرورت ہے۔ اُن نوخیز، نوجوان کنواریوں کی طرح جن کی خاموش پیاس کسی کا انتظار کرتی ہے۔

ہو سکتا ہے آپ میری بات پر ہنسیں یا یوں کہیں مجھ جیسی لڑکیاں خود اپنے احساس کے جال میں جکڑی ہوتی ہیں۔ کسی بھی پسندیدہ شخصیت کے سامنے آجانے کے باوجود اس میں نقص نکال کر کہتی ہیں کہ............ یہ نہیں..... بننے کی بات میں نے یوں کہی تھی کہ میرا آئیڈیل، جرمنی کا شیر دل، ایڈولف، ایمپین ٹیلر تھا۔ میں ٹیلر پر اتھارٹی ہوں، اس کی کوئی خاص توجہ نہیں ہے بس کوئی دل میں خاموشی سے داخل ہو جاتا ہے۔ ایک مردہ وجود لیکن میرے ذہن میں زندہ، میں نے اس شخص کا مطالعہ کیا تھا۔ اس پر ریسرچ کی تھی اور اس کی پوری زندگی کا ہر رُخ مجھے انوکھا لگا تھا۔ وہ انوکھا تھا۔ اور اس کی خصوصی زندگی بھی انوکھی تھی۔ میں اس کہانی سے ہٹ گئی ہوں۔ پھر بھی آپ کو ٹیلر کی زندگی کے انوکھے گوشوں سے آگاہ کروں گی اور آپ میری بات مانیں گے وہ کتنا عجیب معمہ تھا۔

کھڑکی تک پہنچ کر میں نے اندر کی سن گن لی تو مجھے برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ عورت کی باتیں کرنے کی بھی۔ میں نے بڑی احتیاط سے اندر جھانکا اور ایک لمحے کے لیے میرے بدن میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ وہ عورت مسولینا فورڈ تھی۔ کچن میں اس کے علاوہ ایک ملازمہ تھی جو ایپرن پہنے کام کر رہی تھی۔ وہ اسے کھانے کے سلسلے میں ہدایات دے رہی تھی۔ پھر وہ کچن کے باہر چلی گئی۔

میں اندر کا منظر بخوبی دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کسی طرح اندر داخل ہو جاؤں۔ تقدیر نے میری مدد کی ملازمہ کسی کام سے باہر نکلی تو میں برق کی سی تیزی سے کھڑکی سے اندر داخل ہو گئی۔ جہاں چھپنے کے لیے کوئی معقول جگہ نہیں تھی۔ مجبوراً کچن کے دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی اور باورچن کا انتظار کرنے لگی۔ باہر قدموں کی آہٹ ہوئی تو میں الرٹ ہو گئی۔ کوئی خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔ جونہی باورچن نے اندر قدم رکھا میں نے اس کی گردن کے پچھلے حصے پر کھڑے ہاتھ کا وار کیا۔ باورچن کے دونوں ہاتھ پھیل گئے۔ منہ کھلا پھر بند ہو گیا اور بس نیچے گرنے لگی لیکن میں نے اسے سنبھال لیا۔ اور آہستہ سے ایک طرف لگا دیا۔

پھر میں کچن سے نکلی اور ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھتی ایک راہداری میں پہنچی پھر وہاں سے دوسری طرف مڑ گئی۔ تھوڑے فاصلے پر نیچے جاتے زینے تھے۔ ایک ستون کی آڑ میں رک کر میں نے مدھم روشنی میں چاروں طرف دیکھا۔ یہاں موجود کمرے تاریک پڑے تھے۔ البتہ نیچے روشنی اور وہاں سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

میں دبے پاؤں نیچے اترنے لگی۔ سیڑھیوں کے اختتام پر میں ایک دروازہ تھا۔ وہیں سے روشنی جھلک رہی تھی۔ دروازے کے برابر کافی چوڑا ستون تھا یہ میرے لیے بہترین جگہ تھی کہ اچانک کوئی دروازے سے باہر نکل بھی آئے تو ستون کی آڑ میں مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اندر کی آوازیں نمایاں تھیں۔ یہ نسوانی آواز مسولینا کی تھی جو کہہ رہی تھی۔

''دماغ خراب ہو گیا سب کا۔ میں اور کتنی قربانیاں دوں۔ اب جو کچھ کرنا تم لوگوں کو کرنا ہے۔ میں تھک گئی ہوں۔''

''لیکن میڈم یہ ملکی سلامتی کا معاملہ ہے۔''

''ساری ذمے داریاں صرف میرے لیے ہیں۔ تم یہ باتیں مجھ سے چاپلوسی سے کہہ سکتی ہو۔''

''نہیں۔ میں آپ کے خلاف کبھی زبان نہیں کھول سکتی۔'' یہ کسی دوسری عورت کی آواز تھی۔

''مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔''

''میری طرف سے آپ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔'' دوسری عورت نے کہا۔

''تمہاری ہر بات مجھے غصہ دلا رہی ہے۔ براہ کرم خاموش ہو جاؤ۔ اب میں چلتی ہوں میرے جانے کے بعد تم پیچھے سے آنا۔''

''جو حکم میڈم۔'' دوسری آواز نے کہا۔

''مجھے لگا کہ جیسے مسولینا اب باہر آ رہی ہے۔ چنانچہ میں نے خود کو ستون کے پیچھے پوشیدہ کر لیا۔ وہ باہر آئی اور پھر تیزی سے باہر جانے والے راستے پر چل پڑی۔ مجھے ایک لمحے میں فیصلہ کرنا تھا کہ میں مسولینا فورڈ کا تعاقب کروں یا اندر موجود دوسری عورت کو دیکھوں۔ اور یہی فیصلہ کیا کہ دوسری عورت زیادہ کارآمد ہو سکتی ہے۔ چند لمحے توقف کے بعد میں دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ حالانکہ دروازہ بند نہیں تھا لیکن پھر بھی میں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔

اندر سے قدموں کی چاپ ابھری اور پھر اندر والی عورت نے دروازہ کھولا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسے زور سے دھکا دیا۔ اور وہ پیچھے گر پڑی۔ میں پستول سیدھا کیے ہوئے اندر داخل ہو گئی۔ فرش پر پڑی عورت حیران اور خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس کی حیران آواز ابھری۔

''تم؟''

میں نے بھی اسے پہچان لیا۔ یہ ایشل نارمن تھی۔ جو کلب میں کلب کے مالک کے ساتھ تھی اور بعد میں اسے کلب سے اغوا کر کے یہاں لایا گیا تھا۔ میں اس کا تعاقب کرتی یہاں آئی تھی اور مجھے ایک خطرناک عورت مسولینا فورڈ نظر آ گئی تھی جو کورڈیل گروپ کی نمبر دو تھی۔

''اٹھ جاؤ پلیز۔ میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔

''مگر تم...... تم یہاں کیسے آ گئیں۔''

''تمہارا پیچھا کرتی ہوئی۔ مجھے پتا چل گیا تھا۔ واش روم کے پاس سے تمہیں اغوا کر لیا گیا ہے۔''

''لیکن تم کون ہو؟'' وہ بولی۔

''میں خفیہ پولیس میں کام کرتی ہوں اور تمہارے شوہر مسٹر نارمن کے خلاف تحقیق کر رہی ہوں۔''

''نارمن کے خلاف؟''

''ہاں۔ اس کا تعلق ایک خطرناک تنظیم کورڈیل سے ثابت ہو چکا ہے۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ تمہارا شوہر کون سی سرگرمیوں میں ملوث ہے۔''

میں نے صاف محسوس کیا کہ ایشل نارمن کا چہرہ اتر گیا ہے۔ تاہم اس نے کہا۔

''نہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ تمہیں صرف غلط فہمی ہوئی ہے۔ نارمن ایک بے وقوف سا آدمی ہے مجھے نہیں معلوم کہ وہ کس ادارے کے لیے کام کر رہا ہے میں بالکل نہیں جانتی۔''

''کیا تم یہاں قیدی ہو؟''

''کسی حد تک۔''

"یہاں سے نکلنا چاہتی ہو؟"

"ہاں۔"

"رکاوٹ کیا ہے جبکہ مسولینا فورڈ بھی جا چکی ہے۔"

"یہاں اور بھی لوگ ہیں۔ خاص طور پر گارڈز جو مسلح رہتے ہیں۔"

"آؤ۔ اگر نکلنا چاہتی ہو تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔" میں نے کہا۔ وہ کچھ لمحے تذبذب میں رہی پھر تیار ہوگئی۔ میرے لیے اسی پائپ کے ذریعے واپس جانا مشکل نہیں تھا لیکن ایشل کسی طور پر وہاں سے نہیں جا سکتی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مین گیٹ سے ہی باہر نکل جاؤ۔ ایشل اب میرے ہر حکم کی تعمیل کر رہی تھی۔ ویسے وہ بری طرح خوف زدہ تھی۔

میں اسے لیے عمارت کے صدر دروازے سے باہر نکل آئی۔ میں نے اپنا پستول سنبھال رکھا تھا۔ اور کسی بھی لمحے کچھ کرنے کے لیے تیار تھی۔ اور پھر کچھ کرنا ہی پڑا۔ ابھی گیٹ کی طرف چند قدم ہی چلی تھی کہ پیچھے سے ایک کرخت آواز ابھری۔

"کون ہے۔ رک جاؤ۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔"

ضروری تھا کہ یہاں ایجی پارک کی اصل شخصیت سامنے لائی جائے۔ میں نے رُخ بھی نہیں بدلا بس آواز کی سمت کا اندازہ لگا کر ہاتھ اٹھالیا اور فائر کر دیا۔ ایک دلدوز چیخ سنائی دی تھی اور کوئی شاید اوپر کی منزل کے نیچے گرا تھا۔

"اوہ مائی گڈ۔ تمہارا نشانہ غضب ہے۔"

ایشل بے اختیار بولی۔ لیکن میں نے ایک لمحہ ضایع نہیں کیا اور بغلی حصے کی طرف دوڑی۔ میں نے ایشل کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور وہ میرے ساتھ گھسٹتی چلی آ رہی تھی۔ گیٹ پر موجود گارڈ مستعد ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے چیخ کر کہا۔

"رک جاؤ..... رک جاؤ کون ہے۔"

جواب میں میں نے لگاتار کئی فائر کیے لیکن یہ ہوائی فائرنگ تھی بے مقصد خونریزی مناسب نہیں تھی۔ البتہ دوسری طرف سے گارڈ بھی باقاعدہ فائرنگ کرنے لگے۔ میں بغلی حصے کی دیوار کے پاس رکی۔ یہ دیوار اتنی اونچی تھی کہ تھوڑی سی کوشش سے اسے عبور کیا جا سکتا تھا۔ ایشل اس وقت حیران رہ گئی ہوگی جب میں نے اس کی پتلی کمر میں ہاتھ جمائے اور اسے اوپر اٹھا دیا۔

"چلو..... دیوار پکڑ کر دوسری طرف کود جاؤ۔" میں نے کہا اور اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ وہ بھی کافی پھرتیلی تھی۔ خود میرے لیے اچھل کر دیوار کے کنارے پکڑنا اور دوسری طرف کود جانا مشکل نہیں تھا۔ اس قسم کی جمناسٹک کی مجھے پوری پریکٹس تھی۔

گارڈ اب اندھا دھند گولیاں چلا رہے تھے۔ لیکن وہ ہماری سمت کا اندازہ نہیں لگا سکے تھے۔ پھر بھی میں نے دیوار کے دوسری طرف جانے میں دیر نہیں کی اور دوسری طرف کود گئی۔ ایشل پوری طرح تعاقب کر رہی تھی۔ چنانچہ میرے ساتھ دوڑتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ باقی کسر جوزف نے پوری کر دی۔ وہ موقع کی نزاکت کا اندازہ لگا کر گاڑی اسٹارٹ کیے تیار تھا۔ پھر اس نے ہم دونوں کو دیکھ لیا اور تیزی سے گاڑی ہماری طرف لے آیا۔ میں نے جلدی سے دروازہ کھولا پہلے ایشل کو اندر دھکا دیا پھر خود بھی کار میں داخل ہوگئی اور جوزف نے کار آگے بڑھا دی۔

ایشل بُری طرح بدحواس نظر آ رہی تھی۔ لیکن میں ٹھیک تھی۔ البتہ اس وقت میں تھوڑی سی متفکر ہوگئی۔ جب میں نے کسی کار کی روشنیاں اپنی کار کے پیچھے آتی دیکھیں۔ جوزف کو بھی احساس ہو گیا کہ کوئی کار تعاقب کر رہی

ہے۔ وہ گولیوں کی آوازیں اور ہماری بھاگ دوڑ بھی دیکھ چکا تھا۔ اس لیے اس نے جلدی سے کہا۔
''ایک کار پیچھا کر رہی ہے۔''
''چلتے رہو۔'' میں نے کہا اور اپنا ریوالور لوڈ کرنے لگی۔
ایشل بالکل خاموش تھی اور پوری جدوجہد دیکھ رہی تھی۔ ایک موڑ سے گھومتے ہی میں نے کہا۔
''رکو..... کار کو روک دو۔ روشنیاں بند کر دو۔'' اس نے برق رفتاری سے یہ عمل کیا اور کار سائیڈ کر کے نہ صرف روکی بلکہ روشنیاں بھی بجھادیں۔ میں کار کی کھڑکی سے لگ گئی۔ صرف چند سیکنڈ کے بعد تعاقب کرنے والی کار نے موڑ کاٹا اور ہمارے سامنے سے گزری اس وقت میرے پسٹل نے گولیاں اگلنا شروع کر دیں۔ میرا نشانہ شاذونادر ہی خطا ہوتا تھا۔ سامنے سے گزرنے والی کار کے ٹائر نشانہ بن گئے اور بریکوں کی تیز چرچراہٹ ابھری لیکن ڈرائیور اسٹیئرنگ پر قابو نہ پاسکا اور دشمن کار سڑک کے نشیب میں لڑھکنے لگی۔ تب سے میں نے کہا۔
''جوزف چلو۔'' جوزف نے کار اسٹارٹ کی اور چل پڑا۔
اس وقت میں الجھی ہوئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ ایشل کو لے کر کہاں جاؤں۔ یہ میرے لیے کافی اہمیت کی حامل تھی اور اس سے مجھے کافی معلومات حاصل ہوسکتی تھیں۔ اس وقت جوزف براؤن نے ایک بڑی مشکل حل کر دی۔
''کیا آپ ہوٹل جائیں گی میڈم؟''
''یہی سوچ رہی ہوں۔''
''مسٹر میک مین نے کہا ہے کہ اگر ضرورت ہو تو آپ کو چیف ہاؤس پہنچا دیا جائے۔''
''ارے واہ۔ یہ چیف ہاؤس کیا ہے۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔ اور جوزف مجھے اس بارے میں بتانے لگا۔ چیف ہاؤس واقعی بہترین جگہ تھی۔ ایک خالص گھر جہاں گرہستی کا سامان موجود تھا۔ کچن دیکھ کر میں نے کہا۔
''ایشل ڈارلنگ۔ کوفی کے ساتھ کوئی عمدہ سی چیز بنالو۔ اس کے بعد ہم باتیں کریں گے۔''
ایشل بھی مجھ سے بہت متاثر ہوگئی تھی۔ اس نے خاموشی سے کچن کا رخ کیا۔ میں نے میک مین سے رابطہ کیا تو مجھے کچھ اہم خبریں ملیں۔ پہلے میں نے اسے ایشل کی بازیابی کے بارے میں بتایا اور کہا کہ وہ اس وقت میرے ساتھ ہے اور میں چیف ہاؤس میں ہوں۔
''میرے پاس بھی تمہارے لیے ایک اہم اطلاع ہے۔''
''کیا؟''
''تمہاری اطلاع پر ہم نے کورڈین کلب پر زبردست چھاپہ مارا ہے۔ وہاں سے کچھ مواد حاصل ہوا ہے جس کی چھان بین کی جائے گی۔ لیکن سب سے اہم اطلاع یہ ہے کہ کلب کے مالک نے خودکشی کر لی ہے۔''
''اوہ۔'' میں ہونٹ سکوڑ کر رہ گئی۔ یہ بڑی سنسنی خیز خبر تھی میرے لیے۔

☆......☆......☆

کارمیل سارترے اور ترمودا اپچی نے مجھ پر یعنی اینی پارک پر انحصار کیا تھا جس پر انھوں نے زبردست محنت کی تھی اور اسے ون مین آرمی کی حیثیت دے دی تھی۔ اس کے لیے انھوں نے مجھے دنیا کی بڑی جاسوس عورتوں کی ان صفات سے مرصع کیا تھا جو آج تک نامور جاسوساؤں میں شمار ہوتی تھیں اور میں نے خوشی سے یہ ذمے داری قبول کی تھی کیونکہ خود میری فطرت ایڈونچر پسند تھی۔ اور میں خود کو منفرد پاتی تھی۔
اپنی زندگی کے اس پہلے مشن میں مجھے بہت سے تجربے ہوئے تھے۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس زندگی میں عام انسانی فطرت سے تھوڑا سا ہٹ کر رہنا ہوتا ہے۔ بہت سے جذبوں کو خیر کہنا ہوتا ہے۔ فطرت میں بے رحمی

ضروری ہوتی ہے ورنہ پھر خود قابلِ رحم ہو جانا پڑتا ہے۔ میں خود کو مکمل تو نہیں کہہ سکتی۔ لیکن اب تک کی کارکردگی میں بہت سے مرحلوں پر میں اپنے آپ سے مطمئن تھی اور اپنا کام بہتر طور پر کر رہی تھی۔ میرے ہاتھوں کچھ زندگیاں بھی ختم ہو گئی تھیں اور میں نے یہ قتل پوری بے رحمی سے کیے تھے۔ جس پر مجھے خود حیرت تھی۔ ویسے مجھے دلچسپ تجزیے ہو رہے تھے۔ اب تک بہت سے نیگیٹو پوزیٹو کردار مجھے ملے تھے۔ لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ انھیں میرے بارے میں معلوم تھا۔ یعنی وہ جانتے تھے کہ برٹش حکومت نے کورڈیل میں ہونے والی سازشوں اور اس میں موجود کالی بھیڑوں کو تلاش کرنے کے لیے ایک خطرناک ایجنٹ کی خدمات حاصل کی ہیں جو غیر متعلق شخصیت ہونے کی وجہ سے دیانت داری سے کام کرلے گا اور حقیقت کو منظرِ عام پر لائے گا۔ اس کے ساتھ میں ان سازشوں کا سلسلہ جاری تھا جن کی وجہ سے حالات بگڑ سکتے تھے۔ اور اس کی تصدیق اس عورت سلوا اسٹارک سے ہو گئی تھی جس نے آبدوز کے اغوا اور اس سے حاصل شدہ میزائلوں کے خطرناک اور تباہ کن استعمال کی تیاریوں کی نشاندہی کی تھی۔

بات یہ نہیں تھی کہ میں نے اب تک ذہانت سے کام نہیں کیا تھا۔ میں نے پوری محنت کی تھی اور بہت سے مسئلے حل کر لیے تھے لیکن جو کمی رہ گئی تھی اس کا مجھے پورا احساس تھا۔ آخر میں، تو میں پوری طرح پھنس گئی تھی اور وہ تو سلوا اسٹارک کی مہربانی تھی کہ اس نے مجھے تھوڑی سی زندگی دیدی تھی ورنہ وہ اگر چاہتی تو راستے کی گھاس کی طرح مجھے کاٹ کر پھینک دیتی اور کورڈیل کی کالی بھیڑوں کے لیے ایک خطرہ ختم ہو جاتا۔

یہ اب تک کا کھیل تھا۔ لیکن یہ گارڈ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ میں تو ٹھیک طور سے اس کے چہرے کے نقوش بھی نہیں دیکھ سکی تھی بس اس کے لہجے اور کچھ الفاظ سے پتہ چلا تھا کہ وہ مشرقی باشندہ اور پھر یہ گھر۔ یہ عورت۔

میں نے غسل کر کے اس کا دیا ہوا لباس پہنا اور حیران رہ گئی۔ لباس میرے بدن پر بالکل فٹ آیا تھا۔ اسے شاید علم تھا کہ میں اس وقت کس پوزیشن میں ہوں۔ چنانچہ جیسے ہی میں بال وغیرہ درست کر کے تیار ہوئی وہ ناشتے کی ٹرے لیے اندر داخل ہو گئی۔ بڑے سلیقے کا ناشتا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ناشتے میں مصروف ہو گئی۔

”تم بھی میرے ساتھ ناشتا کرو۔“ میں نے کہا۔

”نا جی نا۔ ہم تو بس حیران ہیں۔“

”کیوں؟“

”مشکل ہے تو تم گٹ پٹی لگو ہو پر ہماری زبان بول رہی ہو۔ کتنی اچھی لگ رہی ہے تمہارے منہ سے اپنی زبان۔“

”تمہارا نام بشیراں ہے نا؟“ میں نے کہا تو اس کی خوب صورت آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”ہائے میں مرجاؤں۔ کیسا پیارا لگا ہے تمہارے منہ سے اپنا نام...... تمھیں الہ دین نے بتایا ہوگا۔

”الہ دین کون؟“ میں نے کہا۔

”ایں۔ وہی جس نے تمھیں یہاں بھیجا ہے۔“

”ہاں اس نے تمہارا نام بشیراں بتایا تھا لیکن اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ اس کا نام الہ دین ہے۔“

”ہاں جی۔ پر تمہارا نام پینو ہی ہے نا مطلب یہ کہ پردین؟“ اس کے انداز میں کس قدر گھبراہٹ پیدا ہو گئی۔

”کیوں۔ تم گھبرا کیوں گئیں۔“

”بس جی ایسے ہی خیال آیا تھا کہ ہم سے غلطی تو نہیں ہو گئی۔ تم کوئی اور تو نہیں ہو۔ اس نے معصومیت سے کہا۔

''کیا کہتا تھا اس نے میرے بارے میں۔'' میں نے ناشتا کرتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔
''لے اس نے بھی کوئی ڈھنگ کی بات کہی ہے جواب کہے گا۔'' وہ بولی۔
''پھر بھی کچھ تو کیا ہوگا میرے بارے میں۔''
''کہنے لگا بشیراں ہوسکتا ہے کہ ایک لڑکی یہاں آئے۔ خوب صورت گوری چٹی ہے۔ بالکل میم لگتی ہے۔ اس کا نام پروین ہے۔ اس کے ماں پیو اسے پنو کہتے ہیں۔ اگر وہ آئے تو اس کا اچھی طرح خیال رکھنا۔ اسے کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔''
''ہوں۔ اور کیا کہا؟''
''اور تو کچھ نہیں کہا۔''
''وہ خود کہاں ہے۔''
''نا جی نا۔ اس کے بارے میں تو آج تک کوئی بھی نہیں بتا سکتا۔''
''کیا مطلب۔''
''کوئی مطلب نہیں۔ کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔''
''کیا وہ یہاں نہیں رہتا۔؟''
''آج تک نہیں رہا۔''
''تم سے اس کا کیا رشتہ ہے۔''
''بس جی۔ کوئی رشتہ نہیں ہے ہمارا۔ ہم بے یار و مددگار پھر رہے تھے اس موئے گٹ سپٹے شہر میں نہ کسی کی بات ہماری سمجھ میں آتی تھی نہ ہماری کسی کی سمجھ میں۔ برے حال تھے۔ سوچ سوچ کر مر رہے تھے کہ اب کیا ہوگا کہ اللہ نے مدد کی اور الہ دین مل گیا۔''
''مگر تم لندن میں کیا کر رہی تھیں۔''
''بس جی۔ ایک صاحب اور بی بی جی ہمیں ہمارے ملک سے یہاں لائے تھے۔ نوکرانی تھے ہم ان کی۔ ان ہی کے ساتھ رہتے تھے۔ صاحب کی نوکری یہاں لگی تو وہ بی بی صاحب کو بھی لے آئے اور ہمیں بھی۔ دو سال یہاں ساتھ رہے۔ پھر دونوں میں جھگڑا ہوا۔ بی بی نے صاحب کو گولی ماردی اور خود جیل چلی گئیں ہمارا کسی نے کچھ نہیں سوچا۔ اور ہم دربدر ہوگئے۔ اپنے ملک جانے کا بھی ہمیں کوئی پتہ نہیں تھا کہ کیسے جائیں۔ مارے مارے پھر رہے تھے کہ الہ دین مل گیا اور یہاں لے آیا۔ اس نے کہا ہے کہ ہمیں ملک بھجوا دے گا۔ وہاں جا کر پھر کسی کے ہاں نوکری کرلیں گے۔ وہاں بھی ہمارا کون ہے؟'' بشیراں نے اپنی درد بھری کہانی سنائی۔
میں بہت متاثر ہوئی۔ زندگی کے کتنے پہلو ہوتے ہیں۔ پھر میں نے کہا۔
''کیا تم اس سے محبت کرتی ہو بشیراں۔''
''نہیں جی۔ وہ بندہ بشر ہی کہاں ہے۔'' بشیراں کا لہجہ شکایتی ہوگیا۔
''کیا مطلب؟''
''جناور ہے پورا اور یہاں آتا ہی کب ہے۔ من موجی ہے۔ کوئی کام ہوا تو آگیا ورنہ غائب۔''
''کہیں نوکری کرتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''وہ بتائے گا کسی کو کہ کیا کرتا ہے۔'' بشیراں بولی۔ اس سے زیادہ میں اس سے اور کیا پوچھتی چنانچہ خاموش ہوگئی۔ کچھ دیر کے بعد بشیراں نے برتن اٹھائے اور جاتے ہوئے بولی۔
''آپ آرام سے سو جاؤ جی کسی فکر کی بات نہیں ہے۔''
آرام وہ بستر پر لیٹ کر میں اس عجیب شخص کے بارے میں سوچنے لگی۔ کیا شے ہے وہ، ممکن ہے اپنے ملک

کا کوئی سیکرٹ ایجنٹ ہو اور یہاں کسی عام حیثیت سے رہ رہا ہو جیسے اس گھر میں گارڈ کی حیثیت سے اور اپنے وطن کے مفادات کی نگرانی کر رہا ہو۔ اس نے مجھے نہ صرف آزادی دلائی تھی بلکہ بہترین ہتھیار بھی فراہم کیے تھے جن کا حصول آسان نہیں تھا۔

لیکن اس نے میرے لیے یہ سب کیوں کیا۔ وہ میرے بارے میں کیا جانتا ہے۔ یہ ذرا تشویش کی بات تھی ا س طرح میری شخصیت ہلکی پڑ جاتی تھی۔ نیز یہ کہ کسی کی نظروں میں بھی آ جاتی تھی۔ دوسرا ایک اور خیال میرے ذہن میں آیا۔ کہیں وہ مسٹر سارترے ہی کا کوئی کارکن نہ ہو۔ سوئی جی آرگنیو کی برانچیں دنیا کے بہت سے ملکوں میں پھیلی ہوئی تھیں اور ان میں بے شمار لوگ کام کرتے تھے۔ ممکن ہے مسٹر سارترے اور مسٹر واانچی نے اپنے کام کے لیے اس طرح کے لوگ بھی رکھے ہیں اس شاطر شخص کو ہدایت کی گئی ہو کہ میری نگرانی رکھے اور اگر میں کسی مشکل کا شکار ہوں تو میری مدد کرے۔

انہی سوچوں میں تھی کہ میرے کمرے کے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ پھر دروازہ بہت آہستگی سے کھلا۔ اتفاق یہ ہے میں اس طرف کروٹ لیے لیٹی تھی۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا اور ایک دم محتاط ہو گئی تھی۔ بشیراں تھی اور اتنے احتیاط سے اندر جھانک رہی تھی کہ مجھے شک ہو گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور معمولی سی جھری سے بشیراں کو دیکھتی رہی۔ وہ کچھ لمحے کھڑی رہی پھر اسی آہستگی سے دروازہ بند کر کے واپس چلی گئی۔

بھی سوچا جا سکتا تھا کہ ممکن ہے وہ میرے آرام میں خلل انداز نہ بننا چاہتی ہو اس لیے یہ احتیاط برت رہی ہے لیکن میری چھٹی حس بات کی نفی کر رہی تھی۔ چنانچہ میں اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ پھر ننگے پاؤں کمرے کے دروازے سے باہر نکل آئی۔ بشیراں ساتھ والے دوسرے کمرے میں گئی تھی۔ اس نے دروازہ بند نہیں کیا تھا اور اتنی جھری تھی کہ میں اس سے اندر جھانک سکتی تھی۔ تب میں نے اندر کا منظر دیکھا۔ بشیراں کمرے سے ایک گوشے میں اپنا لباس اتار رہی تھی۔ پورا لباس اتارنے کے بعد اس نے اپنے بدن سے کسی خاص چیز سے بنا ہوا ایک خول اتار کر ایک طرف ڈالا اور میں دنگ رہ گئی۔ وہ مصنوعی طور پر موٹی بنی ہوئی تھی۔ خول کے نیچے سے ایک بے حد روشن اور اسمارٹ بدن نمودار ہوا۔ پھر اس نے دوسرا عمل کیا اور اپنے شانوں کے پاس سے پکڑ کر ایک جھلی سی تلاش کی جو کافی موٹی تھی اور پھر ایک ہوشربا منظر میرے سامنے آ گیا۔ جھلی اس نے اوپر کھینچی اور اس کے چہرے سے ماسک اتر گئی جو بالوں سمیت تھی۔ اس کے نیچے سے بہت نفاست سے تراشیدہ بال اور ایک دلکش مشرقی چہرہ نمودار ہو گیا۔

اب میرے سامنے ایک حسین مشرقی لڑکی بے لباس کھڑی ہوئی تھی۔ پھر اس نے برابر رکھے اسٹینڈ سے ایک عمدہ جینز اور شرٹ اتاری اور اسے پہننے لگی۔ یہ لباس پہننے کے بعد اس نے ڈریسنگ کے پاس جا کر بال سنوارے اور نک سک سے تیار ہو کر دروازے کی طرف بڑھی۔ میں جلدی سے ایک آڑ میں ہو گئی۔ وہ باہر جانے والے دروازے کی طرف چل پڑی اور میں نے اس کا پیچھا کیا۔ باہر پہنچ کر گھر کے پچھلے حصے کی طرف چل پڑی۔ شاید وہ عقبی دروازے سے باہر جانا چاہتی تھی۔

میری حیرت عروج پر تھی۔ میں تو خود کو ہی بہت اسمارٹ اور تیز و طرار سمجھتی تھی لیکن یہ لڑکی ہاں اب میں اسے لڑکی کہنے پر مجبور تھی۔ ایک خوب صورت، اسمارٹ نوجوان لڑکی جب کہ بشیراں کے روپ میں بھی وہ زیادہ عمر کی تو نہیں لگتی تھی لیکن پھر بھی پکی عمر کی معلوم ہوتی تھی اور اب......!

ایک بار پھر چونکنا پڑا۔ گھر کے پچھلے حصے میں کسی کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک پونٹیاک نمودار ہوئی جس کے اسٹیئرنگ پر وہ موجود تھی۔ گیٹ کے پاس وہ نیچے اتری، گیٹ کھولا اور کار میں بیٹھ کر باہر نکلی۔ دوبارہ گیٹ بند کیا اور ہوا ہو گئی۔ میرے پورے بدن میں اینٹھن ہو رہی تھی۔ اعصاب کشیدہ ہو گئے تھے، بہت ہی پراسرار جوڑا تھا، کون ہیں یہ دونوں؟

بہت دیر تک حیرت کا شکار رہی، پھر خود کو سنبھالا اور اس کمرے میں گھس گئی جس میں اس لڑکی نے اپنا چولا بدلا تھا۔ اب اسے بشیراں کہتے ہوئے بھی عجیب لگتا تھا۔ بشیراں ایک مشرقی معصوم سا نام تھا جب کہ وہ لڑکی تو بہت آگے کی چیز لگتی تھی۔

میں نے اس کمرے کے چپے چپے کا جائزہ لے لیا۔ الماری میں بہت سے جدید اسٹائل کے لباس رکھے ہوئے تھے جو میرے بدن پر فٹ آسکتے تھے۔ چند ایسے لباس بھی تھے جنہیں بشیراں اسٹائل کا کہا جاسکتا تھا۔ کمبخت نے کیا چالاکی کی ہے مجھے بے وقوف بنایا تھا اور موٹی بشیراں بن کر کتنی کامیاب اداکاری کر رہی تھی۔ کسی بھی جگہ ایسی کوئی چیز نہیں ملی جس سے ان کی شخصیت پر روشنی پڑتی۔ پھر میں اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں آگئی۔ یہ بھی بیڈروم تھا۔ وہ کمرہ اگر بشیراں کا تھا تو یہ بھی الہ دین کا لگتا تھا۔ اسٹینڈ پر مردانہ کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ بستر کے پاس مردانہ جوتے، ایک اماری میں کچھ مردانہ لباس لیکن دوسرے لمحے میں چونک پڑی۔ سامنے ہی مجھے ایک بہت ہی قیمتی موبائل سیٹ نظر آرہا تھا۔

میں اسے غور سے دیکھتی رہی۔ اسے اٹھاؤں یا نہ اٹھاؤں۔ کوئی خطرناک چیز نہ ہو، لیکن ہو بھی سکتی ہے۔ اس نے جس طرح مجھے وہاں سے نکالا تھا اور اس کے بعد دوسری آسانیاں فراہم کی تھیں وہ مجھے نقصان پہنچانے کے لیے نہیں تھیں۔ چنانچہ موبائل سیٹ بھی غلط نہیں ہوسکتا۔ میں نے ہمت کر کے اسے اٹھالیا۔

جونہی میں نے اسے چھ کیا اس کا ڈائل روشن ہوگیا۔ پھر ایک مردانہ آواز ابھری۔

''ہیلو مس اینی پارک، بات کیجیے پلیز۔ ہیلو مس اینی پارک......''

''کون ہیں آپ؟'' میں نے بھی بڑی شرافت سے پوچھا۔

''الہ دین۔'' دوسری طرف سے جواب ملا۔

''جب کہ آپ الہ دین نہیں ہوسکتے۔'' میں نے شیریں لہجے میں کہا۔

''کیوں؟''

''اس لیے کہ آپ کے پاس جادو کا چراغ نہیں ہے۔''

''ہاں میں اس کی تلاش میں ہوں۔ یہ پتا نہیں چل سکا کہ جب الہ دین کی موت واقع ہوئی تھی تو اس نے چراغ کہاں چھوڑا تھا۔''

''میں بتا سکتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''اس دور میں، میں واحد لڑکی ہوں جسے معلوم ہے کہ چراغ کہاں ہے۔''

''تو پھر بتائیے پلیز۔''

''ایسے نہیں بتایا جاسکتا۔''

''کیا مطلب۔''

''یا تو آپ یہاں آجائیے۔ یا پھر رات کو کسی عمدہ سے ہوٹل میں مجھے ڈنر کرائیے۔ میں آپ کو جادو کے چراغ کا پتا دے دوں گی۔ ویسے کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی نائی بشیراں اچانک جوان ہوکر یہاں سے فرار ہوگئی ہیں۔'' میں نے کہا اور دوسری طرف خاموشی چھاگئی۔ پھر آواز آئی۔

''آپ کو اردو، اور اردو کلاسکس سے کافی دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ بشیراں کو آپ نے مائی بشیراں کہہ کر ثابت کیا ہے کہ آپ کو بامحاورہ اردو آتی ہے جب کہ آپ کے بارے میں یہ فیصلہ مشکل ہے کہ خود آپ کا تعلق کہاں سے ہے۔

''آپ نے اس خطرناک جگہ میری مدد کر کے مجھ پر بہت احسان کیا ہے۔ مجھے بہترین اسلحہ بھی فراہم کیا اور

پھر یہ پناہ گاہ بھی دی۔ اس کے لیے میں شکر گزار ہوں۔ میرے دل میں آپ کے بارے میں شدید تجسس ہے لیکن اگر آپ مجھے اپنے بارے میں تفصیل نہ بتانا چاہیں تو ٹھیک ہے۔ اتنا مجھے ضرور بتا دیجیے کہ میں جہاں کتنی دیر رہ سکتی ہوں۔ یہ جگہ میرے لیے خطرناک تو نہیں ہے اور کیا میں آپ پر آگے بھی اعتماد کر سکتی ہوں۔''

انار کلی کو یہاں سے جانا تھا۔ میرے خیال میں وہ یہاں واپس نہیں آئے گی لیکن یہ جگہ اس وقت تک محفوظ ہے جب تک میں وہاں نہ آؤں ہو سکتا ہے وہ لوگ آپ سے زیادہ میری تلاش میں ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ راٹھور نے مجھے پا لیا ہو اور میری نگرانی کر رہے ہوں۔ اس لیے میرا آنا ٹھیک نہیں ہے۔ البتہ رات کے نو بجے آپ ملتن کنیز کے علاقے میں بلو ڈک ریستوران پہنچ جائیں اور میرے ساتھ کھانا کھائیں۔''

''او کے! لیکن آپ کس انار کلی کی بات کر رہے تھے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں وہی جس کا پہلا نام بشیراں ہے۔''

''تو اب اس کا نام بدل گیا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''آپ اسے روشن آرا بیگم بھی کہہ سکتی ہیں۔''

''گویا آپ اس کا صحیح نام نہیں بتا سکتے۔''

''صحیح کام تو میں آپ کو اپنا بھی نہیں بتا سکتا۔ دوسری طرف سے جواب ملا بعد میں خاموشی ہو گئی۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''ہیلو۔''

''جی جی، میں آپ کے نام کے بارے میں سوچ رہی تھی جبکہ آپ میرے نام سے واقف ہیں؟''

''اور اس بات سے بھی کہ آپ کورڈیل کے خلاف کورڈیل کے لیے کام کر رہی ہیں۔''

''رات کو نو بجے ملتن کنیز، بلیو ڈک۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''میں خود آپ کو تلاش کر لوں گا اور پریشان نہ ہوں۔ اس میں ہونے والی گفتگو اس کے دوسرے سیٹ پر ایک مخصوص کوڈ فریکوئنسی پر ہی سنی جا سکتی ہے۔ آپ جب آئیں تو اسے ساتھ میں لے آئیں اور کوئی خاص بات؟''

''نہیں۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا اور دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میں وہ سیٹ ہاتھ میں لیے بیٹھی رہ گئی۔ اچانک میں احساس ہوا کہ میں سپر گرل نہیں ہوں۔ میں نے بڑے بڑے سرکش اور بگڑے ہوئے نوجوانوں کی مرمت کی ہے اور اب میں نے نہایت بے رحمی سے کئی قتل بھی کیے ہیں اور مجھے کوئی وقت کوئی ملال نہیں ہوا۔ میں نے اپنے پاپا سے ان کے ہر مشن پر کام کرنے کا پر اعتماد وعدہ بھی کیا ہے۔ لیکن اس انوکھے تجسس نے ایکدم مجھے انسان بنا دیا۔ گوشت پوست کا انسان جس کے دل میں خوف بھی ہوتا ہے حیرت بھی ہوتی ہے سوچ بھی ہوتی ہے۔

دیر تک میں اس کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ اس خطرناک جگہ وہ ایک گارڈ کی حیثیت سے مجھے ملا تھا اور اس نے مجھے وہاں سے نکال کر پورے تحفظ کے ساتھ یہاں تک پہنچا دیا تھا۔ وہ بے حد چالاک بے انتہا خطرناک تھا۔ کسی حد تک خوش مزاج بھی تھا لیکن وہ کون ہے۔ یہاں کیا کر رہا ہے۔ خطرناک عورت سلوا اسٹارک کی پوشیدہ رہائش گاہ میں اتنی اہم ڈیوٹی پر کیسے پہنچ گیا۔ یہ ساری سوچیں مجھ پر مسلط تھیں۔ اچانک میں سنبھل گئی۔ میں ایک ایسی جگہ ہوں جس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں ہے پورا گھر خالی ہے کس کا گھر ہے کسی بھی مصیبت میں پڑ سکتی ہوں۔ ہر چند کہ مجھے مقامی اعلیٰ حکام کی پشت پناہی حاصل ہے لیکن میرا یہاں سب کچھ بے حد عجیب چل رہا ہے۔

کیا کروں بالکل اجنبی لوگوں پر بھروسا کر کے یہاں رکوں یہاں سے نکلوں۔ بڑی عجیب سی پوزیشن ہو گئی تھی۔ اس بارے میں پاپا سے رابطہ قائم کر کے ہدایات لیتے ہوئے بھی سبکی محسوس ہوئی۔ آخری فیصلہ میں نے

یہی کیا کہ یہاں رکوں۔ رات کو یہاں سے نکلوں اور اس سے ملنے کی کوشش کروں اب یہ فیصلہ غلط ہے یا صحیح اس کے نتائج دیکھ کر ہی سوچا جا سکتا تھا۔ البتہ میں نے ایک بار پھر اس مکان کا بھرپور جائزہ لیا تھا وہاں محصور ایک ایک چیز کو دیکھا تھا لیکن کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔ البتہ رات کے لیے میں نے اس لڑکی کے کپڑوں کی الماری سے جدید اسٹائل کا سوٹ ضرور نکالا تھا۔ ویسے مجھے یقین تھا کہ وہ دونوں یہاں واپس ضرور آئیں گے۔ ان کی بے شمار قیمتی چیزیں یہاں موجود تھیں۔

مجھے یہ بھی احساس تھا کہ میں ایک عجیب سے مسئلے میں پھنس گئی ہوں اور اپنے طور پر نہیں سوچ رہی ہوں لیکن اب اس مسئلے کو حل کیے بغیر دوسرا کوئی کام کرنا بھی مشکل تھا۔

ذرا دیکھ لوں یہ سب کیا ہے۔ پھر اپنی ڈگر پر آجاؤں گی اور پھر میں نے اس مصلحت کے خول میں آجانے والی لڑکی کو لات مار کر خود سے دور کر دیا اپنی پارک کو آواز دے لی جو صرف خود پر بھروسا کرتی تھی۔ خود پر انحصار کرتی تھی۔ روانگی کے لیے تیار ہو کر میں نے خود کو آئینے میں دیکھا اور اپنے بارے میں بہت سی خوش فہمیوں میں ڈوب کر باہر نکل آئی۔

سب سے پہلے میں نے ملٹن کینیز سٹی کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کیں اور اندازہ قائم کیا کہ یہاں ڈنر کے وقت سے پہلے پہنچنا ضروری ہے تاکہ اس خوب صورت مقامی شہر کا نظارہ کیا جائے۔

آخر کار مختلف مراحل سے گزر کر میں یہاں پہنچ گئی۔ جس جگہ کی میں نے پہلی سیر کی۔ وہ یہاں کی ایک بڑی مارکیٹ جسے ہائی اسٹریٹ کہا جاتا ہے تھی۔ یہ کافی لمبی مارکیٹ ہے جس کے درمیان کافی کشادگی ہے۔ ایک مخصوص انداز ہے یہاں کا۔ درمیانی جگہ میں لوگوں کے بیٹھنے اور سستانے کے لیے لکڑی کے بینچ اور چھتریاں بنا دی گئی ہیں۔ ضروریات زندگی کی اشیاء تک پڑی ہیں۔ اس کے علاوہ ریستورانوں کی بھرمار ہے جن میں خوب رش نظر آ رہا تھا۔

میں نے بلوڈک کے بارے میں معلومات کیں تو پتا چلا کہ یہاں سے خاصے فاصلے پر جھیل کے کنارے واقع ہے۔ میں اس طرف چل پڑی۔ جھیل دائرے کی شکل میں کافی لمبی تھی اور یہاں اور بھی کئی خوب صورت ہوٹل

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم ُالحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

تھے۔ ایک نیلی بلب کیا نیون سائن دور ہی سے متحرک نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور یہ اندازہ لگایا کہ کوئی میری طرف متوجہ تو نہیں ہے۔ بظاہر ایسی کوئی بات نہیں نظر آ رہی تھی۔ چنانچہ میں اس خوب صورت ریستوران میں داخل ہوگئی اور اندر جا کر دل بے حد خوش ہوا۔ بڑی خوب صورت جگہ بنائی گئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے کیبن بنے ہوئے تھے۔

ابھی میں تجسس کا شکار تھی کہ ایک ویٹر میرے قریب آ کر جھکا۔

''کیبن نمبر اکیس میڈم۔''

میں نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ بولا۔ ''سر انتظار کر رہے ہیں۔''

''او کے!'' میں نے کہا اور اکیس نمبر کی طرف چل پڑی کیبن سے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑے ہوئے دوسرے ویٹر نے گردن خم کر کے کیبن کا پردہ ہٹایا اور مجھے اندر جانے کا اشارہ کر دیا۔ ایک لمحے کے اندر میرے اعصاب میں کشیدگی پیدا ہوئی تھی لیکن دوسرے لمحے میں سنبھل گئی اور کیبن میں داخل ہوگئی۔ اندر جو شخصیت مجھے نظر آئی تھی اسے دیکھ کر میں ایک لمحے کے لیے عجیب سے احساس کا شکار ہوگئی۔ مردانہ مشرقی حسن کا شاہکار تھا۔

وہ چہرہ اس قدر ملیح اور جاذب نگاہ کہ اس پر سے نظر نہ ہٹے۔ سرخ و سفید رنگت، دلکش نقوش جو کہ بے حد معصومیت لیے ہوئے تھے۔ اس کے بارے میں صرف چند الفاظ کہہ کر اس شخصیت کی عکاسی نہیں کی جا سکتی تھی۔

''ہیلو!'' اس نے کرسی سے کسی قدر اٹھ کر مہذب لہجے میں کہا۔

''ہیلو سر۔''

''پلیز۔'' اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور میں بیٹھ گئی۔ کرسی پر بیٹھ کر میں نے دوبارہ اس کا جائزہ لیا اور دنگ رہ گئی۔ مجھے اس کے چہرے پر شرم کے آثار کے ساتھ ہلکی سی سرخی بھی نظر آئی تھی۔

''میں اینی پارک ہوں۔''

''الہ دین۔'' وہ بولا۔

''اوہ، آپ اپنا نام اب بھی یہی بتائیں گے۔''

''آپ نے خود چراغ کی پیشکش کی تھی۔'' وہ بولا۔

''ہاں بعض جھوٹ بڑے منافع بخش ہوتے ہیں۔''

''وہ کیسے؟''

''دیکھئے نا، مفت میں اتنے عمدہ ہوٹل میں ڈنر مل رہا ہے۔ میں نے کہا اور ہنس پڑی۔ اس نے میری ہنسی پر کوئی توجہ نہیں دی تھی جب کہ مجھے کہتے ہوئے دیکھنے والے دیر تک دوسری طرف نہیں دیکھتے پاتے تھے۔ میں نے جلدی سے خود کو سنبھال کر دوبارہ کہا۔

''حالانکہ آپ کی زبردستی کی مہمان میں بہت دیر سے ہوں۔ وہاں مجھے کھانا بھی ملا ہے اور دوسرے آرام بھی۔''

''کیوں نہ ہم چراغ کی باتیں کریں۔'' وہ بولا۔

''کیوں نہ ہم کھانے کی باتیں کریں کیوں کہ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔'' میں نے کہا۔ عین اسی وقت ویٹر نے اندر آنے کی اجازت مانگی تھی۔ کھانے کے بعد کوفی کا پہلا سپ لے کر میں نے کہا۔

''آپ وہی گارڈ ہیں جس نے میری مدد کی تھی۔''

''آپ ضرور پوچھیں گی کہ کیا میں وہاں گارڈ کی نوکری کرتا ہوں۔''

''نہیں میں بالکل نہیں پوچھوں گی لیکن کیا آپ میرے ہر سوال کا جواب دیں گے جب کہ آپ میرے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔''

''نہیں، میں آپ کے ہر سوال کا جواب نہیں دوں گا اور آپ کو بھی مجبور نہیں کروں گا کہ آپ میرے ہر سوال کا جواب دیں۔''

''گڈ۔سوال نمبر ایک۔''

''جی۔''

''اس وقت میں نے آپ کو گارڈ کے روپ اور وردی میں دیکھا تھا۔گو میں نے آپ کے نقوش نہیں دیکھے تھے لیکن جس قدر بھی دیکھے تھے وہ اس وقت سے بہت مختلف تھے۔کیا اس وقت آپ جس شکل میں ہیں یہ آپ کے اصلی شکل ہے۔''

''سوال بالکل غیر متعلق اور ذاتی ہے۔جواب نہیں دیا جائے گا۔''

''آپ کا تعلق مشرق سے ہے؟''

''غیر متعلق سوال،سوری۔''

مجھے غصہ آ گیا۔کمبخت میری ساری شخصیت کی نفی کر رہا تھا۔اس کا خیال ہو گا کہ میں اس کی ذاتی وجاہت سے متاثر ہو کر اس کے بارے میں سوالات کر رہی ہوں۔میں نے خاموشی سے کوفی کے کچھ گھونٹ لیے پھر بولی۔

''آپ نے میری مدد کی ہے جس کی میں شکر گزار ہوں۔آپ میرے بارے میں کیا جانتے ہیں۔''

''بہت مختصر اور یہ میرا کوئی کارنامہ نہیں کہ میں نے آپ کے بارے میں اتنا جان لیا۔بس سمجھ لیجیے کہ کورڈیل کے خلاف میں بھی ایک مشن پر تھا اور اس کی کچھ خفیہ کارروائیوں کی تفتیش کر رہا تھا کہ آپ مادام انی پارک میرے علم میں آئیں،کچھ اہم لوگ جو اب ہلاک ہو چکے ہیں ایک میٹنگ میں آپ کے لیے تشویش کی باتیں کر رہے تھے اور آپ سے خوفزدہ تھے۔پھر آپ کے نام سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اپنے کام کے دوران میں نے آپ کی چھان بین کی اور پھر اتفاق سے آپ سلوا اسٹارک کی قیدی کی حیثیت سے نظر آئیں۔وہ لوگ آپ سے کافی خوفزدہ ہوئے تھے اور سلوا اسٹارک جو کہ کورڈیل کی نمبر ایک سربراہ ہے۔اس نے آپ کے بارے میں آخری فیصلہ کر دیا۔''

''اوہ آخری فیصلہ۔''اب میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''جی۔اس نے کہا کہ آپ کو ختم کر دیا جائے۔اس قید خانے میں گیس چھوڑ کر آپ کو متحرک کرنے کی ہدایت کی گئی تھی اور اس ہدایت پر تھوڑی دیر کے بعد عمل ہونے والا تھا۔''

میں سناٹے میں رہ گئی اور دیر تک کچھ نہیں بول سکی۔پھر میں نے کہا۔

''آپ کا شکریہ مسٹر۔''میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ مسکرا کر کے بولا۔

''الہ دین۔''

سارا وجود سلگ کر رہ گیا تھا۔ضرورت سے زیادہ اسمارٹ بن رہا تھا۔لیکن مجھ پر احسان کر چکا تھا اس لیے اس کے بارے میں کسی برے انداز سے نہیں سوچا اور چند لمحوں کے بعد کہا۔

''آپ کا تعلق اپنے ملک کی کس خفیہ ایجنسی سے ہے۔''

''میرا تعلق اپنے ملک سے ہے اور بس۔''

''میرا مطلب ہے کورڈیل کے معاملے میں آپ جو کچھ کر رہے ہیں وہ اپنے ملک کے لیے کر رہے ہیں۔''

''میں جی ہی اپنے ملک کے لیے رہا ہوں۔''

'' میں اب آپ سے کچھ نہ پوچھوں گی۔ اس شاندار ڈنر کے لیے آپ کا شکریہ اور''

'' نہیں بس۔ اس سے آگے میں بولنا چاہتا ہوں۔''

'' جی فرمایئے۔''

'' میں آپ کے بارے میں نہیں جاننا چاہتا کہ آپ کون ہیں اور کس ملک کے لیے مصروف عمل ہیں۔ کورڈیل کے کرتا دھرتاؤں کی میٹنگ میں یہ انکشاف نہیں ہوسکا کہ آپ کون سے ملک کے لیے کام کررہی ہیں لیکن وہ آپ کے عمل سے متفق تھے اور آپ کی بھرپور مدد کرنا چاہتے تھے۔

البتہ میں میٹنگ کے خاتمے کے بعد جب میں یہ کچھ ایسے لوگوں کا جائزہ لے چکا تھا جو بظاہر آپ سے تعاقب کرنے کی حمایت کررہے تھے۔ کی ایک خفیہ میٹنگ بھی ہوئی جس میں آخری فیصلہ کیا گیا کہ آپ پر اب رسک نہیں لیا جاسکتا اور آپ کو فوری ختم کردیا جاتا۔ ان میں پیش پیش مسز سلوا اسٹارک تھیں اور وہی اس میٹنگ کی ہیڈ تھیں۔ میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ اب اس کو اس طرح مرنے دیا جائے۔ چنانچہ میں نے کارروائی کی۔''

میں پتھرائے ہوئے انداز میں یہ باتیں سن رہی تھی۔ ان سے کہا۔

'' اگر میرا مشن بھی یہی ہوتا جو آپ کا ہے تو لازمی تھا کہ میں پہلے اپنے بارے میں سوچتا۔ میں آپ کو ان کے ہاتھوں مرنے تو نہیں دیتا لیکن آپ کو اتنے عرصہ قید ضرور کردیتا کہ میرے مشن کی تکمیل ہوجاتی۔

لیکن یہ بہتر ہے کہ ہمارے مشن مختلف ہیں اب میری زبان سے کچھ کام کی باتیں سن لیں۔ اس کے علاوہ میرے پاس ایک فائل بھی ہے جو ابھی میں آپ کے حوالے کردوں گا۔ اس فائل کے حصول کے لیے آپ کو چار چھ قتل ضرور کرنا پڑے یا آپ خود چار چھ مرتبہ قتل ہوتیں۔

یہ آپ کے لیے بے حد کارآمد ہے۔ یہ کورڈیل کی تیس سالہ تاریخ ہے اور اس کے اندر جو سیاست چل رہی ہے اور جو کالی بھیڑیں اسے بدنام کرکے نہ صرف ختم کرنے کی کوشش کررہی ہیں بلکہ کچھ جنگ باز ملکوں کو تو آپس میں لڑا کر تیسری جنگ عظیم کی فضا سازگار کررہی ہیں ان کی تفصیل ٹھوس ثبوتوں کے ساتھ موجود ہے۔''

میں اعتراف کرتی ہوں کہ اس وقت میرے دل و دماغ کی عجیب کیفیت تھی۔ مسٹر سارتر سے اس معلومات کے لیے جو سودا کیا گیا تھا اور میں یہاں اس لیے آئی تھی۔ مجھے کامیابی کے لیے ابھی وقت درکار تھا لیکن وہ جو کچھ کہہ رہا تھا اور اس نے جو دستاویزات دینے کی بات کی تھی اس نے میرے ہاتھ پاؤں پھلا دیئے تھے۔ میں تھکی تھکی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔

'' اصل میں یہ تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کورڈیل کئی ممالک کی مشترکہ آرگنائزیشن ہے اور اس کے سربراہان ان ممالک کے چنے چنے لوگ ہیں لیکن ہر ملک کے اپنے اپنے معاملات اور پالیسیاں ہیں اور مخفی مقاصد کی تکمیل کے لیے وہ ایک دوسرے سے بے خبر بھی نہیں ہوتے اور ان کے درمیان خفیہ سازشیں چلتی رہتی ہیں۔ اس وقت اس آرگنائزیشن کے دو سربراہ ہیں۔

میڈم سلوا اسٹارک اور گولڈ کراس، مسٹر گولڈن کراس صاف ستھری طبیعت کے مالک بہترین انسان ہیں لیکن سلوا اسٹارک ایک خطرناک خاتون ہیں اور اب مس اینی پارک اپنے مطلب کی بات سنیے۔ وہ اغوا شدہ آبدوز یہاں سے کافی دور ایک جزیرے ایڈمون کے ساحل کے پاس موجود ہے۔ اس فائل میں آبدوز کی جگہ کا پورا نقشہ محفوظ ہے لیکن آپ کو اصل میں سلوا اسٹارک کے ایک خفیہ ٹھکانے پر قابو پانا ہے۔ کیونکہ آبدوز پر موجود میزائل کا سارا کنٹرول اسی ٹھکانے پر ہے۔''

اس شخص نے اپنے پیروں کے پاس رکھے ایک چرمی بیگ کو نیچے ہی نیچے کھول کر ایک فائل نکال لی۔

(اینی پارک..... جاسوسی کی دنیا میں اب کیا تہلکہ مچائے گی۔
اس کا اگلا شکار کون ہوگا؟ جاننے کے لیے اگلی قسط کا انتظار کیجیے)

پہلا شعلہ

محبت اور نفرت کی دہکتی ہوئی آنچ میں لو دیتی ہوئی شعلہ مثال تحریریں



سوئٹی



سنبل

معاشرے میں پھیلا ایک بہت عام سا مرض، جس کو سنبل نے لفظوں سے زندگی دی

کتے کے بھونکنے کی آواز اتنی زوردار اور دل کو دہلاتی ہوئی تھی کہ میں گھبرا کر بالکنی کی طرف بھاگی اور سامنے کا منظر دیکھ کر میرے لبوں پہ مسکراہٹ آ گئی سامنے ہی ایک کونے میں کاغذ چننے والا ایک افغانی بچہ دبکا کھڑا تھا اور سوئٹی اس پر بھونک رہی تھی۔ یہ ابتداء تھی سوئٹی کے ہمارے محلے میں آنے کی۔ سوئٹی نے رات ہی ہمارے برابر میں رہنے والی روبینہ کی کیاری میں چار بچے دیے تھے۔ اور صبح سے یہ حالت تھی کہ کوئی بھی کیاری کے پاس سے گزر جاتا تھا تو سوئٹی فوراً الرٹ ہو جاتی تھی۔

اور اتنا برا بھونکتی تھی کہ پاس سے گزرنے والا ڈر کے دبک جاتا تھا یا پھر بھاگ کھڑا ہوتا تھا مگر یہ بھی بہت شروع کی بات ہے۔ جیسا کہ اس وقت ہوا تھا۔ میں بالکونی میں آنے سے پہلے کھانا پکا رہی تھی اور چکن دھونے میں مصروف تھی۔ اس وقت بھی میرے ہاتھ میں چکن کی ایک بوٹی تھی۔ میں نے سوئٹی کو پچکار کر وہ بوٹی اوپر سے پھینکی تو وہ اس افغان بچے کو چھوڑ کر اس بوٹی پہ لپکی اور میں نے اس بچے کو اشارہ کیا اور وہ بھاگتا ہوا گلی پار کر گیا۔

☆☆☆

ہمارے برابر والے گھر میں روبینہ رہتی تھی۔ اپنے شوہر اور چھوٹے چھوٹے دو بچوں کے ساتھ۔ ان دونوں میاں بیوی میں بنتی نہیں تھی۔ ہر دوسرے دن لڑائی جھگڑے اور اتنی بلند آواز میں کہ آس پاس کے چار محلے سنا کرتے تھے۔ محلے والوں کے لیے وہ ایک بڑی دلچسپ تفریح تھی کیونکہ اگر روبینہ کا میاں سیر تھا تو وہ سوا سیر تھی۔ اس کا میاں اسد صرف نام کا ہی اسد تھا ورنہ اس گھر کی شیرنی اصل میں روبینہ تھی۔ اسد میں بہرحال ایک اچھی بات تھی کہ لڑائی میں بھی اس کی زبان کنٹرول میں رہتی تھی۔

مگر روبینہ کی زبان کے آگے تو خندق تھی۔ گالی گلوچ، بددعائیں اور کوسنے۔ اسے یہ احساس تک نہیں ہوتا تھا کہ وہ اپنے شوہر اور اپنے بچوں کے باپ کے لیے کون سی زبان استعمال کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ بھی روبینہ کے بارے میں بڑی عجیب و غریب باتیں مشہور تھیں کہ اس کے پاس اس کے شوہر کی غیر موجودگی میں لوگ آتے ہیں۔ میں بہرحال روبینہ کے بارے میں بات کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ مجھے عورتوں کی اس قسم سے شدید نفرت تھی اور کوسب سے تو اس سے بھی زیادہ شدید نفرت ہے

بہر حال وہ کیسی تھی کیسی نہیں میں نے کبھی کھوجنے کی کوشش نہیں کی۔ مگر اکثر بھری دوپہر میں وہ بچوں کو گھر سے باہر نکال دیتی تھی۔ بنیادی خرابیوں کے علاوہ بہر حال ہمارے محلے والوں میں اور کوئی خرابی نہیں تھی۔ ایسے وقت میں محلے کا جو بھی شخص ان بچوں کو دیکھتا اپنے گھر بلا لیتا تھا۔ بہر حال روبینہ ہمارے محلے کا چٹخارہ تھی۔

☆☆☆

شروع شروع میں سوئی سب پر بھونکتی تھی مگر بعد میں گلی کے دونوں جانب کے 20 گھروں کے افراد کو پہچاننے لگی۔ اب وہ ان پر چڑھائی نہیں کرتی تھی۔ اور کچھ ہی عرصے میں وہ گلی میں مستقل آنے والوں مثلاً سبزی والوں، کچرے والے اور ماسیوں کو بھی پہچاننے لگی سو وہ بھی محفوظ ہو گئے مگر کچرا چننے والوں، فقیروں اور مشتبہ افراد کو وہ گلی سے باہر تک چھوڑ کر آتی تھی۔

اور یہی وجہ تھی کہ وہ دنوں میں پورے اہل محلّہ کی لاڈلی بن گئی۔ گھروں میں جو کچھ بنتا اس میں اس کا اور اس کے بچوں کا حصہ ضرور نکلتا۔ اس کے علاوہ بھی چکن کے چھیچھڑے وغیرہ خریدے جاتے تھے۔ سوئی کے آنے سے قبل ہمارے محلے میں سیٹی والے بابا (چوکیدار) کی موجودگی کے باوجود کافی چوریاں ہو رہی تھیں۔ ہماری ہی لائن میں تیسرے گھر سے چھت پر رکھے پنجرے سے کوئی سارے قیمتی پرندے چرا کر لے گیا۔

اس کے علاوہ ہمارے ہی گھر کی گاڑی سے کوئی اسٹیریو سسٹم نکال کر لے گیا تھا۔ کافی گاڑیوں سے کار AC نکال لیے گئے تھے۔ گویا وہ کیا آئی ہمارے محلے کی چوکیدارنی آ گئی۔ ہمارے محلے میں رات تو دور، کئی بار دن میں بھی اجنبی ہمارے گلی میں آتے ہوئے ڈرتے تھے ہماری گلی مشہور ہی اتنی ہو گئی تھی۔

سوئی نام میں نے ہی اسے دیا تھا کیونکہ بچے اسے کتیا ہی بلاتے تھے۔ جو انڈو پاک میں بطور گالی استعمال ہوتا ہے۔ اور پاکستانیوں کی عادت ہے جو لفظ



برا یا بُرے معنوں میں لیا جائے اسے انگلش میں بولنے لگتے ہیں مگر کوئی ان سے پوچھے Bitch انگریزوں میں کون سا خیر کا کلمہ ہے۔

بہر حال کچھ ہی عرصے میں سوئٹی کے چاروں بچے اس کے ساتھ ساتھ پھرنے لگے تھے۔ ننھے ننھے خوب صورت سے بچے۔ اور بچے تو کسی کے بھی ہوں اچھے ہی لگتے ہیں۔ خصوصاً کتے، بلی کے بچے تو بہت ہی کیوٹ ہوتے ہیں۔

☆☆☆

اس دن چھٹی تھی۔ روبینہ اور اسد کا شاندار معرکہ ہوا تھا۔ گھر برابر میں ہونے کی وجہ سے اکثر باتیں کانوں میں نہ چاہتے ہوئے بھی پڑ جاتی تھیں۔ ابھی بھی کسی نے اسد کو اس کی غیر موجودگی میں لوگوں کے آنے کی اطلاع دی تھی اور بجائے اس کے کہ روبینہ شرمندہ ہوتی وہ بڑے دھڑلے سے اعتراف کر رہی تھی اور اسد کو باور کروا رہی تھی کہ اس کی تنخواہ میں وہ گھٹ گھٹ کر نہیں جی سکتی لہٰذا اسے یہ چور راستے ڈھونڈنے پڑے۔'' اس پر اسد نے اسے مارا تھا۔ اور اب اس کی گالیاں، کوسنے اور بددعائیں عروج پر تھیں۔

اور اچھے خاصے ٹھنڈے موسم کے باوجود میری پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ ساحر غالباً کافی دیر سے میرے تاثرات نوٹ کر رہے تھے میرے پاس آ کر بولے۔

''کیا بات ہے کوئی پریشانی ہے کیا؟'' انھوں نے پوچھا اور میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں کوئی نہیں'' میں نے سر جھکا۔

''ان آوازوں سے پریشان ہو۔ ارے یہ تو روز کا معمول ہے۔'' انھوں نے گویا مجھے ریلیکس کرنا چاہا۔

''ہاں تو مگر مجھے اس عورت کے عورت ہونے پر شرم آتی ہے۔'' میں نے تاسف سے کہا۔

''تم ٹینشن مت لو دیکھو میں کچھ کرتا ہوں۔'' انھوں نے مجھے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''آپ کیا کریں گے'' میں نے حیرانی سے انھیں دیکھا۔

''ارے کرائے دار ہی تو ہیں۔ محلے والوں سے بات کرتا ہوں انھیں نکالتے ہیں یہاں سے۔'' وہ بے لچک لہجے میں بولے۔

''چھوڑیں بھی ساحر! ہم کون ہوتے ہیں کسی کی زندگی کے فیصلے کرنے والے ویسے بھی وہ چھوٹے چھوٹے بچوں کی موجودگی میں کہاں رلتے پھریں گے اور ویسے بھی یہاں کے محلے والے اچھے ہیں۔

بچوں کا خیال بھی رکھ لیتے ہیں۔ پتا نہیں دوسرا محلہ کیسا ہو۔

مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کی معصومیت کے چھن جانے سے۔'' میں نے ساحر کو ان کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے کہا۔

''اگر تم اسی طرح سے ٹینشن لیتی رہیں تو میں تو ضرور بات کروں گا ان کے متعلق۔'' وہ بغیر میرے تقریر سے متاثر ہوئے بولے۔

''یہ لیں نہیں لیتی ٹینشن، اب آپ بھی اپنی بات پر قائم رہیے گا۔'' میں نے چہرے پر ہاتھ پھیر کر گویا ٹینشن جھاڑی۔

''ان کا فیصلہ تو آئندہ کے حالات دیکھ کر ہوگا۔'' انھوں نے گویا بات ہی ختم کر دی۔

اس جھگڑے میں تھپڑ کھانے کے بعد روبینہ اپنے میکے چلی گئی۔ بچے جو پہلے ہی رُل رہے تھے مزید رُلنے لگے۔ اسد نے مجبور ہو کر معافی تلافی کی اور روبینہ گھر آ گئی اور پھر وہی روبینہ تھی، وہی اس کے روز و شب تھے۔ وہی بچوں کی ناقدری اور وہی روز کے لڑائی جھگڑے۔

☆☆☆

سوئٹی کے بچے اب کھانے کے لائق ہوگئے تھے۔ اب اسے جو کچھ بھی ملتا تھا وہ اپنے بچوں کے آگے ڈال دیتی اور ان کے سیر ہونے کے بعد خود کھاتی تھی۔

اب بھی خطرہ محسوس ہونے پر چیل کی طرح اپنے بچوں کی جانب لپکتی اور انھیں محفوظ جگہ پر پہنچا دیتی تھی۔ اور پھر مطلوبہ شخص کی ایسی کی تیسی کرتی تھی۔

شہر میں کتے بہت ہو گئے تھے، سو میونسپل کارپوریشن کی طرف سے کتا مار مہم کا آغاز ہوا ایسے ہی ایک دن جب سوئٹی بچوں کو چھوڑ کر گلی سے باہر گئی ہوئی تھی کہ بچوں نے اس مہم کے تحت ڈالا گیا گوشت کھا لیا۔ سوئٹی کی واپسی تک دیر ہو چکی تھی اس کے چاروں بچے اس کے آنے تک مر چکے تھے کیونکہ وہ زہر خورانی سے مرے تھے سو ان کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔

میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہ ایک ایک بچے کے پاس جاتی اور ان کے منہ سے نکلنے والے جھاگ کو چاٹتی پھر اسے ان چاروں کو منہ سے پکڑ پکڑ کر ایک ساتھ لا کر لٹا دیا اور ان کے پاس منہ ڈال کر لیٹ گئی۔

بعد میں کچرے والا چاروں بچوں کی لاشیں اٹھا کر لے گیا مگر سوئٹی اسی جگہ بیٹھی رہتی۔ کبھی کبھی آواز سے روتی اور اکثر اس کے آنسو بہتے رہتے تھے۔

کوئی کچھ ڈالتا تو منہ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔ بے بسی سے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھتی اور باآواز بلند روتی۔ یہ سلسلہ کچھ عرصے تک جاری رہا آخر کار سوئٹی ہماری گلی چھوڑ کر چلی گئی۔

☆☆☆

اس دن ماسی دیر سے آئی تھی ابھی میں اسے کچھ سنانے ہی والی تھی کہ وہ خود سے بول پڑی۔

"باجی! کچھ سنا؟" وہ متجسس تھی۔

"نہیں اور یہ سننے سنانے والا کام اور گھروں میں کیا کرو۔" میں نے اسے جھڑکا۔

"نہیں باجی! بات ایسی ہے کہ جب تک میں سنا نہ لوں گی مجھ سے کام نہیں ہوگا۔" وہ پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔

"تو کر لو غیبت، کر لو پیٹ ہلکا۔" میں نے چڑ کر کہا۔

"باجی! وہ اپنے برابر والی روبینہ باجی ہے ناں!" اس نے آواز دھیمی کر کے اسرار پھیلایا۔

"ہاں ہے کیا ہوا ہے اسے؟" میں نے عام سے بے تاثر لہجے میں کہا۔

"ہونا کیا ہے اس چڑیل کو۔ کل بھاگ گئی اپنے کسی یار کی ساتھ۔" ماسی نے چٹخارہ لینے والے انداز میں کہا اور مجھے لگا جیسے سر پر میرے ہی گھر کی چھت آ گری ہو۔ مگر ماسی کو تنبیہہ ضروری تھی۔

"الفاظ، الفاظ کا چناؤ ٹھیک کیا کرو میرے سامنے۔ اور اب روبینہ اتنی بھی بری نہیں ہے۔" میں نے پست لہجے میں کہا۔

"بری۔ آپ کو کیا پتا وہ کتنی بری ہے باجی! بچوں کو گھر میں بند کر کے گئی تھی اسد بھائی نے شام میں خوف سے مرتے ہوئے بے ہوش بچوں کو آ کر بچایا ہے۔" ماسی نے مزید گل افشانی کی اور میں کھڑے سے بیٹھ گئی۔ اور ماسی گھبرا گئی۔

"باجی! طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری۔" وہ پریشانی سے بولی۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں تم جلدی سے کام کرو اور جاؤ۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"باجی! گلوکوز بنا دوں۔" ماسی پرانی تھی وہ جانتی تھی میں آسانی سے ہاتھ پیر چھوڑنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

"نہیں تم کام کرو۔" میں نے دوٹوک کہا۔

اور اب ماسی کام کر کے جا چکی ہے۔ اور میں سوچ رہی ہوں کتیا کون ہے سوئٹی یا..... اور آیا ایسی عورت کو کتیا کہنا کہیں کتیا کی توہین تو نہیں۔

ہمارے معاشرے میں ہمیشہ سے ہی لفظ کتیا بطور گالی استعمال ہوا ہے۔

لیکن ایسی عورت کیا ہے ہمارے معاشرے کے لیے۔ روبینہ کے لیے لفظ کتیا استعمال کرتے ہوئے میری نظروں کے سامنے ہمیشہ سوئٹی آ جاتی ہے اور سوئٹی کے نظروں کے سامنے آنے پر میری نظریں احتراماً جھک جاتی ہیں۔ لیکن کیا ایسی عورت کتیا بھی کہلانے کے لائق ہے جس کا نام تک ذہن میں آتے پر نظریں شرم کے مارے زمین پر گڑ جاتی ہیں۔ فیصلہ آپ کریں۔

☆☆......☆☆......☆☆

سیلو پوائزن



شاہد رفیق سہو

اُس عورت کی فتنہ خیزی، جو آدم کو اپنے پوائزن کا عادی کر کے لوٹتی تھی

میرا دوست رستم بڑا سیدھا سادا بندہ تھا۔ ملتان کے ایک گاؤں سے لاہور آیا تھا۔ کچھ عرصہ تک اپنے ماموں کے گھر گلبرگ میں رہا۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد اسے ایک دوائیوں کی کمپنی میں سیلز مین کی ملازمت مل گئی۔ دوائیاں لوکل میڈ ہوتی تھیں اور مارکیٹ میں چلنے والی دوائیاں تھیں۔ اس لیے رستم کو اپنے قدم جمانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ کمپنی نے اس کی محنت اور کام سے دلچسپی کے پیش نظر اسے ایک موٹر سائیکل بھی دے دی تھی۔ اب وہ خوب جم کر محنت کرنے لگا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس کی تنخواہ بھی بڑھا دی گئی جبکہ اسے کمیشن ٹھیک ٹھاک مل جاتا تھا۔

اس کی حالت بہتر ہوئی تو وہ ماموں کے گھر سے کہیں اور شفٹ ہو گیا۔ کیونکہ اس کے ماموں کے پاس جو فلیٹ تھا اس میں زیادہ گنجائش نہیں تھی۔ اب اس نے ایک مختصر سا فلیٹ کرائے پر لے لیا تھا۔ ماموں نے اس سے کہا کہ بیٹا دل لگا کر کام کرو اور فضول خرچی سے ہمیشہ اپنے آپ کو بچا کر پیسہ جمع کرو۔ ہم سال ڈیڑھ سال بعد تمہاری شادی کر دادیں گے اور اس بات پر وہ کاربند تھا۔

اس سے میری دوستی کیسے ہوئی اور کیوں ہوئی اس کا جواب یہ ہے کہ میرا ایک میڈیکل اور جنرل اسٹور ہے۔ بس اس دکان میں اس کے آنے جانے سے ہماری دوستی ہو گئی۔ میں کبھی کبھی اس کے فلیٹ میں بھی چلا جاتا تھا۔ مگر مجھے اس بات کا علم بہت بعد میں ہوا کہ کچھ لوگ اور بھی اس کے حلقۂ احباب میں تھے۔ جن میں سے کچھ اچھے بندے نہیں تھے۔ انہی لوگوں نے رستم کو شہناز بیگم تک پہنچایا تھا۔ شہناز بیگم بظاہر بڑی مہمان نواز خاتون تھیں۔ ان کے گھر میں اکثر نوجوانوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ شہناز بیگم بڑی محبت اور لگاوٹ کے ساتھ ہر ایک مہمان کے ساتھ پیش آتی تھیں۔ مشروبات کا دور چلتا تھا۔

وہ ایک طلاق یافتہ خاتون تھیں اور خودمختار زندگی بسر کر رہی تھیں۔

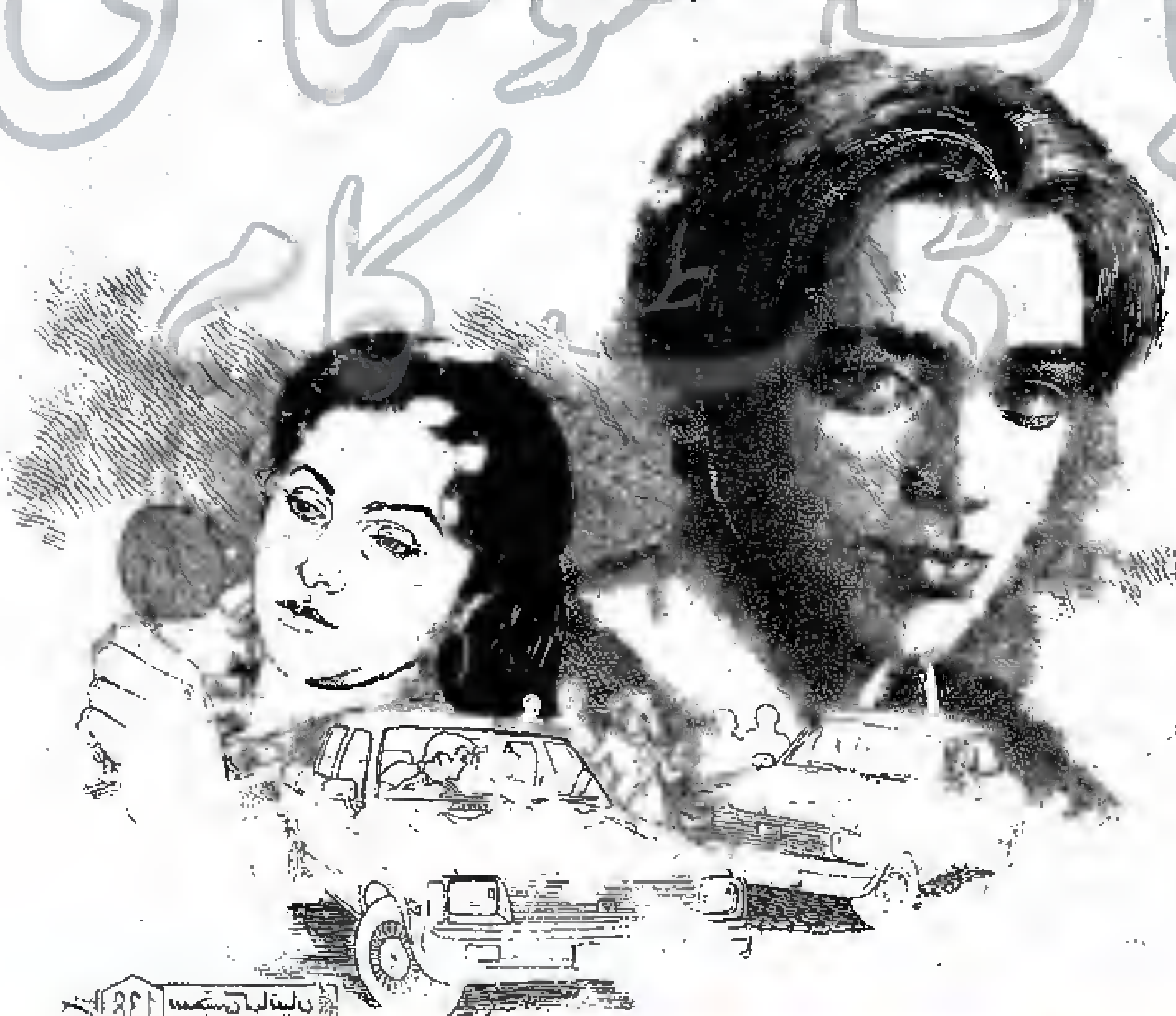
ایک دن رستم نے مجھے بتایا کہ شہناز بیگم بڑی اچھی اور ملنسار خاتون ہیں ان کے گھر کا ماحول بڑا دوستانہ ہے۔''

''مگر یہ باتیں تمہیں کیسے معلوم ہوئیں۔ کیا تم بھی ان کے گھر جاتے ہو'' میں نے اس سے پوچھا تو ذرا ہچکچاہٹ کے بعد اس نے اقرار کر لیا کہ وہ بھی کبھی کبھار چلا جاتا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ تم وہاں نہ

جایا کرو وہ اچھی عورت نہیں ہے۔“
میری بات سن کر وہ جھٹ سے بولا کہ تو کیا تم اسے جانتے ہو۔“
”ارے نہیں بھائی! مگر میں جانتا ہوں کہ اس قسم کی عورتیں اچھی نہیں ہوتی جو غیر مردوں کا جمگھٹا اپنے گرد لگائے رکھتی ہیں۔“
”نہیں یار امجد، شہناز بیگم ایسی عورت نہیں وہ تو بڑی گریس فل شخصیت کی مالک ہیں۔ وہاں جانے والے سب ان کی بڑی عزت کرتے ہیں۔“
”تو گاؤں گوٹھ کا بندہ ہے نا اس لیے تجھے معلوم نہیں کہ لاہور جیسے بڑے شہروں میں کیسے کیسے بڑے بڑے شعبدہ باز بستے ہیں۔ ایک چہرے پر ہزاروں چہرے سجائے ہوئے ہوتے ہیں لوگ کس کس طرح سیدھے سادے لوگوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔“
”میں گاؤں گوٹھ کا ضرور ہوں مگر اتنا بھی بھولا بادشاہ نہیں کہ اچھے اور برے لوگوں کی پہچان نہ کر سکوں۔ یار امجد کسی دن میرے ساتھ چل کر تو بھی ان کو دیکھ لے۔ میری بات پر تجھے یقین آ جائے گا۔“
مگر میں نے اس کے ساتھ جانے کی حامی نہیں بھری۔ مجھے ضرورت ہی کیا تھی شہناز بیگم کو جا کر دیکھنے کی۔ جبکہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایسی عورتیں واقعتاً اچھی نہیں ہوتیں۔ ان کی اچھائی کے پس پردہ بہت سی برائیاں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ مگر میں نے یہ باتیں اس سے نہیں کہیں۔

☆☆☆

ایک دن اس نے میری دکان سے ایک قیمتی پرفیوم کی بوتل خریدا۔ وہ میری دکان سے ضرورت کی چیزیں مثلاً صابن، شیونگ کا سامان اور ایسی ہی دوسری چیزیں جو معمولی قیمت کی ہوتی ہیں خریدتا تھا۔ پرفیوم کی کوئی شیشی اس نے کبھی نہیں خریدی تھی۔ میرا ماتھا اسی وقت ٹھنکا تھا۔ مگر اس وقت میں نے اسے ٹوکا نہیں۔



کئی دنوں کے بعد جب میں اس کے فلیٹ گیا تو
میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں مجھے پرفیوم کی وہ
بوتل کہیں دکھائی نہیں دی۔ ذرا دیر بعد میں نے اس
سے اچانک پوچھ لیا۔
''شہناز بیگم نے تم سے یہ نہیں کہا کہ یہ گھٹیا پرفیوم
اٹھا کر لے آئے ہو۔'' وہ ایک دم چونک پڑا جیسے اس
کی چوری پکڑی گئی ہو۔ پھر مسکرایا۔
''ارے نہیں یار۔ وہ بڑی مہذب خاتون ہیں۔
کسی کی بے عزتی یا توہین کرنا ان کا شعار نہیں۔''
میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جس پر
اس نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
''وہ دراصل ان کی سالگرہ کی سادہ سی تقریب تھی
نا۔ میں نے اس موقع پر انھیں تحفے کے طور پر وہ پرفیوم
گفٹ کیا تھا۔
اب میں نے کہا کہ ان کے اور دوستوں نے بھی
انھیں تحائف دیے ہوں گے۔''
''ہاں! اور لوگوں نے تو بڑی قیمتی قیمتی چیزیں دی
تھیں۔ ان کے مقابلے میں میرا تحفہ واقعی بڑا گھٹیا اور
کمتر لگ رہا تھا۔ مگر شاباش ہے اس اعلیٰ ظرف خاتون
کو اس نے اس محبت اور خلوص سے میرا تحفہ بھی قبول
کیا۔ جس خلوص اور محبت سے دوسروں کا قیمتی تحفہ
وصول کیا۔''
میں نے اس موقع پر اس سے تو کچھ نہیں کہا۔
اپنے دل میں کہا۔ بیٹا اس کی اعلیٰ ظرفی کا تو تمہیں
اس دن یقین آ جائے گا جس دن وہ تمہیں بھرے
بازار میں ننگا کر دے گی۔
وقت گزرتا رہا۔ کبھی کبھی رستم شہناز بیگم کی کوئی
ایک آدھ بات بھی کر لیتا تھا۔ میری اچھی یا بری
عادت ہے کہ میں کسی کو سمجھاتا ہوں کوئی نیک مشورہ
دیتا ہوں اگر وہ اسے نہیں سمجھتا، اس مشورے پر عمل
نہیں کرتا تو زیادہ زور زبردستی نہیں کرتا۔ رستم کو بھی چند
بار سمجھانے کے بعد میں نے اس کے حال پر چھوڑ دیا
تھا۔
کچھ دنوں بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت
ترنگ میں رہنے لگا ہے۔ پہلے لڑکیوں اور خواتین کو دیکھ
کر اپنے جذبات کو قابو میں رکھتا تھا مگر اب وہ
ندیدوں کی طرح ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگتا تھا۔
ایک دن میں نے اسے کہا کہ تُو ایسا کیوں ہو گیا ہے؟
پہلے تو تُو ایسی چھچھوری حرکتیں نہیں کرتا تھا۔''
''کیا ہو گیا مجھ کو اور میں کون سی چھچھوری حرکت
کرتا ہوں۔ پھر اس نے خود ہی جواب بھی دے دیا۔''
یار امجد! تُو نے ابھی شادی نہیں کی ہے نا اس
لیے نہیں جانتا کہ عورت میں کتنا جادو ہے۔'' اس کی
بات سن کر میں مسکرایا۔
''مگر تُو نے کب کی ہے شادی کہ یہ جادوگری
تجھے معلوم ہو گئی ہے۔'' وہ ایک دم گڑبڑا گیا۔ غالباً
اس نے ترنگ میں آ کر جادوگری کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔
اس دن میں نے اسے زیادہ کریدا نہیں مگر چند دنوں
کے بعد میں نے اسے چھیڑا۔
''میرے یار مجھے بھی کسی دن اپنی شہناز کے
پاس لے چل نا۔'' اس نے کھل کر تو انکار نہیں کیا
آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ
کیوں انکاری ہے۔
''تُو تو اس طرح کترا رہا ہے جیسے میں جا کر انھیں
منع کر دوں گا کہ....'' اس کے بعد میں نے دانستہ اپنا
جملہ نامکمل چھوڑ دیا تھا۔
''کیا منع کر دو گے۔'' اس نے تڑپ کر پوچھا
تھا۔
''جو تُو سمجھ رہا ہے وہی۔'' اس نے شرمندگی سے
سر جھکا لیا۔ چند لمحوں تک خاموش رہا۔ پھر میری طرف
دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتا ہوا بولا۔
''وہ ایک دن ہوا یہ کہ وہ...... بس تو پھر اس کے
بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔'' وہ اپنی پوری کہانی سنا گیا تھا۔
شہناز بیگم کے بارے میں جب میں نے رستم
کے منہ سے پہلی بار سنا تھا اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ وہ
اچھی عورت نہیں ہے۔ اس گاؤں گوٹھ کے بندے کو
میں نے سمجھانے کی بھی کوشش کی تھی۔ مگر وہ نہیں سمجھا۔
پھر آہستہ آہستہ اس کی خوبیاں سامنے آتی گئیں اور
اب رستم کی باتوں سے اس کا اصل روپ سمجھ میں آ گیا
تھا۔ اگرچہ اب بھی اس بھولے بادشاہ کی سمجھ میں وہ

عورت نہیں آئی تھی۔

☆☆☆

کچھ دنوں کے بعد رستم کچھ پریشان نظر آنے لگا۔ کھویا کھویا ہونقوں جیسا۔ پہلے تو میں نے انتظار کیا کہ وہ خود ہی اس کی وجہ بتائے گا مگر جب اس نے کچھ نہیں کہا تو مجھے ہی پوچھنا پڑا۔

''کیا بات ہے رستم! تم کچھ دنوں سے پریشان لگ رہے ہو۔''

''امجد بھائی! کچھ نہیں میں بہت زیادہ پریشان ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔''

''آخر بات کیا ہے، کھل کر بتاؤ۔''

''وہ شہناز بیگم ہیں نا...... انھوں نے مجھے اپنے پاس آنے سے سختی سے منع کر دیا ہے۔ اپنی چوکھٹ پر قدم رکھنے سے بھی روک دیا ہے۔ پھر بھی میں ایک دن چلا گیا تو انھوں نے ایک لڑکے کو اشارہ کیا جس نے مجھے دھکے دے کر وہاں سے نکال دیا۔''

'چلو خس کم جہاں پاک۔' میں نے دل ہی دل میں برجستہ کہا۔

''کیا عام لوگوں کے ساتھ ملنے سے منع کیا ہے یا خفیہ ملاقاتوں سے۔''

''وہ بات دراصل خفیہ ملاقاتوں سے ہی شروع ہوئی تھی۔ ایک دن کہنے لگی۔ تم نے مجھے کیا سمجھ لیا ہے میں کوئی گری پڑی عورت ہوں۔ بازاری عورت ہوں۔ جب دیکھو میرے پاس بھوکے بھیڑیے کی طرح چلے آتے ہو۔ آج کے بعد میرے گھر پر قدم رکھنے کی بھی کوشش مت کرنا۔ میں ایک دن پھر بھی ان کی عام محفل میں شریک ہونے کی نیت سے چلا گیا تو انھوں نے ایک لڑکے کو اشارے سے کچھ کہا اس نے آکر دھکے دے کر مجھے نکال دیا۔''

یہ سن کر میں نے تحمل سے اسے کہا کہ بات دراصل یہ ہے پیارے کہ ان کا دل تجھ سے بھر گیا ہوگا اس لیے۔''

''مگر میرا دل تو اس سے نہیں بھرا تھا۔'' اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔'' وہ تو میری ضرورت بن گئی تھی۔ اب میں کیسے......''

''اب تو شادی کر لے پیارے۔'' میں نے بھی قطع کلامی کی۔'' تیرا یہی علاج ہے۔'' یہ سن کر اس پر ایک دم مردنی سی چھا گئی۔

''شادی...... مگر میں شادی کیسے کر سکتا ہوں۔ میں تو بالکل قلاش ہو گیا ہوں۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو۔'' میں نے حیرت سے کہا۔

''تیری جمع پونجی کیا ہوئی کہاں گئی۔'' مجھے معلوم تھا کہ اس نے کوئی ستر اسی ہزار روپے جمع کر لیے تھے۔ اس کے ماموں نے کہا تھا کہ لاکھ ڈیڑھ لاکھ ہو گئے تو مجھے بتانا میں تیری شادی کروا دوں گا۔''

''وہ ساری جمع پونجی تو شہناز بیگم کھا گئی۔ وہ ہر ملاقات میں مختلف حیلے بہانوں سے کچھ پیسوں کا مطالبہ کرتی تھی اور میں......'' اتنا کہہ کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''میرے یار! میں نے تجھ سے پہلے دن ہی کہہ دیا تھا ایسی عورتیں جو مردوں کا جمگھٹا اپنے گرد جمع رکھتی ہیں اچھی نہیں ہوتی ہیں۔ مگر تو نے میری بات پر یقین نہیں کیا تھا۔ میں نے تجھے بہت سمجھایا تھا کہ یہ لاہور ہے۔ یہاں ایسے شعبدہ بازوں کی کمی نہیں جو سیدھے سادے لوگوں کو ننگا کر دیتے ہیں۔ میں نے کہا تھا یا نہیں؟''

''کہا تھا۔ مگر میں بھی اسے ننگا کیے بغیر نہیں رہوں گا۔ میں بھی کسی بھری محفل میں اسے ننگا کر دوں گا۔ سارے لوگوں کو بتا دوں گا کہ اس نے مجھے اپنے جال میں پھنسا کر کنگال کر دیا ہے۔ تم لوگ بھی اس شکاری عورت سے بچو۔ کل کو وہ تمھیں بھی کہیں کا نہیں رہنے دے گی۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

میں نے اسے منع کیا تھا کہ وہ ایسی کوئی غلطی نہ کرے لیکن مجھے یقین تھا کہ اس نے ایسی غلطی کی ہوگی اور شاید اس کا نتیجہ تھا کہ ایک دن اس کی لاش بے گور و کفن ایک سڑک پر پڑی ہوئی ملی تھی۔

آخرکار ماجد شہناز بیگم کے سلو پوائزن کا شکار ہو ہی گیا تھا۔ اور زہر کی صورت کوئی بھی ہو انجام موت ہی ہوتا ہے۔

☆☆☆

کیا لے جائے گا؟

مسز نگہت غفار

معاشرے کے اُن کرداروں کی کہانی جو عارضی سکھ کو بہت سمجھتے ہیں لیکن جب......

''آپا...... او آپا...... کہاں ہو؟'' دیکھو تو بھائی تمہارے لیے کیا لایا ہے؟ ارے اس بار تو اچھل پڑو گی۔ اس شہزادے اور اس کی بولی رقم کا سن کر۔ بڑی تگڑی بولی لگائی ہے اس نے۔ ہماری بٹیا کی۔''

رشیدہ دلدار کی آواز سن کر باہر لان کی طرف لپکی۔

''ارے میرا بھائی بڑے دنوں بعد آیا ہے۔'' اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ لان میں بچھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ دلدار نے بڑا سا خاکی لفافہ میز پر رکھا اور اس میں سے چند تصاویر نکالیں۔ رشیدہ نے بھی اُسی تصویر کے حق میں فیصلہ دیا جس کا ذکر دلدار نے کیا تھا۔ واقعی خوب صورتی کے ساتھ ساتھ امیر بھی تھا۔

''اجالا'' اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر لان میں بیٹھے رشیدہ اور دلدار کی حرکات و سکنات کو دیکھ رہی تھی۔ دل ہی دل میں کُڑھ رہی تھی۔

''آ گیا خبیث۔ چہرے سے خباثت ٹپکتی ہے مکروہ شکل کا۔ اماں کا بھائی...... یقین نہیں آتا یہ اماں کا بھائی ہے۔ کسی چیز سے بھی ظاہر نہیں ہوتا۔ جب آتا ہے اماں کے لیے اچھی اور ہم بہنوں کے لیے بُری خبر لے کر آتا ہے۔'' کافی دیر تک کھسر پھسر ہوتی رہی پھر دلدار مکروہ ہنسی ہنستا رہا۔

''اچھا سن آپا سب نے دوسرے شہر میں ایک مکان کا بندوبست کر لیا ہے جیسے ہی اجالا کی شادی ہو گی تم وہاں شفٹ ہو جانا۔

دوسری ہی گلی میں میں نے اپنے لیے بھی مکان دیکھ لیا ہے۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے بھائی بہن دو۔'' رشیدہ نے جانے کن سوچوں اور وسوسوں میں گھر گئی تھی۔

''آپا...... یہ تُو کیا سوچنے لگی۔'' وہ غور سے رشیدہ کو دیکھ کر بولا۔

''تُو آج مجھے زیادہ خوش اور مطمئن نظر نہیں آ رہی ہے۔ خیر تو ہے؟ کن خیالوں میں گم ہے؟''

''وہ...... میں...... یہ پوچھ رہی تھی کہ تُو نے آج یہ کن کاغذات پر مجھ سے دستخط لیے ہیں؟'' رشیدہ دل کی بات زبان پر لے آئی۔ وہ عجیب شکی نظروں سے دلدار کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی دلدار تھا اُس نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ بے ساختہ ہنس پڑا۔

"اچھا! تو اب تو اپنے اس بھائی پر شک کرنے لگی ہے، جس نے تجھے مالا مال کر دیا۔ یہ بینک بیلنس، یہ کوٹھیاں گاڑیاں یہ...... یہ سب کچھ تو نے کہاں سے حاصل کیا ہے؟ اپنے دامادوں سے...... اور یہ چکر چلانے والے بندے کس نے ڈھونڈ کر نکالے...... ہاں بول...... اب چپ کیوں ہے؟ آگے کبھی میں نے تجھ سے دھوکا کیا ہے؟ تیرا برا چاہا ہے؟ نہیں نا۔ تو تُو آج ایسے کیوں پوچھ رہی ہے۔" دلدار خفگی سے بولا۔

"اچھا چل معاف کر دے انسان ہوں۔ اور انسان کو شیطان ورغلاتا ہے اس نے مجھے ورغلایا۔ میں سمجھی کہ شاید پہلے تجھے ورغلایا ہوگا۔"

رشیدہ نے دھیرے سے کہا تو ایک بار پھر دلدار کے مکروہ قہقہے فضا میں بلند ہوئے جنہیں سن کر اُجالا نے کان میں انگلیاں دے لیں۔

اُسے اس شخص سے سخت نفرت تھی۔ اس سے پہلے دو بہنوں کو ماں نے اس مکروہ شخص کے ساتھ مل کر بیچ دیا تھا۔

کون ہے؟ کیسا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ ماں کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بڑی بہن کو ماں نے جس شخص کو بیچا تھا وہ امیر کبیر شخص تھا۔ آوارہ بدمعاش، وہ دلال تھا اس ستر سالہ بوڑھے نے رابعہ کو خریدا اور پھر نجانے کیا ہوا کہ نہ پھر کبھی ماں نے بیٹی کی خبر لی...... نہ بیٹی پلٹ کر آئی اور وہ بوڑھا رابعہ کو لے کر دیارِ غیر میں جا بسا۔

دوسری شاہینہ ایسے شخص سے بیاہی گئی جس کی پہلے سے تین بیویاں تھیں۔ چند ماہ میں ہی پتا چلا کہ شاہینہ کینسر کی مریضہ بن کر اس دنیا سے چلی گئی۔ اب...... اب اجالا کی باری تھی۔ اجالا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح خود کو ایسی ماں اور ایسے ماموں سے بچائے؟

ابا کی زندگی میں تو کبھی یہ شخص گھر میں نہیں آیا اور ابا کے انتقال کے بعد پچھلے دس سال سے یہ ہمارا ماموں بن کر ماں کو مالا مال کر رہا ہے اور ہم بہنوں کو



تباہ و برباد۔ وہ بس سوچ کر رہ گئی۔

☆☆☆

"اماں خدا کے لیے اماں..... میں مر جاؤں گی اب دوبارہ وہاں نہیں جاؤں گی۔ وہ شخص بہت ظالم اور اوباش ہے۔ وہ...... انسان نہیں ہے درندہ ہے۔ مجھے ہر لمحہ اذیت کی سولی پر چڑھائے رکھتا ہے۔ اس کے سینے میں دل نہیں پتھر ہے پتھر۔ وہ مجھے پیسہ کمانے کی مشین سمجھتا ہے۔ اُسے خدا اور رسول کا ڈر بھی نہیں ہے۔ اماں وہ تو شوہر ہے۔ مگر...... تم تو ماں ہونا۔ ارے ممتا اور پیار محبت وارفتگی، چاہت و خلوص، ایثار و قربانی کا مجسمہ ہو تم۔ تم ممتا کا نور ہو۔ اماں یہ سارے نرم ریشمی جذبے کہاں گئے۔ کیا تمہارے سینے میں بھی پتھر ہے؟ تمہیں مجھ پر ترس نہیں آتا۔ میں بالکل ختم ہوگئی ہوں۔ یہ کھوکھلا پنجرہ جس میں ایک مجروح روح بھٹک رہی ہے۔ دو بیٹیاں تو آپ کی ان ہی عادتوں کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ جیتے جی ہمیشہ کے لیے ہم سے بچھڑ گئیں۔ اماں مجھے بچالو میں ساری زندگی آپ کی خدمت کرتی رہوں گی۔"

"ارے چل ہٹ چھوڑ میرے پیر! چل ہٹ۔" رشیدہ نے ٹھوکر مار کر بیٹی کو دھتکارا۔ اُجالا ایک جھٹکے سے اُٹھی آنسو صاف کیے اور غصے سے چیخی۔

"اماں اللہ کو کس بات کا جواب دو گی۔ کون سی کوتاہی یا غلطی یا گناہ کی معافی مانگو گی؟" سوچو...... کچھ تو سوچو اپنے لیے، اپنی عاقبت کے لیے، اپنی اُس زندگی کے لیے جوابدہی ہوگی۔"

"اری اب بک بک ختم بھی کرے گی یا لگاؤں الٹے ہاتھ کا۔" وہ غصے میں بیٹی کی طرف لپکی۔

"بڑی آئی مجھے سبق پڑھانے والی۔ میں نے تجھے پیدا کیا ہے تُو نے مجھے نہیں جو تو حکم چلائے گی۔ ابھی ایسا چکر چلاؤں گی، ایسی کہانی گھڑوں گی کہ اس محلے کے لوگ تجھ پر تھو تھو کریں گے اور محلے سے نکال باہر کریں گے۔" وہ ہنسی۔

"ہاں تم کر بھی کیا سکتی ہو۔ جھوٹی کہانیاں گھڑنے میں تمہیں بڑی مہارت حاصل ہے۔ دونوں بیٹیوں کے بارے میں تمہارے ذہن نے بڑی ہی تگڑی کہانیاں گھڑی ہیں۔ اماں ایسا نہ ہو کہ لوگ تمہاری کہانی سنانے لگیں۔" اب کی بار اُجالا طنزاً ہنستی گئی۔ دیر تک ہنستی رہی۔

"اب میں تمہارے آگے ہاتھ نہیں جوڑوں گی۔ اب میں...... اپنے رب سے مانگوں گی۔ میں اپنے اللہ سے انصاف مانگوں گی۔ وہ میرا انصاف کرے گا۔"

اُجالا نے ہاتھ لیا دیر تک شاور کے نیچے رہی دل و دماغ میں بھڑکی آگ، جذبات اور احساسات جن پر قابو پانا ناممکن ہو رہا تھا۔ ایسا کرنے سے وہ کچھ ریلیکس ہوئی اور جائے نماز بچھا کر دیر تک محو عبادت رہی جب دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے تو پھر ایسا کچھ سلسلہ چل نکلا کہ اُسے خبر ہی نہ ہوئی کہ وہ کتنی دیر تک اپنے مالک حقیقی سے راز و نیاز کی باتیں کرتی رہی۔

رشیدہ کو نہ جانے ایسا کیا ضروری کام یاد آیا کہ وہ چادر اُٹھا کر دلدار کے گھر کی طرف چل پڑی۔

اُجالا جب نماز اور دعا سے فارغ ہوئی تو ایک مدت کے بعد کلام پاک کو نکالا۔ دیر تک چومتی رہی آنکھوں سے لگائی گئی۔ وہ جیسے جیسے آنکھوں سے لگاتی اُسے ایک عجیب قسم کی ٹھنڈک اور تازگی محسوس ہوتی گئی۔ اُسے لگا جیسے آنکھوں کے راستے ایک نور، ایک روشنی ایک خوشبو کی لہر اس کی روح میں اس کے دل میں اترتی چلی گئی۔ وہ دیر تک کلام پاک کی تلاوت کرتی رہی۔

☆☆☆

"دلدار...... میں...... میں تیرا خون پی جاؤں گی نمک حرام کمینے، دھوکے باز، خبیث تو نے مجھے یہ گُر سکھائے تُو نے مجھے یہ راستہ بتایا اور میں نے ہر طرح سے تجھ پر بھروسہ کیا تو نے ایسی کیا پٹی پڑھائی کہ میں بالکل اندھی ہوگئی۔ میں...... تو...... یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تو مجھ سے ایسا بدلہ لے گا۔ یوں دھوکا دے گا تو نے جب جو مانگا میں نے

تجھے دیا پھر تجھے یہ دھوکا کرنے کی ضرورت کیوں آ گئی رے...... میں کتنی پگلی تھی کہ تجھے...... اپنے ہر بھید سے واقف رکھا......

تجھے اتنی چھوٹ اتنی ڈھیل دی کہ تو نے میرے گھر پر ڈاکہ ڈالا۔ میری جائدادیں، بنگلے گاڑیاں سب...... سب پر دیدے لگائے بیٹھا تھا۔ تو نے اُس روز کن کاغذات پر دستخط لیے تھے مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ تو نے مجھے اتنے اعتماد میں لیا کہ میں شک بھی نہ کر سکی۔" رشیدہ سینہ پیٹ پیٹ کر دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔

دلدار کے وہی مکروہ قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ رشیدہ تڑپ رہی تھی، بلک رہی تھی مگر کچھ حاصل نہ تھا۔ وقت کا پنچھی تو اڑتا رہتا ہے کبھی اس کی پرواز دھیمی ہوتی ہے کبھی تیز کبھی لگتا ہے بھاگ رہا ہے۔ کبھی لگتا ہے رینگ رہا ہے اور ہاں گزرا وقت کبھی لوٹ کر آیا ہے نہ آئے گا۔

رشیدہ نے جب اپنی الماری سے گھر کے جائداد کے کاغذات غائب دیکھے تو اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرک گئی۔ آسمان اس کے سر پر آن گرا اس نے الماری کو اُلٹ پلٹ کر سارا کمرہ بکھیر دیا اور سب کچھ اس طرح چھوڑ کر دلدار کے گھر کی طرف دوڑی۔

اب وہ چیخ رہی تھی الجھ رہی تھی۔ واویلا کر رہی تھی کہ سینہ پیٹ رہی تھی۔ دلدار نے آگے بڑھ کر اس کا منہ بند کیا۔

"زیادہ واویلا، زیادہ کہرام نہ مچا، یہ نیا محلہ ہے اور میں نے سب کو یہ ہی بتایا ہے کہ تو میری پاگل بہن ہے۔ جب پاگل پن کا دورہ پڑتا ہے یونہی چیختی چلاتی ہے تو چیختی رہ یہاں کوئی نہیں آنے کا تیری مدد کرنے۔"

ہاہاہا وہ دیر تک ہنستا رہا۔ رشیدہ نے اُسے نوچا مارا جھنجھوڑ دیا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ دلدار نے اُسے دھکا دے کر گیٹ سے باہر کیا اور گیٹ بند کر دیا۔ رشیدہ چیختی رہی چلاتی رہی گیٹ پیٹتی رہی۔ مگر کسی نے بھی اس کی طرف دھیان نہ دیا۔

مقالات حکمت

☆ روزے پہ زخم آتا ہے۔ روزے پہ رحمت آتی ہے اور ضرور آتی ہے۔ دل جوئی بھی روزے ہی کی ہوتی ہے۔

☆ ہر نماز کے بعد تین مرتبہ پہلا کلمہ پڑھو اور یہ دعا مانگو کہ اے اللہ! یہ کلمہ تیرے پاس میری امانت ہے۔ اور مرنے سے دو منٹ پہلے یہ مجھے لوٹا دینا۔" اللہ کبھی امانت میں خیانت نہیں کرتا۔

☆ کسی کے عیب تلاش کرنے والے کی مثال اُس مکھی کے جیسی ہے جو سارا خوبصورت جسم چھوڑ کر صرف زخم پر بیٹھتی ہے۔

حسنِ انتخاب: رازِ عدن۔ بحرین

"چہ چہ چہ...... ہائے ہائے بے چاری پر پاگل پن کا دورہ پڑا ہے دیکھو تو۔ دروازہ پیٹتے پیٹتے ہلکان ہوگئی ہے۔ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ بیچاری کی کیا مدد کریں۔" لوگ اُسے دیکھتے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے مگر کوئی اس کے قریب نہیں جا رہا تھا۔

وہ روتے روتے ایکدم پلٹی۔ اور تیزی سے سڑک پر دوڑنے لگی۔

بھاگتی گئی بھاگتی گئی اور تیز رفتار ٹریفک کے اس ہجوم میں اچانک کسی گاڑی کے ٹائر چرچرائے، ایک دلخراش چیخ بلند ہوئی اور تارکول کی سیاہ سڑک پر رشیدہ کا سُرخ سُرخ لہو بہتا چلا گیا۔

لوگوں نے دیکھا افسوس کیا پھر اُسے لاوارث قرار دیا گیا۔ یہ کیسا انجام تھا؟ یہ کیسی موت تھی؟ یہ کیسا حادثہ تھا؟ کسی کو خبر نہ تھی۔ رشیدہ...... جس نے زندگی میں کتنی بے حساب دولت کمائی۔ کتنے عیش کی زندگی گزاری کتنا بینک بیلنس جائدادیں بنائیں۔ کیا کچھ نہیں کیا...... مگر...... ہائے وقت!! وقت اپنا کام کر گیا۔

☆☆......☆☆

نگارِ جہاں دراز ہے

سنگلاخ دیواروں کے پیچھے سے جرم کی کوکھ میں پل کر مجرم بننے والوں کی عبرت سامان دل سوز تحریریں جن میں آنسوؤں کی نمی بھی ہے اور سسکتی ہوئی زندگی کے نوحے بھی

آدھی سہاگن



جاوید راہی

کچھ جرم اپنا وجود رکھتے ہوئے بھی الزام کی فہرست سے دست بردار کردیے جاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک جرم، ایک آدھی سہاگن کو مکمل کر گیا تھا

پروفیسر حلیم زبیری نے چائے کی پیالی میز پر رکھی اور کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر دقت دیکھا۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ وہ ایک مقامی کالج میں معاشیات کے پروفیسر تھے۔ ان کی پہلی کلاس ساڑھے آٹھ بجے شروع ہوتی تھی لیکن وہ وقت سے پہلے پہنچنا پسند کرتے تھے۔ آج ان کی طبیعت بوجھل سی تھی شائد موسم تبدیل ہونے کا اثر تھا۔

''ناہید!'' انہوں نے زور سے اپنی بیوی کو آواز دی۔

ناہید بھاگتی ہوئی باورچی خانے سے آئی۔ خشک ہوا نے اس کے رخساروں کو دہکا دیا تھا۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی لیکن وہ تیس پینتیس سال سے زائد نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے کسے کسے جسم میں اب بھی جوانی کی چستی موجود تھی اور پروفیسر حلیم عمر میں چار سال کم ہونے کے باوجود اس سے دس سال بڑے نظر آتے تھے۔

''تیار ہوگئے جناب!'' ناہید نے شوخی سے کہا۔ اس کا موڈ بے حد خوشگوار نظر آرہا تھا۔

''ہاں بھئی۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''اگر کچھ منگوانا ہو تو بتادو' واپسی پر لیتا آؤں گا۔''

''جی ہاں بہت کچھ منگوانا ہے' پروفیسر صاحب! آپ کو یاد نہیں؟ نیا مہینہ شروع ہوگیا ہے۔ میں نے سامان کی فہرست بنا رکھی ہے بس آپ فہرست کے مطابق چیزیں خرید کرلائیں لیکن ترتیب کے ساتھ ورنہ آپ پھر کچھ بھول جائیں گے۔''

ناہید کے لہجے میں شوخی برقرار تھی وہ پلٹی اور خواب گاہ میں چلی گئی۔ اس سے گفتگو کے دوران میں وہ بہت غور سے اس کا جائزہ لیتے رہے تھے۔ اور آج پھر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ انہوں نے ناہید سے شادی کرکے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔

وہ قدامت پسند خاندان کے ایک فرد تھے خود بھی قدامت پسند تھے اور آج بھی انہیں اس کلیے پر پورا یقین تھا کہ محبت کی شادیاں کبھی کامیاب نہیں ہوتیں حالانکہ ان کی اپنی مثال اس کلیے کی واضح اور ٹھوس تردید تھی لیکن معاشیات پڑھاتے پڑھاتے وہ خود بھی ہر کلیے میں استثنٰی پر دل سے یقین کرنے لگے تھے اور اپنی شادی ان کے نزدیک ایک استثنٰی ہی تھی۔

انہوں نے ناہید سے شادی کرکے کسی غلطی کا ارتکاب نہیں کیا تھا۔ وہ صرف تعلیم یافتہ ہی نہیں تھی

بلکہ گھر چلانا بھی جانتی تھی۔ محبت کا ایک پرسکون سمندر تھی جس کے وجود میں وہ ڈوبتے چلے جاتے تھے۔ جوانی میں اس سمند کی بپھری ہوئی تیز و تند لہروں میں ان کا وجود ایک حقیر تنکے کی طرح بہہ گیا تھا۔ جب انہوں نے معاشیات میں ایم اے کر کے لیکچرار کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی تھی اور ناہید وہاں پہلے سے انگریزی کی لیکچرار تھی۔ شکل و صورت کے اعتبار سے وہ بس معمولی تھی لیکن اس کے وجود میں محبت کے کئی سمندر پوشیدہ تھے۔ جو انہیں دیکھتے ہی بپھر گئے۔ اس کی شخصیت میں بلا کی کشش تھی، گفتگو کرتی تو کوئی بھی یہ اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ اس لڑکی میں جذباتی طوفان مقید ہیں جنہیں وہ کبھی بے لگام نہیں ہونے دیتی۔ اس زمانے میں وہ نوآموز تھے۔ ان کے خیالات بہت بلند تھے۔ اپنے پیشے کو وہ بے حد مقدس تصور کرتے تھے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ قدامت پسند خیالات رکھتے تھے۔

ایک شادی شدہ عورت سے عشق لڑانے کا تصور ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ لیکن ایک سال بعد ہی انہیں ناہید سے شادی کرنی پڑ گئی۔ ناہید کے بے پناہ عشق نے انہیں موم کی طرح پگھلا دیا۔ انہیں پہلی بار عورت کے دیوانہ وار محبت کے بے خود کر دینے والے پرکیف سرور کا تجربہ ہوا تھا۔ محبت کا خمار ایسا چڑھا کہ کچھ اور دکھائی نہیں دیا۔ ناہید کے عشق کا نشہ ان کی رگوں میں ایسا اُترا کہ وہ اپنے وجود کو فراموش کر بیٹھے۔ ناہید نے اپنے شوہر سے طلاق لے کر ان سے شادی کر لی۔

اس شادی پر خاندان بھر میں کہرام مچ گیا۔ انہونی بات ہو گئی تھی۔ پہلے کبھی کسی نے ایسی سرکشی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ خاندانی رسم و رواج جو غیر تحریری قانون کا درجہ رکھتے تھے کبھی اس طرح باغیانہ انداز میں نہیں توڑے گئے تھے۔ والدین بچپن ہی میں داغِ مفارقت دے چکے تھے۔ ان کی شادی میں ان کے تین بھائیوں نے بھی شرکت نہیں کی۔ انہیں اس کا قلق ضرور ہوا لیکن وہ تو ہوشمندی کے چند لمحات تھے جو



بہت گئے۔ ناہید نے انہیں اپنے دل میں سمیٹ لیا اور انہیں پہلی بار اس کی وسعتوں کا علم ہوا۔ وہ ایک بہت بڑا مندر تھا جس میں صرف ایک دیوتا کا بت نصب تھا اور وہ اس کی واحد پجارن تھی۔

"یہ لیجیے جناب! یہ رہی فہرست، یہ رہے پیسے اور ہاں!۔۔۔۔۔۔ خالد کا کل خط آیا تھا، میں آپ کو بتانا بھول گئی تھی۔" ناہید نے واپس آتے ہوئے کہا۔ پروفیسر صاحب نے فہرست اور پیسے احتیاط سے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیے۔

"خالد کا؟" انہوں نے لفافے میں سے خط نکالتے ہوئے کہا پھر کچھ سوچ کر اسے واپس رکھ لیا۔

"کوئی خاص بات لکھی ہے اس میں؟"

"کچھ نہیں بس خیریت اور پڑھائی کا ذکر کیا ہے۔"

"میں اسے اطمینان سے کالج میں پڑھوں گا۔" انہوں نے بڑی احتیاط سے خط کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

خالد ان کی واحد اولاد تھا جس سے وہ دونوں ہی بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ناہید نے ایک مثالی ماں اور انہوں نے ایک فرض شناس باپ کی طرح اس کی پرورش کی تھی جس کا لازمی نتیجہ ایک ایسی ہی ہونہار اولاد کی صورت میں ملا جس پر دنیا کے تمام والدین فخر کرتے تھے۔ دو سال سے وہ امریکہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ہر سمیسٹر امتیازی درجے میں پاس کر رہا تھا۔ وہ بڑی پابندی سے ہر ہفتے گھر خط لکھتا تھا۔ خالد کا ہنستا مسکراتا چہرہ نظروں کے سامنے آتے ہی ان کے ہونٹوں پر ایک آسودہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ طبیعت کا بوجھل پن اچانک دور ہو گیا اور خود کو ہشاش بشاش محسوس کرنے لگے۔ بے خیالی میں وہ اپنی بیوی کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھے اور جب انہیں وہاں حیاء کی سرخی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی تو وہ بے اختیار مسکرا دیے۔ ناہید اب بھی کبھی کبھی نوجوان لڑکیوں کی طرح شرما جاتی تھی۔

"کیا بات ہے آج بہت خوش نظر آ رہی ہو؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"خوشی کی بات ہی ہے شہناز جو آ رہی ہے۔"

"شہناز؟ اچھا تمہاری بہن؟ کب آ رہی ہے وہ؟" انہوں نے کچھ تعجب سے دریافت کیا۔ کیونکہ اس مرتبہ شہناز تقریباً پانچ سال بعد کراچی آ رہی تھی۔

"میرے خدا!" ناہید نے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "آپ کا اثر آتا جا رہا ہے مجھ میں آپ کو یہ بتانا بھول ہی گئی کہ شہناز آج تیز گام پر آ رہی ہے کل شام اس کا فون آیا تھا پتہ نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے مجھے۔"

"اوہ! تیز گام کب آتی ہے؟"

"گیارہ بجے۔"

"ہاں آپ ایسا کریں کہ شام کو واپسی پر کچھ مٹھائی وغیرہ لیتے آئیے گا، میں ابھی مارکیٹ سے کھانا پکانے کا سامان لے آتی ہوں۔ اوہ اتنے کام کرنے ہیں آج۔"

"اور کون آ رہا ہے اس کے ساتھ؟"

"کون آئے گا بیچاری کے ساتھ۔ پہلے تو رضوی صاحب آ جاتے تھے لیکن ان کے انتقال کے بعد تو تنہا رہ گئی ہے بیچاری، بال بچہ بھی کوئی نہیں کہ راستے میں دوڑ کر اسٹیشن سے کوئی چیز لا دے۔"

"تو کیا میں اسے اسٹیشن پر سے لینے جاؤں؟"

"نہیں میں چلی جاؤں گی۔ آج گاڑی یہیں چھوڑ جائیں ٹیکسی وغیرہ تلاش کرنے میں بڑی پریشانی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے تم گاڑی لے جانا میں ٹیکسی پر چلا جاؤں گا۔"

"بس تو اب آپ دیر نہ کریں۔ ٹیکسی تلاش کرنے میں بھی وقت لگے گا آپ کو۔"

پروفیسر حلیم زبیری جب گھر سے نکلے تو بہت گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انہیں گھر سے نکلتے ہی ایک خالی ٹیکسی مل گئی اور وہ ڈرائیور کو کالج کا پتا بتانے کے بعد نشست سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئے۔ بھولی بسری یادوں نے ان پر یلغار کر دی۔ شرمناک یادیں۔ گناہوں میں لتھڑی ہوئی راتیں جنہیں وہ کبھی فراموش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ جب کبھی شہناز کی آمد کی اطلاع ملتی ان یادوں کے

عزیمت ذہن کے تاریک گوشوں سے نکل کر ان پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ یہ کیفیت یکطرفہ نہیں تھی۔ شہناز بھی کبھی احساسِ گناہ سے نجات نہیں پا سکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اتنی دور سے آنے کے باوجود' اتنا طویل سفر طے کرنے کے بعد بھی وہ کبھی آٹھ دس روز سے زیادہ ان کے گھر قیام نہیں کرتی تھی۔

اس مختصر وقفے میں وہ جب بھی ان کے سامنے آتی ان کی نظریں گناہوں کے بوجھ سے جھکی رہتی تھیں۔ اگر اسے اپنی بڑی بہن سے شدید محبت نہ ہوتی تو شاید وہ کبھی دوبارہ ان کے گھر میں قدم نہ رکھتی۔ دونوں بہنیں ایک دوسرے پر جان چھڑکتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جب ناہید اسکول میں زیر تعلیم تھی تو ان کے والد وفات پا گئے۔ پھر جب اس نے اپنی تعلیم مکمل کی تو ان کی ماں اس دنیا سے رخصت ہو گئیں جیسے انہیں بس اسی کا انتظار تھا۔ ناہید نے اسکول میں ملازمت کر کے چھوٹی بہن کو اولاد کی طرح پالا تھا۔ ایک خالہ کے سوا ان کا دنیا میں کوئی عزیز نہیں تھا۔ احساسِ تنہائی اجنبیوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیتا ہے۔ ماں تو نہیں تھیں پھر جب ان کی خالہ نے ناہید کی شادی زبردستی کر دی تو وہ شہناز کو ان کے سپرد کر کے اپنے شوہر کے ساتھ کراچی آ گئی جہاں کچھ عرصے بعد انہیں کالج میں لیکچرار شپ مل گئی۔

وہ رات جس نے اکیس برس پہلے انہیں گناہوں کی دلدل میں دھکیلا تھا آج بھی ان کے ذہن میں اسی طرح تازہ تھی جیسے کل ہی کی بات ہو۔ اس رات کے بعد ایسی ہی شرمناک راتیں اور بھی آئیں لیکن وہ سب ایک ہی زنجیر کی کڑیاں تھیں۔ نئی کڑیاں بنتی گئیں' زنجیر دراز ہوتی گئی اور پھر اس زنجیر نے انہیں اس بری طرح جکڑا کہ ان کی روح گھائل ہو گئی' ان کا چہرہ داغدار ہو گیا۔ اکیس سال گزرنے کے باوجود وہ اس کی ایک کڑی بھی توڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ آج بھی جب انہیں وہ رات یاد آتی تھی تو ان کا سر ندامت سے خود بخود جھک جاتا تھا۔ تاسف اور پشیمانی کے جذبات قطرے بن کر ان کی پیشانی سے پھوٹنے لگتے تھے۔ جوانی کے ان منہ زور جذبات نے ایسا گھاؤ

میں اتنا ہی کر سکتا ہوں

ایک بوڑھے کسان نے اپنے بے گناہ بیٹے کو جیل میں خط لکھا۔

"پیارے بیٹے! میں اس سال آلو کی فصل نہیں بو سکتا۔ مجھ سے کھیت میں کھدائی نہیں ہوتی۔ کاش تم میری مدد کر سکتے۔" بیٹے نے جواب دیا۔

"بابا کھیت نہ کھودنا میں نے وہاں اسلحہ چھپایا ہوا ہے۔"

اگلے دن پولیس نے سارے کھیت کی کھدائی کر ڈالی لیکن انہیں کچھ نہ ملا۔ بیٹے نے پھر باپ کو خط لکھا۔

"بابا اب آپ آلو کی فصل بو سکتے ہیں۔ میں آپ کے لیے اتنا ہی کر سکتا تھا۔"

مراسلہ: ملک علی رضا۔ فیصل آباد

لگایا کہ ناسور بن کر رہ گیا۔

یہ اس زمانے کی بات تھی جب ان کی شادی کو دو سال سے زائد عرصہ گزر گیا تھا اور ناہید کو بانجھ ہونے کا طعنہ دیا جانے لگا جس نے اس کی نیندیں حرام کر دیں۔ پھر جب بھائیوں نے کھلم کھلا انہیں دوسری شادی کا مشورہ دینا شروع کر دیا تو ناہید کو چپ لگ گئی اور یہی غم اسے اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹنے لگا۔ وہ بیمار ہو گئی اور ایسی بیمار ہوئی کہ گھر چوپٹ ہو گیا۔ اس نے گھبرا کے لاہور سے اپنی چھوٹی بہن شہناز کو بلوا لیا جو اس وقت کالج میں زیرِ تعلیم تھی۔ شہناز نے آتے ہی بڑی ہوشیاری سے گھر سنبھال لیا اور بڑی جانفشانی سے اپنی بہن کی تیمارداری میں لگ گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ خود انہیں بھی اولاد کی تمنا تھی لیکن ناہید کی دل آزاری کے خیال نے کبھی انہیں اس تمنا کا اظہار نہیں کرنے دیا تھا۔ وہ اس کی بے پناہ چاہت کو دیکھتے ہوئے دوسری شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ پھر جب انہوں نے ناہید پر طعنوں کا اتنا شدید ردعمل دیکھا تو ہمیشہ کے لئے اولاد کی خواہش دل سے نکال دی۔ جس اولاد کا ابھی کوئی وجود نہیں تھا اس پر وہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



اپنی بیوی کی صحت کو بہر حال ترجیح دیتے تھے۔

اس رات سے پہلے انہوں نے کبھی شہناز کو نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو ان کی نظر میں ناہید کی صرف چھوٹی بہن تھی۔ پھر نجانے کیا ہوا کہ ایک رات اچانک ان پر ایک نسوانی وجود آ گرا۔

تاریکی میں اس سائے کے وزن ہی سے انہیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ لرزتا ہوا، کانپتا ہوا، نسوانی بدن ان کی بیوی کا نہیں ان کی سالی کا ہے۔ تاہم اس وقت انہیں شہناز کی بے باکی اور بے حیائی پر بھی کوئی تعجب نہیں ہوا۔ ان کی حالت تپتے ہوئے لق و دق صحرا کے اس مسافر جیسی تھی جس کی زبان پیاس کی شدت سے سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہو اور یکدم اسے دور کہیں ٹھنڈے پانی کا چشمہ ابلتا ہوا نظر آ جائے وہ زادِ راہ پھینک کر بے تحاشہ اس چشمے کی طرف دوڑ پڑے۔ ان کے اندر کا وحشی مرد بیدار ہو گیا جو کسی قانون کا پابند نہیں ہوتا۔ اخلاقی قدریں، مذہبی بندشیں اور احساسِ گناہ ان کے ذہن سے محو ہو گئے۔

بپھرتا ہوا جذبات کا طوفان گذر گیا۔ شہناز جس خاموشی سے آئی تھی اسی طرح واپس چلی گئی اور وہ تمام رات اس واردات پر غور کرتے رہے جو کچھ ہوا تھا غلط ہوا تھا۔ ایک کمزور لمحے نے انہیں دغا دار کر دیا تھا۔ وہ خود کو بے حد حقیر محسوس کر رہے تھے۔ اگر انسان بھی نفس کا غلام بن جائے تو اسے کیا چیز جانوروں سے ممتاز کرے گی؟ اب انہیں شہناز پر تعجب ہو رہا تھا وہ سیدھی سادھی لڑکی ایسی نظر نہیں آتی تھی جو جذبات کے دھارے میں اس طرح حقیر تنکے کی طرح بہہ جائے لیکن انہیں اس بات کا ضرور احساس ہوا تھا کہ اس کا ضمیر آخیر وقت تک اس سے برسرِ پیکار رہا تھا اور جذبات کے تیز دھارے ان کے وجود کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لیے جا رہے تھے۔ طوفان گزرنے کے بعد ان کے چہرے پر دو گرم آنسو بھی ٹپکے تھے۔ ندامت اور پشیمانی کے آنسو، پھر جب وہ واپس جا رہی تھی تو اس کا سر مجرموں کے سے انداز میں جھکا ہوا تھا۔

خود وہ بھی اپنے آپ کو مجرم محسوس کر رہے تھے صبح وہ ایک بار بھی اپنی بیوی سے نظریں نہیں ملا سکے۔ ندامت اور پشیمانی کے جذبات ان پر غالب تھے۔ جب بھی ناہید مسکرا کر ان کی طرف دیکھتی وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتے۔ انہیں ایسا معلوم ہوتا جیسے ناہید نے ان کی چوری پکڑ لی ہو اور شہناز بھی ان کے سائے سے کترا رہی تھی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی بہن سے نظریں چرا رہی تھی۔ اس روز انہیں شدید گھٹن کا احساس ہوا۔ وہ جلدی سے ایک کپ چائے پی کر کالج چلے گئے۔ اس رات جب وہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں آئے تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ پچھلی شب کے واقعات کسی متحرک فلم کی طرح ان کی نظروں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ نرم و گداز بستر میں کانٹے ابھر آئے تھے۔ وہ کروٹیں بدلتے رہے، ان کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں لیکن ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں پھر نہ جانے کب ایک مرتبہ جب انہوں نے کروٹ بدلی تو انہیں اپنی گردن پر گرم گرم سانسوں کی سرسراہٹ محسوس ہوئی اور دوسرے ہی لمحے ان پر خود فراموشی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔

یہ سلسلہ شہناز کی واپسی تک جاری رہا۔ ہر شب لذتوں کا پیغام لاتی اور صبح ندامت و پشیمانی کا باعث بنتی۔ ناہید کی صحت یابی پر وہ واپس گھر چلی گئی لیکن اس کے بعد بھی وہ مہینوں ناہید سے نگاہیں ملا کے بات نہیں کر سکے۔ کئی سال بعد جب شہناز کی شادی ہوئی تو نہ جانے انہوں نے کیوں بڑا سکون محسوس کیا جیسے ان کے سر پر سے کوئی بوجھ اتر گیا ہو۔ شادی کے بعد جب وہ پہلی بار کراچی آئی تو بہت گھبرائی ہوئی سی نظر آ رہی تھی غالباً وہ ان کی طرف سے وسوسوں کا شکار تھی۔ اگر اسے اپنی بڑی بہن سے اتنی محبت نہ ہوتی تو شائد کبھی دوبارہ ان کے گھر میں قدم نہ رکھتی۔ وہ اس احمق لڑکی کے اندیشوں پر دل ہی دل میں مسکرائے تھے۔ انہوں نے جلد ہی اپنے طرزِ عمل اور ذو معنی فقروں سے اس کا خوف دور کر دیا تھا۔ اس کے باوجود شہناز جب بھی کراچی آتی تھی کبھی آٹھ دس روز سے زیادہ قیام نہیں کرتی تھی۔

ایک سال بعد شہناز کراچی آتی تھی۔ دوسرے سال ناہید خالد کے ساتھ گرمیوں کی تعطیلات گزارنے پنڈی چلی جاتی تھی کبھی کبھار وہ خود بھی اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ ہو لیتے تھے لیکن یہ سلسلہ تین سال قبل شہناز کے شوہر رضوی صاحب کی وفات کے ساتھ منقطع ہو گیا تھا۔ وہ خود بھی ناہید اور خالد کے ساتھ تعزیت کے لئے پنڈی گئے تھے اور انہیں اس بیچاری پر بہت ترس آیا تھا۔ وہ سوچنے لگے کہ اس غریب کے تو کوئی اولاد بھی نہیں، آخر کس طرح یہ پہاڑ جیسی زندگی کاٹے گی؟ یہی سوچ کر انہوں نے ناہید سے یہ کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی بہن کو اپنے ساتھ کراچی لے چلے خالد کے امریکہ جانے کے بعد ممکن ہے وہ خود بھی تنہائی محسوس کرے اس لئے دونوں کا دل لگ جائے گا۔ رضوی کے انتقال کے بعد ان دونوں کا اس دنیا میں کوئی قریبی عزیز نہیں تھا۔ لیکن ناہید نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ شہناز اس پر کبھی تیار نہیں ہو گی۔ وہ اپنی بہن کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھی۔

پروفیسر حلیم زبیری ٹیکسی ڈرائیور کی آواز سن کر چونک گئے۔ ان کا کالج آ گیا تھا۔ انہوں نے جلدی سے کرائے کے پیسے ادا کئے اور ٹیکسی سے اتر گئے۔ کالج میں ان کا شمار سینئر اساتذہ میں کیا جاتا تھا۔ طالبعلموں کے علاوہ دوسرے اساتذہ بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ اس روز انہیں گم صم دیکھ کر کئی ہمعصروں نے بڑی ہمدردی سے ان کی خیریت دریافت کی۔ کچھ دیر بعد پرنسپل نے انہیں کسی کام سے اپنے دفتر طلب کیا۔ انہوں نے غور سے انہیں دیکھا

"کیا بات ہے؟ زبیری صاحب، طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟"

"میں بالکل تندرست ہوں جناب۔" پروفیسر صاحب نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں زبیری صاحب!" انہوں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "آج آپ ست نظر آ رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہے آپ بہت فرض شناس ہیں لیکن جب انسان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوتی تو وہ اپنے فرائض ٹھیک طرح سے انجام نہیں دے سکتا۔ اس کالج اور طلباء کو آپ کی ضرورت ہے اپنی صحت کا خیال رکھنا آپ پر فرض ہے۔ اب آپ گھر تشریف لے جائیں اور اس وقت تک آرام کریں جب تک آپ خود کو ہشاش بشاش محسوس نہ کریں۔ جائیں یہ میرا حکم ہے۔"

اور انہیں حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔

انہوں نے بڑی عجلت میں بازار سے خریداری کی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر وہ جلد گھر پہنچ گئے تو دوپہر کے کھانے میں دونوں بہنوں کے ساتھ شریک ہو جائیں گے۔ جب وہ خورد و نوش کے سامان سے لدے پھندے گھر میں داخل ہوئے تو انہیں شہناز کی آواز سنائی دی جو غصے کے عالم میں کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ ٹھٹھک گئے۔ یہ تو ظاہر تھا کہ شہناز کی مخاطب اس کی بڑی بہن کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ لیکن انہوں نے پہلے کبھی شہناز کو بڑی بہن کے سامنے آواز بلند کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور خاص طور پر آج جب کہ وہ چند گھنٹے قبل آئی تھی۔ اس طرح بڑی بہن سے لڑنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

"چیخو مت شہناز۔" انہیں اپنی بیوی کی آواز سنائی دی۔ "میں تمہاری کیفیت سمجھ رہی ہوں۔ تنہائی بہت بری چیز ہے بہن، تم پھر کمزور اعصاب کی عورت ہو تین سال کی تنہائی نے تمہارا ذہنی توازن بگاڑ دیا ہے۔"

"میرا ذہنی توازن تو اسی روز بگڑ گیا تھا جب میں نے تمہاری محبت میں اندھی ہو کر اپنا سب کچھ تم پر قربان کر دیا تھا۔"

"ہوش میں آؤ شہناز، جو کچھ ہو گیا اب اسے دہرانے سے کیا فائدہ۔"

"میں دہراؤں گی، ضرور دہراؤں گی، میں ساری دنیا کو سناؤں گی۔ میں دولہا بھائی کو بھی تمہارے کرتوت بتاؤں گی، انہیں بھی تو پتہ چلے کہ ان کی فرشتہ خصلت بیوی اندر سے کیا ہے۔"

"شہناز!" ناہید نے سخت لہجے میں کہا۔ "خبردار جو تم نے اپنے دولہا بھائی سے کچھ کہا۔"

پروفیسر صاحب نے احتیاط سے خورد و نوش کا سامان فرش پر رکھ دیا اور اپنی پوری توجہ ان کی گفتگو پر

مرکوز کردی۔

"اپنی نیک نامی تو تمہیں اتنی عزیز ہے باجی لیکن تمہیں کبھی اپنی بہن کی پاکدامنی کا خیال نہیں آیا۔ اپنے مستقبل پر چھوٹی بہن کی عصمت کا سودا کرتے ہوئے تمہیں اپنی پارسائی کا بھی خیال نہیں؟ اپنی مسرتوں سے میری پاکدامنی کا سودا کرتے ہوئے تم نے کوئی جھجک محسوس نہیں کی؟ کون یقین کرے گا باجی کہ مجھ بد نصیب کو سہاگ رات گناہوں کے اندھیروں میں اس طرح دبے پاؤں آئی کہ خود مجھے بھی اس کی چاپ سنائی نہیں دی۔ نہ شہنائیاں بجیں نہ مہندی لگی، نہ میں نے سرخ جوڑا پہنا، میری مانگ اُجڑی ہوئی تھی، کسی نے میرے بال نہیں سنوارے نہ کسی نے میرا گھونگھٹ اُٹھایا۔۔۔۔ وہ میری سہاگ رات تھی باجی۔۔۔"

"بس کرو شہناز خدا کے لئے چپ ہو جاؤ۔"

پروفیسر حلیم زبیری کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا، ٹانگیں بے جان ہو گئیں، بدن برف کی طرح ٹھنڈا ہو گیا انہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"میں اپنی زبان کاٹ دوں گی باجی۔ بس مجھے میرا بچہ واپس دے دو۔ زندہ رہنے کے لئے ایک اُمید دے دو باجی، میرا کون ہے اس دنیا میں۔ تمہارا کیا بگڑے گا۔ اب کوئی تمہیں طعنہ نہیں دے گا۔ اب اس عمر میں دولہا بھائی شادی نہیں کریں گے۔ وہ آج بھی تم سے محبت کرتے ہیں۔ وہ آج بھی تمہارے پاس ہیں، میرا کون ہے میں بالکل تنہا ہوں، مجھ پر ترس کھاؤ باجی میرا بچہ مجھے واپس دے دو۔ دیکھو تمہاری چھوٹی بہن اپنا دامن پھیلائے کھڑی ہے" شہناز کی آواز حلق میں رندھ گئی۔

"طعنے؟ دوسری شادی؟ میرا بچہ؟ لیکن شہناز کے تو کبھی کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی۔ یہ سب کیا ہے۔؟" پروفیسر صاحب کا سر چکرانے لگا۔

"یہ ناممکن ہے شہناز! ماضی کو بدلا نہیں جا سکتا۔ ذرا سنجیدگی سے غور کرو اگر تمہاری یہ بچکانہ خواہش پوری کر دی جائے تو اس کے کیا نتائج برآمد ہوں گے؟"

"میں کچھ نہیں جانتی باجی مجھے میرا بچہ چاہیے، میں تم سے اپنا خون مانگتی ہوں اپنا لخت جگر مانگتی ہوں۔"

"پاگل مت بنو شہناز، ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو۔۔۔ ابھی کسی کو اس راز کا علم نہیں ہے کہ خالد میری نہیں تمہاری کوکھ سے پیدا ہوا ہے۔۔۔۔"

اس انکشاف نے پروفیسر حلیم زبیری پر سکتہ طاری کر دیا۔ چند لمحوں کے لئے ان کے حواس معطل ہو گئے، ہر شے ساکت ہو گئی۔۔۔ پھر حرکت کے پہلے احساس کے ساتھ ان کے ذہن میں خیالوں کی آندھیاں چلنے لگیں۔ گرہیں کھلتی گئیں، کڑیوں سے کڑیاں ملتی گئیں، بہت سے بھید کھل گئے، کئی گتھیاں سلجھ گئیں، ناہید کی پراسرار بیماری کا عقدہ کھل گیا۔

انہیں اولاد کی خواہش ضرور تھی لیکن ناہید کی دل آزاری کے خیال سے انہوں نے کبھی اس تمنا کا اظہار نہیں کیا تھا۔ پھر جب ناہید کو بانجھ ہونے کے طعنے ملے اور انہیں دوسری شادی کے مشورے دیئے جانے لگے تو وہ گھبرا گئی۔ اس صورتحال سے نمٹنے کے لئے اس نے ایک شرمناک منصوبہ تیار کیا جس پر عملدرآمد کرتے ہوئے وہ بیمار ہو گئی اور ایسی بیمار ہوئی کہ گھر کی دیکھ بھال کے لئے لاہور سے اپنی چھوٹی بہن شہناز کو بلانا پڑ گیا۔ کبھی اس کی بیماری پر ڈرامے تک کا شبہ نہیں ہوا۔ وہ ذہین تھی اور مردوں کے فطری تقاضوں کا پورا ادراک تھا۔ اس لئے اس نے بیمار ہوتے ہی علیحدہ کمرے میں سونا شروع کر دیا۔ جب اسے لوہے کے سرخ ہونے کا یقین ہو گیا تو اس نے ٹھیک وقت پر چوٹ لگائی اور اس کی چوٹ کارگر ثابت ہوئی۔

اس نے شہناز کی عصمت اور پاکدامنی کو اپنی محبت اور مستقبل کی خاطر داؤ پر لگایا اور وہ جیت گئی۔ ان کا آہنی کردار جذبات کی حدت میں موم کی طرح پگھل گیا۔ اس رات طوفان گزرنے کے بعد ان کے چہرے پر دو گرم آنسو ٹپکے تھے۔ وہ لٹی ہوئی عصمت اور دوشیزہ کے آبدار گوہر تھے۔ وہ آرزوں اور تمناؤں کا خون تھا، وہ بد نصیبی اور بربادیوں کے پیامبر تھے۔ جنہیں وہ ندامت اور پشیمانی کے آنسو سمجھ بیٹھے تھے۔ پھر جب ان کی بیوی کو یقین ہو گیا کہ زرخیز زمین پر

پڑنے والا پہلا بچہ ہی بانجھ ثابت ہو گا تو اس نے شہناز کو واپس بھیج دیا۔ اپنے امید سے ہونے کی خبر سنائی اور چند ماہ بعد خود بھی اس بہانے لاہور اپنے میکے چلی گئی کہ وہاں اس کی بخوبی نگہداشت ہو سکے گی۔ پہلے بچے کی پیدائش بڑا نازک معاملہ ہوتا ہے اور یہاں اس کی دیکھ بھال کرنے اور صحیح مشورہ دینے والا کوئی نہیں ہے۔ ناہید کا استدلال بہت مضبوط تھا۔ انہوں نے اسے اپنے میکے جانے کی اجازت دے دی۔

جب واپس آئی تو اس کی گود بھری ہوئی تھی۔ معترضین اور مخالفین کی زبانیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔ وہ خالد سے بے پناہ محبت کرتی۔ اس کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ جایا کرتی تھی ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے کسی کو یہ شک بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ خالد کی حقیقی ماں نہیں ہے۔ اس نے ایک مثالی ماں کی طرح خالد کی پرورش کی تھی۔

''ذرا سوچو شہناز! جب خالد کو اس راز کا علم ہو گا تو اس کی کیا حالت ہو گی؟'' ناہید کہہ رہی تھی۔

''وہ اب بچہ نہیں ہے جوان ہے' سمجھدار ہے اور تمہاری طرح بے حد حساس بھی ہے۔ تم کس منہ سے کہو گی کہ وہ تمہاری ناجائز اولاد ہے؟ اور جب دنیا پر یہ راز کھلے گا اور خالد کے منہ پر اسے حرامی کہیں گے تو کیا وہ تم سے شدید قسم کی نفرت نہیں کرنے لگے گا؟ پھر تمہارے دولہا بھائی۔۔۔ وہ کیا سوچیں گے۔ ان پر اس انکشاف کا کیا ردعمل ہو گا؟ ان کی نظروں میں میری کیا وقعت رہ جائے گی! کیا اس کے بعد میں زندہ رہ سکوں گی؟ کیسی جگ ہنسائی ہو گی۔ ہم میں سے کوئی بھی دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ دنیا ہم سے نفرت کرے گی۔ لوگ ہمارے سائے سے بھی بچیں گے۔ تم کیوں اتنی ساری زندگیوں سے کھیلنا چاہتی ہو شہناز؟ تین سال کی تنہائی نے تمہیں پاگل کر دیا ہے۔ عقل سے کام لو' ٹھنڈے دل سے غور کرو' تم تعلیم یافتہ ہو' میں نے صورتحال تمہارے سامنے رکھ دی ہے۔ زندہ رہنے کے لئے حقائق کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی سوچو شہناز کہ اگر تمہاری خواہش پوری بھی ہو جائے

وعدہ

دل میں جب بے قراری کا ظہور ہوتا ہے
جانے کیوں بندہ ہر شے سے دور ہوتا ہے
تم نے وعدہ کیا تھا مل جاؤ گے عید کے روز
ہر برس کی طرح اس بار بھی دیکھیے
کب وعدہ یہ پورا حضور ہوتا ہے

شاعر: سعادت علی خان۔ لیہ

تب بھی تم خالد کو نہیں پا سکو گی۔ وہ بہت حساس اور جذباتی لڑکا ہے کہیں خودکشی نہ کر بیٹھے۔۔۔۔''

''خدا۔۔۔۔۔ اوہ میرے خدا۔۔۔ آخر کب تک مجھے ایک لغزش کی سزا ملے گی۔ تو کب تک سزا دیتا رہے گا۔ اٹھارہ سال اولاد کے لئے تڑپتی رہی کیا یہ سزا میرے لئے کافی نہیں؟ میرا شوہر مجھ سے چھین کر مجھے زندہ درگور کرا دیا گیا۔ کیا یہ سزا میرے لئے کافی نہیں تھی۔۔۔؟ تنہائی کا یہ عذاب کب تک جاری رہے گا؟ مجھے موت کیوں نہیں آ جاتی۔۔۔ مجھے موت دے دے خدایا۔۔۔۔۔'' شہناز جذباتی انداز میں بری طرح چیخ رہی تھی۔

''شہناز! شہناز! ہوش میں آؤ' پاگل نہ بنو شہناز! یہاں لیٹ جاؤ' ٹھہرو میں تمہارے لئے پانی لاتی ہوں۔۔۔۔۔''

ناہید بڑی تیزی سے کمرے سے باہر آئی۔ فرش پر رکھے ہوئے خورد نوش کے سامان پر نظر پڑتے ہی اس کے قدم زمین پر گڑ گئے اس نے آہستہ آہستہ چہرہ اوپر اٹھایا۔ اپنے شوہر کو دیکھا اس کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھیل گئیں۔ اس کا منہ چیخنے والے انداز میں کھلا لیکن حلق سے آواز نہیں نکلی۔ اس کی قوت گویائی سلب ہو گئی تھی' چند لمحوں کے لئے جیسے وقت کی گردش رک گئی۔۔۔۔۔۔ پھر ناہید کے حلق سے ایک گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی اور وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر قریبی کمرے میں گھس گئی۔

وہ بہت دیر تک اسی طرح ساکت کھڑے اپنی

بیوی کی گھٹی گھٹی چیخیں اور دبی دبی سسکیوں کی آوازیں سنتے رہے۔ عورت کے دل کی وسعتوں کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا اس کی محبتوں کی تہہ پانا ناممکن ہے۔ انہوں نے سوچا اور پھر ایک گہرا سانس لیا۔ ان کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ بوجھل قدموں سے اس کمرے میں داخل ہوئے جہاں ناہید بستر پر پڑی تکیے میں منہ چھپائے ہچکیاں لے رہی تھی۔

شام کے وقت چائے کی میز پر پروفیسر صاحب کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ناہید سر جھکائے خاموش ان کے سامنے بیٹھی تھی۔ ان کا چہرہ سوگوار اور آنکھیں بہت زیادہ رونے کی وجہ سے سوجی ہوئی تھیں۔ پروفیسر کبھی کبھی نظریں اُٹھا کر اپنی بیوی کو دیکھ لیتے تھے۔ ان کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ اس سے کچھ پوچھنا چاہتے ہوں لیکن حوصلہ نہ پڑ رہا ہو۔

''تو شہناز چلی گئی!'' کچھ دیر بعد انہوں نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔ وہ اب بھی کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ناہید نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تمہارے خیال میں وہ اب کبھی نہیں آئے گی؟''

ناہید نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں سر ہلایا اور کمرے پر خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں ڈوب گئے۔

کچھ دیر بعد پروفیسر صاحب نے سر اُٹھا کر غور سے سامنے بیٹھی ہوئی ناہید کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں اب بھی غیر یقینی کیفیت موجود تھی۔ چند لمحے وہ اسی طرح اپنی بیوی کو دیکھتے ہوئے کچھ سوچتے رہے پھر ایکدم وہ کسی فیصلے پر پہنچ گئے۔ انہوں نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''ناہید! خالد سے تمہاری محبت دیکھتے ہوئے کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اس کی حقیقی ماں نہیں ہو اور مجھے کبھی شک نہیں ہوا۔ تم نے بالکل ماں کی طرح اس کی پرورش کی۔ رات رات بھر جاگ کی تیمارداری کی۔ اس کی ذرا سی تکلیف پر تم تڑپ جایا کرتی تھیں۔

۔۔۔۔ کیا ۔۔۔۔۔ کیا واقعی تمہیں اپنی بہن کی اولاد سے اتنی محبت تھی یا ۔۔۔۔۔۔ وہ سب کچھ مجھے دکھانے کے لیے تھا؟''

ناہید نے سر اُٹھایا اور چپ چاپ کچھ دیر ٹکٹکی باندھے اپنے شوہر کو دیکھتی رہی پھر اس نے نظریں جھکالیں۔

''تم خاموش کیوں ہو ناہید؟'' انہوں نے بڑی نرمی سے کہا۔ ''کیا واقعی تمہیں خالد سے محبت تھی۔ اس لیے کہ تمہاری بہن کا لڑکا تھا یا محض مجھے دکھانے کے لیے ایک بہترین ماں کی اداکاری کرتی تھیں؟''

ناہید نے نظریں اُٹھا کر ایک مرتبہ انہیں دیکھا اس کی آنکھوں سے اندرونی کرب و اذیت کا اظہار ہو رہا تھا۔

''اگر تم میرے سوال کا جواب نہیں دینا چاہتی تو رہنے دو'' پروفیسر صاحب نے دھیمے لہجے میں کہا اور چائے کا ایک بڑا گھونٹ لے کر خالی پیالی میز پر رکھ دی۔

''آپ شائد نہ سمجھ سکیں سرتاج'' ناہید نے پہلی بار لب کشائی کرتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''میں کوشش کروں گا سمجھنے کی۔'' انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔

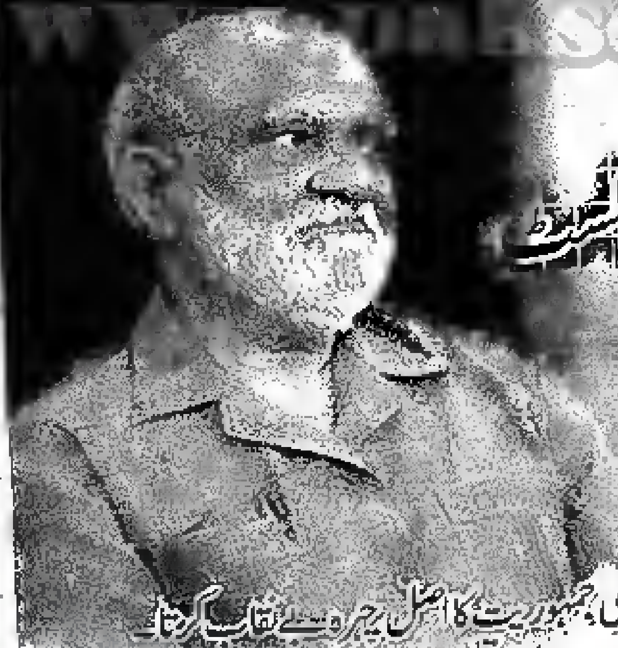
''خالد میری بہن کی کوکھ سے پیدا ہوا تو کیا ہوا ۔۔۔۔۔ خون تو آپ کا ہے......''

پروفیسر زبیری نے ناہید کو غور سے دیکھا اور اس کے قریب آئے۔ دونوں ہاتھوں سے اس کا جھکا ہوا سر اوپر کیا اور محبت کا ایک بوسہ اُس کے ماتھے پر ثبت کردیا۔

ساری بات اُن کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اب ان کا دوسرا قدم ناہید کی بہن شہناز کو واپس بلانے کے لیے فون کی جانب بڑھا تھا۔

وہ اُس ادھوری سہاگن کو پوری کردینا چاہتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ بہن کو ان کے عقد میں دینے پر ناہید کو کوئی اعتراض نہ ہونا تھا۔

☆☆......☆☆



بھارت میں بلیک لسٹ

محمود شام

جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا اصل چہرہ بے نقاب کرتا
نامور صحافی محمود شام کے بے باک قلم سے، سفر نامۂ بھارت

ساتواں حصہ

قاسم جان ملین

اڈوانی صاحب کو کراچی کا یاد ستانے لگی ہے، میں انہی یادوں میں چھوڑ کر ان سے رخصت لے کر چل پڑا ہوں۔ مجھے الجمعیت کے دفتر پہنچنا ہے۔ پرانی دلی میں۔ پرانی دلی مجھے ہر روز اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ نئی دہلی اپنی جدید ترین عمارتوں اور شاہراہوں کے باوجود پرانی دلی کی شان و شوکت، گہما گہمی اور رونقوں کو ماند نہیں کر سکی ہے، پرانی دلی میں جا کر اپنے زندہ ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ گاڑی کو باہر ٹھہرا کر میں اکیلا ہی کوچہ بلی ماراں کی طرف چل پڑا ہوں، پہلے روز ایک صاحب میرے ساتھ تھے۔ اس وقت میں دشمن ملک ہندوستان کے دارالحکومت دہلی کے عین قلب میں اسٹریٹ میں پہنچتا ہے۔ وہی کھوے سے کھوا چھلتا ہوا۔ سائیکل رکشے پر اسکوٹر چڑھتا ہوا، مزدور سامان سے لدے ٹھیلوں کو کھینچتے ہوئے۔ میں دفتر کے قریب ہی پہنچ گیا ہوں۔ مزید گلیاں، مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی دکانیں۔ الجمعیت'' پڑھا جا رہا ہے۔ کہیں کہیں دیواروں پر بلیک بورڈ بھی نظر آتے ہیں۔ جن پر مسلمانوں کی مختلف انجمنوں کے اعلانات نظر آتے ہیں کچھ پوسٹر ہیں، جن میں جن سنگھ کے خونی ارادوں کو للکارا گیا ہے۔ جن سنگھ پر مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنا چاہتی ہے، یہ پوسٹر دہلی مسلم لیگ کی طرف سے ہیں، کچھ پوسٹر مسلمانوں کی کسی اور انجمن کی طرف سے ہیں۔ ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب سے ایک اقتباس لے کر جلی حروف میں شائع کیا گیا ہی، جس کا مفہوم ہے مشرقی پاکستان۔ کبھی مغربی پاکستان سے ہم آہنگ نہیں ہو سکے گا سرحد اور بلوچستان میں بھی ہنگامے ہوتے رہیں گے۔ پوسٹر میں لکھا گیا ہے کہ امام الہند بہت پہلے یہ کہہ گئے تھے اور اب بلوچستان، سرحد میں گورنروں کی برطرفی کے بعد یہی صورت حال پیدا ہو رہی ہے۔

مسلمان محلوں میں مسلمان انجمنوں کی طرف سے یہ پوسٹر۔ خدا جانے کس لیے ہیں؟؟

ایک انتہائی تنگ گلی میں ''الجمعیت'' کا دفتر نظر آ گیا ہے۔ دو تین کمرے۔ ایک کمرے میں چوکیوں پر کاتب حضرات بیٹھے ہیں۔ سامنے دو ایڈیٹر صاحبان۔ پچھلے کمروں میں اکاؤنٹس سرکولیشن وغیرہ۔ ایک طرف ایڈیٹر ''الجمعیت'' مولانا محمد عثمان فارقلیط کا کمرہ۔ یہ ہے ''الجمعیت'' کا دفتر۔ چیف رپورٹر

جناب سلیمان ضابر پیچھے بیٹھیوں میں ہی مل گئے ہیں۔ میں پہلے کمرے میں بیٹھ گیا ہوں۔ سب حضرات وہیں کرسیاں ڈال کر میرے گرد جمع ہو گئے ہیں۔ یہ بزرگ مجھے کتنی عزت بخش رہے ہیں۔ میں ان سے عمر اور تجربے میں کتنے پیچھے ہوں پھر بھی لوگ کتنی محبت سے پیش آ رہے ہیں۔ ''الجمعیت'' مسلمانانِ ہند کا بہت پرانا ترجمان ہے۔ یہ جمعیت علمائے ہند کا پرچہ ہے۔ ناز انصاری صاحب ہیں، بہار برنی ہیں، وہ پاکستان کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ کیا صورتِ حال ہے۔ بلوچستان سرحد میں کچھ ہوتا تو نہیں ہندوستان ٹائمز میں آپ کا انٹرویو شائع ہوا تھا۔ ہم نے اسے اپنے ہاں بھی شائع کیا ہے۔ بہت اچھا بیان دیا ہے آپ نے ہماری دعا ہے کہ اب پاکستان میں یہ منتخب جمہوری حکومت قائم رہے۔ پاکستان میں کچھ ہوتا ہے تو ہمارا دل دھڑکتا ہے اس میں بہت نقصان ہوتا ہے۔

میں مقدور بھر کوشش کرتا ہوں کہ انھیں پاکستان کے حقیقی حالات بتا سکوں اور انھیں اطمینان دلا سکوں کہ پاکستان کے عوام اب کسی غیر جمہوری حکومت کو برداشت نہیں کریں گے۔ اب وقت ہمیں اور زیادہ متحد کرے گا۔ بنگلہ دیش پر بھی بات ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پاکستان بنگلہ دیش کو اپنے زاویے سے مناسب وقت نے پر تسلیم کرے گا۔ کیونکہ دوسرے ممالک اور پاکستان کی طرف سے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے میں بڑا فرق ہے۔ اس لیے دوسرے ملکوں کی طرح پاکستان اسے عجلت میں تسلیم کرے گا۔ چائے آ گئی ہے۔ چائے کے ساتھ کیک پیسٹری کی بجائے مٹھائی آئی ہے۔ یہ روایتی مہمانداری ہے، دفتری مہمانداری نہیں ہے۔ اپنے دوستوں کے بارے میں پوچھا جا رہا ہے۔ جنگ میں کون کون حضرات کام کر رہے ہیں۔

''سید محمد تقی ہیں۔''

''وہ دو برس پہلے چھوڑ گئے تھے۔''

''میر خلیل الرحمٰن صاحب کا کیا حال ہے۔''

''بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ اب تو جنگ پنڈی کے بعد کوئٹہ اور لندن سے بھی نکل رہے ہیں۔''

''ہماری ان سے یہاں ملاقات ہوتی رہی ہے اور رئیس امروہوی صاحب بخیریت ہیں؟''

''جی ہاں۔ قطعے اسی زور و شور سے لکھ رہے ہیں۔''

''اور کون کون حضرات ہیں۔''

''یوسف صدیقی صاحب ہیں۔''

''یہاں وہ جنگ میں نہیں تھے ویسے کبھی کبھی آیا کرتے تھے۔ ابراہیم جلیس صاحب لکھ رہے ہیں؟''

''نہیں وہ ہماری ہڑتال کے بعد واپس نہیں آئے۔''

''اور کون نمایاں صحافی ہیں۔''

میں بتاتا ہوں۔'' ہمارے بزرگ انعام درانی ہیں۔''

''یہ کون صاحب ہیں۔ ان کا نام نہیں سنا۔''

''نہیں صاحب! وہ تو بہت پرانے صحافی ہیں۔''

''خیر یہاں یہ نام نہیں سنا اور'' جنگ'' سرکولیشن اور طباعت کے لحاظ سے اب بھی اول نمبر پر ہوگا۔''

''جی ہاں بالکل۔ ابھی تک تو ماشاء اللہ سب سے آگے ہے۔''

''الجمعیت'' اب بھی لیتھو پر شائع ہوتا ہے۔ کاتب حضرات پہلے کاغذ لیے بیٹھے ہیں۔ کتابت بھی خاصی چالو اور طباعت بھی ایسی ہی ہے۔ تصویر اب بھی کوئی کوئی چھپتی ہے۔ اشتہارات بھی نہ ہونے کے برابر۔ ایک ہفتہ وار ایڈیشن چھوٹے سائز اور آفسٹ پر چھاپنا شروع کیا ہے، اس میں بھی خالص علمی، دینی اور سیاسی مضامین ہوتے ہیں۔ مسلمانوں میں سب سے زیادہ یہی روزنامہ پڑھا جاتا ہے۔ اردو میں اور بھی روزنامے شائع ہوتے ہیں۔ ویر بھارت، ہندوسماچار، ملاپ، پرتاپ۔ آفسٹ پر چھپتے ہیں۔ جمنا داس اختر کا پرچہ، سویرا، بھی لیتھو پر شائع ہوتا ہے۔

چائے اور آ گئی ہے۔ مجھے مولانا عثمان فارقلیط صاحب نے خاص طور پر الجمعیت کا ایک پرچہ دیا ہے جس میں انھوں نے ''سرحدوں پر قفل'' کے عنوان

سے اداریہ تحریر کیا ہے۔ وہ انتہائی درد بھرے لہجے میں کہہ رہے ہیں کہ آپ بھی اپنے اخبارات میں زور دیجیے کہ کم از کم خطوط اور اخبارات کی ترسیل کی اجازت تو ہو جائے، ڈاک اور مواصلات پر اس پابندی کا سب سے زیادہ نشانہ مسلمانوں کو ہی بننا پڑتا ہے، ان کے خاندان منقسم ہیں رشتہ داروں کو کسی موت کی اطلاع بھی نہیں ہو پاتی۔ مائیں بیٹوں سے بے خبر ہیں، بھائی بھائی سے دور ہے۔ لندن، کویت، امریکہ، کینیڈا سے ہوتے ہوئے خطوط ایک دوسرے کو پہنچتے ہیں۔ ایک مہینے سے کبھی بھی کم وقت نہیں لگتا، خط ملنے میں۔ ہم اپنی حکومت پر زور دے رہے ہیں، آپ اپنی حکومت پر زور دیں۔ میں بتاتا ہوں کہ آپ کا کہنا بالکل صحیح ہے کیونکہ میں پہلے شملے آیا اس وقت بھی کافی خطوط لایا تھا، جنھیں شملے سے ڈاک کے حوالے کیا، اب کے خطوں کی تعداد اور بھی زیادہ تھی۔ اب کے میں کچھ جواب بھی لے کر جا رہا ہوں۔ ان حضرات نے کہا کہ کچھ خطوط ہمارے بھی آپ لے کر جائیں گے۔

محمد عثمان فارقلیط۔ بہت ضعیف ہو چکے ہیں۔ وہ ریٹائرڈ ہو رہے ہیں۔ نئے ایڈیٹر کے لیے بات ہو رہی ہے۔ مولانا فارقلیط اپنی ذات میں ایک عہد ہیں۔ تحریک آزادی، پھر آزادی کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت اور ان کی آواز کی ترجمانی کرتے رہے ہیں۔ نیا ایڈیٹر تو آ جائے گا مگر الجمعیت کا ایک عہد ختم ہو جائے گا۔

میں "الجمعیت" کے چیف رپورٹر سلیمان صابر کے ساتھ ان سب حضرات سے اجازت لے کر چل پڑا ہوں۔ سلیمان صابر بہت پرانے صحافی ہیں۔ حکومت ہند کی طرف سے ایکریڈیشن رکھنے والے واحد مسلمان ہیں۔ اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں باہر بھی جا چکے ہیں۔ ان کے ساتھ ان تنگ تنگ کوچوں سے نکلتے ہوئے۔ میں مولانا عزیز الرحمان لدھیانوی کا ذکر کرتا ہوں۔ جو ممتاز احراری لیڈر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے صاحبزادے ہیں۔ میرے والد صاحب نے ان سے ملنے کے لیے بھی کہا تھا۔ وہ یہاں کوئی مدرسہ چلا رہے ہیں۔ سلیمان صابر مجھے اس وقت ساتھ لے چلتے ہیں کہ یہیں نزدیک ہی ہیں آپ ابھی مل لیں اب اور بھی چھوٹی چھوٹی گلیاں سامنے ہیں، پرانے مکانات چھوٹے چھوٹے دروازے، کھڑکیاں، مکانوں کے اندر ہی دکانیں ہیں۔ دودھ دہی کی دکانیں، پرچون، کوئلے، دھوبیوں، درزیوں کی دکانیں، خالص ٹکسالی زبان سنائی دے رہی ہے، یہاں زیادہ تر مسلمان ہی ہیں۔ ان گلیوں میں ریڈیو پاکستان لاہور کی آواز مسلسل سنائی دیتی ہے۔ دکانوں پر پاکستانی ریڈیو آزادانہ چل رہے ہیں۔ پاکستان کے وقت کے مطابق ایک بجا ہے۔ اردو میں خبریں آ رہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب ریڈیو پاکستان سننے پر اعتراض ہوتا ہے، تو مسلمان ان سے کہتے ہیں کہ کیا کریں۔ آل انڈیا ریڈیو۔ صبح سویرے صرف بھگوت گیتا کا پاٹ سناتا ہے۔ مسلمان صبح سویرے قرآن پاک سننا چاہتے ہیں، وہ ریڈیو پاکستان سے سنائی دیتا ہے۔ صبح سویرے سے لاہور ریڈیو لگتا ہے تو پھر دن بھر لگا ہی رہتا ہے۔

مولانا عزیز الرحمان لدھیانوی کے ہاں پہنچتے ہیں۔ وہ مدرسے میں ہیں، وہاں انھیں اطلاع دی جاتی ہے۔ میں انھیں بتاتا ہوں کہ میں ان کے دوست صوفی شیر محمد صاحب کا بیٹا ہوں۔ وہ بڑے تپاک سے ملتے ہیں اور پھر ماضی کی یادوں میں کھو جاتے ہیں۔ وہ بھی کافی بوڑھے ہو گئے ہیں۔ مسلمان بچوں بچیوں کی تعلیم کی طرف خاص توجہ دے رہے ہیں۔ ان کے مدرسے میں صرف مسلمان بچیاں پڑھتی ہیں۔ پاکستان کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں ان کے صاحبزادے آتے ہیں وہ انھیں یاد دلاتے ہیں کہ وہ مجھ سے تصدیق کریں کہ آغا شورش کاشمیری زندہ ہیں یا انتقال کر چکے ہیں۔ میں انھیں بتاتا ہوں کہ اللہ کے فضل سے زندہ ہیں اور بخیریت ہیں۔ گزشتہ دنوں حکومت نے انھیں پھر گرفتار کر لیا تھا۔ حال ہی میں رہا ہوئے ہیں۔ مولانا عزیز الرحمٰن کے صاحبزادے بتاتے ہیں کہ اباجی کو جانے کہاں سے خبر

ملی۔ رشید یوسنا یا کسی اخبار سے یہ غلط فہمی ہوئی۔ انھیں پتا چلا کہ آغا صاحب کا انتقال ہوگیا۔ ان کا بہت بُرا حال تھا۔ دو روز تک غم میں ڈوبے رہے، کچھ کھایا نہ پیا اور یہ اب تک یہی سمجھے ہوئے تھے کہ آغا صاحب چل بسے ہیں۔ میری زبانی ان کی خیریت سن کر مولانا نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور کہا کہ انھیں میرا اسلام کہیے گا۔ آپ کے ملنے سے میرا ایک غم تو دور ہوا۔

مولانا کھانے کے لیے اصرار کر رہے ہیں، میں ان سے معذرت چاہ رہا ہوں۔ پھر ہم انھی چھوٹی چھوٹی بل کھاتی گلیوں سے باہر نکل رہے ہیں، نیپالی ڈرائیور ہیرالال انتظار میں سو گیا ہے۔ ہیرالال بھی خوب آدمی ہے۔ ہندو ہے۔ مگر ہر صبح آتا ہے تو مجھے ''السلام علیکم'' کہتا ہے۔ بڑا تیز اور ہوشیار ہے۔ اس شہر کے چپے چپے سے واقف ہے۔ ہر وقت اس کے چہرے پر مسکراہٹ رہتی ہے۔ غلیظ ڈرائیوروں کی طرح چکر نہیں دیتا اس کے بیوی بچے یہیں ہیں، والدین نیپال میں ہیں۔ سال کے سال جاتا ہے۔

کانگریس کے صدر سے ملاقات

ساڑھے چار بجے مجھے بھارت کی حکمران پارٹی کے صدر جناب شنکر دیال شرما سے ملنا ہے آل انڈیا کانگریس کے صدر۔ بھوپال کے رہنے والے ہیں۔ وہیں سے لوک سبھا کے ممبر بھی ہیں۔ پرانے کانگریسی ہیں۔ پہلے کافی وزارتی عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں وہ سرکاری رہائش گاہ میں مقیم ہیں۔ حکمران پارٹی نے اب تک یہ تخصیص رکھی ہوئی ہے۔ سرکاری عہدے الگ، جماعتی عہدے الگ۔ اپنی پارٹی کے عہدے داروں کو بھی وہ بہت عزت بخشتے ہیں۔ شیروانی، کھلا پاجامہ، کانگریسی ٹوپی، لمبا قد۔ یہ ہیں کانگریس کے صدر ڈاکٹر شنکر دیال شرما۔ ان کا اپنا پورا سیکریٹریٹ ہے۔ جو پورے ہندوستان میں کانگریس کی شاخوں کو کنٹرول کرتا ہے۔ پمفلٹ شائع کرتا ہے۔ عوام کو کانگریس اور کانگریسی حکومت کی پالیسیوں سے آگاہ کرتا ہے۔

میں پوچھ رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب! اب پارٹی کو حکومت پر کتنی بالادستی حاصل ہے؟ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جب سے مسز اندرا گاندھی وزیراعظم بنی ہیں، حکومت پر پارٹی کی گرفت کمزور ہوگئی ہے؟

ڈاکٹر صاحب اس سوال کی اتنی جلدی شاید توقع نہیں کر رہے تھے۔ اس لیے وہ ذرا سے پریشان ہیں، وہ بتا رہے ہیں۔ شروع میں پارٹی بھی تھی۔ ایک ورکنگ فارمولا تھا۔ جو برابر اس وقت چل رہا ہے۔ کانگریس کے صدر اور وزیراعظم آپس میں مخالف نہیں بلکہ ایک دوسرے کے مددگار ہیں، یہاں ٹکراؤ کی نہیں ساتھ رہنے کی گنجائش ہے۔ پارٹی پروگرام موجود ہے۔ منشور ہم بناتے ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں ہم نے بنایا۔ ۱۹۷۲ء میں ہم نے بنایا جتنے بڑے پالیسی فیصلے ہوتے ہیں وہ کانگریس کرتی ہے۔ ان پر عملدرآمد حکومت کرواتی ہے۔ اسی طرح روزمرہ کے معاملات میں عوام کو آگاہی کے لیے، عوام کے حل میں پارٹی اور حکومت دونوں ملک کر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ تقسیم کار بہرحال موجود ہے۔ جو کام خالصتاً انتظامیہ سے متعلق ہیں۔ اس میں ہم کوئی دخل نہیں دیتے۔ اگر گورنمنٹ کے کسی سیکریٹری کے تقرر وغیرہ کا مسئلہ ہو، تب گڑبڑ ہو جائے گی، ہمارا منشور موجود ہے، جس میں لکھا ہوا موجود ہے کہ پارٹی کو کیا کچھ کرنا ہے۔''

ڈاکٹر صاحب بتا رہے ہیں کہ کانگریس میں تنازعہ کا کیا پس منظر تھا۔ اقتدار کے دو مرکز بن گئے تھے۔ کانگریس کے صدر اور ادھر وزیراعظم۔ یہ ایک نظریاتی تصادم تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ جو عوام سے وعدے کیے تھے، وہ پورے نہیں کیے جا رہے تھے۔ لوگ بہت حساس ہو رہے تھے۔ ہم نے جو وعدے کراچی کے سیشن منعقدہ ۱۹۳۱ء میں کیے، پھر ۱۹۴۸ء میں کیے، ہم ان کے مطابق آگے بڑھ نہیں پا رہے تھے۔ جب ان وعدوں کی تکمیل کی بات ہوئی تو مفاد پرست عناصر سے براہِ راست تصادم شروع ہوا۔ ۱۹۴۸ء میں جے پور سیشن میں طے کیا تھا کہ بینکوں کو قومی ملکیت میں لے لیا جائے گا۔ جب ایک عرصے بعد ایسا کرنا چاہا تو ہمارے وزیرِ خزانہ نے کہا کہ آپ کو نیا وزیرِ خزانہ ڈھونڈنا پڑے گا۔ بعد میں پھر اختلافات ہوئے، ہم نے ہر جگہ جمہوریت کے مطابق غور کیا۔ بنگلور کے

اجلاس منعقدہ ۱۹۶۹ء میں جو فیصلے کیے گئے، ان میں اکثریت ہمارے ساتھ تھی۔ ان کے فیصلے سپریم کورٹ تک نے برقرار رکھے، کانگریس کی تنظیم ہمیشہ ہمارے ساتھ رہی۔

ڈاکٹر صاحب کہہ رہے ہیں!! ہم سوشلزم کے راستے پر بڑھنا چاہتے تھے، آزادی کی لڑائی میں گاندھی جی کے آنے کے بعد جان آئی، ان کی قیادت میں یہ راہ متعین کردی گئی کہ آزادی آنے کے بعد آزادی کی روشنی دور سے دور جھونپڑی میں پہنچے گی، آزادی کی لڑائی کو عوام کی لڑائی بنادیا۔ اندرا جی نے بینک اور بنیادی صنعتوں کو قومی ملکیت میں دے کر ۱۹۷۱ء میں کیے گئے وعدے کے ایک ایک لفظ کو پورا کردیا۔ اندرا جی نے کہا کہ یہ ہمارے اخلاقی فرائض ہیں، اگر ہم یہ نہیں پورے کریں گے تو ہمیں کوئی حق نہیں ہے کہ ہم لوگوں سے ووٹ مانگنے جائیں۔ اندرا جی کے آنے سے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی کہ پارٹی کو حکومت پر بالادستی نہ رہی ہو یا پارٹی اور حکومت میں اختلاف ہوگیا ہو۔ یا پارٹی کمزور ہوگئی ہو۔ اندرا جی نے وعدے پورے کرنے پر زور دیا۔ اقتدار میں دوعملی کو ختم کیا، جو کام پارٹی کے ہیں۔ پارٹی کرتی ہے، جو کام حکومت کے ہیں حکومت کرتی ہے۔“

”میں پوچھ رہا ہوں، ہندوستان میں اپوزیشن پارٹیوں کے زیادہ مضبوط اور مقبول نہ ہونے کا آپ کے نزدیک کیا سبب ہے۔“

ڈاکٹر صاحب کہہ رہے ہیں۔ میرا تجزیہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے جلد بازی کی۔ جمہوریت میں ایسے کام نہیں بنتا۔ پارٹی بدل بھی جاتی ہے۔ یہ کام ہوا بھی۔ ہمارے خلاف کئی جگہ حکومت بھی بن گئی۔ ہریانہ، پنجاب میں رہی۔ کیرالہ میں بھی بنی۔ آج ہم کو جو طاقت ملی، اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری پارٹیوں کی حکومتیں بھی بنیں، لوگوں نے اس تماشے کو دیکھ لیا۔ یہ بہرحال ہمارے کام کا اثر ہی ہے۔ اپوزیشن کو یہ سمجھنا چاہیے کہ جمہوریت میں اپوزیشن ٹھیک رویہ اختیار کرے۔ تو لوگ انھیں بھی موقع دیتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ اپوزیشن مستقل مزاجی سے کام لے۔

”آخر میں اصل مسئلے پر بات چل رہی ہے یعنی پاکستان سے تعلقات کیسے ہونے چاہئیں۔“

”ڈاکٹر صاحب کہہ رہے ہیں۔ پاکستان کے سلسلے میں میری حکومت اور میری پارٹی کا رویہ بالکل صاف رہا ہے۔ ہماری بات کو پاکستان کے نیتاؤں نے کیوں نہ سمجھا یہ ہماری عقل سے باہر ہے۔ مسٹر بھٹو کی حکومت آئی تو ہم نے اطمینان ظاہر کیا کہ یہ منتخب حکومت آئی ہے۔ اب تعلقات بہتر ہوسکیں گے۔ جن سنگھ کے مسٹر باجپائی ہم پر بڑے اعتراض کرتے تھے۔ شملہ معاہدہ سے پہلے اور بعد میں۔ کہ مسٹر بھٹو کا اعتبار کیا وہ تو سخت ہندوستان دشمن ہیں۔ ہم نے باجپائی صاحب سے کہا کہ جمہوریت سے محبت کرنے والے لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں کہ ہم یحییٰ خان کے مقابلے میں مسٹر بھٹو کو بہتر کیوں سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کہہ رہے ہیں کہ ہماری مسلسل کوشش رہی ہے کہ پاکستان سے تعلقات بہتر ہوں، کیونکہ عوام کی خواہش ہے کہ یہ تعلقات اچھے ہوں۔ ۱۹۷۱ء میں جنگ سے پہلے انتخابی منشور میں ہم نے کہا تھا: یہ ہماری مسلسل کوشش ہوگی کہ پاکستان سے تعلقات معمول پر لائے جائیں کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ دونوں ملکوں کے عوام جو آپس میں بہت کچھ مشترک رکھتے ہیں وہ دوست ہمسایوں کی طرح رہنا چاہتے ہیں۔ لڑائی کے فوراً بعد جب الیکشن ہوئے تھے اس وقت بھی پاکستان سے تعلقات بہتر کرنے کے اعلان کو اپنے انتخابی منشور میں شامل کیا۔ عوام نے اس پر ووٹ بھی دیا۔ معاہدۂ شملہ ہوا، تو اپوزیشن پارٹیوں کی مخالفت کے باوجود کانگریس نے عوام کو شملہ معاہدہ کے نتائج سے آگاہ کیا۔ آج بھی ہماری پارٹی کا یہی موقف ہے پاکستان سے ہمارے تعلقات معمول پر آئیں۔ کیونکہ کانگریس پارٹی تو یہ سمجھتی ہے کہ ہمارا مشترکہ دشمن غربت ہے۔ اس کا مقابلہ برصغیر کے سب ممالک مل کر کرسکتے ہیں۔“

ڈاکٹر صاحب مرنجان مرنج انسان ہیں۔ تکلف بھی بہت کر رہے ہیں۔ چائے، مٹھائی، کیک بسکٹ جانے کیا کچھ آیا ہوا ہے۔

میں ان سے اجازت لے رہا ہوں۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد روڈ پر پت جھڑ چھائی ہے۔ دور دور تک پتے بکھرے ہوئے ہیں۔ سامنے ہی شاستری بھون ہے۔ یہاں سے بخشی ایس بھٹ میرے ساتھ چلیں گے۔ پھر پرانے سیکریٹریٹ میں جانا ہے۔ جہاں وزارت دفاع کے ایک اہم افسر سے ملنا ہے۔

دہلی کا یہ حصہ عظمت رفتہ کی یاد دلاتا ہے۔ ایک طرف پارلیمنٹ کی پرشکوہ عمارت، سیکریٹریٹ کی سرخ سرخ عمارتیں۔ ماضی کی یہ عمارتیں، کتنی شوکت کتنی عظمت رکھتی ہیں۔ نئی عمارتیں ان کے مقابلے میں کہاں آسکتی ہیں۔ ساؤتھ بلاک میں ہم اس افسر کے ملاقاتیوں کے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ کیونکہ ان صاحب کو اچانک وزیر دفاع نے بلا لیا ہے۔

وزارت دفاع کے ایک بڑے افسر سے

وزارت دفاع کے اہم ترین افسر سے ملاقات، اپنی نوعیت کی واحد ملاقات ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ جو کچھ وہ کہیں، میں وہ لکھ تو سکتا ہوں، لیکن ان کے نام سے نہیں۔ میں صحافیانہ اخلاقیات کے تحت ان کا نام نہیں دے رہا ہوں۔ لیکن ان سے ملاقات بڑی اہم اور دلچسپ ہے۔ اپنے اس قیام کے دوران میں جتنے بھی افسروں سے وزیروں سے یا اور اہم شخصیتوں سے ملا ہوں، ان سب کا رویہ بڑا دوستانہ، عوامی اور بے تکلفانہ رہا ہے۔ کسی چہرے پر رعونت یا فتح کا غرور نظر نہیں آتا ہے، لیکن یہ آفیسر صاحب کچھ رعونت کا زیادہ ہی شکار ہیں۔ ہم ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں تو وہ کرسی سے اٹھنے کی زحمت بھی نہیں کرتے، بیٹھے بیٹھے ہی ہاتھ آگے بڑھا دیتے ہیں جیسے مجبوراً ہاتھ ملا رہے ہوں۔ دوسرے افسروں کی طرح نہ وہ اٹھ کر بے تکلفی سے ملتے ہیں، اور نہ ہی الگ صوفے پر جا کر باتیں کرنے کی تکلیف گوارا کرتے ہیں۔ کافی سینئر آفیسر ہیں، چہرے پر کچھ بڑھاپے کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ یو پی کے رہنے والے ہیں۔ قد بھی لمبا ہے اور ویسے بھی ذرا اونچی سطح سے بات کرتے ہیں۔ بات چیت شروع ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں کچھ ہندوستان پاکستان کے تعلقات پر بات کرتا ہے۔ اب یہ کس مرحلے میں ہیں۔ آئندہ ان کے کیا امکانات ہیں؟ میری اتنی سی بات سن کر وہ شروع ہو جاتے ہیں۔ ان کا لہجہ کبھی مشفقانہ، کبھی بزرگانہ، کبھی فاتحانہ اور کبھی متفخرانہ اور کبھی استہزائیہ ہے سنیے۔

کہہ رہے ہیں۔ ”میرا بلکہ ہمارا احساس یہ ہے کہ آپ نے پھر تصادم یا قوت استعمال کرنے کی پالیسی اختیار کر لی ہے۔ یہ پالیسی حال ہی میں آپ نے شملہ میں چھوڑ دی تھی۔ یا ہم نے محسوس کیا تھا کہ آپ سنجیدگی سے باہمی بات چیت سے معاملات طے کرنے کی پالیسی اپنا رہے ہیں۔ لیکن اب اس احساس میں تبدیلی ہوئی۔ تاشقند میں بھی آپ نے یہ پالیسی چھوڑی، تقسیم کے وقت چھوڑی۔ تقسیم کے وقت کونسل کی میٹنگ ہوئی۔ سردار عبدالرب نشتر اور ولبھ بھائی پٹیل گلے مل رہے تھے۔ ہم نے سوچا بھائی بھائی کا جھگڑا ختم ہوا اب وراثت میں ملنے والی آزادی کو نبھائیں گے، پھر جھگڑا ہوا کشمیر کا۔ پھر آپ نے امریکیوں سے دوستی کی اور سوچا کہ ہم مل کر کمیونسٹوں کو ٹھوکیں گے، پھر آپ نے پانی کا اور بندوں کا مسئلہ چھیڑا۔ اس وقت یہ سوچا گیا کہ اصلی مسئلہ اقتصادی ہے۔ یہ آپ کا جو ڈر ہے کہ ہم آپ کی ساری نہریں خشک کر دیں گے، اسے نکلنا چاہیے۔ تربیلا وغیرہ میں پیسے دیے جائیں۔ اثاثوں کے معاملے طے ہوئے۔ متروکہ جائیداد کا مسئلہ آیا، تربیلا ڈیم کے لیے ۱۹۵۹ء میں پیسے دینے کے لیے کہا۔ معاملات طے ہو گئے۔ ۱۹۶۲ء میں ہمارا چین سے جھگڑا ہوا۔ پہلے تو آپ نے سوچا کہ آپ بھی شامل ہو جائیں۔ پھر آپ نے فیصلہ کیا کہ اگرچہ ہندوستان سے ہمارے جھگڑے ہیں لیکن ہمیں اس وقت مشکل میں ہندوستان کو نہیں دبانا چاہیے۔ ۱۹۵۶ء میں فضول کی چھیڑ خانی کی ٹینک وغیرہ کچھ زیادہ آ گئے تھے۔ شاید کشمیر میں مداخلت کی۔ ہم نے ٹھوکا۔ آپ نے ٹھوکا۔ غلطی ہوگئی تھی دونوں سے کہا پرانی پوزیشن پر آجاؤ۔ بھٹو میاں ایوب کے خلاف ہو گئے۔ تاشقند نہیں چلا۔ پھر ۱۹۷۱ء آ گیا اور دسمبر میں آپ نے حملہ کر دیا۔ وہ بھی ختم ہوا۔

یکطرفہ سیز فائر ہم نے کیا، کیونکہ ہمارا مغربی پاکستان سے کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ رقبہ ہتھیانے کی بات نہیں ہے۔ اس کا اچھا ردعمل ہونا چاہیے تھا۔ آپ کے امریکی چینی دوستوں نے کوئی مدد نہیں کی۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے روس کو زبایا ورنہ ہندوستان مار ہی نہیں دیتا۔ روس ہندوستان کو کیسے دبائے گا۔ فالتو ہتھیار تو آپ کے پاس زیادہ ہیں۔"

یہ سینئر آفیسر کرسی پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدلتے جارہے ہیں اور بے تکان سنائے جارہے ہیں۔ اب وہ شملہ معاہدے تک آپہنچے ہیں۔ شملہ معاہدہ سے اندازہ ہوا کہ آپ تصادم کی پالیسی نہیں چاہتے ہیں، آپ کا خیال ہے اقوام متحدہ امریکہ، روس، چین ہمارا کوئی مسئلہ حل نہیں کرسکتے اور نہ ان سے ہمارا کوئی مسئلہ حل ہوا۔ جھگڑا کرنے میں نقصان ہے، آپ کے ہاں جمہوریت بن رہی ہے۔ عوامی نمائندے ہیں، عوام کی رائے چلے گی۔ ہم نے زرعی اصلاحات کی ہیں اور بہت کچھ کررہے ہیں۔ اس پر معاہدہ ہوگیا۔ لڑنے کا وقت نہیں ہے۔ معاملہ ختم ہوا۔ گھر واپس جائیں۔ آپس کے جو بھی معاملات ہیں، مل بیٹھ کر طے کریں۔ عوام کی فلاح و بہبود کی سوچیں ہم بھی خوش تھے، بھٹو صاحب خوش تھے۔ ہمیں کیا خبر کہ اصل مزاج اور تھا۔ مائنڈ بدلا، آہستہ آہستہ دیر لگانے کی نیت ہوئی۔ بنگلہ دیش کی بات ہوئی۔ لائن آف کنٹرول پر چھوٹی چھوٹی باتیں ہوئیں۔ تمام ملکوں کے سفیروں کو بلا کر کچھ کہنے لگے۔ اس طرح ۱۹۷۱ء کے رجحانات پھر ظاہر ہونے لگے، ہم نے سوچا ان کی کوئی مشکل ہوسکتی ہے۔ لائن آف کنٹرول میں تھوڑا بہت ردوبدل کرلیتے ہیں، تھاکو چک پر ان کی بات مان لیتے ہیں۔ میٹنگ ہوئی۔ چپ چاپ بات کرنے کی بجائے عوام کے سامنے بات پیش کردی۔ کیا بین الاقوامی ڈپلومیسی یہی ہے۔ اب خود ہی کہہ رہے ہیں کہ جب تک بنگلہ دیش میں الیکشن نہیں ہوجاتا۔ ہم کچھ نہیں سوچ سکتے۔ جنگی قیدیوں کا معاملہ اس وقت تک طے نہیں ہوگا جب تک ہم تینوں مل کر نہ بیٹھیں، ہم نے کیا نہیں کہا کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ مسئلہ یہ ہے کہ بنگلہ دیش اور پاکستان مل کر بیٹھنے کو تیار نہیں ہیں۔ جنگی قیدی ہمارے پاس ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، کرتے رہیں گے، خیال آیا، عورتیں بچے واپس چلے جائیں، بنگلہ دیش بھی راضی ہوگیا کہ ان کی بھی عورتیں بچے ہیں۔ بہت اچھا جواب آیا۔ ہم نے پانچ ہزار عورتوں اور بچوں کا کہا۔ آپ نے ۱۵ ہزار بنگالیوں کا کہا۔ اب مسئلہ چل گیا فہرستوں کا۔ فہرستیں بننے میں دیر ہورہی ہے میں تو کہتا ہوں کہ ریڈ کراس والے بیٹھ جائیں، سوئٹزرلینڈ کے سفارت خانے کے کچھ لوگ بیٹھ جائیں۔ اسلام آباد میں بنگلہ دیش کا کوئی نمائندہ بیٹھ جائے، آدمی جانچ جانچ کر بھیجے جائیں۔ شہری جنگی قیدیوں کا مسئلہ کچھ ایسا ہی ہے، ملٹری والوں کے لیے تو جنیوا کنونشن میں طے ہے کہ ان پر جو پیسے خرچ کیے جائیں، وہ متعلقہ ملک سے مل جاتے ہیں۔ شہری جنگی قیدیوں کے لیے ایسی کوئی گنجائش نہیں ہے اس لیے چھ مہینے پہلے ہم نے تجویز کیا تھا کہ ان کے لیے پیسے بھیجے جاسکتے ہیں۔ پہلے تو کوئی جواب نہیں آیا جواب آیا تو کہا کہ ہمیں کوئی دلچسپی نہیں ہے، کچھ لوگوں کو مزا آتا ہے کہ پہلے تکلیف پہنچے، پھر کہا جائے کہ ہندوستان والے تکلیف پہنچا رہے ہیں۔

میرے خیال میں یہ رجحان جذبہ شملہ کے خلاف ہے۔ میں اگر کہوں کہ ۱۹۷۱ء سے پہلے کی پالیسی پھر جاری ہوگئی ہے۔ یہ کہنا تو ناممکن ہے کہ اب بھی وہی پالیسی غلبہ پاگئی ہے۔ ہم بھی یہ کہہ لیتے ہیں کہ شاید یہ اندرونی صورت حال کی وجہ سے ہے بھٹو صاحب ایک بات نہیں کرتے، متضاد باتیں کرتے ہیں۔"

میں ان کا فاضلانہ گفتگو غور سے سن رہا ہوں، یہاں میں مداخلت ضروری سمجھتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ جہاں تک مجھے علم ہے، ہماری حکومت نے ۱۵ ہزار بنگالیوں کے لیے یہ پیش کش بھی کی ہے کہ انھیں ہم واہگہ کی سرحد تک پہنچا دیتے ہیں۔ بنگلہ دیش کی حکومت انھیں واہگہ سے لے جانے کا انتظام کردے جہاں تک فہرستوں کی تیاری میں تاخیر کا تعلق ہے۔ مجیب الرحمٰن صاحب نے خود سب لوگوں کو لینے سے انکار کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ اچھی طرح جانچ پڑتال کے

بعد بنگالیوں کو واپس لیں گے، کیونکہ ان میں پاکستان اپنے کوئی ایجنٹ بھی بھیج سکتا ہے، اس لیے ان پندرہ ہزار کی فہرست تیار کرنا ضروری سمجھا گیا۔ یہ لوگ جنگی کیمپوں میں مقید نہیں ہیں، اس لیے ان کی فہرستوں کی تیاری میں قدرتی طور پر تاخیر ہونا تھی۔ اب بہرحال فہرست تیار ہو چکی ہے۔ واگہ کے راستے سے ان کی واپسی میں ہندوستان نے رکاوٹ ڈالی ہے، اس لیے اب پیش کش کی گئی ہے کہ کراچی کی بندرگاہ پر انھیں پہنچا دیا جائے گا، بنگلہ دیش انھیں وہاں سے چٹاگانگ لے جانے کا انتظام کرے۔''

یہ سن کر یہ سینئر افسر ذرا پریشان ہوتے ہیں، پھر اپنی خفت مٹانے کے لیے کہتے ہیں ہماری طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ ہم تو اجازت دینے کے لیے تیار ہیں۔ میرے خیال میں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی بہرحال اب بھی ہماری طرف سے یہ پیش کش موجود ہے۔''

پھر میں جنگی قیدیوں کا مسئلہ چھیڑتا ہوں کہ آپ ان سے اچھے سلوک کا دعویٰ کرتے ہیں مگر ریڈ کراس والوں کو بھی وہاں نہیں جانے دیتے۔''

وہ کہتے ہیں ''ریڈ کراس والے جا سکتے ہیں۔ رپورٹ بھی بھیجتے ہیں۔ پہلی رپورٹ میں ہم نے کوئی ترمیم یا تنسیخ نہیں کرائی۔ صرف طریقِ کار پر اعتراض تھا۔ اگر کوئی جنگی قیدی ان سے کچھ کہتا ہے تو اس کو ضرور سنیں۔ لیکن اس کے بعد انکوائری کریں۔ کیمپ کمانڈنٹ کی بات بھی سنیں۔ دونوں کے بیان سے پھر اپنی رائے متعین کریں۔ یکطرفہ بیان تو جائز نہیں ہے۔''

میں کہتا ہوں کہ اگر آپ ان سے اچھا سلوک کر رہے ہیں تو جنگی قیدیوں کے کیمپوں میں کسی اخبار نویس کو جانے کی اجازت کیوں نہیں دی جاتی۔''

وہ اپنے اس رعونت بھرے لہجے میں کہہ رہے ہیں۔ ''ہم نے ان کا کوئی چڑیا گھر تو نہیں بنا رکھا ہے جو دکھایا جائے۔ کسی وجہ سے یہ مصیبت میں پھنس گئے تھے۔ ان کی غلطی یا کسی اور کی غلطی کہ وہ بدقسمتی سے آج کیمپوں میں بند ہیں۔ ان کے ساتھ تو شرافت سے پیش آنا چاہیے۔ قید سے ظاہر ہے کہ کوئی خوشی تو نہیں ہو سکتی۔ وہ اچھی بات تو نہیں بتائیں گے کہ کسی کو...... ویسے کھیل کود کا انتظام ہے۔ مذہبی عبادات کا انتظام ہے۔ کھانے پینے کو ٹھیک مل رہا ہے۔''

میں پوچھتا ہوں کہ ریڈ کراس کی رپورٹ میں لکھا ہے کہ میرٹھ والے کیمپ میں جا کر احساس ہوتا ہے کہ CAGE (پنجرے) کا لفظ آج تک اتنا صحیح نہیں استعمال نہیں ہوا ہوگا۔''

اس پر اس افسر کی رعونت کچھ مجروح ہوتی ہے، چہرے پر شکنیں ابھرتے ہیں۔ جواب تو نہیں بن پڑتا کہتے ہیں ''پنجرے کا لفظ صحیح ہو یا غلط۔ ان کی نقل و حرکت محدود ہے۔ آپ اسے جو چاہے کہہ لیں۔ ریڈ کراس والے دیکھ سکتے ہیں کہ ان لوگوں کو سزائیں کیسے دی جاتی ہیں۔ ہوسٹل میں رہنے والوں کو بھی خلاف ورزی پر سزا دی جاتی ہے۔''

میں اب اپنے صحافی بھائیوں کی بات کرتا ہوں۔ وہ تو اپنی صحافیانہ ڈیوٹی پر تھے، بین الاقوامی اخلاقیات کا تقاضا ہے کہ انھیں قید نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ان کے لیے بات چلی تو یہ کہا گیا کہ ہندوستان کے دو صحافی کسی زمانے میں سرحد عبور کر کے فوجی کارروائی کے دوران مشرقی پاکستان میں گئے تھے۔ ان کا کچھ پتا نہ چلا۔ وہ واپس کیے جائیں تو ہم ان کے صحافی واپس کر دیں گے۔ یہ صحافی مغربی پاکستان میں بہرحال نہیں ہیں۔ مشرقی پاکستان اور ان دنوں کی حکومت اور فائلیں بھی آپ کے یا بنگلہ دیش کے پاس ہیں۔ ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ بعد میں کہا گیا کہ ان کے بدلے کچھ بنگالی صحافی چھوڑ دیے جائیں۔ ہماری حکومت نے کہا ہے کہ آپ بتا دیں کس کس بنگالی صحافی کو بنگلہ دیش واپس لینا چاہتا ہے۔ ہم انھیں چھوڑ دیتے ہیں۔

اس پر یہ آفیسر کہتے ہیں کہ مجھے بہت خوشی ہوگی۔ صحافیوں کے سلسلے میں کچھ ہو جائے تو۔

پھر دفاعی بجٹ کی بات چلتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے تو بجٹ کا ۲۵ سے ۳۳ فیصد تک دفاعی اخراجات کے لیے مخصوص ہے۔ اسلحہ ہم خود بناتے ہیں باہر جس کسی کو پیسے دو، اسلحہ دیتا ہے۔ ہم اسلحہ کے

لیے بھیک نہیں مانگتے ہیں۔ آپ کے بجٹ کا تو بہت
بڑا حصہ اس پر اٹھ جاتا ہے۔ میں آپ کی دفاعی
تیاریوں سے ڈرتا نہیں ہوں۔ البتہ تیار رہتا ہوں۔
تصادم سے ڈر لگتا ہے۔ ہم کو خوشی نہیں ہوتی کہ آپ پر
دباؤ ڈالیں۔ مغربی پاکستان میں اس لیے یکطرفہ
جنگ بندی کی تھی کہ مغربی پاکستان میں کوئی زد پڑی تو
اس سے ہمیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ سیز فائر کا اعلان
کرتے وقت وزیراعظم کا یہ زبردست خیال تھا کہ
مغربی محاذ پر ایسی صورت حال پیدا نہ ہو۔ آپ کے
ہاں اس کا کوئی احساس نہیں ہے۔ پھر تیاریاں کی
جارہی ہیں۔ آپ بتائیں کہ ایسا کیوں ہے؟''

میں کہتا ہوں۔ ''یہ تیاریاں تو ہماری اپنی حفاظت
اور عزت کے لیے ہیں۔ اتنے بڑے دشمن کے مقابلے
میں ہمیں تیار تو رہنا ہے۔''

وہ کہتے ہیں۔ ''اپنی حفاظت اور عزت کے لیے
تیاریاں تو ہونا چاہئیں۔ مسلح افواج بھی ہونی
چاہئیں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ اپنی حفاظت اور
عزت سے زیادہ کا معاملہ ہے۔ ۱۹۷۱ء سے پہلے کی
پالیسی کا احیاء اس لیے کہتا ہوں کہ آپ نے تین
ڈویژن فوج اور بڑھالی ہے۔ آپ نے چار پانچ اور
ہیڈ کوارٹروں کا اضافہ کیا ہے۔ آپ نے جو میراج
خریدے ہیں۔ غیر ملکی کرنسی میں پورے پیسے دے کر
خریدے ہیں۔ اس کی کیا ضرورت تھی۔ چین سے
ٹینک اور طیارے لیے ہیں۔ امریکہ سے ایف ۱۰۵
طیارے لیے ہیں۔ تکہ خان پیکنگ جائیں۔ ہمیں
ضرورت ہو تو ہمارا آدمی بھی جاسکتا ہے۔ آپ کے
وسائل کم ہوگئے فوج بڑھ گئی۔ جنگی قیدیوں کے
خاندانوں کو بھی پوری تنخواہ دے رہے ہو۔ ہم ان پر جو
خرچ کررہے ہیں۔ وہ بھی دو گے۔

پروپیگنڈا بازی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم تو
علمبردار ہو امن کے تمہارا رویہ تو مثالی ہونا چاہیے پہلے
یہ ہوتا تھا کہ ذرا سی بات کہیں کسی نے لکھ دی تو ہماری
وزارت خارجہ کہتی تھی کہ ہمارا وقار مجروح ہورہا ہے۔
آج کل کی دنیا میں کوئی دوسرے کو اچھا یا برا نہیں کہہ
سکتا۔ پاکستانی سفیر اقوام متحدہ میں کچھ کہتے ہیں تو
کہنے دو۔ ہم جب تک خود مطمئن ہیں۔ کوئی کتنا ہی برا
کہے، ہم دو چیزیں نہیں چھوڑیں گے، جب تک کوئی بات
ہمیں اچھی لگے گی، آپ کے کہنے سے نہیں چھوڑیں
گے۔ آپ جنگی قیدیوں کے مسئلے پر ہمیں دبا رہے
ہیں۔ لاکھ امریکی برطانوی سفیر آکر ہمیں اس کے
لیے زور دیں گے ہم اس سے متاثر نہ ہوں گے۔

سفارتی آداب کا مسئلہ ہے۔ ورنہ دل تو کہتا ہے
کہ ان سے کہوں۔ ''آپ ٹھہرے ازلی اور ابدی
ڈھیٹ۔ آپ پر کسی کا کیا اثر ہوگا۔ میں خاموش رہتا
ہوں۔''

وہ کہتے ہیں کہ جب بھی ہم سے کوئی کچھ کہتا ہے،
ہم کہتے ہیں کہ یہ مشترکہ کمان کا مسئلہ ہے۔ بنگلہ دیش
کی منظوری ضروری ہے۔

کشمیر کے مسئلے پر وہ خود ہی کہنے لگے کہ کشمیر کا
معاملہ سمجھ لینا چاہیے جس طرح جرمنی نے سمجھ لیا، اس
کے لیے طاقت کا استعمال بے کار ہے۔ اب آپس
میں تعاون کی ضرورت ہے۔''

بات ختم ہوگئی۔ اس آفیسر کے کمرے سے میں
اُٹھ رہا ہوں اور جاتے جاتے ان کے پیچھے لٹکے
ہوئے دنیا کے نقشے پر نظر ڈال رہا ہوں جس میں مشرقی
پاکستان ابھی تک موجود ہے۔ اپنے کمرے کا نقشہ
بدلنے کی ابھی شاید انھیں توفیق نہیں ہوئی ہے۔ یہ
آفیسر اجازت بھی ہمیں اس رکھائی سے دے رہے
ہیں جس رکھائی سے انھوں نے خیر مقدم کیا تھا۔

دلی کے پرانے سیکریٹریٹ پر رات نے غلبہ پالیا
ہے۔ آج کا دن کتنا طویل رہا ہے۔ اب میں ہوٹل پہنچ
رہا ہوں ہندوستان میں آیا ہوں اور اب تک کوئی فلم
نہیں دیکھی ہے۔ یہ نہیں کہ میں اصولاً نہیں دیکھنا
چاہتا، بلکہ وقت ہی نہیں مل رہا ہے۔ اکثر ملاقاتوں کا
وقت فلم کے اوقات سے ٹکراتا ہے۔ ظاہر ہے یہ
ملاقاتیں میرے لیے زیادہ اہم ہیں اشوکا ہوٹل،
روشنیاں، استقبالیہ اور پھر وہی کمرہ نمبر ۲۶۳۔ جہاں
ریڈیو آن کرکے خبریں سنتا ہوں۔ پھر اپنے چھوٹے
ٹرانزسٹر سے دشمن ملک میں ریڈیو پاکستان کی
آواز سنتا ہوں۔ اب میں اطمینان سے سوسکتا ہوں۔

آج پیلو مودی صاحب سے ملنا ہے۔ وہ بھٹو صاحب کے دوست ہیں۔ ہم جماعت بھی رہ چکے ہیں۔ انھوں نے ایک کتاب "زلفی...... مائی فرینڈ" بھی لکھی ہے۔ جو آج کل ہاتھوں ہاتھ بک رہی ہے، پیلو مودی سوتنترا پارٹی کے سربراہ ہیں۔ اسے آپ اعتدال پسند سیاسی جماعت کہہ سکتے ہیں۔ جیسے ہمارے ہاں پی ڈی پی ہے۔ نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ مرنجان مرنج، فربہ جسم، رنگ کھلتا ہوا۔ عینک سے موٹی موٹی آنکھیں جھانکتی۔ آج کل ملیشیا کی شلوار اور قمیض پہن رہے ہیں۔ اوپر ایک شال ڈالے رکھتے ہیں۔ بتاتے ہیں کہ ابھی پاکستان گیا تھا تو بھٹو صاحب نے ایسے چند جوڑے تحفتاً دیئے تھے۔ رابندرا پارک میں کافی بڑے بنگلے میں رہتے ہیں۔ ان سے میں یونہی غیر رسمی بات چیت کررہا ہوں۔ انٹرویو وہ مناسب خیال نہیں کرتے ان کی لائبریری بہت بڑی ہے۔ بھٹو صاحب کی طرح تازہ ترین کتابوں کے مطالعے کا شوق انھیں بھی ہے۔ اپنا سیکریٹریٹ بھی بنا رکھا ہے۔ ان کے اپنے بیانات کی الگ الگ فائلیں ہیں۔ مسائل حاضرہ پر الگ تراشوں کی فائلیں ہیں۔

پارلیمنٹ کے ارکان اور سیاسی جماعتوں کے سربراہوں میں سے پیلو مودی ایسی شخصیت ہیں جو جنگی قیدیوں کے مسئلے پر شروع سے پاکستان کا ساتھ دیتے آئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میں بھٹو صاحب کی ذاتی دوستی کی وجہ سے نہیں بلکہ انسانی اور اخلاقی اعتبار سے ان کی واپسی کی حمایت کرتا ہوں۔ میں اور میری پارٹی چاہتی ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات آپس میں اچھے ہوں۔ یہ اس کے لیے انتہائی مناسب وقت ہے کیونکہ دونوں طرف منتخب جمہوری حکومتیں قائم ہیں۔ وہ پارلیمنٹ میں بھی اس کے حق میں آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔ اپنی اندرونی سیاست میں وہ کانگریس کا کافی زور وشور سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ ایک زمانے میں پارلیمنٹ میں اپوزیشن میں ان کی سب سے زیادہ سیٹیں رہی ہیں۔ وہ مجھ سے پاکستان کے سیاسی حالات کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں، مجھے جو کچھ معلوم ہے۔ میں انھیں بتاتا ہوں۔ انھیں پارلیمنٹ کے سیشن میں جانا ہے۔ مجھے بھی وہاں جانا ہے۔ اس لیے میں اجازت چاہتا ہوں۔

لوک سبھا میں [illegible]

بھارت اس اعتبار سے ایشیا کی بڑی جمہوریت ہے کہ یہاں جمہوری عمل 25 برس سے کسی نہ کسی طرح چل رہا ہے۔ اس میں گھپلے بھی ہوئے ہیں چالبازیاں بھی لیکن کبھی جمہوریت کا قتل نہیں ہوا اور ہماری طرح مارشل لاء بھی نافذ نہیں ہوا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ پارلیمنٹ کا اجلاس سال میں آٹھ مہینے جاری رہتا ہے۔ آج میں پہلی مرتبہ بھارت کی لوک سبھا کا اجلاس دیکھنے جارہا ہوں۔ برصغیر کی تاریخ کو تہہ وبالا کرنے میں اس پارلیمنٹ کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ دنیا کے 55 کروڑ افراد کی تقدیر اس پارلیمنٹ کے قبضے میں ہے۔ پارلیمنٹ کی عمارت انگریزوں نے بنائی تھی۔ تمام پارلیمانی آداب اور ضروریات سے مرصع۔ آج بیرونی تعلقات سے متعلق سوالات کا وقفہ ہے۔ پاکستان سے متعلق سوالات ضرور زیر بحث آئیں گے۔ اس لیے میں نے آج کا دن منتخب کیا ہے پریس کے لیے نشستوں کا انتظام ہماری سندھ اسمبلی کی طرح ہے۔ دائرے میں چھ قطاریں ہیں جن میں سے 4 سرکاری اور 2 اپوزیشن کی ہیں۔ یہ پورے ہندوستان کے نمائندے ہیں۔ ان میں وزیر بھی ہیں۔ وزیر مملکت بھی، جاگیردار بھی، سرمایہ دار بھی، صنعت کار بھی، سیاسی پارٹیوں کے لیڈر بھی لیکن ہماری طرح چمکتے دمکتے سوٹوں کی بہار نہیں ہے۔ ڈبل بریسٹ سوٹ تو کسی کے تن پر بھی نظر نہیں آتا۔ نکٹائی بھی کسی نے نہیں لگائی ہوئی ہے اکثریت دھوتی قمیض میں ہے، ماتھے پر تلک لگائے ہوئے، پھر پاجامے، قمیض والے ہیں۔ پھر اچکن پاجامے والے۔ پھر بند گلے والا کوٹ پہنے ہوئے نمائندے ہیں۔ خواتین نے سادہ ساڑیاں زیب تن کر رکھی ہیں۔ یہ پہلا تاثر ہے جو میں اس پارلیمنٹ سے حاصل کر رہا ہوں

25 سال میں ہندوستان نے خاصی ترقی کی ہے۔ مردوں نے ابھی تک ڈبل بریسٹ سوٹ پہننا نہیں سیکھا۔ خواتین نے بیل باٹم اختیار نہیں کیا۔ یہ لوگوں کے نمائندوں کا حال ہے عام لوگوں کو لباس کا کیا ذوق ہوگا۔

اپوزیشن کم تعداد میں ہے لیکن ایوان پر چھائی رہتی ہے۔ اس پارلیمنٹ میں بھی شاید جمہوریت اور پارلیمانی اصولوں کا بوجھ بنگالی ممبروں نے اپنے سر پر اٹھا رکھا ہے۔ زیادہ شور وہی مچاتے ہیں۔ زیادہ نکات بھی وہی اٹھاتے ہیں۔ آج بھارت کے وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ کو سوالات کا سامنا کرنا ہے۔ تحریری جوابات والے سوالات میں بھی زیادہ تر پاکستان کے بارے میں ہیں۔ شاید اس وجہ سے بھی کہ پارلیمنٹ کا اجلاس اکثر ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس لیے ان کے لیے کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ارکان اپنے علاقوں کا دورہ کرتے رہتے ہیں۔ جب ان سے متعلق کوئی ضروری معاملہ درپیش ہو تو یقیناً آجاتے ہیں اور حاضری اتنی بھی کم نہیں کہ کورم ہی پورا نہ ہو۔ آج 22 فروری ہے، آج ہندوستان کی لوک سبھا میں پاکستان کے بارے میں جو سوالات پوچھے جارہے ہیں وہ دیکھیے۔ اس طرح بروقت سوالات پوچھ لینے سے نہ صرف ارکان پارلیمنٹ بلکہ ہندوستانی عوام بھی حالات اور مسائل سے کیسے باخبر رہتے ہیں۔ ہماری طرح بے یقینی کی کیفیت نہیں رہتی ہے۔ ہم اسی انتظار میں رہتے ہیں کہ سرکاری ترجمان کوئی اخباری بیان دیں یا صدر مملکت کچھ فرمائیں تو معلوم ہو کہ کیا ہوا اور کیا ہونے والا ہے۔

پوچھا جارہا ہے۔ وزیر خارجہ بتائیں کہ بھارتی وزیراعظم کو پاکستان کے دورے کی دعوت دی گئی ہے۔ کیا صدر پاکستان نے باقاعدہ دعوت دی ہے۔ کیا یہ دعوت قبول کرلی گئی ہے۔ اگر قبول کی گئی ہے تو اس کی ممکنہ تاریخ اور معاملات جو زیر بحث آئیں گے۔

☆ وزیر دفاع بتائیں۔ چین کی طرف سے پاکستان کو اسلحہ کی امداد۔ کیا پاکستان کی طرف سے اعلیٰ اختیاراتی وفد نے چین کا دورہ کیا اور کیا اسلحہ حاصل کیا اگر ایسا ہے تو حکومت کا ردعمل۔

☆ وزیر خارجہ بتائیں کہ پاکستان نے ہندوستان پر الزام لگایا ہے کہ ہندوستان پاکستان کے جنگی قیدیوں کو رہا نہ کر کے جنیوا کنونشن کی شدید خلاف ورزی کررہا ہے۔ کیا حکومت کو اس الزام کا علم ہے اور اس کا اس سلسلے میں کیا ردعمل ہے۔

☆ ان سوالات کے زبانی جوابات طلب کیے جائیں گے اور تحریری جوابات ان سوالوں کے مانگے گئے ہیں۔

☆ پاکستان اپنے مقبوضہ علاقوں میں ہندوستانی فوج کی تباہ کاریوں کے سلسلے میں جو پروپیگنڈہ کررہا ہے کیا حکومت اس سے باخبر ہے اور کیا حکومت اس جھوٹے پروپیگنڈے کا جواب دینے کے لیے کوئی قدم اٹھا رہی ہے۔

☆ حکومت نے صدر بھٹو کو کیا کوئی ایسا پیغام بھیجا ہے جس میں شملہ معاہدہ کے بعد پیدا شدہ مختلف مسائل پر بھارت کے موقف کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں حکومت پاکستان نے کیا جواب دیا ہے۔

☆ صدر بھٹو کی طرف سے مبینہ طور پر بھارتی وزیر خارجہ کے خلاف جو قابل اعتراض زبان استعمال کی ہے جس کے بارے میں ہندوستانی ٹائمز مورخہ 20 جنوری 1973ء میں خبر شائع ہوئی ہے کیا حکومت اس سے باخبر ہے۔ اس سلسلے میں حکومت کا ردعمل۔ یوپی کے ایک کیمپ سے پاکستانی جنگی قیدی کا 11 جنوری 1973ء کو فرار۔ اس سلسلے میں کوئی تحقیقات کی گئی۔ اس تحقیقات کے نتیجے میں کوئی کارروائی کی گئی۔

پاکستان پروپیگنڈہ مشینری نے بین الاقوامی ریڈ کراس کی رپورٹ کو جس طرح استعمال کیا گیا ہے کیا

حکومت اس سے باخبر ہے۔ کیا رپورٹ کا کوئی قصہ بھارتی حکومت سے تصدیق کرائے بغیر ریڈ کراس والوں نے حکومت پاکستان کو براہ راست بھیجا ہے۔ اس سلسلے میں حکومت کا کیا رد عمل ہے۔

پاکستان کے ساتھ تجارتی، سفری اور مواصلاتی تعلقات کی بحالی کے سلسلے میں شملہ معاہدہ کی روشنی میں کیا کوئی قدم اٹھایا جا رہا ہے۔ کیا حکومت مسائل کی چھان پھٹک کے لیے اپنی طرف سے کوئی اقدام کرنا چاہتی ہے۔ کیا دونوں حکومتوں میں سے کسی نے اب تک کچھ کیا ہے۔ پاکستان میں مقیم غیر ملکی سفارتی نمائندوں کو ہندوستانی فوجوں کے خالی کیے ہوئے علاقے دکھائے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض نے جو بیانات دیے ہیں کیا وہ حکومت کے نوٹس میں لائے گئے ہیں اور حکومت کا کیا رد عمل ہے۔

لیکن فی الحال ان سوالات پر ایک بڑا سوال چھا گیا ہے۔ پورے ایوان میں ایک عجیب خوف اور سنسنی پھیلی ہوئی ہے۔ لندن میں بھارتی ہائی کمیشن پر چند نامعلوم افراد نے حملہ کر دیا ہے۔ پوری تفصیلات تو نہیں ملی ہیں۔ کل اخبارات کے باہر، خاص خبروں والے بورڈ پر بھی یہی خبر لگی ہے۔ آج صبح تمام اخبارات میں شہ سرخی یہی ہے اور لندن میں مقیم بھارتی اخبارات کے نمائندوں نے بھی بڑے تفصیلی تار بھیجے ہیں۔ بہت سے اخبارات نے پہلے دن ہی انہیں پاکستانی قرار دے دیا ہے۔ آج پارلیمنٹ میں سردار سورن سنگھ پہلے سرکاری طور پر بیان پیش کر رہے ہیں۔ اس بیان میں حکومت برطانیہ کی طرف سے موصول ہونے والی سرکاری رپورٹ میں پیش کی گئی ہے۔ لندن پولیس نے جو کارنامہ سرانجام دیا اس کی تعریف کی گئی ہے۔ سردار صاحب کے بیان پڑھے جانے کے بعد۔ سوالات شروع ہونے والے ہیں لیکن اس سے پہلے اپوزیشن کے ایک رکن لندن پولیس کے لیے تھری چیرز کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ ہندوستان کی پارلیمنٹ میں لندن پولیس کے لیے اپوزیشن اور سرکار دونوں کی طرف سے بچ بچا بچا کر خراج تحسین پیش کیا جا رہا ہے۔

اپوزیشن والے اپنے دوسرے سفارت خانوں کے تحفظ کے لیے سوالات کر رہے ہیں اور یہ پوچھ رہے ہیں کہ کیا حکومت نے برطانوی حکومت پر زور دیا ہے کہ وہ مجرموں کو سخت سزا دے۔

اس کے بعد دوسرے سوالات شروع ہو رہے ہیں۔ جس میں چھمب کا علاقہ پاکستان کو دینے پر بھی بڑی لے دے ہو رہی ہے۔ سردار صاحب بار بار جواب دیتے ہیں لیکن مغربی بنگال کے یہ رکن اپنی مخصوص بنگالی انگریزی میں پھر ایسی بوچھاڑ کرتے ہیں کہ سردار صاحب جھنجلا کر رہ جاتے ہیں۔ بے چارے پھر کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر کچھ وضاحت کرتے ہیں لیکن دال میں کچھ کالا تو ہے۔ اس لیے کھل کر جواب نہیں دے سکتے ہیں۔

پیلو مودی کا جثہ بھی خاصا مزاحیہ ہے پھر وہ کافی حد تک مزاحیہ کردار بھی ادا کرتے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے تفنن طبع کے لیے کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑتے رہتے ہیں۔ جس سے سب کی ہنسی چھوٹ پڑتی ہے۔ ہر چند سنٹ بعد وہ ایوان سے باہر نکل جاتے ہیں۔ پھر تھوڑی دیر بعد کچھ نہ کچھ بولتے ہوئے واپس آ جاتے ہیں۔

اسپیکر چاہے پاکستان کی قومی اسمبلی کا ہو یا ہندوستان کی لوک سبھا کا شاید ایک سا ہی ہوتا ہے۔ اپنے چوہدری فضل الٰہی صاحب کی طرح بھارت کے اسپیکر سردار گورو دیال سنگھ بھی دھیمے دھیمے لہجے بولتے ہیں، جو ارکان اسمبلی بھی شاید ہی سن پاتے ہوں، کوئی رکن کتنے بھی جارحانہ ہو رہے ہوں، وہ کبھی مشتعل نہیں ہوتے۔ اسپیکر کے علاوہ پاکستان کی قومی اسمبلی اور بھارت کی لوک سبھا میں ایک اور مشترک چیز بھی نظر آ رہی ہے۔

سانحے کی سنسنی خیز روداد
انہی صفحات پر ملاحظہ فرمایئے۔

توشۂ خاص، خوانِ ہفت رنگ حکایتیں

مختصر مختصر، خوش بیان، فرحت سامان، زہر کار، عبرت اثر حکایتیں

پہلی حکایت

زر بخت اور شب گل



سیدہ عطیہ زاہرہ

ایک ایسے طلن کی حکایت، جسے آپ کبھی فراموش نہ کر پائیں گے



بستی سر دخیل گاڑھی کہر میں ڈوبی ہوئی تھی، شدید سردی مزاج پوچھ رہی تھی۔ نلکوں میں پانی جما ہوا تھا، لیکن یہاں کے رہنے والوں کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔

زیادہ تر موسم ایسا ہی ہوتا تھا۔ عمر رسیدہ زمین تاج نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور گہری سانس لے کر گردن ہلانے لگا۔ ہلکے پھلکے رنگین کپڑوں میں ملبوس شب گل وسیع آنگن میں جھاڑو دے رہی تھی۔ موسم کی شدت کا اسے کوئی احساس نہیں تھا، جوانی موسم کو خاطر میں کہاں لاتی ہے، خود زمین تاج کو اپنی جوانی بھی یاد تھی۔

کبھی کبھی بستی میں شہری لوگ بھی آجاتے تھے۔ یہ سیاح ہوتے تھے، موٹے موٹے کپڑوں میں لپٹے ہوئے لیکن تھر تھر کانپتے ہوئے۔ سیر و سیاحت کے لیے آتے تھے لیکن سردی سے بچنے کے لیے چوہوں کی طرح بل تلاش کرتے پھرتے تھے۔ بستی کے لوگ ان پر خوب ہنستے تھے جن میں زمین تاج بھی ہوتا تھا۔ عمر البتہ بہت سی تسلیمات کا مرکز ہوتی ہے چنانچہ ساٹھ سالہ زمین تاج نے بھی مان لیا تھا کہ سر دخیل کا موسم زیادہ ہی سرد ہوتا ہے، پھر چار سال پہلے ہونے والے فالج نے اسے اور بھی بہت سی باتیں سمجھا دی تھیں۔ ہاں اب اگر وہ اپنی جوانی کی جھلک دیکھنا چاہتا تو اپنی بیٹی شب گل میں دیکھ لیتا تھا جس کے بالائی لب پر ایسے موسم میں بھی شکست خوردہ سردی کے قطرے نظر آجاتے تھے۔

”شب گل! پہلے مجھے قہوہ دے دو، صفائی بعد میں کرلینا۔“

”لائی بابا۔“ شب گل نے جھاڑو ایک طرف رکھی۔ چھوٹے سے باورچی خانے میں جاکر تیار قہوے کے دو بڑے پیالے بھرے اور انہیں لے کر زمین تاج کے پاس پہنچ گئی۔ ابھی اس نے قہوے کا گھونٹ بھی نہیں لیا تھا کہ باہر کے کھلے دروازے سے کوئی اندر داخل ہوگیا، یہ ایک چوبیس پچیس سال کا خوبصورت نوجوان تھا۔

دودھ جیسا چہرہ گھیرے گلابی ہونٹ دلکش نقوش۔ صرف ایک شلوار پہنے ہوئے اوپری بدن بے لباس۔

کمر پر ٹاٹ کی بوری پڑی ہوئی جس پر سخت کھردری لکڑیوں کا گٹھڑ رسیوں سے بندھا ہوا تھا جن کے دونوں سرے اس نے دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے تھے۔

کھپری کے پاس آکر اس نے گٹھڑ زمین پر پٹخا، رسیاں کھولیں اور لکڑیاں کھپری میں چننے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ جان لیوا سردی اس کے لیے مذاق سے زیادہ نہ ہو۔

''شب گل! اسے قہوہ دے.. مالک اسے پناہ دے، کتنی دور سے آیا ہے۔''

''جاتی ہوں۔'' شب گل اپنا قہوے کا پیالہ لے کر باہر نکل گئی۔ نوجوان تیزی سے لکڑیاں چن رہا تھا۔ پھر وہ لکڑیاں چن کر باہر نکل آیا۔ شب گل نے قہوے کا پیالہ نوجوان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''زربخت... لو قہوہ پی لو..''

''ارے اس کی کیا ضرورت تھی۔'' نوجوان نے پیالہ اس کے ہاتھ سے لے کر کہا اور شب گل مسکرا دی۔ شب گل اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔

''تمہاری بستی میں بھی اتنی ہی سردی ہے۔''

''ہاں.. ہوگی تو۔''

''تمہیں نہیں پتا۔''

''نہیں۔'' وہ بے نیازی سے بولا اور شب گل ہنس دی۔

زربخت قہوے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہا تھا اور شب گل کو دیکھے جا رہا تھا۔

''جلدی پیو۔'' شب گل بولی۔

''نہیں۔''

''کیوں۔''

''نہیں بتاؤں گا۔''

''نہ بتاؤ میں جانتی ہوں۔'' شب گل بولی۔



زر بخت بستی بازی دری میں رہتا تھا۔ امین خان کی لکڑی اور کوئلے کی ٹال پر نوکری کرتا تھا، اس کا کام لوگوں کے گھروں میں کوئلے اور لکڑی پہنچانا تھا۔ ماں باپ مر چکے تھے۔ امین خان ہی اس کا سب کچھ تھا، ماں بھی باپ بھی، شب گل اور وہ ایک دوسرے پر جان دیتے تھے چنانچہ اس نے امین خان سے کہا۔

''بابا خان... میں شب گل سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''سر دخیل کے زمین تاج کی بیٹی شب گل۔''

''جی بابا خان۔''

''ہوں... بات کروں گا اس سے۔'' امین خان نے کہا۔

سر دخیل اور بازی دری دو جڑواں بستیاں تھیں، درمیان میں شاغلی نالہ تھا جو عام دنوں میں تو سوکھا پڑا رہتا تھا، بارش کے موسم میں اس کی جوانی ناقابل تسخیر ہو جاتی تھی۔

لیکن جوان مرد اسے اس موسم میں بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے اور اس کے درمیان سے گذر کر دونوں بستیوں کے درمیان آنا جانا جاری رہتا۔ امین خان نے زمین تاج سے دونوں کی شادی کی بات کی تو زمین تاج نے کہا۔

''اچھا بچہ ہے... محنتی ہے... ہمت والا ہے۔''

''میرے لیے اولاد کی طرح ہے، میرے پاس ہی رہتا ہے، شب گل خوش رہے گی، میں خود اس کا خیال رکھوں گا۔''

زمین تاج نے بستی کے بڑوں سے رائے لی، ضروری امور طے ہوئے اور شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ تمام مدارج بحسن وخوبی طے ہو گئے۔ لیکن پچھلے دنوں موسم شدید ہو گیا۔

بارشیں وقت کے بعد بھی جاری رہیں۔ شاغلی تیزی سے دوبارہ بہنے لگا۔

زمین تاج نے امین خان کو پیغام بھیجا۔

''موسم کی وجہ سے تاریخ آگے نہیں بڑھائی جا سکتی، اگر تم مناسب سمجھو۔''

''دو مشورہ کرتا ہوں۔'' امین خان نے کہا۔

بزرگوں اور سیانوں نے تو پس و پیش کی، لیکن نوجوان اڑ گئے۔

''بستی میں دلہن وقت پر ہی آئے گی۔''

بارات وقت پر سر دخیل چل پڑی۔ نوجوانوں نے نالے کی ایک نہ چلنے دی اور پانی میں شرابور سر دخیل پہنچ گئے۔ نکاح ہوا رخصتی میں البتہ جلدی کی گئی تاکہ روشنی میں شاغلی عبور کر لیا جائے اور زر بخت ایک فاتح بن کر اپنی بستی چل پڑا۔ ہر طرف سے سیلاب کی خبریں مل رہی تھیں، خود ان دونوں بستیوں کے نشیبی علاقے پانی میں ڈوب گئے تھے، لیکن نوجوانوں نے حفاظتی انتظامات کر لیے تھے۔ وہ سیلاب کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے۔

زر بخت نے شب گل کو اپنی پناہ میں لے رکھا تھا، بارات شاغلی میں اتر گئی۔ باہمت نوجوان زنجیر بنائے ہوئے نالے سے گزر رہے تھے کہ اچانک... بہت دور سے پانی کی ایک دیوار متحرک نظر آئی۔

اس کی رفتار بے پناہ تھی۔ باراتیوں نے خوف سے اسے دیکھا۔ شاغلی اتنا بے رحم نہیں تھا وہ اپنوں سے ان کی زندگی کبھی نہ چھینتا۔ لیکن یہ سیلاب قدرتی نہیں تھا۔

پانی کا ریلا کہیں اوپر سے چھوڑا گیا تھا، آن کی آن میں وہ ان مختصر سے انسانوں کے سروں پر پہنچ گیا۔

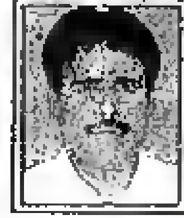
شب گل نے دلدوز چیخ ماری اور زر بخت سے لپٹ گئی۔

''کوئی بات نہیں۔'' زر بخت کی آواز ٹکڑوں میں نکلی اور اس نے شب گل کو بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ پانی کی پالکی شب گل کو لے کر برق رفتاری سے پیا گھر چل پڑی۔ زر بخت کی آواز جب تک نکل سکی وہ بولتا رہا۔

''ہم اپنے گھر جا رہے ہیں، بابا جان نے گھر بہت اچھا سجایا ہے، وہاں...'' وہ بولتا رہا مگر شب گل خاموش ہو گئی تھی۔ پھر زر بخت بھی خاموش ہو گیا۔

☆☆......☆☆

کسے الزام دوں



عبدالغفار عابد

اُس نوجوان کی حکایت غم ناک، جسے ناکردہ عذاب تاعمر جھیلنا پڑا

میری شادی آرزو سے ہوئی۔ شادی سے پہلے ہم دونوں اجنبی نہیں تو ایک دوسرے سے شناسا بھی نہیں تھے۔ منگنی کے بعد ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ضرور تھا لیکن گفتگو کا موقع نہیں ملا تھا۔ اصل میں ہماری محبت شادی کے بعد پروان چڑھی۔

وہ بہت جلد میری محبت میں گرفتار ہوگئی۔ اس کی

محبت میں بڑا والہانہ پن تھا۔ ایک طرح سے وہ میری دیوانی تھی۔ وہ مجھے اس قدر چاہنے لگی تھی کہ ایک منٹ کی جدائی بھی اسے گوارا نہ تھی۔ اس کی محبت نے مجھے بہت متاثر کیا میں بھی اسے شدت سے چاہنے لگا۔ ویسے بھی میری زندگی میں کوئی لڑکی نہ آئی تھی مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔

ہمارے شب و روز ہنستے کھیلتے اور خوشیاں لٹاتے گزر رہے تھے۔ چھ ماہ پلک جھپکتے میں نکل گئے تھے۔ ہماری محبت میں کوئی کمی نہ آئی تھی بلکہ وہ روز بہ روز بڑھتی ہی جاتی تھی۔

پھر شاید ہماری محبت کو کسی کی نظر کھا گئی۔ میرے ساتھ وہ ہوا جو کبھی کسی کے ساتھ نہ ہوا ہوگا۔ ڈاکٹر تو مسیحا ہوتا ہے لیکن میرے حق میں وہ قاتل ثابت ہوا۔ اس نے میری آرزو کو مجھ سے جدا کر دیا۔ دو پیار بھرے دل ہمیشہ کے لیے الگ ہو گئے۔

ہوا کیا؟ یہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ ہوا یہ کہ کچھ دنوں سے میرے دائیں پیر، دائیں بازو اور سر کے دائیں حصے میں درد رہنے لگا تھا۔ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا جیسے میرے جسم کے دائیں حصے نے کام کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ یہ ایک پریشان کن بات تھی لیکن ایسا کبھی کبھی ہوتا تھا۔ میں نے اپنی اس کیفیت کا گھر میں کسی سے ذکر نہیں کیا کہ سب خواہ مخواہ پریشان ہوں گے۔ میں خاموشی سے ڈاکٹر سے مشورہ کرنے چلا گیا۔ ڈاکٹر نے مختلف قسم کے ٹیسٹ اور الٹرا ساؤنڈ اور ایکسرے وغیرہ لکھ کر دیے اور چیک اپ کرنے کے بعد زندگی کا سب سے بھیانک انکشاف کیا کہ میرے جسم کے دائیں حصہ جلد یا بدیر بالکل مفلوج ہو جائے گا۔ اس نے وضاحت کی کہ میرے جسم کے دائیں حصے میں خون کا نظام بُری طرح متاثر ہو چکا ہے۔ پھر اس نے مجھے کچھ دوائیں لکھ کر دیں تاکہ وقتی طور پر اس حملے سے محفوظ رہوں۔ میں نے کپکپاتے ہاتھوں سے دواؤں کا نسخہ لیا اور ڈگمگاتے قدموں سے کلینک سے باہر آ گیا۔

اس انکشاف نے میری روح میں سناٹا اتار دیا تھا۔ یہ کیا ہو گیا تھا ابھی تو ہماری خوشیوں کا آغاز ہوا تھا کہ ڈاکٹر نے صور اسرافیل پھونک دیا۔

وہ شام میری زندگی کی بدترین شام تھی۔ آرزو نے میرا والہانہ انداز میں استقبال کیا لیکن میں اپنے اندر والہانہ پن نہ پیدا کر سکا۔ آرزو کو دیکھ کر بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو امڈے لیکن میں نے خود پر قابو کیا۔ اپنے آنسوؤں کو روکا۔ انھیں اندر ہی اندر پی لیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں یہ روح فرسا خبر آرزو کو نہیں سناؤں گا میں۔ اس سے اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ، اس آنکھوں کی چمک نہیں چھیننا چاہتا۔

میں کئی راتوں سے اپنی سنگین بیماری کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں جلد یا بدیر مفلوج ہونے والا تھا۔ میری زندگی تباہ ہونے والی تھی۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ میری بیماری کی سزا آرزو کو کیوں ملے۔ میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا بلکہ مجھے اس کا سو فیصد یقین تھا کہ وہ میری محبت میں اپنی ساری زندگی مجھ اپاہج انسان کے ساتھ گزار دے گی۔ مگر میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میری خاطر اپنی بھری جوانی برباد کر دے۔ اپنی زندگی میں آگ بھر لے۔

سوچ سوچ کر بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کو اصل وجہ بتائے بغیر طلاق دے دی جائے تاکہ وہ اپنی زندگی کے سنہرے دن بہتر طریقے سے گزار سکے۔ لیکن طلاق کے لیے آخر کوئی نہ کوئی جواز تو پیدا کرنا تھا۔ لہٰذا میں نے ایک ڈرامہ رچایا۔ ایک لڑکی سے محبت کا ڈرامہ..... میں نے آرزو پر یہ ظاہر کرنا شروع کر دیا کہ میں کسی اور لڑکی کی زلف کا اسیر ہو گیا ہوں اور اس سے ہر قیمت پر شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آرزو کو میری اس ''بے وفائی'' کا بڑی مشکل سے یقین آیا۔ بہرحال اس طرح میں نے اسے طلاق دے دی۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرنے کے باوجود ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔

☆☆☆

میری طلاق نے اُسے مظلوم بنا دیا جبکہ میں بدنام ہو گیا۔ کیونکہ طلاق کی اصل وجہ سے کوئی واقف نہ تھا۔ اپنی بدنامی کی مجھے ذرا بھر بھی فکر نہ تھی میں تو آرزو کو خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے سچی محبت کی تھی۔

اس طرح چھ ماہ اور گزر گئے۔ میری بیماری جوں

کی توں رہی ہے۔ میں ڈاکٹر سے علاج کرواتا رہا اور آنے والی مفلوج زندگی کے بارے میں غور کرتا رہا۔

ایک دن آرزو کا فون آیا۔ اس کے فون نے میرے دل کا خون کر دیا۔ اس کی شادی ہو رہی تھی۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔

"ناظم میں تمہیں زندگی بھر نہ بھلا سکوں گی۔ عورت زندگی میں صرف ایک دفعہ محبت کرتی ہے اور جس سے محبت کرتی ہے اسے ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھوں میں بسا لیتی ہے اسے بھلائے نہیں بھولتی۔"

اب میں اس کو کیا بتاتا۔ کیسے بتاتا کہ میں خود اسے ایک لمحے کے لیے نہیں بھلا سکا ہوں اور نہ ہی زندگی بھر بھلا سکوں گا۔ جب تک جیوں گا، اسے رو رو کر یاد کرتا رہوں گا۔ آرزو تم میری مفلوج زندگی کا سرمایہ ہو گی۔ تمہارے ساتھ گزارے ہوئے دن، میری بجھتی آنکھوں میں شمع کی طرح روشن رہیں گے۔

پھر آرزو کسی اور کی ہو گئی اور میں اپنی ہی لگائی آگ میں جلتا رہا۔

☆☆☆

ایک روز اچانک میرے ایک بچپن کے دوست اشفاق سے ملاقات ہو گئی جو کئی سالوں کے بعد وطن لوٹا تھا۔ اس سے بہت سی باتیں ہوئیں اس کے سامنے میں نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ میرا دل بھرا ہوا تھا میں نے وہ سب کچھ بتا دیا جسے میں نے اب تک راز رکھا ہوا تھا۔

وہ مجھے زبردستی ایک دوسرے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اس نے میرا تفصیلی معائنہ کیا، ٹیسٹ کروائے الٹراساؤنڈ کیا پھر ان رپورٹوں کو بغور دیکھا اور اپنا فیصلہ سنایا۔ اس کا فیصلہ میرے لیے بڑا جان لیوا تھا اس نے کہا میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میرے مفلوج ہونے کا قطعاً کوئی خطرہ نہیں ہاں یہ ٹھیک ہے کہ نظام خون میں کبھی کبھی رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے جسم سن ہو جاتا ہے۔"

اس نے پرانی دوائیں تمام بند کر دیں۔ نئی دوائیں لکھ کر دیں۔ ہلکی ورزش کرنے کا مشورہ دیا۔

اب بالکل ٹھیک ہوں مجھے کوئی بیماری نہیں لیکن میرا دل ویران ہو گیا ہے۔ اشفاق کہتا ہے کہ میں دوسری شادی کر لوں۔

میں جانتا ہوں کہ مجھ بدنام آدمی کو کون اپنی بیٹی دے گا۔ جس نے ایک محبت کی خاطر اپنی بیوی کو چھوڑ دیا۔ وہ آئندہ بھی کسی کی محبت میں گرفتار ہو کر اپنی دوسری بیوی کو بھی چھوڑ سکتا ہے۔ اب میں کس کس سے اصل حقیقت بیان کرتا پھروں گا۔ میری بات پر کون یقین کرے گا۔

☆☆☆

TITANIC

4 اپریل 1912ء کو دنیا کا مشہور بحری جہاز ٹائی ٹینک اپنے اولین بحری سفر کے دوران ایک آئس برگ سے ٹکرا کر بحر اوقیانوس میں ڈوب گیا۔ ٹائی ٹینک کا وزن 46,328 ٹن اور لمبائی 882.5 فٹ تھی۔ یہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا بحری جہاز تھا اور اس کے بارے میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ یہ کبھی نہیں ڈوب سکتا۔

10 اپریل 1912ء کو یہ جہاز تقریباً بائیس سو مسافروں کے ہمراہ اپنے پہلے بحری سفر پر روانہ ہوا۔ جہاز کے کپتان کا نام ای جے اسمتھ تھا۔ وہ ایک تجربہ کار کپتان تھا۔ اس نے کوشش کی کہ وہ بحر اوقیانوس کو سب سے کم مدت میں عبور کرنے کا نیا عالمی ریکارڈ قائم کرے چنانچہ اس نے جہاز کو انتہائی تیز رفتار سے چلانا شروع کیا اور ان انتباہی اطلاعات پر کان نہیں دھرے کہ سمندر میں آئس برگ موجود ہیں۔

14 اپریل 1912ء کو رات 11 بج کر 40 منٹ پر ٹائی ٹینک ایک آئس برگ سے ٹکرا گیا اور اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ جہاز میں لائف بوٹس نہایت مختصر تھیں جن کی مدد سے صرف 755 افراد اپنی جان بچا سکے اور باقی مسافر جن کی تعداد 1490 سے 1635 کے درمیان بتائی جاتی ہے ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔

مرسلہ۔ قاسم خان بلوچ۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ

100 روپے کا نوٹ

سیما عروج صدیقی

بے شک اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے، زندگی کی تعمیر کرتی ایک اعلیٰ پائے کی حکایت

میں ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہوں۔ شروع ہی سے اپنے مزاج میں قناعت پسند خوش مزاج اور من موجی ہوں مگر ساتھ ہی بہت مستقل مزاج بھی۔ تبھی آج میرے کلینک کو 30 سال ہونے کو آ رہے ہیں۔ میرے مریضوں کی اچھی خاصی تعداد میرے کلینک کو کامیابی سے ہمکنار کیے ہوئے ہے۔ کچھ اللہ نے ہاتھ میں شفا دی ہے کہ دور دور سے مریض آتے اور شفا یاب ہو رہے تھے۔ مگر میں نہیں جانتی تھی کہ دوسروں کو شفایاب کرانے والی خود گڑ گڑا کر رب کے حضور اپنے کیے کے باعث اپنی اولاد کی شفایابی کی التجائیں کرے گی۔

اللہ نے مجھے شادی کے بعد جلد ہی صاحبِ اولاد کر دیا۔ میرے ایک دو تین پھر چوتھی بیٹی پیدا ہوئی تو میں جو اللہ پر توکل رکھنے والی ہوا کرتی تھی۔ بوکھلا کر رہ گئی۔ الٰہی اتنی مہنگائی میں ان چار بیٹیوں کی شادی بیاہ تعلیم و تربیت آسان نہ تھی اس فکر کے ساتھ مجھے اور میرے شوہر کو بیٹے کی تمنا نے بے چین کر دیا۔

اب میری ہر دعا بس اولادِ نرینہ کے لیے ہوتی۔ میں اپنی ہومیو کلینک دوائیں بھی استعمال کرتی اور میاں کو بھی کھلاتی کہ اللہ ہمیں اولادِ نرینہ عطا کر دے۔

اور پھر جب پانچویں بار اللہ نے خوش خبری دی ہماری دعاؤں میں شدت آ گئی۔

میں نے باقاعدہ اولادِ نرینہ کے لیے وظیفے شروع کر دیے۔ اور پھر اس دن میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب مجھے ڈاکٹر نے الٹرا ساؤنڈ کے بعد بیٹے کی نوید سنائی۔

ہم دونوں میاں بیوی نے شکر کے سجدے کیے۔ میں نئے آنے والے کی آمد کے دن گن گن کر گزار رہی تھی۔ انہی دنوں میں اپنے کلینک میں بیٹھی تھی کہ ایک ٹرسٹ والے کلینک آ گئے۔ وہ معذور بچوں کے لیے فنڈ جمع کرتے تھے۔ وہ مجھ سے فنڈ کا تقاضا کرنے لگے۔ کافی دنوں سے میری دراز میں ایک 100 روپے کا کرارا نوٹ پڑا تھا۔

مگر استعمال کیوں نہیں ہو سکا تھا کہ اس کے ایک نمبر کی جگہ ایک چھوٹا سا سوراخ تھا۔ جس کی وجہ سے نمبر غائب تھا۔ میں نے یہ سوچے سمجھے بغیر کہ اللہ کی راہ میں ہمیشہ اچھا اور پاکیزہ مال دینا چاہیے۔ وہ سوراخ زدہ 100 کا نوٹ۔

حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے معذور بچوں کے لیے خیرات میں دے دیا۔

اس لمحہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اللہ کو میرا یہ ادنیٰ سا عمل کتنا ناگوار لگے گا۔

جس کا مجھے آگے چل کر نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ لیکن میں رب کی شکرگزار ہوں کہ رب نے مجھے اسی دنیا میں میرے گناہ کی سزا دے کر مجھے معاف بھی کر دیا۔ نجانے اس عمل کی سزا آخرت میں بھگتنا پڑتی تو کیا کرتی۔

100 روپے کی خیرات کے کچھ ہی دنوں بعد اللہ نے وہ دن بھی دکھایا جب میں سخت تکلیف سے تڑپ رہی تھی۔ لمحہ لمحہ مجھ پر نزع کی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ میری چاروں بیٹیوں کی پیدائش بہت آسانی سے ہو گئی تھی مگر اس بار مجھے سخت مشکل کا سامنا تھا خدا خدا کر کے اللہ نے یہ مشکل ترین مرحلہ طے کرایا میں نیم غنودگی اور نقاہت کی حالت میں بیڈ پر لیٹی تھی۔

تبھی نرس نے میری دعاؤں کا ثمر میرا بیٹا میری گود میں دیا۔

میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نا تھا۔ سب ہی خوش تھے۔ میرے شوہر کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے وہ مجھے متشکر نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

تبھی نرس نے بتایا کہ بچے کی کمر کے نچلے حصے میں ایک چھوٹا سا سوراخ ہے۔ ویسے بچہ بالکل نارمل اور صحت مند ہے فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم نے بچے کی کمر پر پٹی لگا دی ہے۔

آپ لوگ بچے کو کسی بڑے ڈاکٹر کو چیک اپ کرا دیجیے گا۔

بچہ کیونکہ نارمل ہوا تھا لہٰذا مجھے جلد چھٹی دے دی گئی۔ اور میں بچے کو لے کر گھر آ گئی۔ ہم نے بچے کا نام عمر رکھا کہ یہ ہماری دعاؤں کا ثمر تھا۔ بچہ بہت خوب صورت اور توانا تھا۔ مگر اس کی کمر کا ناسور بڑھنے لگا تھا۔ ہم نے کئی ڈاکٹروں کو دکھایا۔

انھوں نے آپریشن کا مشورہ دیا۔ مگر وہ ساتھ ہی کہتے تھے کہ بچے میں معذوری بھی آ سکتی ہے۔ میں



بہت کشش و پنچ میں تھی۔ میں خود ڈاکٹر ہو کر بے بس تھی۔ یہ ایسا مسئلہ تھا کہ میں اس ناسور سے گھن لگ چکا تھا۔

میرے بچے کی کمر کا ناسور دن بدن بڑھنے لگا تھا وہ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ریڑھ کی ہڈی نظر آنے لگی تھی۔ ڈاکٹروں نے ایسی بات کہی تھی کہ دل آپریشن کے لیے راضی نہ ہوتا تھا۔ میں اپنے بچے کو معذور دیکھنے کے لیے آمادہ نہ تھی میں اُس کی کمر کی جتنی دیکھ بھال کرتی ناسور اتنا ہی گہرا ہوتا جاتا۔ اب سوائے اس کے کوئی اور راستہ نہ تھا کہ میں ہر مشکل میں ہمیشہ کی طرح خدا سے گڑ گڑا کر التجائیں کروں کہ وہ میرے بچے کو صحت عطا کر دے۔

اچانک میرے دل میں خیال آیا کہ ڈاکٹروں کی اتنی فیس دوں گی کیوں نہ پہلے صدقہ کروں۔ صدقہ ردِ بلا ہوتا ہے۔ ہم بیماریوں کے علاج پر تو بے دریغ خرچ کرتے ہیں صدقے کی طرف ہمارا خیال کم ہی جاتا ہے۔

سب لوگوں کا مشورہ تھا کہ بچے کا سوراخ جس تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اُس کے لیے بہر حال ہمیں رسک لینا ہی ہوگا اور آپریشن کروانا ہی ہوگا۔ باقی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

لہٰذا آپریشن کی تاریخ لے لی گئی۔ ساتھ ساتھ میری دعاؤں میں انتہائی رقت اور شدت آ چکی تھی میں ہر وقت اپنے رب سے گڑ گڑا گڑ گڑا کر دعائیں کرتی تھی انہی دنوں میرے والدین حج کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔

میں نے اُن سے خصوصی طور پر بیت اللہ میں اپنے بیٹے کی صحت یابی کے لیے دعا کرنے کو کہا۔ امی ابو کے جانے کے اگلے پندرہ دنوں بعد آپریشن کی تاریخ تھی۔ اس دوران میں نے بکرے کا صدقہ بچے کے لیے دیا۔ ادھر امی ابو نے خانہ کعبہ میں بچے کے لیے خصوصی دعائیں کرائیں۔

اب رب کو مجھ پر رحم آیا اور اچانک ایک روز میرے ذہن میں یہ خیال کوندا کہ کہیں میرے رب کی طرف سے یہ اس سوراخ زدہ 100 روپے معذور بچوں کے لیے صدقے کا نتیجہ یا سزا تو نہیں جو میں نے اس خیال سے دیا تھا کہ چلو یہ کہیں نہیں چل رہا انہیں دے دیتی ہوں۔

اس خیال کے آتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں سرتاپا لرز گئی۔ یقین ایسا ہی تھا۔ وہ 100 روپے کا ننھا سا سوراخ میرے بیٹے کی کمر کا ناسور بن کر مجھے ملا تھا۔

معذور بچوں کے فنڈ میں 100 روپے دیے تو میرے بیٹے کی معذوری کا سبب ہو گیا تھا۔ کیوں اس لیے کہ اللہ کی راہ میں اچھا اور پاکیزہ مال دینے کا حکم ہے اور میں نے اللہ جو ہمیں سب کچھ دیتا ہے اُس کی راہ میں وہ 100 روپے دیے تھے جو کسی کام کے نہ تھے۔ میں نے اپنی دانست میں قدرت کو دھوکہ دینے کی کوشش کی تھی اتنا بڑا گناہ مجھ سے نادانستگی میں ہو گیا یہ میں نے کیا کیا؟

اس خیال کے آتے ہی میں سجدے میں گر گئی اور اللہ سے رو رو کر معافی مانگی۔ وہ بڑا کریم ہے اور رب نے مجھے معاف کر دیا۔

سجدے سے اٹھی تو دل کا بوجھ جیسے ہلکا ہو چکا تھا۔ ہومیوپیتھک میں ایک مرہم ہوتا ہے ”کیلنڈولا“ میں نے وہ مرہم اپنے بچے کی کمر کے ناسور میں بھرا اور اُسے کھلا چھوڑ دیا۔ دن میں تین بار میں ایسا کرتی اور صفائی کرتی۔

قارئین! آپ یقین کریں تیسرے دن میرے بچے کا زخم خود بخود اس ایک مرہم سے بھرنا شروع ہو گیا اور آپریشن کی تاریخ آتے آتے میرے بچے کا زخم 75 فیصد ٹھیک ہو گیا تھا۔

زخم کس طرح بھرا میں نہیں جانتی بس میں تو اتنا جانتی ہوں کہ اللہ بڑا رحیم و کریم ہے۔ اُس نے مجھے آزمائش میں ڈال کر مجھے ہدایت بخشی اور میرے بچے کی زندگی۔ آج میرا بیٹا بالکل صحت مند نارمل ہے۔ اللہ کے حضور شکر گزاری کے طور پر میں نے اپنے بیٹے کو حافظ بنایا ہے۔ تاکہ وہ اپنے رب کی حمد و ثنا کرتا رہے۔

☆☆......☆☆

چوتھی حکایت

بازی گر



امیر حمزہ بلوچ

اُس بازی گر کی حکایت عبرت، جو مہذب بازی گری میں کمال رکھتا تھا



میں نے جب سے بجائے اسٹیج پر "بھائی صاحب" کو دولہا کے روپ میں دیکھا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اس شادی میں، میں لڑکی والوں کی طرف سے مدعو تھا۔ دلہن، میری بیوی کے رشتے داروں میں سے تھی۔ میں نے شادی کارڈ بھی غور سے نہ دیکھا تھا۔ اب اپنے آپ پر بڑا غصہ آرہا تھا۔ اگر میں شادی کارڈ کو غور سے پڑھ لیتا تو بھائی صاحب کا نام اور ولدیت پڑھ کر میں فوراً سمجھ جاتا کہ دولہا کون ہے؟ اور اگر مجھے پہلے سے دولہا کے بارے میں معلوم ہوجاتا تو پھر یہ شادی کسی قیمت پر نہ ہونے دیتا، میں دولہا کے بارے میں وہ سب کچھ بتادیتا جو میرے علم میں تھا۔ لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ نکاح ہوچکا تھا میں اور میری بیوی دولہا دلہن کو شادی کی مبارک باد دینے اسٹیج کی طرف جارہے تھے۔ تب میں نے دولہا کو غور سے دیکھا تھا۔

میرے لیے دولہا کوئی اجنبی شخص نہ تھا۔ وہ میرا سابقہ بہنوئی تھا۔ سابقہ اس لیے کہ اب میری بہن اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔ میری بہن روشنی واقعی کسی کی مانند تھی۔ چمکتی اور جھلملاتی ہوئی۔ وہ جہاں بھی ہوتی سب سے الگ نظر آتی۔ بہت خوب صورت اور بہت معصوم۔ اس کی عمر ہی کیا تھی کہ وہ شادی کے بندھن میں بندھ گئی۔ مشکل سے سترہ اٹھارہ سال کی رہی ہوگی۔ میری خالہ، اصغر احمد کا رشتہ لائیں۔ اصغر احمد کو جس نے بھی دیکھا پسند کیا۔ رشتہ اچھا تھا۔ لڑکا صاحب حیثیت اعلیٰ تعلیم یافتہ، خوب صورت اور نیک تھا۔ ایسے رشتے تقدیر ہی سے ملتے ہیں۔ یہ سوچ کر میرے والدین نے فوراً ہاں کردی لیکن جب میں نے اصغر احمد کو دیکھا تو مجھے وہ پسند نہ آئے۔

میں نے اپنی رائے کا امی سے اظہار بھی کردیا میری رائے کو اس وقت کوئی اہمیت نہ دی گئی بچکانہ سمجھی گئی۔ میں اس وقت تھا بھی بچہ۔ میں روشنی سے صرف ایک سال چھوٹا تھا۔ مرد تھا لہٰذا روشنی سے ایک سال بڑا لگتا تھا۔ ویسے بھی میں نے روشنی کو بڑے ہونے کے ناتے کبھی باجی نہ کہا۔ روشنی ہی کہتا تھا اور اسے چھوٹی بہنوں کی طرح ٹریٹ کرتا تھا۔

خیر، اصغر احمد سے میری بہن کی شادی ہوگئی۔ شادی کے بعد میں اصغر احمد کو بھائی صاحب کہنے لگا۔ آخر کو وہ میرے بڑے بہنوئی تھے ان کو عزت سے تو پکارنا تھا۔ وہ بھی مجھے خاصی اہمیت دیتے تھے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں اپنے بہنوئی کا ادب ضرور کرتا تھا لیکن ان سے مجھے محبت کبھی نہ ہوئی۔ میرا ان سے دل کبھی نہیں ملا۔ اس کی وجہ کیا تھی، یہ میں کبھی نہ سمجھ سکا۔ شاید یہ قدرتی بات تھی۔ بھائی صاحب بڑے ملنسار اور بااخلاق واقع ہوئے تھے جو بھی ان سے ایک بار مل لیتا، ان کا گرویدہ ہوجاتا۔ اسی حسن اتفاق نے انھیں بچائے رکھا، رسوا نہ ہونے دیا۔ میری بہن روشنی، اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی اور کوئی بھائی صاحب کی طرف انگلی بھی نہ اٹھا سکا۔

میری بہن روشنی شادی کے بعد صرف چھ ماہ زندہ رہ سکی۔

اور جو کچھ ہوا، وہ اس قدر بھیانک تھا کہ مجھ سے برداشت نہ ہوسکا مجھے اپنی بہن روشنی سے بے حد محبت تھی۔ جب میں نے روشنی کے بارے میں یہ سنا کہ وہ زندگی کے آخری سفر پر روانہ ہوگئی ہے تو میں بے ہوش ہوگیا۔

وہ بات ہی ہوش اڑا دینے والی تھی۔ مرنے سے پہلے وہ ایک ہفتہ ہمارے گھر رہ کر گئی تھی۔ مجھے اگر معلوم ہوتا کہ روشنی اب کبھی اس دہلیز پر قدم نہ رکھ سکے گی تو میں اسے یہ دہلیز پار ہی نہ کرنے دیتا۔

اپنی زندگی کے خاتمے سے چند گھنٹے پہلے اس نے مجھ سے فون پر بات کی تھی۔ وہ اس دن کس قدر خوش تھی۔ وہ مجھ سے پکنک پر چلنے کا پروگرام بنا رہی تھی۔ اس بے چاری کو کیا معلوم تھا کہ تقدیر اس سے کیا کھیل کھیل رہی ہے۔

چند گھنٹوں کے بعد دنیا ہی بدل چکی تھی۔

اصغر احمد ہمارے گھر آئے تو ان کی حالت غیر تھی۔ بمشکل انھوں نے وہ روح فرسا خبر سنائی۔ تو ہم لوگوں کی صدمے سے چیخیں نکل گئیں۔ میں تو اپنے ہوش ہی گنوا بیٹھا۔

میری پیاری بہن اپنے گھر میں جل مری تھی۔

آگ پورے گھر کو لگی تھی گھر کا سارا سامان جل گیا تھا۔ آگ اس قدر تیزی سے پھیلی تھی کہ روشنی کو گھر سے نکلنے کا موقع نہ ملا۔ بھائی صاحب گھر پر نہ تھے۔ وہ جب اپنے ایک دوست سے مل کر گھر پہنچے تو ان کا گھر شعلوں میں گھرا ہوا تھا اور محلے کے لوگ آگ بجھانے کی اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔

جب تک فائر بریگیڈ آیا اس وقت تک پورا گھر جل چکا تھا۔ بھائی صاحب نے روشنی کو بچانے کے لیے شعلوں سے گھرے گھر میں گھسنے کی کوشش کی لیکن محلے کے لوگوں نے انھیں پکڑ لیا وہ دیوانہ وار چیختے رہے۔ ''میری روشنی اندر ہے مجھے اندر جانے دو۔'' لیکن کسی نے انھیں اندر نہ جانے دیا۔

گھر جل گیا۔ میری پیاری بہن روشنی بھی راکھ ہوگئی۔ گھر میں آگ کس طرح لگی۔ یہ کبھی معلوم نہ ہوسکا۔ روشنی کی لاش بیڈروم میں ملی۔

رات کا وقت تھا۔ آگ تقریباً رات کے دس بجے لگی۔ بھائی صاحب جس وقت گھر پہنچے اس وقت تک سب کچھ جل کر راکھ ہو چکا تھا۔

روشنی اور گھر کے جلنے کے بعد سے اصغر احمد بہت اَپ سیٹ ہوگئے تھے۔ انھوں نے اس گھر کو فروخت کر دیا اور امریکہ چلے گئے۔

کچھ عرصے ان کے خطوط آتے رہے پھر آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بند ہوگیا۔ ہر خط میں روشنی کی باتیں ہوتی تھیں۔

اصغر احمد نے میری بہن کی زندگی کا بیمہ کرا دیا تھا مکان بھی بیمہ شدہ تھا۔ مکان جلنے اور روشنی کے مرنے سے انھیں ایک بھاری رقم ملی۔ یہ رقم ایک کروڑ روپے تھی۔ اصغر احمد نے ہم سے کبھی اس بیمے کا ذکر نہ کیا۔

یہ بات ہمیں اصغر احمد کے امریکہ چلے جانے کے بعد ان کے دوستوں سے پتا چلی۔ بس تبھی سے مجھے اصغر احمد سے نفرت ہوگئی۔

دس گیارہ سال بعد، میں نے ایک مرتبہ پھر اس بازی گر کو دولہا بنا دیکھا تو میں نے خود کو شعلوں میں گھرا پایا۔ اصغر احمد کی صورت دیکھ کر میرے دل میں دھواں سا اٹھنے لگا تھا۔

امریکہ سے واپس آ کر اب اس نے اس شہر میں

بڑا آدمی

''بڑے آدمی کی تمام خوبیاں اور فضائل اس کی زندگی میں بھی کام آتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی اس کی عظمت کو اجاگر کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ جب بڑا آدمی مرتا ہے تو اگلے دن خبر آتی ہے کہ اس شہر کے تمام بڑے آدمی شریک ہوئے۔

تاہم بڑے آدمی کاروں میں قبرستان پہنچ جاتے ہیں۔ کندھا دینے والے چار آدمی چھوٹے آدمی ہوتے ہیں کیوں کہ ان کے کندھے چوڑے اور مضبوط ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ بڑے آدمیوں کو کندھا دیتے ہیں۔ افسوس کہ بڑے آدمی بھی بالآخر اس جہانِ فانی سے کوچ کر جاتے ہیں اور انھیں بیس کنالوں کی کوٹھیوں سے نقل مکانی کر کے بقیہ عمر چھوٹے آدمیوں کے ساتھ دو گز والے پلاٹ کی قبروں میں بسر کرنا پڑتی ہے۔ بڑے آدمیوں کو چاہیے کہ وہ اس بات پر غور کریں اور یہ بات اپنے بڑے آدمیوں کے نوٹس میں لائیں۔''

حسنِ انتخاب: ریاض حسین تبسم چوہان۔ فیصل آباد

قیام کیا تھا اور اب پھر سے ایک نیا جال بنا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ نکاح ہو چکا تھا۔ اب اس کے بارے میں کسی کو کچھ بتانا بیکار تھا۔ میرے پاس کوئی ثبوت نہ تھا میں کس سے کیا کہتا۔ کیا بتاتا میری بات کا بھلا کون یقین کرتا۔

تب میں نے اتنا کیا کہ اسٹیج پر چڑھتے چڑھتے واپس پلٹ آیا میں اصغر احمد کی شکل دیکھنا نہیں چاہتا تھا مجھے اس سے شروع سے ہی کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اب تو مجھے اس سے نفرت ہوگئی تھی۔ وہ میری بہن کا قاتل تھا۔

☆☆......☆☆









ان دنوں ہم لاہور کے علاقے گوالمنڈی میں رہائش پذیر تھے۔ میرے والد صاحب ایک کامیاب بزنس مین تھے۔ جس کی وجہ سے ہماری گزر بسر بہت اچھی طرح سے ہو رہی تھی۔ میں گورنمنٹ سینٹرل ماڈل ہائی اسکول (لوئر مال) لاہور میں پڑھا کرتا تھا۔ ندیم میرا کلاس فیلو اور بہت ہی اچھا دوست تھا۔ وہ اور میں پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے وہ ہماری کلاس کا سب سے لائق اور ہوشیار طالب علم تھا۔ اس کے والد صاحب موچی تھے۔ سارا دن وہ جو کچھ کماتے اس سے گزارا مشکل سے ہوتا تھا۔ ندیم اپنے دونوں بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اس کے والد صاحب بڑی مشکلوں سے اسے سینٹرل ماڈل اسکول لوئر مال میں داخلہ دلوایا۔

ندیم جب اسکول میں آتا تھا تو لڑکے اس کا حلیہ دیکھ کر مذاق اڑایا کرتے تھے۔ کیونکہ اس کا لباس اور جوتے بہت خراب حالت میں ہوا کرتے تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوتا میں ندیم سے اکثر کہا کرتا تھا کہ اگر تم برا نہ مناؤ تو میں تمہیں نئے کپڑے اور جوتے خرید کر دے دوں۔''

جواب میں وہ کہتا کہ یار معظم! اگر مجھے تم سے مدد لینے کی عادت پڑ گئی تو میں زندگی میں بھی آگے بڑھ نہ پاؤں گا۔ میری صلاحیت اور جذبہ ختم ہو جائے گا۔ اگر لڑکے میرا لباس اور جوتے دیکھ کر مذاق اڑاتے ہیں تو کوئی بات نہیں۔ مجھے ان کی باتوں پر کبھی غصہ نہیں آتا۔ آج میرے دن برے ہیں تو کل میرے دن اچھے بھی آ سکتے ہیں۔ کیونکہ وقت ایک سا نہیں رہتا۔ مجھے تو علم حاصل کرنا ہے اور ایک بڑا آدمی بننا ہے۔ میرے حالات ضرور ٹھیک ہوں گے انشاء اللہ۔''

ایک دن ندیم کے والد صاحب کو دل کا شدید دورہ پڑا اور فوراً اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان دنوں میں اور ندیم چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے۔ اس دن میں ندیم کے گھر گیا اور اس کے والد صاحب کے انتقال کی تعزیت کی۔ اس کے دونوں چھوٹے بھائی اور والدہ محترمہ بری طرح رو رہی تھیں۔ ندیم نے حوصلے سے کام لے کر اپنے بھائیوں اور والدہ محترمہ کو صبر کرنے کی تلقین کی۔

ابھی ندیم کے والد صاحب کو وفات پائے چند ماہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ اسکول کی طرف سے ندیم کو یہ نوٹس دیا گیا کہ چار ماہ کی فیس ایک ہفتے میں جمع کرا دو۔ ورنہ تمہیں اسکول سے نکال دیا جائے گا۔

ویسے تو ندیم اسکول کا نہایت لائق اور ہونہار طالب علم تھا۔ مگر پھر بھی اسکول والوں نے اصول پرستی کی بنا پر اسے یہ نوٹس جاری کر دیا۔ ندیم بہت پریشان ہوا۔ میں نے ندیم کو حوصلہ دیا کہ اللہ تعالیٰ پر امید رکھو وہ سب ٹھیک کرے گا۔

اگلے دن میں اسکول گیا تو ندیم غیر حاضر تھا۔ آدھی چھٹی کے وقت میں فوراً گھر آیا۔ والد صاحب گھر پر موجود تھے۔ سلام و دعا کے بعد میں نے انھیں ندیم کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ اور اس کی مدد کرنے کے لیے کہا۔

والد صاحب نے کہا کہ معظم بیٹا! اگر ندیم لائق ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں چار ماہ کی فیس تو کیا اس کے لیے ایک سال کی فیس بھی دے دیتا ہوں۔ مگر تمہارے دوست کو یہ پتا نہ چلے کہ اس کی مدد کس نے کی ہے؟ بس تم ابھی اسکول جا کر یہ ایک سال کی فیس اور چار ماہ کی بقایا فیس جمع کرا دو۔"

میں نے والد صاحب سے وعدہ کیا کہ ابا جان میں ایسا ہی کروں گا۔ چنانچہ میں فیس کی رقم لے کر واپس اسکول آیا۔ اور فیس جمع کرانے کے بعد میں نے کلرک کو ہدایت کی اس کے بارے میں وہ کسی کو کچھ نہ بتائے کہ یہ کام کس نے کیا ہے؟

دوسرے دن جب ندیم اسکول آیا تو اسے پتا چلا کہ اس کے بقایا جات اور ایک سال کی فیس کوئی جمع کروا گیا ہے۔

تو اس نے فوراً کلرک سے جا کر پوچھا کہ وہ نیک آدمی کون تھا؟ تو کلرک نے جواب دیا کہ ایک خدا ترس آدمی یہ تمام رقم جمع کروا گیا ہے۔ ویسے میں اسے نہیں جانتا کہ وہ کون تھا؟ اس نے تو اپنا نام پتا بھی نہیں بتایا۔

اسی طرح ندیم کی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ دسویں جماعت تک میرے والد صاحب برابر ندیم کی فیس کی رقم مجھے دیتے اور میں خفیہ طریقے سے جمع کروا دیتا۔ میٹرک میں ندیم نے پورے اسکول میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔

ان ہی دنوں ندیم نے آرمی میں درخواست دے رکھی تھی۔ جو منظور کر لی گئی تھی۔ اور بلاوا بھی آ گیا جانے سے پہلے وہ کلرک سے ملا اور کہا کہ اب تو بتا دو کہ وہ نیک آدمی کون تھا؟ جو میری فیس ادا کرتا رہا ہے۔ اب تو میں اسکول چھوڑ کر آرمی جوائن کرنے جا رہا ہوں۔ میں اس نیک دل ہستی کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ جس کی بدولت میں اپنی منزل کے قریب پہنچ چکا ہوں۔ کلرک کو ندیم کی حالت پر ترس آ گیا اور اس نے بتا دیا کہ وہ نیک ہستی کون ہے؟ جس نے تمہارے ساتھ بھلائی کی ہے۔

ندیم بہت حیران ہوا۔ آرمی جوائن کرنے سے ایک دن پہلے وہ گھر آیا اور میرے گلے لگ کر رونا شروع کر دیا اور کہا کہ یار معظم! تم میرے ساتھ بھلائی کرتے رہے اور مجھے پتا بھی نہ چلا کہ میرے ساتھ وہ نیک ہستی ہے جس نے میرے ساتھ اتنی بڑی بھلائی کی ہے۔

میں تمہارے اس احسان کو ساری عمر نہیں بھولوں گا۔

میں نے کہا کہ ندیم یہ سب اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے کیا ہے اور میں اس بھلائی کا ذریعہ بنا۔

ندیم چھ سال کے بعد واپس آیا۔ کافی بدل چکا تھا۔ کیپٹن کی وردی میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ میرے گھر آ کر مجھ سے گلے ملا اور کہا کہ یہ چھ سال کیسے کاٹے میں تمھیں بتا نہیں سکتا۔

وعدہ تو تین سال کے بعد آنے کا تھا مگر میں اس لیے نہیں آیا کہ اس وقت میں ایک چھوٹا آفیسر تھا۔ اب میں ماشاء اللہ کیپٹن بن کر تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔ اور تمھیں سیلوٹ کرتا ہوں۔

پھر واپس جاتے وقت وہ اپنی ماں اور دونوں بھائیوں کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ ندیم مجھے کبھی کبھی سال دو سال کے بعد ملنے ضرور آتا ہے۔ وہ ماشاء اللہ اب فل کرنل (کمانڈو) ہے۔

میری ہمیشہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ندیم کو ہمیشہ اپنی حفاظت میں رکھے جہاں بھی رہے خوش رہے اور اس سے بھی بڑا آفیسر بنے۔ آمین۔

☆☆......☆☆

استعفیٰ

محمد اسماعیل بروہی

اُس شخص کا قصہ عبرت، جسے زندگی کی سروس سے اچانک ہی استعفیٰ دینا پڑ گیا تھا

عشق کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ عشق کسی بھی عمر میں ہوسکتا ہے۔ چاہے آپ کی عمر بارہ سال ہو یا باون سال۔ علیم صاحب نے اس کہاوت کو سچ کر دکھایا۔ ان کی عمر کسی بھی طرح باون سال سے کم نہ تھی۔ سر کے سارے بال سفید تھے بلکہ بھنویں تک چاندی کی طرح چمکتی تھیں۔ اس عمر میں وہ ایک چوبیس سالہ لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوگئے۔ معلوم نہیں پہل کس طرف سے ہوئی، اس لڑکی نے چکر چلایا یا علیم صاحب نے اس پر جال پھینکا۔ بہرحال لوگوں نے یہ دیکھا کہ ایک دن وہ دفتر آئے تو ان کے بال کالے بھنورا جیسے ہوگئے تھے۔ اسمارٹ آدمی تھے۔ بھنویں اور سر کے بال کالے ہوئے تو ان کے حسن میں نکھار آگیا۔ صحت اچھی تھی۔ خوب تیز تیز چلتے تھے اس عشق نے ان کی چال میں اور تیزی بھر دی۔ وہ چست لباس زیب تن کرنے لگے۔

علیم صاحب بینک میں ایک بڑے افسر تھے۔ وہ سیلف میڈ آدمی تھے۔ کلرکی سے ترقی کر کے اعلیٰ افسری تک پہنچے تھے۔ بیوی کلرکی کے زمانے کی چلی آرہی تھی جو اب انھیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اگرچہ علیم صاحب کی بیوی ان سے پانچ سال چھوٹی تھیں لیکن عورتیں، مرد کے مقابلے میں جلد بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ سو ان کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ بیوی پرانی ہو جائے اور بوڑھی نظر آئے تو پھر مرد کن اکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا ہے۔ علیم ویسے شریف آدمی تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کیریر بنانے میں گزار دی تھی۔ وہ عورتوں کے چکر میں کبھی نہیں پڑے تھے۔ اگر پڑتے تو یہاں تک ترقی بھی نہ کرتے۔ اب جانے کیا ہوا کہ بیٹھے بٹھائے انھیں عشق ہوگیا اور وہ بھی باون سال کی عمر میں اور ایک چوبیس سالہ لڑکی سے.....

وہ چوبیس سالہ لڑکی رافعہ بڑی چونچال تھی۔ اس رافعہ کو بینک جوائن کیے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا لیکن اس نے حیرت انگیز طور پر ترقی کی تھی۔ وہ کمپوزر سے افسر گریڈ میں آگئی تھی۔ رافعہ بہت تیز قسم کی لڑکی تھی۔ اس نے بینک میں یہاں سے وہاں تک ہر طرف جال پھینک رکھے تھے۔ وہ سب سے مسکرا کر ملتی اور اس طرح لفٹ دیتی کہ بندہ سمجھتا، بس یہ مجھی پر مرتی ہے۔ بینک کے چھوٹوں سے لے کر بڑوں تک ہر کوئی اُس کا گرویدہ تھا۔ مسکرا کر ملنے، ہنسی مذاق کرنے اور بے تکلف گفتگو کے باوجود وہ بندے کو اس کی حد میں رکھتی تھی۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ کس سے کس طرح ملنا ہے۔ کس کو گھر کا پتا بتانا ہے اور کس کو دفتر کے دروازے پر ہی خدا حافظ کہہ دینا ہے۔ رافعہ ایک زمانہ شناس لڑکی تھی۔ خوب صورت تھی لیکن بے وقوف نہ تھی۔ وہ ہر ایک کے دل کی ملکہ بنی ہوئی تھی لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے سر کا تاج کون ہے؟

علیم صاحب کو جانے کیسے یقین ہوگیا تھا کہ رافعہ ان کے دل کی ملکہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ رافعہ نے اس طرح





کی کوئی لائن دی ہو۔ انھیں غلط فہمی میں ڈالنے کی سعی کی ہو۔ اصل معاملہ کیا تھا، یہ تو معلوم نہیں لیکن علیم صاحب رافعہ کے معاملے میں سنجیدہ ہو گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی عمر کم کرنے کے لیے بال رنگ لیے تھے۔

اب وہ باون سال سے بیالیس کے ہو چکے تھے وہ درمیانے قد اور گٹھے ہوئے جسم کے مالک تھے لہٰذا یہ جھوٹ، نبھ گیا تھا۔ اب رافعہ ادھر اُدھر، یہاں وہاں علیم صاحب کے ساتھ دیکھی جا رہی تھی۔ علیم صاحب کی خصوصی دلچسپی نے رافعہ کے لیے ترقی کی راہیں کھول دی تھیں۔ انھوں نے کوشش کر کے اس کا گریڈ بڑھوا دیا تھا۔ انھی سے بھاری شاپنگ کروادی تھی، اس کی پسند کے زیورات کا بھی آرڈر دے دیا تھا۔

اور معاملات خطرناک صورت اختیار کرنے جا رہے تھے علیم صاحب، رافعہ کے گھر کے کئی چکر لگا چکے تھے ان کا خیال تھا کہ رافعہ کے والدین ان کے اعلیٰ عہدے سے متاثر ہو کر اپنی بیٹی کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیں گے لیکن انھوں نے اس رشتے کی سختی سے مخالفت کی تھی۔

خیر راضی تو رافعہ بھی نہ تھی، وہ ان کی محبت کا دم بھرتی تھی۔ کہتی تھی کہ ہماری آپ کی دوستی پکی لیکن شادی کی بات نہ کریں۔ ایک تو والدین راضی نہ ہوں گے دوسرے وہ پہلے سے شادی شدہ اور کئی جوان بچوں کے باپ تھے۔ جب رافعہ کے والدین نے ٹکا سا جواب دے دیا تو رافعہ نے ان سے شادی کی یہ شرط رکھی کہ وہ اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دیں۔ علیم صاحب طلاق دینا نہ چاہتے تھے لیکن رافعہ کے لیے اس پر بھی راضی ہو گئے۔ انھوں نے پہلی بیوی کو دودھ بال کی طرح نکال پھینکا اور طلاق دے دی۔

آج ان کا رافعہ سے نکاح تھا۔ انھوں نے اس نکاح کے لیے ایک دوست کا گھر حاصل کر لیا تھا۔ اس وقت اس گھر میں علیم صاحب شادی کا سوٹ پہنے بے قراری سے اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ بنگلے پر ان کے دو دوست موجود تھے۔ نکاح خواں بھی آ چکے تھے لیکن جس سے نکاح پڑھایا جانا تھا، وہ ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔

رافعہ کیونکہ یہ شادی والدین کی مرضی کے خلاف کر رہی تھی لہٰذا اس نے تنہا ہی گھر سے آنا تھا اور ہمیشہ کے لیے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا، علیم صاحب کی بے قراری بڑھتی ہی جاتی تھی اور دلہن کا کہیں دور تک پتا نہ تھا۔

تین گھنٹے کے جان لیوا انتظار کے بعد ایک بند لفافہ آیا۔ یہ لفافہ بنگلے کے گیٹ پر کوئی لڑکا دے گیا تھا۔ لفافہ علیم صاحب کے نام تھا۔ انھوں نے بے قراری سے لفافہ چاک کیا۔ لکھا تھا۔

”علیم صاحب! میں آپ سے کسی قیمت پر شادی نہیں کر سکتی، آپ نے میری خاطر اپنی بیوی کو چھوڑ دیا، ہو سکتا ہے کل آپ کسی اور کی خاطر مجھے چھوڑ دیں۔ اس خط کے ساتھ ہی میں اپنا استعفیٰ بھی بھیج رہی ہوں۔ براہ کرم اسے منظور فرما کر ممنون کیجیے۔“

علیم کبھی اس خط کو دیکھتے، کبھی استعفیٰ کو دیکھتے اور کبھی نکاح خواں کو۔ ان کی زندگی بھی لگتا تھا اُن سے استعفیٰ ہی مانگ رہی ہوں۔ اور پھر وہ اس جگہ سے غائب ہو گئے۔ سنا ہے کہ انھوں نے اس عمر میں اپنی بدنامی کا داغ دھونے کے لیے اپنی جنم بھومی سے بھی استعفیٰ دے دیا ہے۔ یعنی ملک بدر ہو گئے ہیں۔

☆☆......☆☆

ساتویں حکایت

چٹھی نہ کوئی سندیس...

منیر احمد جوکھیو

محبت کی ایک ایسی حکایت جس میں ملن اور جدائی دونوں موجود ہیں

میں اور امتیاز قبرستان کا نظارہ کر رہے تھے۔ ہم اپنے مردوں کے دعائے بخشش کے لیے ہر سال محرم کی 9 تاریخ کو یہاں ضرور آیا کرتے تھے۔ کیوں کہ ان دنوں میں قبرستان آنا اور پھر اپنے پیاروں کے ایصال ثواب دینے سے کئی گناہ زیادہ اجر ملتا ہے۔ ہمارے گاؤں کا سب سے بڑا قبرستان تھا۔

پچھلی صدیوں میں جب یہاں میروں کی حکومت تھی اس زمانے سے لے کر آج تک یہی ایک بڑا اور پرانا قبرستان مانا جاتا ہے۔ گھومتے گھومتے ہم ایک گنبد کے قریب چلے گئے، جس میں میں ایک بڑا مزار بنا ہوا تھا۔ جب گنبد کو اندر سے دیکھا تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کاریگروں نے اس پر بڑی خوب صورتی سے مینا کاری کی تھی۔ ہم نے ان کی کاریگری کو سلام پیش کیا۔ پینٹنگ کے ساتھ ساتھ انھوں نے پھلوں کی پینٹنگ بھی کر ڈالی تھی۔ جیسے کہ آم، کیلا، سیب، تربوز وغیرہ ہم بڑی دیر تک اس گنبد کو دیکھتے رہے۔ کچھ دیر بعد ہم وہاں سے نکلے تو میری نظر ایک سرنگ پر پڑی، نیچے سرنگ اور اس کے اوپر قبر سی بنی ہوئی تھی۔ امتیاز دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کر کے کہا۔

''امتیاز یہ دیکھو قبر کے اندر سرنگ ہے۔'' امتیاز بھی اس سرنگ کو دیکھتے ہی میری طرح ہکا بکا رہ گیا اور بولا۔ ''کس نے بنائی ہوگی یہ سرنگ۔''

''پتا نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

اتنے میں ایک بوڑھا آدمی ہمارے پاس سے گزرا میں نے اس سے پوچھا کہ انکل کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ سرنگ کیسے بنی؟ بوڑھے نے کہا۔

''بیٹا میروں کے پاس بے شمار خزانہ تھا، اسی لیے وہ لوگ اپنے خزانے کو محفوظ کرنے کے لیے ان کے اوپر مقبرے بناتے تھے۔'' بوڑھا چلا گیا۔ ہم بھی گاؤں کی طرف چل دیے۔ ''یار پچھلی صدیوں میں ایسا بھی ہوتا تھا۔'' امتیاز حیرانی سے بولا۔ میں نے سر ہلاتے ہوئے اس کی بات کی تائید کی۔

ہم قبرستان سے فاتحہ خوانی کے بعد جب ہم گھر کی طرف مڑے تو امتیاز کے منہ سے نکلا۔ ''ایک نہ ایک دن ہمیں بھی یہاں آنا ہے۔'' میں کچھ نہیں بولا۔

ہماری دوستی کو سالوں بیت گئے، دن بدن ہماری دوستی گہری سے گہری ہوتی جا رہی تھی۔ بچپن میں ہم اسکول ایک ساتھ جاتے اور چھٹی کے وقت بھی ایک ساتھ ہی لوٹتے۔ ہم اپنی نہ ٹوٹنے والی دوستی کو آگے بڑھانے میں مصروف تھے۔

میں اسکول سے چھٹی کے بعد امتیاز کے گھر سے دور کھیتوں میں جا کر ملتا جہاں وہ اپنے باپ کے ساتھ کھیتی باڑی کرتا۔ وہاں ہم دونوں خوب گپیں لگاتے، ہنسی مذاق میں دن ایسے گزر جاتا کہ پتا ہی نہیں چلتا۔

میٹرک کے بعد میں نے اپنی تعلیم کو خیر آباد کہہ دیا کیوں کہ ہمارے گھریلو حالات ایسے تھے کہ میں اپنی تعلیم کو جاری نہ رکھ سکتا تھا۔

اب میں بھائی کے ساتھ مزدوری کرنے لگا تھا۔

ایک دن امتیاز بیمار پڑ گیا اس کے گھر والے اُسے علاج کے لیے دادو لے کر چلے گئے۔

کیوں کہ ہمارے گاؤں میں ایک چھوٹی سی ڈسپنسری تھی جس میں معمولی علاج ہوتا تھا اگر کوئی بڑا پیشنٹ آجاتا تو ڈاکٹر ان کو بولتے کہ اس پیشنٹ کا علاج کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ تو وہ اپنے پیشنٹ کو بڑی مشکل سے دادو ہسپتال پہنچاتے۔ اگر کوئی سیریس پیشنٹ ہوتا تو راستے ہی میں دم توڑ دیتا۔

شام کو جا کر میں بس اسٹاپ پر کھڑا ہو گیا کیوں کہ امتیاز دادو سے آنے والا تھا۔ مجھے اس کی بڑی فکر لگی ہوتی تھی۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے آنے لگے تھے کہ آخر امتیاز کو بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا ہے۔

میں ابھی کھڑا ہی تھا کہ بھائی وہاں مجھے لینے آ گیا کہ امی نے بلایا ہے۔ وہ مجھے گھر لے آیا۔

گھر پہنچا تو امی کے بتائے ہوئے کاموں سے فرصت ہی نہیں مل رہی تھی۔ وقت کا پتا ہی نہ چلا۔ جب فارغ ہوا تو رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ گلیاں سنسان ہو چکی تھیں، دیہات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

میں نے امتیاز کے گھر جا کر اُسے آواز دی۔ وہ باہر آیا تو میں اس سے لپٹ گیا۔

''اوہ میرے یار! بول کیسی ہے طبیعت تیری؟''

میں نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ بس جسم میں عجیب



سی بے چینی اور ٹانگوں میں جان نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے تین دن کی دوائی دی ہے اس کے بعد ڈاکٹر کے پاس جائیں گے دادو۔'' پھر آپس کی باتیں ہوئیں اور کچھ دیر بعد میں گھر چلا آیا۔ صبح کو بھائی نے کہا کہ دوسرے گاؤں میں بابا کو کام ملا ہے ٹھیکے کا۔ وہاں ہم بھی جائیں گے۔''

میں بڑے بھائی کو کیسے انکار کرسکتا تھا۔ ویسے بھی بیکار سے بیگار اچھی ہوتی ہے۔

☆☆☆

ہم وہاں جاکر کام میں لگ گئے وہاں کا کام بڑا مشکل تھا۔ کیونکہ سرکاری کام سیمنٹ سے ہو رہا تھا۔ اس کام میں ہاتھ اور پاؤں زخمی ہو جاتے تھے۔ مجھے امتیاز کی الگ فکر لگی ہوئی تھی۔ روز رات کو اس کے بارے میں سوچتا رہتا تھا کہ پتا نہیں امتیاز کیسا ہوگا۔ اس کی طبیعت کیسی ہوگی۔ وہ صحت مند ہوا ہوگا کہ نہیں۔ گن گن کے پندرہ دن گزارے تب جاکر گاؤں جانے کی چھٹی ملی۔

اپنے گھر جانے سے پہلے ہی میں نے امتیاز کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ گھر سے ایک چھوٹا بچہ نکلا۔ اس نے کہا کہ امتیاز کھیتوں پر گیا ہوا ہے۔''

اس وقت میں بہت تھکا ہوا تھا۔ اس لیے گھر چلا گیا صبح کو دیر سے آنکھ کھلی نہا دھوکر ناشتا کر کے امتیاز کے پاس کھیتوں میں پہنچ گیا۔ جیسے ہی اس کی مجھ پر نظر پڑی وہ دوڑتا ہوا آیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ خوشی کے ساتھ ساتھ وہ ہلکی ہلکی سسکیاں بھی لے رہا تھا۔ میں نے اس کی سسکیاں سنیں تو جھٹکے سے اس کا بازو پکڑ کر بولا۔

''کیا ہوا یار!''

''مت پوچھ یار مت پوچھ۔'' اس نے تھوڑا آگے چلتے ہوئے کہا۔

''یار بھی کہتا ہے اور پوچھنے سے منع بھی کرتا ہے۔ کیسی یاری ہے میرے یار۔'' میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے کہا۔

''بس...... اس نے ایک زوردار چیخ ماری اور میرا ہاتھ اچھالتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے خون بھرا ہوا تھا۔ میں ہکا بکا رہ گیا اور اس کے منہ کو تکتا رہا۔ تھوڑی دیر گزارنے کے بعد وہ دوڑ کر میرے سینے سے لگ گیا اور رونے لگا۔

''پتا نہیں کن ظالموں نے مجھ پر تعش ڈالا ہے، میرے اندر جیسے سوئیاں چبھ رہی ہیں۔''

''کیا!'' میں نے جھٹکے سے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور کہا کہ یہ تو کیا کہہ رہا ہے امتیاز۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں میرے دوست۔ میرا دل بھی آہستہ آہستہ جکڑتا جا رہا ہے اور میرے دل کو سکون بھی نہیں ہے۔'' مجھے ایک شدید حیرت کا جھٹکا لگا اور سوچنے لگا کہ آخر کون ہو سکتا ہے، جو امتیاز کے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑا ہوا ہے اور پھر میں نے امتیاز کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''یار اللہ پر بھروسہ رکھ وہ تجھے بالکل ٹھیک کر دے گا۔''

امتیاز سے مل کر میں گھر چلا آیا۔ بھائی نے کہا کہ کل کام پر چلیں گے میں نے اسے کہہ دیا کہ یہ کام مشکل ہے، مجھ سے نہیں ہوگا۔ اور میں کراچی چلا آیا۔

ایک فیکٹری میں مجھے کام مل گیا اور میں دل لگا کر کام کرتا رہا اور فرصت کے وقت امتیاز کو خط بھی لکھتا اور امتیاز میرے خط کا جواب باقاعدگی سے دیتا۔

فیکٹری میں مجھے چار ماہ گزر گئے لیکن میں گاؤں نہ جاسکا۔ ایک ماہ سے امتیاز کی طرف سے خط کا جواب نہیں آیا تھا۔ میں نے لگاتار دو خط لکھ ڈالے پھر بھی جواب نہیں آیا۔ ایک دن بڑا بھائی آن پہنچا۔ اس کے ساتھ اس کا دوست بھی تھا۔ بھائی نے کہا کہ تم گاؤں کیوں نہیں آ رہے۔''

بس میں اس سوال کا جواب کیا دیتا۔ خاموش ہی رہا۔ باتوں باتوں میں بھائی نے بتایا کہ تیرا دوست امتیاز فوت ہو گیا۔

میرے اوپر جیسے سکتہ سا طاری ہو گیا اور دل میں ایسی چوٹ لگی کہ رونے کی آواز بھی اندر دب کر رہ گئی۔

میں کتنا بدنصیب انسان ہوں، جس دوست سے ایک پل بھی الگ نہیں رہ سکتا تھا اس دوست کا آخری دیدار بھی نصیب نہیں ہوا۔

اس واقعے کو دس برس بیت گئے اب بھی جب امتیاز کی یاد آتی ہے تو آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ یہی قدرت ہے اور سب کی منزل وہی ہے۔ جیسے میرا جان سے پیارا دوست بغیر کسی چٹھی، سندیس کے مجھ سے دور ہو گیا تھا۔ ہمیشہ نہ ملنے کی تشنگی دے کر۔

☆☆......☆☆

خزانہ

شازیہ گل

اُس باپ کا قصہ جس نے اپنی بیٹی کو خزانے کے لالچ میں برباد کر دیا

میں جب سارہ کے گھر داخل ہوئی تو مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آرہا تھا۔ میرے سامنے میری پیاری دوست ثانیہ ابدی نیند سو رہی تھی۔ اور آنٹی جمیلہ (سارہ کی امی) بار بار بے ہوش ہو رہی تھیں۔ رو رو کر بے حال ہو رہی تھیں۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ سارہ نے خودکشی کی تھی۔

''مگر کیوں؟''

یہ سوال بار بار مجھے تنگ کر رہا تھا۔ مگر میں خاموش رہی۔ جب سوئم والے دن میں آئی تو مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے آنٹی جمیلہ سے پوچھا۔

''آنٹی مجھے سارہ کی موت کا بہت افسوس ہے مگر اُس نے خودکشی کیوں کی؟''

''کیا بتاؤں ثانیہ بیٹا! سارہ ہماری کم عقلی اور لالچ کی بھینٹ چڑھ گئی۔ میری سارہ مر گئی بیٹا میری سارہ مر گئی۔''

''آنٹی سنبھالیں خود کو پلیز۔''

''ہاں بیٹا سارہ تو ہماری دنیا اندھیر کر کے چلی گئی کاش میں اُس کی بات کا یقین کر لیتی مگر......''

''کیا مگر؟ آنٹی پلیز کچھ بتائیں کیا ہوا تھا سارہ کو؟''

میری بات سن کر وہ غموں سے چُور داستان بتانے لگی۔

''آج سے 25 دن پہلے تمہارے انکل یعنی سجاد کی دکان پہ عارف (سجاد کا دوست) کے ساتھ ایک پیر یعنی سائیں مستو آئے۔ سجاد کی کپڑے کی دکان ہے اور ان دنوں اُس کا کام بہت نرم جا رہا تھا۔ عارف جب سجاد کی دکان پہ آیا تو اس کے ساتھ ایک بزرگ بھی تھے۔ سلام دعا کے بعد سجاد نے انھیں چائے پانی کا پوچھا۔ اور عزت کی ساتھ بٹھا دیا۔

''کاروبار کیسا چل رہا ہے سجاد؟'' عارف نے پوچھا۔

''بس کیا بتاؤں یار عارف کام کرنے کو دل ہی نہیں کرتا سارا دن گزر جاتا ہے اِکا دُکا ہی گاہک آتے ہیں۔ گھر کے اخراجات بھی بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ بہت پریشان ہوں یار۔''

''اچھا پریشان نہ ہو سجاد یہ سمجھ لے کہ اللہ نے تیرا مسئلہ حل کر دیا۔ ان سے ملو یہ ہیں جناب بابا سائیں مستو صاحب! ان کے پاس ہر مسئلے کا حل موجود ہے۔ بہت کرامات والے بابا جی ہیں۔ میرے بھی

دو تین مسئلے تھے جوان کی دعا اور تعویذات سے حل ہوگئے ہیں۔"
"اچھا! تو پھر بابا جی آپ دیکھیں نا، میرا کام کاروبار اتنا نرم کیوں چل رہا ہے۔ ہر وقت مالی پریشانیاں گھیرے رکھتی ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا؟"



"کوئی بات نہیں بیٹا پریشان نہ ہو۔" سائیں مستو نے کہا۔

سائیں مستو نے ہاتھ میں تسبیح پکڑی ہوئی تھی اور کاندھے پہ ایک چھوٹا سا بیگ تھا جس میں اُس نے اپنی تعویذات کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ سجاد نے دکان بند کی۔ عارف کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے سجاد کا مسئلہ حل کرنے کا سوچا۔ اور سائیں مستو کو لے کر گھر پہنچا۔

دروازے پہ دستک دی۔ دروازہ سارہ نے ہی کھولا۔ سائیں مستو نے جب سارہ کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ خوب صورت دراز قد سترہ سالہ سارہ اتنی حسین اور معصوم تھی کہ جو دیکھتا دیکھتا ہی رہ جاتا۔ سارہ کے حسن کو دیکھتے ہوئے سائیں مستو کی نیت میں بھی کھوٹ آ گیا۔

سجاد نے اپنی بیوی کو سائیں مستو کے بارے میں بتایا اور پھر وہ سائیں مستو کو لے کر ایک کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔ سائیں مستو نے ایک کاغذ پہ کچھ آڑی ترچھی لکیریں کھینچیں اور سجاد سے کہا۔

"آپ کے گھر پر اور کام کاروبار بند کرنے کے لیے کسی نے کالا جادو کروایا ہوا ہے۔" پھر اتنا کہا اور پھر کاغذ پر کچھ لکیریں کھینچیں اور سجاد سے کہا۔

"مبارک ہو آپ کو! میرے مؤکلات نے بتایا ہے کہ آپ کے گھر میں خزانہ چھپا ہے۔ مگر ایک مسئلہ ہے اس خزانے کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ایک خاص عمل کرنا پڑے گا۔ اور اس کے لیے مجھے کسی نوجوان بچی کی ضرورت پڑے گی۔ چالیس دن کا عمل ہے۔"

سجاد خوشی سے چہک کر بولا۔

"بابا جی میں ساری زندگی آپ کا احسان مند رہوں گا اور بچی کی فکر نہ کریں میری بیٹی سارہ بھی 17 سال کی ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے ہم کل سے ہی عمل شروع کر دیں گے۔"

☆☆☆

دوسرے دن اُس نے ایک خالی کمرے میں سارہ کو بلایا۔ سجاد اور اُس کی بیوی کو سائیں مستو پہ بہت بھروسہ تھا۔ کیونکہ وہ دونوں میں ہی سائیں مستو نے اُن کا اعتماد جیت لیا تھا۔ سجاد اور اُس کی بیوی نے بلا جھجک سارہ کو اُس کے پاس تنہا کمرے میں بھیج دیا۔ سائیں مستو بہت چالاک تھا۔ کمرے میں جانے سے پہلے سائیں مستو نے سجاد سے کہا۔

"مؤکلات کے آنے کی وجہ سے ہوسکتا ہے آپ کو چیخوں کی آواز آئے تو گھبرانا نہیں۔ سارہ بچی ہے پہلی بار مؤکلات سے ہم کلام ہوگی تو ہوسکتا ہے گھبرا جائے مگر آپ لوگ دھیان نہ دینا۔ اور کمرے کی طرف کسی کو نہ آنے دینا۔ ورنہ عمل ٹوٹ جائے گا۔"

پھر جب سائیں مستو کمرے میں داخل ہوا تو سارہ کچھ سہمی سہمی سی تھی۔ سائیں مستو نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگالی اور اپنے چھوٹے بیگ سے ایک بوتل نکال کر سارہ کو حکم دیا کہ پہلے اس کو پی لو۔ سارہ نے کپکپاتے ہاتھوں سے بوتل تھام کر جیسے ہی ہونٹوں کے قریب کی تو کچھ عجیب سی بدبو لگی مگر سائیں مستو نے گرج کر حکم دیا کہ پی لو۔ اور مجبوراً سارہ نے پی لی۔

مگر تھوڑی دیر میں اُس کی حالت عجیب ہونے لگی اور اس کا پورا فائدہ اٹھایا اور انسان نما شیطان ظاہر ہوگیا۔ سارہ کو اس نے بے دردی سے بھنبھوڑ ڈالا۔ اس کی عزت کی دھجیاں اڑا دیں۔ اور اس سے بھی زیادہ کمینہ پن یہ کیا کہ اس کی نازیبا ویڈیو بنا ڈالی۔ اور اُسے ویڈیو دکھا کر کہا کہ اگر گھر والوں کو یا کسی کو بھی کچھ بتایا تو اس کی ویڈیو نیٹ پر دے دے گا۔

سارہ کو چپ لگ گئی سارہ نے ماں کو بتانے کی کوشش کی مگر ان کی آنکھوں پہ تو سائیں مستو کے اعتبار کی پٹی بندھی تھی وہ کچھ سننے کو تیار نہ تھے اسی طرح 15 دن گزر گئے۔ سارہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ اور سولہویں دن سارہ نے رات کو زہر کھا کر خودکشی کر لی۔ کیونکہ اُس نے اپنی امی کو جب بتانا

چاہا تو اس کی امی اُس پہ غصہ کرنے لگی۔

امی پلیز مجھے اس درندے کے ساتھ کمرے میں نہ بھیجیں۔ وہ جھوٹ کہتا ہے۔ اُس کے پاس کوئی موکلات نہیں۔ وہ خود ایک شیطان صفت انسان ہے۔"

"ارے کیا کہہ رہی ہو سائرہ۔ خبردار جو تو سائیں بابا کے خلاف اک لفظ بھی بولا تو۔ وہ ہمارے محسن ہیں ہمارے لیے چلّہ کاٹ رہے۔ تاکہ ہمارے دن پھر جائیں اور تو اُن کے خلاف بول رہی ہے۔"

سائرہ جان گئی تھی کہ اس کے ماں باپ اُس کی بات کا کبھی یقین نہیں کریں گے 15 دن وہ اُس شیطان کی حوس کا نشانہ بنتی رہی مگر سولہواں دن اُسے گوارہ نہ تھا۔ اس لیے اُس نے خودکشی کو ہی راہ نجات جانا۔

سائرہ کی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی اور سائیں مستو کو پتا چلا تو وہ بھی فرار ہو گیا۔ دوسری صبح اُسی کمرے کی صفائی کرتے ہوئے سائرہ کی چھوٹی بہن نادیہ جو پندرہ سال کی تھی اس کو سائیں مستو والے کمرے سے ایک میموری کارڈ ملا جو اُس نے لاکر اپنے ابو کو دیا۔

سجاد نے کارڈ جیب میں ڈال لیا۔ کچھ دنوں بعد جب وہ اس غم سے باہر نکلے تو انہیں خیال آیا کہ کئی دنوں سے سائیں مستو نہیں آئے۔ جیسے ہی موبائل نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو میموری کارڈ ہاتھ میں آ گیا۔ سجاد نے میموری کارڈ اپنے موبائل میں ڈال کر جب وڈیو آن کی تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ان سے مزید نہ دیکھا گیا۔

اور سائرہ کی موت کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ جس خزانے کی لالچ میں انھوں نے اپنی بیٹی اور اُس کی عزت کھو دی وہ خزانہ نہ تھا نہ ملا۔

سائیں مستو آج تک فرار ہے دوبارہ نظر نہیں آیا۔ اب آخر میں میری درخواست ہے اپنے مسلمان بہن بھائیوں سے کہ پلیز عقیدہ توحید پہ یقین رکھیے۔ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پہ یقین لائیں۔ یہ یاد رکھیں کہ اللہ کے حکم کے بغیر اگر ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا تو پھر یہ جعلی عامل اور جعلی پیر کیا کسی کی قسمت سنواریں گے۔

جو بھی مانگنا ہی صرف اللہ سے مانگیں۔ کیونکہ وہ اس کائنات کا مالک ہے وہی دینے والا ہے باقی ان لوگوں پر بھروسہ کر کے اپنا ایمان ضائع مت کریں۔ اور بیٹی کی عزت ہی سب سے بڑا خزانہ ہے۔ ہو سکے تو اس خزانے کی حفاظت کیجیے۔ اللہ ہم سب کو نیک کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆......☆☆

Tit for Tat

امریکا کے سابق صدر کولج نے ایک مرتبہ اپنے چند دوستوں کو وائٹ ہاؤس میں کھانے کی دعوت دی۔ امریکی صدر کے یہ دوست کھانے پینے کے آداب سے واقف نہ تھے چند لمحوں بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ کھانے کی میز پر صدر کولج کی نقل کریں گے۔

کھانے کا مرحلہ بخیر و خوبی گزر گیا اور میز پر کوفی رکھی گئی۔ صدر نے طشتری لی اور اس میں کوفی انڈیلی۔ مہمانوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد صدر نے کوفی میں چینی اور کریم ملائی۔ مہمانوں نے بھی صدر کی نقل کی مگر مہمانوں کو اُس وقت بڑی مشکل پیش آئی جب صدر نے کوفی بھری ہوئی طشتری فرش پر رکھ دی اور اپنی پالتو بلی کو بلانے لگے۔

مرسلہ۔ خضر حیات۔ روڈہ تھل

دوسری مرد کہانی

انصاف کون کرے گا؟

راشد لطیف

اُس مرد کی کہانی، جسے مہنگائی اور روپے مار گئے

''راشد اٹھو، صبح ہو گئی ہے، آج کام پہ نہیں جانا کیا؟'' راشد کی بیوی نے اُسے پیار سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اوہو! سکون سے نیند بھی نہیں کرنے دیتی۔ یارب میرے نصیب میں سکون لکھ دیتا تو تیرا کیا جاتا۔'' راشد بڑبڑاتا ہوا بستر سے اٹھ بیٹھا۔

راشد کرایے کے مکان میں رہتا تھا۔ کچی دیواریں، ایک کمرا، ساتھ چار دیواری بنا کر کچن کا نام دے دیا گیا تھا۔ کمرے کی چھت بانس اور باتن ڈال کر بنائی گئی تھی۔ درو دیوار سے غریبی کی بو آتی تھی۔ راشد کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا، بیوی اور تین بچے اُس کی کل کائنات تھے۔ اپنے چھوٹے سے خاندان کو پالنا مشکل ہو گیا تھا۔ کبھی کام ملتا، کبھی نہیں، بیچارہ پڑھا لکھا تو تھا نہیں، محنت مزدوری ہی کر سکتا تھا، وہ بھی کبھی دیہاڑی لگ جاتی، کبھی مایوسی ہوتی۔ آج بھی راشد کی بیوی اُسے کام پہ جانے کے لئے اُٹھا رہی تھی۔ رات بھر سوچتے سوچتے جانے کس پہر اس کی آنکھ لگی تھی۔

راشد بڑبڑاتا ہوا، منہ پر پانی کے چند چھینٹے مارتے بان کی چارپائی پر آن بیٹھا۔

او! پیاری بیگم جلدی سے کھانا دو، ورنہ لیٹ ہو گیا تو کام نہیں ملے گا۔ کیا خبر آج بھی دیہاڑی لگتی ہے یا پھر کل کی طرح چلچلاتی دھوپ میں واپس نہ آنا پڑے۔'' راشد کے اندر کوئی بیچ بول رہا تھا۔

بیگم! مزدور چوک پہ مزدوروں کی لمبی قطاریں ہوتی ہیں، جانے کس کس کی قسمت جاگے گی۔ کام دینے والے تھوڑے ہوتے ہیں اور مزدور بہت زیادہ۔ جس کو کام مل گیا وہ تو بہت خوش ہوتا ہے، رب رحمان کا شکر بجا لاتا ہے۔ جس کو کام نہیں ملتا، مایوس، اُداس گھر کو لوٹتا ہے۔''

واہ! میرے مولا! تیری مرضی، جسے چاہے امیر بنا دے، جسے چاہے غریب بنا دے۔ تجھ سے کون پوچھتا ہے؟ تو غریبی نا دیتا تو تیرا کیا جاتا۔ مجھ غریب پہ تیرا کرم کب ہوگا؟ کب میری تنگدستی دور ہو گی۔ کب میرے نصیب بدلیں گے۔ آخر کب؟

راشد خیالوں کی دُنیا میں اپنے پیدا کرنے والے رب سے شکوے شکایات کی پٹاری کھولے بیٹھا تھا کہ اس کی بیوی نے آواز دی۔

کھانا چارپائی پہ پڑا ٹھنڈا ہو گیا تھا، چنگیر میں ایک روٹی اور کٹوری میں تھوڑا سا سالن تھا، جو راشد کی بیوی صبح سویرے ہمسائیوں سے مانگ لائی تھی، انہوں نے رات

کا بچا ہوا باسی سالن اُٹھا کر دے دیا تھا۔ راشد دو، چار نوالے زہر مار کرتا ابھی تو اتنے میں بیگم نے آواز دی۔
ابھی تک آپ کام پر نہیں گئے..... جلدی ۔۔۔جلدی تو بہت لگا رکھی تھی۔
ایک تو روزی نہیں ملتی تھی، اوپر سے بیوی کی زہریلی باتیں کلیجہ چیرتی تھیں۔ راشد نے کھانا وہیں چھوڑا اور چارپائی سے اُٹھ کھڑا ہوا، اٹھتے اٹھتے جواب دیا۔
''اوہو..... جا رہا ہوں۔۔۔میرے سکون کی دشمن، گھر میں دو پل سکون سے بیٹھنے بھی نہیں دیتی ہو۔ دروازہ بند کر لینا، میں جا رہا ہوں۔'' راشد نے لکڑی کے گیٹ کو کراس کرتے ہوئے بیوی کو کہا، جو کچن میں شاید بچوں کے لئے کچھ بنانے میں مصروف تھی۔
''کرلوں گی.....'' اُس نے وہی بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔ اور راشد باہر نکل گیا۔
راشد جوں ہی مزدور چوک پہ پہنچا، اُس کے اوسان خطا ہو گئے۔ سبھی مزدور غمگین چہرے لئے پریشان بیٹھے تھے۔
''کیا ہوا میرے بھائیو!'' راشد نے سانس کو بحال کرتے ہوئے کہا۔ ''آج بھی پریشان لگ رہے ہو۔''
''راشد بھائی! آج پھر ہڑتال ہے۔ جانے اس دیس میں ہڑتالیں اور بے روزگاری کب ختم ہوگی۔ اِس ملک کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔ کب ہمارے وطن کے حالات ٹھیک ہوں گے اور کب ہم غریبوں کو سکون سے روٹی ملے گی۔ راشد خیالوں کے جنگل آباد کرنے لگا تھا۔
آج گھر میں آٹا بھی نہیں تھا۔ میرے بچوں کا کیا بنے گا، بچے صبح نئے کپڑوں کی فرمائش بھی کر رہے تھے۔ عید بھی سر پہ ہے۔ میرے مولا، میرے گھر کا کیا بنے گا؟ راشد سوچوں میں گم تھا، دن چڑھ آیا تھا، مگر آج دوسرے دن بھی کام نہیں ملا تھا۔ آخر بوجھل قدموں سے واپس گھر کو لوٹ گیا۔
دروازے پر ہی بیگم نے لٹکا ہوا منہ دیکھا تو سب سمجھ گئی۔
''بیگم صاحبہ! آج پھر ہڑتال ہے، ہڑتال کی وجہ سے کوئی کام نہیں ملا۔ او.....''
''اسد کے پاپا، ان بچوں کا کیا بنے گا۔ جو دن بھر سے بھوکے ہیں۔ گھر میں پکانے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔''
راشد کے تین بچے تھے۔ دو بیٹے، ایک بیٹی۔ بیٹی جس کا نام سمرین تھا۔ بڑے بیٹے کا نام اسد اور چھوٹے کا ماجد تھا۔ راشد دروازے پر ہی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ زمین گھومتی محسوس ہوئی۔ بیگم دوڑ کر پانی کا گلاس لائی۔ راشد نے پانی حلق سے نیچے اتارا تو سانس بحال ہوئیں، وہ

بھی تو دن بھر سے بھوکا تھا۔ صبح ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔

"بیگم تسلی رکھو، میں کچھ نہ کچھ کرتا ہوں، تم پریشان نہ ہو اور مجھے بھی پریشان نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا۔"

راشد ابیوی کو تسلی دیتا باہر نکل گیا۔ اس کے قدم دوست کی جانب اٹھ رہے تھے۔ دوست نے لٹکا منہ دیکھا تو بھید جانی۔ راشد نے تمام روداد کہہ سنائی تو دوست نے کچھ رقم اُدھار دے دی۔ راشد گھر آتے ہوئے آٹا اور سبزی وغیرہ لے آیا۔ اس طرح اُس دن کی روٹی پکی۔

شام ہوئی تو بیگم، راشد کے پاس آ بیٹھی۔ پیار سے کہنے لگی۔

"اسد کے ابا، تمہیں پتہ ہے کہ بچوں کے کپڑے نہیں ہیں اور عید بھی آ رہی ہے۔"

"جی جی مجھے معلوم ہے۔ بیگم تھوڑا صبر تو کرو، اللہ کرم کرے گا۔ میں کچھ نہ کچھ کرتا ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔ ایک تو میرے پاک وطن کو کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ آئے روز حالات خراب سے خراب تر ہو رہے ہیں۔ پھر یہ لوڈشیڈنگ، اُف اللہ!"

نیلے آسمان والا، غریبوں کا تماشا دیکھ رہا ہے۔۔۔ اور امیروں کو زیادہ دے کر بھول سا گیا ہے۔ کیا میرا رب نہیں جانتا ہے کہ اِس کے بچے بھوکے سوتے ہیں اور امیروں کے کتے ہرن کھا کر ڈکار بھی نہیں لیتے۔۔۔ مجھے مر ہی جانا چاہیے۔

"اسد کے ابا! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ کیسے کفرانہ باتیں کر رہے ہیں، توبہ کیجیے۔۔۔ اللہ تعالیٰ سے ڈریں۔۔۔ کہیں کوئی عذاب ہی نازل نہ ہو جائے۔ وہ رحمان ہے سبھی کے حالات سے واقف ہے، نہ وہ سوتا ہے، نہ غافل ہوتا ہے۔۔۔۔۔ ہاں آزماتا ضرور ہے۔۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔۔ ہاں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کب ٹھیک ہوگا...... جب سانسوں کی ڈوری ٹوٹ جائے گی.....؟"

"اُف، اسد کے ابا۔۔۔۔ اب بس بھی کرو۔"

اچھا چھوڑو سب باتیں، کھانا کھالو۔" راشد کی بیوی نے چنگیر میں روٹیاں اور کٹوری میں سالن لا کر چار پائی پر رکھا دیا تھا۔ اور بچوں کو آواز دی۔ اسد اور ماجد اِن کی باتوں سے بے فکر ہو کر اپنی دُنیا سجائے بیٹھے تھے۔ امی کی آواز پر دوڑے چلے آئے۔

شام کے سائے ڈھلے، سبھی نے کھانا کھایا اور سونے کے لئے چار پائیوں پر لیٹ گئے۔۔۔ اسد اور ماجد ایک ہی چارپائی پر پڑے اوندھے سو رہے تھے اور تھوڑی دُور ٹوٹی ہوئی موٹے بان کی چارپائی پڑا راشد، چاند ستاروں کو گھورتے ہوئے سوچوں کے نگر آباد کیے ہوئے تھا۔ راشد کی بیوی بھی دن بھر کے کام کی تھکن سے جلدی سو گئی تھی۔ واحد وہی تھا۔ جو اپنی قسمت کا ماتم کر رہا تھا۔ اگر کل بھی کام نہ ملا تو۔ اسی سوچ پر وہ کانپ اٹھتا۔ پھر رات کے پچھلے پہر نیند نے رحم کیا اور اُسے اپنی گود میں لے کر لوریاں سنانے لگی۔ راشد کی آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

اگلی صبح راشد جلدی مزدور چوک جا بیٹھا، مگر آج بھی کام نہ ملا۔ راشد دھکے کھا کھا کر اُداس، مایوس، چڑھتے سورج کے ساتھ گھر لوٹ آیا۔ گھر کی دہلیز پر قدم رکھے ہی تھے کہ بیوی نے منحوس خبر سنا دی۔ راشد زمین میں دھنستا چلا گیا۔

"اسد کے ابا! سمرین کی طبیعت بہت خراب ہے۔ اُسے جلدی ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔" اُسے یہ خبر ہی رہی تھی کہ راشد جلدی گھر آیا تھا، شاید آج بھی کام نہیں ملا۔ مگر اُسے تو سمرین کی فکر تھی۔

راشد کی آنکھوں میں آنسو نکلنے لگے۔

"بیگم! آج بھی خالی دامن لوٹا ہوں۔ جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔ دوائی کہاں سے لوں۔؟ میں کدھر جاؤں۔ کہاں سر پیٹوں۔ رب رحمان کو بھی رحم نہیں آتا۔"

راشد کی بیوی بھی رو رہی تھی۔ سمرین کی طبیعت بگڑتی جا رہی تھی۔ راشد کی بیوی بار بار اُسے کہیں لے جانے کا کہہ رہی تھی۔

"اسد کے ابا! کچھ تو کرو، ورنہ یہ مر جائے گی۔ میری بیٹی۔"

"بیگم! سمرین کو ڈاکٹر کے پاس لے چلتے ہیں۔ اور اُس سے فریاد کرتے ہیں کہ ہم غریب لوگ ہیں۔ اس وقت ہمارے پاس ایک روپیہ بھی نہیں ہے۔ اللہ! کے نام پہ ہماری بیٹی کا علاج کر دیں۔ جیسے ہی ہمارے پاس پیسے

آئے ہم دے جائیں گے۔ راشد کی بیگم نے راشد کی
ہاں میں ہاں ملائی اور پھر دونوں سمرین کو لے کر ڈاکٹر کے
پاس چلے گئے۔۔
ڈاکٹر کو سب کچھ بتا دیا، جو وہ گھر میں سوچ کر گئے
تھے۔ ڈاکٹر کی منت سماجت کی، اس سے التجائیں کیں
۔ خیر ڈاکٹر مان گیا۔ لیکن۔۔۔۔
ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نے اپنی
طرف سے ہر ممکن کوشش کی مگر سمرین کا وقت آچکا تھا، وہ
اپنی زندگی کی سانسیں پوری کر چکی تھی۔ سمرین، اپنے اللہ
تعالیٰ کے پاس چلی گئی، اپنے پیدا کرنے والے رب کے
ہاں ہمیشہ کے لئے چلی گئی تھی۔
راشد اور اُس کی بیگم کا رو، رُو کر بُرا حال تھا۔ راشد غم
سے نڈھال تھا تو اُس کی بیوی کو دورے پڑ رہے
تھے۔ کوئی ان کو تسلی دینے والا نہیں تھا، کوئی چپ کرانے
والا نہیں تھا، کوئی سہارا دینے والا نہیں تھا، جس کے
کندھے لگ کر غم ہلکا کرتے۔ کوئی بھی تو نہیں تھا، جب
اپنے ہی نہ رہے تھے تو غیروں نے کہاں تک ساتھ نبھانا
تھا۔ اُن کو صرف اور صرف رب رحمان کا آسرا تھا۔ ان
کے گھر کی رحمت روٹھ گئی تھی۔۔۔۔۔
غم کی گھڑیاں جیسے تیسے گزر گئیں۔ ایک شام راشد
کی بیوی نے راشد سے کہا۔
"دیکھو! اسد کے ابا! مہنگائی ہے۔ اس دور میں ایک
کمانے والے سے کچھ نہیں بنتا۔ آپ کہو تو میں بھی کسی کے
گھر کام کر کے گھر کی گاڑی کو رواں دواں رکھنے میں مدد
کروں۔۔ اس طرح گھر کے حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔
راشد نے کہا۔
"جیسے آپ کی مرضی، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ جیسے
آپ کو اچھا لگے۔ اگلے دن راشد کی بیوی بھی کام پہ
جانے لگی۔ دونوں کو اپنے رب پہ بھروسہ تھا۔
یقین کامل ہو تو منزل مل جایا کرتی ہے۔ کبھی نہ کبھی
گھر کے حالات بدلیں گے۔ اور اچھے دن ضرور آئیں
گے۔ دونوں کے جذبے جوان تھے۔
راشد! ایک روز جب شام کو کام سے گھر آیا تو بہت
خوش تھا۔
بیگم نے راشد کے چہرے پہ دیکھا تو لبوں پر
مسکراہٹ پھیل گئی۔ "خیر تو ہے آج کافی عرصہ بعد اس
چہرے پہ خوشی کے آثار دیکھے ہیں۔"
"ہاں بیگم! آج میں بہت خوش ہوں۔۔۔۔ کچھ
مجھے بھی تو بتاؤ۔ آخر ہوا کیا۔"
"بیگم! جہاں میں کام پہ جاتا تھا۔ اُس مالک کو میرا
کام بہت پسند آیا۔ مالک مکان بہت اچھے انسان
ہیں۔ اُس نے مجھے اپنے ہاں مستقل رکھ لیا ہے۔ تنخواہ بھی
اچھی ہے۔"
راشد کی بیوی بہت خوش ہوئی۔ یہ تو خوشی کی بات
ہے۔ اب ہمارے دن پھر جائیں گے، اس گھر میں بہار
آئے گی۔ غریبی بوریا بستر لے کر کہیں دور بہت دور چلے
جائے گی۔۔ اچھا ہوا آپ کو ایک جگہ کام مل گیا۔
دونوں میاں بیوی کام پہ جانے لگے۔ گھر میں رونق
سی آگئی، غربت کے سائے چھٹنے لگے۔ حالات بہتر
ہونے لگے، دونوں بچے اسکول جانے لگے تھے۔ دونوں
میاں بیوی شکر اللہ کے تفضل ادا کرتے۔ زندگی کی بہاریں
لوٹنے لگی تھیں۔ اُداسی بحرومی کے بادل اپنا منحوس سایہ
کہیں اور لے گئے تھے۔ دونوں بہت خوش تھے، مگر ان کو
خبر ہی نہیں تھی، کہ خوشیوں کے پل چند لمحوں کے مہمان
بن کر آتے ہیں۔ لمحوں کی خوشی کے لئے زندگی بھر غم کی
سوغات ملتی ہیں۔ راشد کے گھرانے پہ بھی غموں کے پہاڑ
ٹوٹ پڑے۔ در و دیوار کاٹنے کو آتے۔ ہر چیز ماتم کناں
لگتی۔ راشد کا گھر خاموشی، مفلسی کا نمونہ بن چکا
تھا۔ اُس کی شریک حیات بیمار پڑ گئی۔ غریب کو کوئی بیماری
لگ جائے تو زندگی لے ہی جاتی ہے۔ راشد کے پاس رقم
نہیں تھی، بیوی کے علاج پہ بہت رقم خرچ اُٹھنا
تھا۔۔ اُس نے اپنا کشکول اپنے مالک کے آگے کر
دیا۔ مالک نے رقم اُدھار دے تو دی۔ مگر کڑی شرائط کے
ساتھ۔
راشد، بیوی کو اچھے ہسپتال میں لے گیا۔ علاج
شروع ہو گیا۔ کبھی یہ انجکشن، کبھی یہ دوائی، لے
آؤ۔۔۔ ڈاکٹر۔۔ پرچی تھماتے ہوئے کہتے۔۔۔
جب تک راشد کی جیب میں رقم تھی دوائی لیتا
رہا۔ کافی دن گزر گئے مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا۔ ایک
طرف بیوی کی بیماری، دوسری طرف بچوں کی دیکھ

بھال، ان کے کھانے کا بندوبست کرنا، نہلانا، کپڑے دھونے کا معاملہ۔۔۔۔۔راشد! کے پاس حوصلے کہاں سے آ گئے تھے۔ بیوی کی طرف سے کوئی رشتے دار، بہن بھائی نے خبر نہیں لی تھی۔ سچ ہی کہتے ہیں غریبی میں تو اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ راشد کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ راشد کی بیوی کو بستر مرگ پر پورا ایک سال گزر گیا تھا۔ راشد کے ساتھ ساتھ، بچے بھی پریشان تھے۔ راشد نے بچوں کو سنبھالا ہوا تھا، ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا ہوا تھا۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے اور راتوں کو دیر تک جاگنے سے راشد کی صحت بھی بگڑنے لگی۔ وہ بھی بیمار رہنا لگا۔ جہاں وہ کام کرتا تھا، وہاں سے کافی رقم اُدھار لے چکا تھا، اب اُنہوں نے بھی اور رقم دینے سے انکار کر دیا تھا۔

اتنی آپ کی تنخواہ نہیں ہے جتنی رقم اُدھار لے چکے ہو۔ راشد کے حالات بد سے بدترین ہوتے گئے۔ گھر کے برتن تک فروخت ہو گئے۔ راشد نفساتی مریض بن گیا۔ گھنٹوں گم صم بیٹھا زمین کے فرش پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچتا رہتا، لب خاموش اور آنکھیں برستی تھیں۔

اُدھر جہاں کام کرتا تھا، اُنہوں نے یہ کہہ کر چھٹی کروا دی تھی کہ اب تم کام کرنے کے لائق نہیں رہے۔ کام کم کرتے ہو اور نقصان زیادہ کرتے ہو، ہم مزید نقصان برداشت نہیں کر سکتے، لہٰذا کل سے کام پہ نہیں آنا۔“

اُن کی باتیں راشد کے دل پر نشتر چلا رہی تھیں۔ لفظ زہریلے تیر بن گئے تھے۔ مرتا کیا نہ کرتا، غریب کی سنتا ہی کون ہے۔ یہاں تو مجبوریوں سے فائدہ اُٹھانے والے بستے ہیں۔ منہ کا نوالہ چھیننے والے تو بہت ہیں، نوالہ دینے والا کوئی نہیں ہے۔ راشد! آنسو بہاتا، روتا، گرلاتا واپس اپنے اجڑے گھر لوٹ آیا۔۔۔

راشد کی بیوی بستر مرگ پہ پڑی مورتی بنی ہوئی تھی۔ کبھی بیوی کو دیکھتا تو کبھی اپنے بچوں کو، کبھی اپنے گھر کے بارے میں سوچ کر چپکے چپکے آنسو بہاتا تھا۔

☆☆☆

وہ معمول کی شام تھی، جب راشد کے گھر ماتم ہو رہا تھا۔ اس کی بیوی بان کی چارپائی پر بے سدھ پڑی تھی۔ کوئی رونے والا نہیں تھا۔ راشد! بیوی کی چارپائی کو پکڑ کر بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ اسد اور ماجد مما مما کہہ کر چیخ و پکار کر رہے تھے۔ رونے کی آوازیں سن کر ہمسائے آئے، اُنہوں نے بیچاری کی آخری رسومات ادا کی اور منوں مٹی تلے دفن کر دیا۔۔۔ راشد! بیوی کے جنازے کو کندھا دے کر جنازہ گاہ تک تو گیا تھا، مگر جنازہ کب پڑھا، اُسے ہوش نہیں رہا۔۔۔۔ جنازے کی پہلی صف میں کھڑا تھا کہ چکرا کر گر پڑا۔۔۔ گرتے ہی بے سدھ ہو گیا۔۔۔۔ دماغ کی شریان پھٹ گئی تھی اور وہ بھی اس دُنیا سے کوچ کر گیا تھا۔۔۔۔ بیوی کی جدائی برداشت نہیں کر سکا تھا۔۔۔۔ اِدھر صف ماتم بچھی تھی اور محلے کے دوسرے کونے میں جاگیردار کے بیٹے کی شادی کی رسم ادا ہو رہی تھی۔ ناچنے والے اپنا تماشا دکھا رہے تھے اور عیاش لوگ، منچلے نوجوان ہرے نوٹوں کی برسات کر رہے تھے۔ عریاں لباس میں رقاصائیں رقص پیش کر رہی تھیں، شباب اور کباب کے مزے اڑائے جا رہے تھے۔

ان کو بھی آج ہی مرنا تھا، کم بختوں نے، شادی کا جشن خراب کر دیا۔

جاگیردار اپنے ایک دوست کو کہہ رہا تھا اور میں پاس کھڑا سن رہا تھا۔ کتنا زہریلا جملہ تھا، میری روح تک کانپ اُٹھی۔

موت کا وقت مقرر ہوتا ہے، اگر ان کا وقت آ گیا تھا تو کم از کم خوشی سے تو مرتے۔۔۔۔ زندہ تھے تو کسی نے خبر تک نہیں لی تھی۔ راشد کس کرب سے گزر رہا ہے، اُس کے بچے بھوکے سوتے ہیں یا ان کو کچھ چاہیے۔

میں جنازہ گاہ میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ مجھے دو ننھے ننھے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا، خیالوں کی دُنیا سے واپس آیا تو دیکھا کہ اسد اور ماجد میرے پاس کھڑے آنسو بہا رہے ہیں۔

”انکل! ہمارے مما پاپا کہاں گئے ہیں۔۔ ہمیں بھوک لگی ہے۔۔۔۔۔ بھوک۔“

میری آنکھیں نمکین پانی سے تر ہوتی گئیں اور میں اسد اور ماجد کو اپنے ساتھ، اپنے گھر لے آیا۔۔۔ اب وہ میرے بیٹے ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کرنا میرا فرض ہے۔۔۔۔ آپ بھی اپنے اردگرد دیکھیں کوئی یتیم بچہ آپ کا منتظر تو نہیں ہے۔۔۔

☆☆.....☆☆

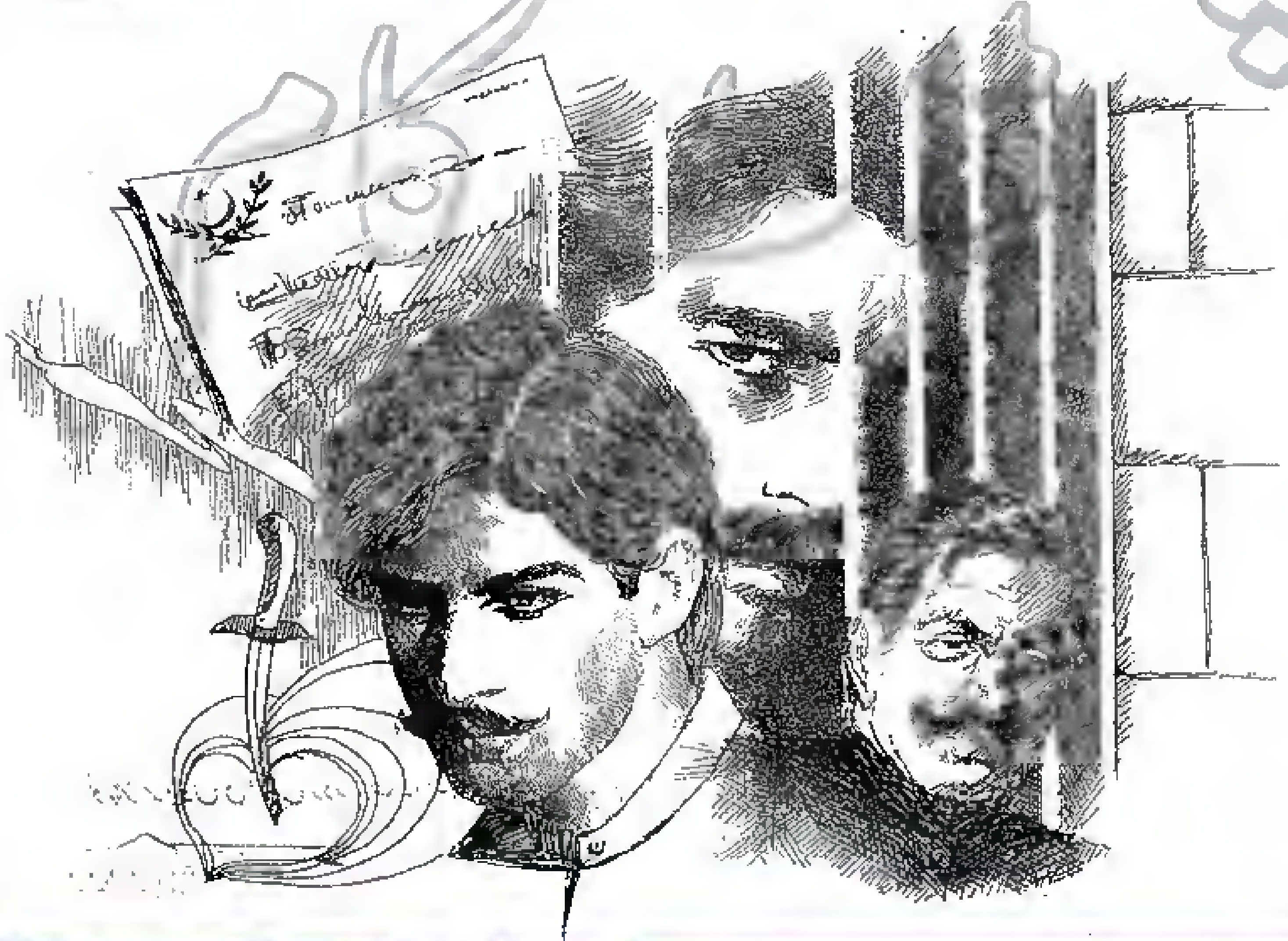
تیسری مرد کہانی

ایک منٹ تیس سیکنڈ

محمد شعیب

اُس مرد کی بپتا، جس نے محبت کے منہ پر طمانچہ مارا تھا

سہ پہر کا وقت تھا۔ سرمئی رنگ کے بادلوں کو چیرتی دھوپ کی کرنیں اس کے چہرے کی خزاں کو بہار میں بدلنے سے قاصر تھیں۔ وہ پانچ منزلہ بلڈنگ سے نکلا تھا، جس کا آرکیٹکچر جدیدیت کا حامل اور بے مثال تھا۔ اس بلڈنگ کے سامنے اس کا وجود زمین پر رینگنے والے حشرات کی مانند تھا۔ پارکنگ ایریا کو عبور کرتے ہوئے وہ مین گیٹ کے سامنے آکھڑا ہوا۔ ایک نظر اس نے غرور و تکبر سے کھڑی اس بلڈنگ پر دوڑائی۔



اس کی نظر تھرڈ فلور پر موجود ایک کھڑکی پر مرکوز تھی۔ وہاں ایک سائے کا گمان ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھ میں آنسو آ گیا، وہی آنسو جو آج سے پانچ سال پہلے اُس کی آنکھ میں تھا، جس آنسو کی پروا اس نے بالکل نہیں کی تھی۔ وہ پلٹا اور اس بلڈنگ کے حصار سے باہر آ گیا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جائے؟ وہ چل رہا تھا مگر منزل غائب تھی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ اس بلڈنگ کے عقبی حصے میں واقع ایک لان میں جا پہنچا اور ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں ابھی بھی اُسی بلڈنگ پر مرکوز تھیں۔

☆☆☆

میرا نام عبیرہ کاشف ہے۔ زندگی نے مجھے بہت کچھ دیا مگر اس کے عوض جو قیمت اس نے مانگی وہ ناقابل بیان ہے۔ آج میں جس مقام پر ہوں، وہ اسی قیمت کی بدولت ہوں جو میں نے آج سے پانچ سال پہلے چکائی تھی۔ مجھے اپنا ماضی بھی یاد نہ آتا اگر وہ آج اپنا چہرہ نہ دکھاتا۔

میں اور ارمغان حجاز یونیورسٹی میں اکٹھے پڑھتے تھے۔ کب اور کیسے ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ نہ اُسے بھنک ہوئی نہ مجھے یا شاید یہ میری بھول تھی کہ اسے مجھ سے محبت ہے۔

''تم سے ایک بات پوچھوں؟؟'' ایک شام یونیورسٹی سے ہم دونوں اکٹھے گھر لوٹ رہے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا، بھینی بھینی خوشبو، رنگ برنگی تتلیاں ماحول میں ایک عجب تاثر ابھار۔

''ہاں پوچھو۔'' ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اُس نے جواب دیا

''تم مجھے یوں چھوڑ تو نہیں جاؤ گے۔ محبت کی ان راہوں میں مجھے رسوا تو نہیں کرو گے؟'' اس بے تکے سوال پر وہ قہقہے لگا کر ہنسنے لگا۔ اس کے نزدیک میرا یہ سوال معمولی سا تھا۔

''یہ کیا بے تکا سوال ہے۔!'' اُس نے تمسخر سے کہا۔

''اگر بے تکا ہے تو بے تکا ہی سہی۔ مجھے جواب دو۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور سنجیدگی سے کہا۔

''جواب کیسے دوں۔ جب بچھڑنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' اس نے جواب دیا۔

اس کے چہرے کا تاثر بے معنی تھا۔ اس کا رویہ مجھے اکثر آنے والے حالات کی خبر دیا کرتا تھا۔ کبھی کبھار ارمغان کی باتیں مجھے بہت عجیب لگتیں۔ وہ محبت سے زیادہ، زندگی کو چاہتا۔ ہر وقت اس کی تمنا کرنا، کسی مقام پر پہنچنے کی تمناؤں میں لئے ہر وقت اس کی باتیں کرنا، اس کا شیوہ تھا۔ میرے ساتھ ہو کر بھی وہ مجھ سے جدا رہتا۔ اس کا تن میرے ساتھ تو رہتا مگر من کہیں اور ہی کھویا ہوتا۔ ایک ایسی دنیا، جدھر خواہشوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ خوابوں کو تعبیر ملتی ہے۔ ان سب کے باوجود میری چاہت تھی کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ شاید اس لئے کہ میری محبت سچی تھی۔ میرا پیار سچا تھا۔ میں تن اور من سے اس کو چاہتی تھی۔ اس کو اپنانا چاہتی تھی۔ اس کی زندگی کا حصہ بننا چاہتی تھی مگر اس کی خواہشیں ہمیشہ اس کے اور میرے درمیان آ جاتی تھیں۔

''کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ تمہیں مجھ سے زیادہ اپنی خواہشوں میں انٹرسٹ ہے۔ تم ہمیشہ مجھ سے زیادہ اپنے خوابوں کو فوقیت دیتے ہو۔'' کانووکیشن کے اختتام پر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر سوال کیا۔

''یار۔ آج تو یہ باتیں چھوڑ دو۔۔۔ آج تو لاسٹ ڈے ہے۔ اس یونیورسٹی میں۔ پھر نا جانے یہ موقع ملے یا نا ملے۔ انجوائے کرنے دو۔'' اس نے بے رخی سے کہا۔

''تمہاری یہی عادت مجھے یہ سوال کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ تمہارا یہی رویہ میرے اندر اس خوف کو جنم دیتا ہے۔ ایک بار تم میرے اس سوال کا جواب دے دو۔ یقین جانو، میں پھر کبھی کچھ نہیں پوچھوں گی۔''

''خدا کے لئے آج کے دن میری جان چھوڑ دو۔۔۔ آج میں کسی بھی قسم کے جھگڑے کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

اس کا لہجہ طنز میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ پیچھے کیا اور دوبارہ دوستوں کے ساتھ خوش

گیسوں میں مصروف ہو گیا۔ اس کی بے رخی میری
آنکھوں کے سامنے بھی۔ مگر اس سب کے باجود میرا
دل اس کی طرف کھنچا چلا جا رہا تھا۔ اس کی بے رخی
، بے اعتنائی، بے پروائی، میری محبت کو کم کرنے میں
ناکام تھی۔ ہر گزرتا لمحہ میری محبت کو پروان چڑھا رہا
تھا۔ میں بے بس تھی۔ محبت کے آگے، اس کی چاہت
کے آگے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی ہر غلطی کو،
ہر بے رخی کو معاف کر دینے کو تیار تھی۔ بس اگر وہ ایک
بار میرے سامنے محبت کا اظہار کر دیتا تو میں سب کچھ
بھلا دیتی مگر افسوس ایسا نہیں ہوا۔ میں ہار گئی۔ میری
محبت ہار گئی۔ میرے بھروسے کو مات کا سامنا کرنا پڑا۔

کانووکیشن کے بعد اس نے ایک بار بھی میری
طرف مڑ کر نہیں دیکھا۔ میں اس کا انتظار کرتی رہ
گئی۔ اس کی راہوں کو تکنا میرا مقصد حیات بن گیا۔ اس
کے ایک فون کے انتظار میں میں نے اپنی راتوں کو کاٹنا
شروع کر دیا۔ نہ دن کو چین تھا نہ رات کو۔

☆☆☆

''تم جانتے بھی ہو کہ میں نے یہ دو ماہ کیسے
گزارے؟ ہر پل تمہاری راہوں کو تکتی رہی۔ ہر وقت
نگاہ میری دروازے پر رہتی کہ کب تم آؤ گے، کب
ہمارے رشتے کی بات کرو گے۔ مگر تم۔۔۔ تم نے کیا
کیا؟ پلٹ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔۔۔''

ایک شام جب میں انٹرویو دے کر واپس گھر کو
لوٹ رہی تھی تو وہ مجھے جناح گارڈن میں ٹہلتا ہوا
ملا۔ میں دوڑ کر اس کے پاس گئی اور جاتے ہی سوالوں
کی بوچھاڑ کر دی مگر اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔
اس کے چہرے پر طمانیت تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا
جیسے وہ ایسا جان بوجھ کر کر رہا تھا۔

''عبیرہ۔ تم یہاں۔'' وہ مصنوعی انداز میں چونکا۔

''میں نے جو پوچھا ہے۔ اس سوال کا جواب
دو۔ کہاں تھے تم؟''

''میں جاب کی تلاش میں تھا۔'' اس نے بنا کوئی
تاثر چہرے پر لائے جواب دیا۔

''جاب کی تلاش میں تھا یہ میری بات کا جواب
نہیں ہے۔ مجھے آج سچ جاننا ہے، کیوں تم مجھے بار بار
اس بات کا احساس دلاتے ہو کہ جو شک میرے دل میں
ہے وہ حقیقت نہیں ہے۔'' میں نے اس کے گریبان کو پکڑتے
ہوئے اس کے وجود کو جھنجوڑنے کی کوشش کی۔

''میرا گریبان چھوڑو۔۔۔'' اس نے جھٹکے سے
میرا ہاتھ پرے ہٹایا۔ میری سوالیہ نگاہیں آنسوؤں
سے تر ہو گئیں۔

''یہ کیا تھا ارمغان؟ تم ایسے تو نہ تھے۔۔ یونیورسٹی
میں تو تم بڑا کہتے تھے کہ تمہارا وجود بہت نرم و نازک ہے
اور آج تم نے اسی نرم و نازک وجود کو اتنی بری طرح مسل
دیا۔'' میں نے اس سے پوچھا۔

''آخر تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ کیوں ہر
وقت میرا پیچھا کرتی رہتی ہو۔۔ بھول کیوں نہیں جاتی
ہو تم مجھے۔'' اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

''ارمغان۔۔۔ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟''

''وہی جو تم سننا چاہتی تھیں۔''

''جو کہنا ہے صاف صاف کہو۔ تمہارے دل
میں کیا چل رہا ہے، میں بھی تو جانوں۔۔''

''تم سننا چاہتی ہو تو سنو۔۔۔ میں تم سے کوئی پیار
دیار نہیں کرتا تھا۔ تم میرے لئے صرف ٹائم پاس تھیں،
سمجھیں؟'' اور میرے لئے اس پیار و یار کے لئے کوئی
ٹائم بھی نہیں ہے۔ مجھے زندگی میں آگے بڑھنا
ہے۔ بلندیوں کو چھونا ہے۔ اپنی قسمت کو اپنے ہاتھ
میں لینا ہے۔ اپنے نام کو چمکتے ستاروں کے درمیان
روشن کرنا ہے اور تمہارے ساتھ رہتے ہوئے ایسا کبھی
ممکن نہیں ہو سکتا۔''

''ارمغان۔'' میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

''تم لڑکیوں کی سب سے بڑی بھول ہی یہی
ہوتی ہے، کوئی لڑکا تم سے ہنس کر بات کیا کر لے۔ تم
اسے پیار سمجھ بیٹھتی ہو۔'' اس نے اپنی ڈھٹائی کا
مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''ارمغان!!'' میں نے ایک طمانچہ اس کے
رخسار پر مارا۔

''اپنے ہاتھ اپنے قابو میں رکھو۔ میرے بھی ہاتھ
ہیں۔۔۔'' اس نے عتابی نظروں سے مجھ پر وار کیا۔

''کیا میری محبت تمہارے لئے کوئی اہمیت نہیں

رکھتی؟؟؟"

"مجھے محبت سے زیادہ پیسہ عزیز ہے۔۔۔اور اگر تم مجھے وہ پیسہ دے دو تو میں تمہارا ہو جاؤں گا۔" اس نے طنزیہ کہا۔

"ارمغان پیسوں سے سب کچھ نہیں ملتا۔ محبت کی قیمت دھن دولت سے زیادہ ہے۔"

"مگر میرے لئے میری خواہشیں زیادہ اہم ہیں اور یہ خواہشیں صرف پیسے سے ہی پوری ہو سکتی ہیں، محبت سے نہیں۔" ایک پل توقف کے بعد اس نے مزید کہا۔

"اگر کام کی بات کرنی ہے تو کرو ورنہ دور ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔ آج کے بعد میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔" اس کے بے رخی نے میری آنکھوں میں آنسوؤں کی شدت میں اضافہ کر دیا۔

"تم پچھتاؤ گے ایک دن ارمغان۔ محبت کو دھتکار کر۔ میری محبت کو ذلیل کر کے تم کبھی سکھ کا سانس نہیں لے پاؤ گے۔ میری آنکھوں کے آنسو تمہیں کبھی خوش نہیں رہنے دیں گے۔"

"جاؤ۔۔۔ جاؤ۔۔۔" اس کا طنزیہ لہجہ میرے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف تھا۔

☆☆☆

آج میں اپنے کیبن میں اس کرسی پر بیٹھی تھی جہاں کبھی ارمغان بیٹھنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر پہلے تک میں سب سے بے خبر تھی۔ آنے والے لمحے سے انجان تھی۔ داہنے ہاتھ میں موجود سلور کلر کے ڈیزائنر قلم سے میں فائل میں کچھ لکھ رہی تھی اور میں نے بائیں شانے سے فون کے ریسیور کو کان سے لگایا ہوا تھا۔ جو دیکھنے والے کے لئے میری مصروفیت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اچانک کیبن کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی مگر میں بنا کسی جنبش کے اپنے کام میں مصروف رہی۔ دو قدم چلنے کی آہٹ سنائی دی مگر پھر وہ آہٹ غائب ہو گئی۔ میں اب بھی کام میں مصروف تھی۔

"او۔کے۔ پھر میٹنگ میں ملاقات ہو گی آپ سے۔۔۔ ٹیک کیئر۔ اللہ حافظ" میں نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور نگاہ سامنے موجود شخص کے قدموں پر گئی۔ سیاہ پرانے شوز، جن پر پالش بھی اچھی طرح نہیں کی گئی تھی۔ میں نے اس شخص کے چہرے کو دیکھا۔ یہ وہی چہرہ تھا جس نے پانچ سال پہلے میری امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ میری محبت کو پاؤں تلے روند کر خواہشوں کے آسمان پر چڑھنے کی کوشش کی تھی مگر قسمت کی ستم ظریفی یہ کہ آج وہی شخص میرے سامنے، میرے آفس میں، اپنی ملازمت کے لئے آیا تھا۔ وہ ساکت کھڑا تھا۔

"عبیرہ۔۔۔" اس نے برجستہ کہا۔

"عبیرہ نہیں۔۔۔ عبیرہ کاشف۔۔۔" ایک پل کے لئے آنسوؤں نے آنکھوں میں آنا چاہا مگر اب ان کا بہنا بے معنی تھا۔ پانچ سال پہلے جب ارمغان نے مجھے میری ناکام محبت کا احساس دلایا تھا۔ اسی وقت میں نے اسے اپنی زندگی سے نکال دیا تھا۔ اب وہ میرے لئے بالکل اجنبی تھا۔ میری زندگی سے اس کا اب کوئی تعلق نہیں تھا۔

"عبیرہ کاشف۔۔۔" اس کا انداز استفہامیہ تھا۔

"ہاں۔۔۔ عبیرہ کاشف۔۔۔ پانچ سال پہلے تم نے کہا تھا نا محبت سے کچھ نہیں حاصل ہوتا، تم غلط تھے۔ یہ دیکھو آج محبت کے بدلے ہی میں اس مقام پر کھڑی ہوں، جہاں تم پہنچنا چاہتے تھے۔"

کاشف میرے اور ارمغان کے ساتھ ہی یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان زیادہ بول چال تو نہ تھی مگر کزن ہونے کے ناتے اس کا گھر میں آنا جانا کافی تھا۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ مگر میرا وجود تھا تو صرف ارمغان کا۔۔۔ تو پھر بھلا اس کو میں کیسے اپنا سکتی تھی۔ مگر جس دن ارمغان نے مجھے چھوڑ دیا تو وہ کاشف ہی تھا جس نے مجھے سنبھالا۔ میرا ساتھ دیا۔ میری بکھری زندگی کو سمیٹا۔ میرا ہاتھ تھاما۔ مجھے اپنایا۔

میری آنکھوں کی پر اعتمادی نے اس کو وہاں سے جانے پر مجبور کر دیا۔ صرف ایک منٹ تین سیکنڈ نے اسے وہ درد دیا جو پانچ سال پہلے اس نے مجھے دیا تھا۔ جاتے ہوئے اس کی آنکھ میں وہی آنسو میں دیکھ رہی تھی جو پانچ سال پہلے میری آنکھوں میں تھا۔

☆☆......☆☆

پلیٹ فارم

ملاپ

ضرغام محمود

اس بیٹے کا قصۂ عجب جسے اسٹیشن پر لگے بوڑھے برگد نے باپ سے ملا دیا



ٹرین تیز رفتاری کے ساتھ سفر طے کر رہی تھی جتنی تیزی کے ساتھ ٹرین اپنا سفر طے کر رہی تھی اس سے زیادہ تیزی سے میری سوچوں کا سفر جاری تھا میں سوچ میں ڈوبا بیٹھا تھا۔ میرے برابر بیٹھے بڑے میاں نے اپنی بغل میں ایک دیسی مرغا پکڑ رکھا تھا وہ مرغا وقفے وقفے سے اپنی چونچ میرے بازو پر مار کر مجھے زندہ ہونے کا احساس دلا رہا تھا۔ میں سوچوں کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا میرا گاؤں ابھی دور تھا۔ شام تک ٹرین مجھے میرے گاؤں پہنچا دے گی۔ کیا گاؤں ابھی تک ویسا ہی ہوگا جیسا میں چھوڑ کر آیا تھا کیا مجھے گھر میں خوش آمدید کہا جائے گا میرا گھر ریلوے پلیٹ فارم کے ساتھ ہی تھا پلیٹ فارم پر ہونے والی تمام سرگرمیاں میرے گھر سے صاف نظر آتی تھی ریلوے پلیٹ فارم جو راتوں کو بھی جاگتا تھا جہاں ٹرین کے آتے ہی زندگی کی لہر دوڑ جاتی تھی ہر طرف دوڑتے قدموں کی آوازیں بلند ہو تیں کوئی ٹرین سے اترتا تھا تو کسی کو ٹرین میں سوار ہونے کی جلدی ہوتی تھی۔ شور شرابہ لڑائی جھگڑا، جلد بازی، ملن کی خوشی جدائی کے آنسو...... پلیٹ فارم پر تو ایک چھوٹی سی دنیا آباد ہوتی ہے۔

کیا پلیٹ فارم پر شکور چچا کا چائے کا کھوکھا اسی طرح لگا ہوگا جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا۔ کیا چچا شکور اپنے چائے کے کھوکھے پر کھڑا اب بھی چائے بنا رہا ہوگا۔ آہ بچپن کی یادیں بھی کتنی خوشگوار ہوتی ہیں مگر یہ یادیں تکلیف کتنا دیتی ہیں...... آہ...... چچا شکور کی نظر بچا کر ان کی شکر کی بوری سے مٹھی بھر شکر چرا کر کھا لیتا اور جب چچا شکور کو اس بات کا پتا چلتا تھا تو وہ مجھے مارنے کو دوڑتے تھے مگر بوڑھے چچا دوڑ میں میرا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ میں شکر منہ میں ڈال کر پلیٹ فارم سے دوڑ لگا دیتا تھا اور چچا شکور اپنی لاٹھی لئے مجھے ڈھونڈتے رہتے تھے۔ کیا نظام دین ٹھیلے والا اسی طرح پلیٹ فارم پر امرود کا ٹھیلا لگا رہا ہوگا کیا اب بھی قلیوں کی ہٹو بچو کی آوازیں آتی ہوں گی...... کیا وہ بوڑھا برگد کا درخت ابھی تک پلیٹ فارم پر کھڑا ہوگا جس کے سائے میں، میں اور میرے دوست کھیلا کرتے تھے...... میں مسلسل سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

آج سے سات سال پہلے جب میں صرف سترہ سال کا تھا جب میں اپنے گھر سے بھاگا تھا۔ میرے گھر سے بھاگنے کی وجہ ابا جان کا سخت رویہ تھا۔ ابا جان ہر وقت مجھے ڈانٹتے رہتے تھے اور جب میں آٹھویں کلاس میں تیسری مرتبہ فیل ہوا تو ابا جان نے سوٹے سے مجھے اتنا مارا کہ میں بے دم ہو گیا بس اسی دن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ موقع لگتے ہی میں گھر سے بھاگ جاؤں گا مجھے لگتا تھا کہ شاید میں ابا جان کا سوتیلا بیٹا ہوں...... نہ جانے کیوں میری ہر بات میں ابا جان کو نقص ہی نقص نظر آتا تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ ابا جان نے کبھی مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھا ہو۔ جب بھی ابا جان نے میری جانب نظر اٹھائی مجھے ان کی آنکھوں میں اپنے لئے شعلے ہی نظر آئے انہیں مجھ سے قطعاً پیار نہیں تھا ان کا سارا پیار میری تینوں چھوٹی بہنوں کے لئے تھا۔ ابا جان صرف ان تینوں کا ہی لاڈ اٹھاتے تھے بے شک میں مانتا ہوں کہ وہ تینوں میرے مقابلے میں ابا جان کی فرمانبردار تھیں اور تعلیم میں بھی مجھ سے بہتر تھیں مگر...... مگر میں بھی تو برا نہیں تھا پھر...... پھر ابا جان مجھ سے اتنی سختی سے کیوں پیش آتے تھے وہ...... وہ مجھ سے پیار ہی نہیں کرتے تھے یہ بات میرے ذہن میں پختہ ہوتی چلی گئی تھی۔

اماں...... اماں کا خیال آتے ہی ان کا محبت بھرا چہرا میری نظروں میں گھوم گیا۔ میں نے اس گھر میں سترہ سال صرف اماں کی محبت کی وجہ سے گزارے تھے ورنہ میں بہت پہلے گھر سے بھاگ جاتا۔ لیکن کب تک آخر کار سترہ سال کی عمر میں، میں نے گھر سے بھاگنے کا فیصلہ کر لیا۔ گھر سے بھاگتے ہوئے میں نے تن کے کپڑوں کے سوا گھر سے کچھ نہیں لیا تھا ہاں...... صرف ایک خط اماں کے نام لکھ کر ان کے سرہانے چھوڑا تھا۔ مجھے آج تک خط کے مندرجات یاد ہیں۔

پیاری اماں جان!

جب آپ کو یہ خط ملے گا تو میں یہاں سے بہت دور جا چکا ہوں گا مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کیجئے گا

ویسے بھی آپ کے علاوہ گھر میں کون ہے جسے میری فکر ہو۔ اباجان! اباجان تو خدا کا شکر ادا کریں گے کہ اچھا ہوا نکما، نالائق اور کام چور چلا گیا۔ جان چھوٹی۔ اچھا ہے اب انہیں گاؤں والوں سے میری شکایتیں سننے کو نہیں ملیں گی...... وہ تو میرے جانے کی خوشی میں گھی کے چراغ جلائیں گے۔

اماں!

سچ بتایئے کیا میں واقعی اباجان کا سگا بیٹا ہوں یا۔ یا میں اباجان کو کسی میلے میں روتا ہوا ملا تھا یا انھوں نے درگاہ کی سیڑھیوں پر سے مجھے اٹھایا تھا۔ آخر اباجان کو مجھ سے محبت کیوں نہیں ہے وہ میرے ساتھ کیوں اتنی سختی سے پیش آتے ہیں انہیں میری ہر بات میں کیڑے کیوں نظر آتے ہیں۔ میں اسی لیے یہ گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے جانے سے اباجان بہت خوش ہوں گے۔

اماں!

میں ایک سال بعد دوبارہ یہاں آؤں گا اگر اباجان کو یہ گوارا ہو کہ میں گھر واپس آجاؤں تو ان سے کہنا پلیٹ فارم پر جو برگد کا پرانا بوڑھا درخت لگا ہے اس درخت پر ایک سفید کپڑا باندھ دیں۔ میں ایک سال بعد واپس آؤں گا اگر برگد کے درخت پر سفید کپڑا نظر آیا تو میں گھر واپس آجاؤں گا اور اگر اس درخت پر مجھے کوئی سفید کپڑا نظر نہیں آیا تو میں سمجھ جاؤں گا کہ اباجان کو میرا گھر آنا پسند نہیں ہے۔ اور میں جس ٹرین سے یہاں آؤں گا اسی ٹرین سے واپس شہر چلا جاؤں گا۔ کبھی واپس نہ آنے کیلئے۔

فقط۔ آپ کا بیٹا

اقبال عرف بالا

لکھنے کو تو میں نے خط میں لکھ دیا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ جب میں ایک سال بعد یہاں واپس آؤں گا تو مجھے برگد کے درخت پر کوئی سفید کپڑا نظر نہیں آئے گا بھلا اباجان کیوں چاہیں گے کہ میں گھر واپس آؤں۔ آخر میری وجہ سے انہیں گاؤں والوں کے ہاتھوں کتنی شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے یہ بات وہ مجھے ہزار بار بول چکے ہیں۔

میں گاؤں سے بھاگ کر شہر چلا گیا شہر میں میرے ساتھ کیا گزری میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا چند ہی دنوں میں مجھے احساس ہو گیا کہ میں نے گھر سے بھاگ کر بہت گھاٹے کا سودا کیا ہے اس سے پہلے کہ میں گاؤں واپسی کا سوچتا مجھے ایک ناکردہ جرم میں گرفتار کر لیا گیا اور میں سات سال جیل میں گزار کر آج صبح ہی رہا ہوا ہوں اور اب ٹرین میں بیٹھا اپنے گاؤں اپنے گھر جا رہا ہوں۔

''کیا گھر پر مجھے خوش آمدید کہا جائے گا یا......''

میں نے ٹرین کی کھڑکی سے باہر کے مناظر دیکھتے ہوئے سوچا۔

''نہ جانے اماں نے ان سات سالوں میں مجھے کتنی بار یاد کیا ہوگا۔ کیا اباجان نے بھی کبھی مجھے یاد کیا ہوگا....؟ یہ خیال مجھے مسلسل ستا رہا تھا میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر پلیٹ فارم پر لگے برگد کے درخت پر مجھے کوئی سفید کپڑا نظر نہیں آیا تو۔

تو میں اسی ٹرین سے واپس شہر آجاؤں گا اور پھر کبھی گاؤں یا اپنے گھر جانے کا خیال تک دل میں نہیں لاؤں گا۔

میں محسوس کر رہا تھا جوں جوں میرا گاؤں قریب آتا جا رہا تھا میری گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔

میرا ذہن مثبت اور منفی خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اگر۔ اگر برگد کے درخت پر سفید کپڑا نظر نہیں آیا تو۔ تو کیا ہوگا۔

ٹرین اپنا سفر طے کرتی جا رہی تھی۔ میرا گاؤں نزدیک آتا جا رہا تھا فیصلے کی گھڑی بس آنے ہی والی تھی خوف کے سائے مجھ پر چھا رہے تھے۔

میں امید اور ناامیدی کی سرحد پر کھڑا تھا مختلف اندیشے میرے گرد اپنا حصار تنگ کر رہے تھے ٹرین کی کھڑکی سے باہر دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

میں نے آنکھیں بند کر کے اپنی گردن جھکا لی۔ اسی وقت ٹرین کی رفتار دھیمی ہوئی اور وہ پلیٹ فارم سے لگ کر رک گئی

''فرید پور آ گیا۔'' میرے پڑوس میں بیٹھے بڑے میاں نے بڑبڑاتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

''فرید پور..... میرا گاؤں.....'' میرے ذہن میں آواز ابھری۔ مجھ سے نظریں نہیں اٹھائی جا رہی تھیں میں۔ میں پلیٹ فارم پر لگے برگد کے درخت کو دیکھنا چاہتا تھا مگر...... مگر مجھے لگ رہا تھا جیسے میری گردن پر منوں بوجھ رکھا ہو جس کی وجہ سے میری گردن اوپر نہیں اٹھ رہی ہے۔

ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ آخر کار میں نے ہمت کر کے سر اوپر اٹھایا اور آنکھیں کھول کر پلیٹ فارم کی جانب دیکھا۔

''یہ کیا..... مم..... مجھے کچھ نظر کیوں نہیں آ رہا..... کیا..... کیا میں اندھا ہو گیا ہوں.....'' جب مجھے کچھ نظر نہیں آیا تو میرے ذہن کے پردے پر سوال ابھرا مگر پھر خود ہی جواب بھی آ گیا۔

''جب آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہو تو کچھ نظر نہیں آتا۔'' مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میری آنکھوں سے آنسو خود بخود بہہ رہے ہیں۔

میں نے اپنی آنکھیں صاف کیں اور ڈرتے ڈرتے پلیٹ فارم پر لگے بوڑھے برگد کے درخت کی جانب دیکھا۔ بوڑھے برگد کے درخت کو دیکھتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ برگد کا پورا درخت سفید کپڑوں سے ڈھکا ہوا تھا درخت کی ہر شاخ پر سفید کپڑے لہرا رہے تھے۔

درخت کی کوئی شاخ خالی نہیں تھی۔ ہر شاخ پر سفید کپڑا لہرا رہا تھا کچھ کپڑے پرانے تھے اور کچھ کپڑے نئے تھے جو درخت کی شاخ پر لہرا رہے تھے۔ میں ہمت کر کے اپنی سیٹ سے اٹھا اور ٹرین کے دروازے تک آیا۔

میں نے اپنی پوری ہمت جمع کر کے ٹرین سے نیچے اتر کر پلیٹ فارم پر قدم رکھے میرے پیر منوں وزنی ہو رہے تھے۔ مجھ سے قدم اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نہایت دقتوں کے ساتھ برگد کے بوڑھے درخت کی جانب بڑھا۔

برگد کے درخت کی جانب بڑھتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک بوڑھا شخص جس کی کمر جھکی ہوئی ہے برگد کے درخت کی ایک شاخ سے سفید کپڑا باندھ رہا ہے اس شخص کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ وہ شخص روتے ہوئے برگد کی شاخ سے سفید کپڑا باندھ رہا ہے۔ مجھے سب دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اپنی آنکھیں صاف کیں جو آنسوؤں سے لبریز تھیں میں نے آنکھیں صاف کر کے بوڑھے شخص کی جانب دیکھا تو...... تو میرے منہ سے چیخ نکل گئی وہ...... وہ ابا جان تھے...... آہ میرے غم میں ابا جان کا کیا حال ہو گیا...... میرے صحت مند ابا کا میری جدائی نے کیا حال کر دیا ...... آہ میں نے کتنا عظیم ظلم کیا..... مجھے بے اختیار رونا آنے لگا۔

''ابا جان...... '' میرے منہ سے بے اختیار نکلا تو ابا جان نے مڑ کر میری جانب دیکھا۔ اور مجھ پر نظر پڑتے ہی ان کا مرجھایا ہوا چہرہ کھل اٹھا اور وہ ہاتھ پھیلا کر تیزی سے میری جانب بڑھے مگر راستے میں پڑے بڑے سے پتھر سے ٹکرا گئے اور پلیٹ فارم پر گرنے لگے۔ میں نے بھاگ کر انہیں اپنی بانہوں میں سنبھالا۔

''میں آ گیا ہوں ابا جان...... میں لوٹ آیا ہوں۔ مجھے..... مجھے معاف کر دیجئے۔'' میں نے روتے ہوئے کہا اور ابا جان کے سامنے معافی کے لئے ہاتھ جوڑ دیئے تو ابا جان نے مجھے بے قراری سے اپنے سینے سے لگا لیا اور میرے گالوں پر پیار کرنے لگے۔ ابا جان کی محبت میری نس نس میں اتر رہی تھی۔

ہم باپ بیٹے کا ملاپ دیکھ کر چچا شکور کی آنکھوں میں بھی خوشی کی آنسو آ گئے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے لوٹ آنے سے پلیٹ فارم کی ہر شے خوش ہو رہی تھی چچا شکور کا چائے کا کیبن بھی مسکرا رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر بنی سیمنٹ کی بینچ اور پانی پینے کا مٹکا بھی میرے واپس گھر آنے سے خوش تھے...... اور سب سے زیادہ خوشی برگد کے بوڑھے درخت کو تھی اس کی ہر شاخ خوشی سے جھوم رہی تھی۔

☆☆......☆☆

بادبان

نعمان اسحاق

خواہشوں کے سمندر میں سفر کرتا، ایک حاصل مطالعہ ناول،

جس میں زندگی کا بادبان ایک نئے جذبے کا سفر کرائے گا۔

(چھٹا حصہ)



تم لوگ بہت یاد آؤ گے۔ خاص طور پر چندہ تم خصوصاً وہ دن جب تمہیں خود سے پکا کر کھانے کا شوق چڑھتا ہے اور تم سارا گھر سر پر اٹھا لیتی ہو کہ کوئی میری مدد نہیں کرتا، میں کسی کو نہیں کھلاؤں گی پر جب کھانا بن جاتا تو خود ہی سب کو پیش کرتی اور کوشش کرتی کہ سبھی تعریف کریں چاہے چیز کھانے کے لائق ہو بھی کہ نہیں۔

اور رانی تم بھی عمر میں بڑی ہونے کی وجہ سے ہماری بڑی آپا بننے کی ہر کوشش جو تم کیا کرتی تھی اور روزی تم جب سرخ کپڑے پہنتی تو ایمان سے سرخ روز ہی لگتی۔ سیفی تم سے کچھ کہنے کے لیے شائد میرے پاس لفظ ہی نہیں۔ تم اس گھر کے آدھے مرد تھے۔ ہمارے باہر کے کام بلا چوں چراں کر دیتے یہ تمہاری مہربانی ہی تھی۔

کرنے کو کون سی بات ہے جو میں نہ کروں تم لوگوں کا ساتھ یاد کی طرح میرے ساتھ ہے ہم پانچ لڑکیاں تھیں۔ نصیب کے کھیل نے سونی کو خدا کے پاس پہنچا دیا اور مجھے اپنے اصل کی طرف لوٹا دیا۔

دل تو تھا تم سب سے مل کر جاؤں پر ابھی ملنے کی ہمت نہیں پاتی۔ لیکن آئندہ کبھی کبھار آیا کروں گی اور مل جایا کروں گی۔ تم سب کو بھی اپنے گھر دعوت پر بلاؤں گی۔

فقط

الوداع

چنبیلی

گھر میں لکھنے کے لیے کچی پنسل تھی ابھی آدھا خط ہوا تھا کہ پنسل کا سکہ ٹوٹ گیا۔

پنسل گھڑنے کے لیے تراش نہ تھی۔ باقی کا خط چنبیلی نے کاجل کی اسٹک سے لکھا تھا۔ لکھنے پڑھنے پر اچھی گرفت نہ تھی پر پھر بھی ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں مدعا بیان کر دیا۔

نوٹ لکھنے کے بعد جب چنبیلی اسے دیوار سے چپکا رہی تھی تب آنکھیں بار بار دھندلا جاتیں۔

در و دیوار پر آخری نظر ڈال کر جب چنبیلی جا رہی تھی تب تک سیفی نہا کر باہر نکل چکا تھا۔

''چنبیلی اتنی صبح صبح کہاں جا رہی ہو؟'' سیفی حیران ہوا تھا ان لڑکیوں کا صبح کے وقت گھر سے باہر جانے کا کہاں رواج تھا۔

چنبیلی نے جواب نہ دیا۔ بس خاموشی سے دروازہ دھکیل کر باہر چلی گئی۔

''اسے کیا ہو گیا ہے؟'' سیفی نے حیرت سے کندھے اچکائے تھے اور تولیے سے اپنے بال رگڑنے لگا تھا۔

☆☆☆☆

انہی دنوں اسغر کے دل میں ایک نئی خواہش جاگی۔

بی اے کی تیاری تو وہ کر رہا تھا۔ روزانہ ٹیوشن سنٹر جاتا۔ گھر آ کر بھی کتابوں کو ٹائم دیتا اور فارغ ٹائم میں عمیرہ احمد فرحت اشتیاق اور ہاشم ندیم کے ناول پڑھتا۔ یہاں تک کہ اس نے دورِ حاضر کے کئی مصنفین کے سارے ناول پڑھ لیے اور دل میں لکھنے کی خواہش جاگی۔

یوں بھی مقابلے کی اس دوڑ میں وہ سدرہ سے کہیں پیچھے رہ گیا تھا۔ سدرہ ابھی سے ڈاکٹر صاحبہ کہلاتی تھی اور اس کو دیکھ کر ہر کوئی یہی خواہش کا اظہار کرتا اگر اسغر بھی ڈاکٹر بن جاتا تو دونوں بہن بھائی ڈاکٹر ہوتے۔

ایک تو مصنف بننے کا شوق دل میں پیدا ہوا تھا۔ دوسرا اس طرح سے وہ دنیا کو بتا سکتا تھا کہ وہ بھی کسی سے کم نہیں۔ چنانچہ لکھنے کے لیے قلم اٹھانے سے پہلے اس نے پڑھے ہوئے ناولوں کو سیکھنے کی نیت سے باریکی سے پڑھا ارد گرد کا مشاہدہ کیا اور کہانی ڈھونڈنے لگا۔ کہانیاں تو بے شمار تھیں بس انہیں ناول کے سانچے میں ڈھالنے والے ہاتھ چاہیے تھے۔

اسی طرح ایک عام سے دن ٹی وی دیکھتے ہوئے زور زور سے بے اختیار ہو کر چلانے لگے تھے اور اسی دن کی شام چنبیلی گھر میں تھی۔

چنبیلی جو اس کی سوتیلی بہن تھی جو پچیس سال قبل کھو گئی تھی اور اب اچانک ایک معجزہ رونما ہوا اور وہ مل گئی۔

نشرِ مکرر میں اسغر نے وہ شو دیکھا تھا جو چنبیلی تک

رسائی کا باعث بنا تھا اور تب اس پر عقدہ کھلا کہ اس کی بہن Prostitute ہے۔ یا تھی؟؟؟ چنبیلی کو دیکھ کر اس کے دل میں کسی قسم کے جذبات نہ پیدا ہوئے تھے۔ البتہ باپ کو خوش دیکھ کر اس کا دل بھی یک گونہ پرسکون ہوا۔ وہ بات، وہ واقعہ جس نے زوار کو ساری زندگی بے کل و بے قرار رکھا، لوٹنے لگا تھا۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہوسکتی تھی۔

دعا جب کبھی آتی اسفر ناول پڑھتا ہوا دیکھتی۔

''خیر تو ہے اسفر تم آج کل فکشن کے کچھ زیادہ رسیا نہیں ہوگئے۔'' دعا جب بھی آتی سدرہ کی نسبت اسفر کے ساتھ زیداہ وقت گزارتی اور اس کا دعا کے پاس خود ساختہ جواز یہی ہوتا چونکہ اسفر کلاس فیلو ہے تو سدرہ کی نسبت اس کے ساتھ وقت گزارنا کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ پر شائد اسے اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ ایسے جواز بس اس کے دل کو ہی اطمینان دے سکتے ہیں ورنہ باقی سب تو دعا کا اسفر کی طرف جھکاؤ محسوس کر رہے تھے۔ ہاں البتہ اسفر بھی ناواقف تھا۔ اپنی شخصیت کی خامیوں میں الجھے اسفر نے کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ دعا کی اپنی طرف خصوصی توجہ کو اہمیت دے۔

''بس یونہی۔'' اسفر نے ناول بند کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ فی الحال وہ کسی کو یہ نہیں جتانا چاہتا تھا کہ وہ ناول لکھنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

''اور سناؤ پھر مستقبل کے سی ایس ایس آفیسر، میرے پسندیدہ رائٹرز نے تمہیں اپنی گرفت میں لے لیا ہے نا۔'' دعا مسکرائی۔

''بے شک کیا کمال تحریریں ہیں۔'' دل ہی دل میں خود کو سی ایس ایس آفیسر کہے جانے پر انشاء اللہ کہتا۔

''اپنی نئی بہن سے بات چیت ہوتی ہے۔''

''زیادہ نہیں تھوڑی بہت'' اسفر چنبیلی کو لے کر آج کچھ نئی نہج پر سوچ رہا تھا۔

''دوستی کر لو اپنی بہن سے پتا نہیں اپنی پچھلی زندگی میں کتنے دکھ سہے ہیں۔'' دعا کے لہجے میں ہمدردی ہوتی تھی۔

یونہی دن گزرتے گئے اور بالآخر وہ دن بھی آ گیا جب اسفر نے اللہ کا نام لے کر ناول لکھنے کی نیت سے قلم اٹھالیا۔

یہ ناول ایک لڑکی کی کہانی تھی جسے ایک دلال چوری کر جاتا ہے لیکن وہ پھر سالوں بعد اپنے گھر کو آ جاتی ہے۔ یہ چنبیلی کی کہانی تھی۔

''موسم حسین تھا۔ بادل اٹھکیلیاں کرتے تھے۔ ہوا بھی شرارت بھری تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ ایسی حسین شام زندگی میں پہلے کبھی آئی تھی اور نہ آئندہ کبھی آئے گی۔۔۔۔۔۔'' رات دس بجے اس نے پہلا لفظ لکھا تھا اور صبح تک وہ لکھتا ہی رہا۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔

☆......☆......☆

''میں سوچتی ہوں رائٹرز اتنے بڑے بڑے ناول لکھ کیسے لیتے ہیں۔'' چنانچہ اسفر آج کل ناولوں کی باتوں میں دلچسپی لیتا تھا اسی لیے دعا بھی خوشی خوشی جب موقع ملتا ناول سے متعلق ہی بات کرتی۔

''لکھنے کے لیے لگن کا، خواہش کا ہونا ضروری ہے۔ ناول تو اپنا آپ خود ہی لکھوا لیتے ہیں۔'' اسفر کہتے ہوئے زیر لب مسکراتا تھا۔ اس کا ناول تکمیل کے مراحل میں تھا۔

''قابل رشک بات ہے۔'' دعا شوق سے کہتی۔ رشک اس کے لہجے سے چھلک رہا ہوتا اسفر کی مسکراہٹ گہری ہو جاتی۔ اور دعا باغ باغ ہو جاتی۔ زندگی میں اسفر نے پہلے کبھی اس قدر میٹھے انداز میں بات نہ کی تھی۔

''اچھا دعا تم نے وہ بانو قدسیہ کا راجہ گدھ پڑھا ہے نا۔''

''بالکل پڑھا ہے۔ ایک بار نہیں بلکہ تین بار۔'' دعا جوش سے کہتی۔

''کتنی فلاسفی ہے راجہ گدھ میں ایسے ناول تو شائد صدیوں بعد لکھے جاتے ہیں۔'' دعا اپنی خیال آرائی پیش کرتی۔ اسفر کچھ سوچتے ہوئے سر ہلاتا رہتا۔

''تمہیں پتا ہے۔ بانو قدسیہ نے وہ ناول ایک مہینے کی قلیل مدت میں لکھا تھا۔''

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دستر خوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

"سچ؟؟" دعا کی آنکھوں میں حیرت ابھر جاتی۔
اسفر نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ویسے اسفر ناول پڑھنے میں دلچسپی سمجھ آتی ہے۔ لیکن یوں رائٹرز کے بارے میں تمہارے پاس اتنی ساری معلومات کہاں سے آئی ہیں اور کیونکر ہیں۔؟" اب کچھ دنوں سے دعا کو لگنے لگا تھا کہ اسفر کچھ چھپا رہا ہے۔

مسکراتے لبوں کے ساتھ بالآخر اسفر نے انکشاف کیا۔

"میں ناول لکھ رہا ہوں۔" دعا کی آنکھیں تحیر سے پھیل گئیں۔

"کیا اسفر؟" دعا کو یقین نہ آیا۔ مسکراتے ہوئے اسفر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہاں میں ناول لکھ رہا ہوں۔"

"چھپے رستم" دعا کی آنکھوں میں ابھی بھی بے یقینی تھی اسفر اٹھا اور اپنی الماری کھولی رجسٹر لے آیا اور دعا کے سامنے لاکر رکھ دیا۔ دعا صفحے پلٹتے جاتی اور حیران ہوتی جاتی۔

"ویلڈن اسفر یہ تم نے کب لکھا؟"

"پچھلے ایک مہینے سے لکھ رہا ہوں۔ ابھی اینڈ لکھنا باقی ہے۔" مسکراہٹ اسفر کے لبوں سے چپک ہی گئی تھی۔

"میں اسے گھر لے جاؤں پڑھ کر واپس کر دوں گی۔" دعا نے رجسٹر گود میں رکھ لیا اسفر نفی میں سر ہلانے لگا۔

"ابھی نہیں مکمل ہو جائے پھر۔"

"تو جلدی سے مکمل کر لو مجھے تو اب نیند ہی نہیں آئے گی جب تک یہ ناول پڑھ نہ لوں گی۔" دعا بے انتہا خوش لگ رہی تھی۔ ظاہر ہے اسفر نے ناول لکھا تھا۔ دعا کو خوش ہونا اتنی غیر معمولی بات نہ تھی۔

"فکر مت کرو یہ ایک دو دن میں مکمل ہو جائے گا۔" اسفر نے ہاتھ بڑھایا اور رجسٹر اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"یہ بات قابل حیرت بھی ہے اور قابل ستائش بھی ہے کہ تم نے ناول لکھا اور وہ بھی محض ایک مہینے کی قلیل مدت میں۔" زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا جب اسفر کو محسوس ہوا اس کی تعریف میں کہے گئے کلمات میں کاملیت تھی ورنہ اس سے قبل کبھی کسی نے اس کی تعریف کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور اگر تعریف کی بھی تھی تو بس دل رکھنے کو کی تھی۔

"لازوال ناول جب کبھی بھی لکھے گئے ہیں قلیل مدت میں لکھے گئے ہیں Hilton James کے Good bye Mr Chips کو لے لو چار دن کی قلیل مدت میں لکھا گیا تھا۔"

"پھر بھی اسفر اچھا یہ بتاؤ سدرہ کو بتایا؟" دعا نے پوچھا تو اسفر کا سر نفی میں ہلا تھا۔

"نہیں تم پہلی بندی ہی ہو جسے بتا رہا ہوں۔ تمہارے علاوہ کسی اور کو بتانے کا ارادہ بھی نہیں تاوقتیکہ ناول چھپ کر بک سنٹرز کی زینت نہ بن جائے۔"

"تمہارے علاوہ" خوش فہم دل کی خوش فہمی کے سامان کے لیے یہ دو الفاظ ہی کافی تھی۔ دعا کا دل بھی جھوم اٹھا تھا۔

"سی ایس ایس کے امتحان میں تمہیں اس کا الگ سے Reward ملے گا۔ ایسی سرگرمیوں کو مقابلے کے امتحان میں خاص اہمیت دی جاتی ہے۔" دعا کہہ رہی تھی اور اسفر سر ہلاتے ہوئے ناول کے اختتام کو سوچ رہا تھا۔ کامیابی بس چند قدم کے فاصلے پر نظر آرہی تھی۔

☆......☆......☆

ناول مکمل ہوا۔ اسفر نے سارا ناول پڑھ کر دیکھا۔ دلچسپ محسوس ہوتا تھا۔ سبق آموز بھی تھا۔ رومانویت بھی۔ تصوف کا رنگ بھی تھا۔ مختصراً سارے رنگ ناول میں سموئے ہوئے تھے۔ اپنا ناول پڑھتے ہوئے ہی اسفر کو دلچسپی محسوس ہو رہی تھی تو کیا دوسرے دلچسپی محسوس نہیں کریں گے؟ اور اس نے اگلے دن ٹیوشن سنٹر میں ناول کا رجسٹر دعا کو پکڑا دیا۔

"ناول سے متعلق تمہاری جو بھی رائے ہو سچ سچ دینا۔ جھوٹی رائے کی کوئی اہمیت نہیں۔" اسفر نے دعا کو جتلا دیا۔ دعا اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکراتی رہی۔ "تین سو ساٹھ صفحے" دعا کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ

☆......☆

اسفر نے لکھا ہے۔ بہر حال اس نے رجسٹر اپنے شولڈر بیگ میں ڈال دیا۔

لیکچرز ختم ہو چکے تھے اسی لیے طلباء گھروں کو جا رہے تھے ایک لڑکی کی سالگرہ تھی لڑکیوں نے سرپرائز پارٹی کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ دعا بھی پارٹی آرگنائز کرنے والوں میں شامل تھی۔

ٹیوشن سنٹر میں پارٹی کے لیے رکی ہوئی لڑکیوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ جس لڑکی کی سالگرہ تھی وہ اس سرپرائز پارٹی سے خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی اور لڑکیوں کی مشکور بھی تھی۔ ابھی کیک نہ کٹا تھا کہ دعا کا فون بج اٹھا۔

''ہاں دعا لینے آ جاؤں؟'' فون کرنے والے حنان بھائی تھے۔

''جی پندرہ منٹ تک آپ روانہ ہو جایئے گا۔ دراصل آج ہماری ایک فیلو کی برتھ ڈے ہے اس لیے ہم لوگ کلاس کے بعد رک گئے ہیں۔'' فون پر بات کرنے کے بعد دعا تقریب کا حصہ بنی، کیک کاٹا گیا۔ کھایا کم گیا اور ایک دوسرے کے چہرے پر زیادہ لگایا گیا۔ برتھ ڈے گرل کا چہرہ تو کیک کی کریم سے اتنا خراب کیا گیا کہ پوری رین بو ہی بن گئی۔

آدھے گھنٹے تک حنان لینے کے لیے پہنچ گئے۔

''آ جاؤ دعا میں باہر انتظار کر رہا ہوں۔'' دعا سلام کر کے ساتھ والے کمرے میں گئی جہاں تمام لڑکیوں کے بیگ پڑے تھے اور دھک سے رہ گئی۔

''اس کا شولڈر بیگ کہیں نہیں تھا۔'' دعا کو اپنا دل بیٹھتا محسوس ہوا تھا۔

کسی لڑکی نے شرارتاً چھپا دیا ہوگا یا پھر وہ کہیں اوپر نیچے ہو گیا ہوگا۔ ذہن میں یہی خیال آ رہے تھے۔

مگر نہ کسی لڑکی نے چھپایا تھا اور نہ ہی اوپر نیچے ہوا تھا۔ حقیقت یہی تھی کہ بیگ چوری ہو گیا تھا اور حقیقت کا سامنا کرنے کی ہمت دعا اپنے میں نہ پائی تھی اور اسفر کے لکھے گئے تین سو ساٹھ صفحوں والے ناول کا مسودہ بھی تو بیگ میں ہی تھا اب کیا ہو سکتا تھا؟''

☆......☆......☆

اسفر زندگی میں پہلی بار دعا کو کال کر رہا تھا۔ لیکن دعا کا دھیان ہی اس طرف نہیں گیا۔ بات ہی کچھ ایسی ظہور پذیر ہو چکی تھی۔

موبائل کی جگمگاتی سکرین پر اسفر کا نام روشن تھا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ دعا نے کال ریسیو کی۔

''کیسی ہو دعا؟'' اسفر کے انداز میں جلدی تھی۔ یقیناً وہ مدعے کی بات کرنا چاہتا تھا۔

''ٹھیک ہوں تم سناؤ۔'' دعا کو اپنی آواز ہی کہیں دور سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔

''میں بھی اچھا ہوں۔ تمہیں بے وقت تنگ تو نہیں کیا۔ سو تو نہیں رہی تھی؟''

''ن ن نہیں نہیں۔'' دعا نے تھوک نگلی تھی اور موبائل ایک کان سے دوسرے کان پر منتقل کیا تھا۔

''ناول پڑھا تم نے؟ کیسا لگا؟؟'' اسفر کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

''اچھا ہے... بہت اچھا ہے۔'' جھوٹ بولتے ہوئے دعا کی زبان اٹکی تھی۔

''ناول کی کونسی بات یا کوئی کردار یا پھر کوئی منظر جو تمہیں اچھا لگا ہو۔'' اسفر کا جیسے سارا جسم ہی کان بنا ہوا تھا۔

دوسری طرف دعا چند لمحے کچھ بول نہ پائی۔

''سارا ناول ہی لاجواب ہے۔'' دعا کا لہجہ کچھ پھیکا تھا اور اسفر نے یہ پھیکا پن شدت سے نوٹ کیا تھا۔ اس کا سارا تجسس و اشتیاق لمحوں میں تحلیل ہو گیا۔ وہ جو تصور کر رہا تھا کہ دعا بے لاگ تبصرہ کرے گی۔ ناول کے ہر کردار، ہر منظر کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرے گی وہ جیسے بات صرف ایک جملے میں نبٹا رہی تھی۔

''تعریف کا شکریہ۔'' بجھے دل کے ساتھ اسفر کال ختم ہی کرنا چاہتا تھا کہ دعا نے کہا۔

''اسفر میں کل تمہارے گھر آؤں گی اور ناول سے متعلق تفصیل سے بات کروں گی۔''

دعا کی آواز میں لرزش تھی اور اسفر نے یہ لرزش محسوس کی تھی۔

اگلے دن جب دعا اسفر کے گھر آئی تو خالی ہاتھ

تھی۔

''ناول لے آتی۔ اب اسے Neat کرتا پھر کسی پبلشر سے بات کرتا۔'' اسفر نے دعا کی خالی ہاتھ دیکھ کر کہا تھا۔ دعا نے جواب نہ دیا۔ لب کاٹتی اسفر کے سامنے چارپائی پر بیٹھ گئی۔

''ہاں کیسا لگا ناول لگتا ہے اچھا نہیں لگا کل فون پر بھی تم بتانے سے ہچکچا رہی تھی۔''

اس بار بھی دعا نے جواب نہ دیا۔ چند ثانیے خاموش بیٹھی رہی اور پھر رونے لگی۔

''کیا ہوا دعا؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے'' اسفر دعا کے یوں رونے سے قدرے بوکھلا گیا۔

''میں نے بیگ بہت ڈھونڈا۔ ہر جگہ کتنی دیر۔ اگلے دن بھی ٹیوشن سنٹر میں سب سے پوچھا مگر بیگ نہ ملا۔'' انہونی کے احساس سے اسفر کچھ نہ کہہ سکا۔ بیگ کے کھونے سے ناول کا کیا تعلق تھا۔ پہلو میں جیسے زور سے دل دھڑکا تھا۔

''مجھے معاف کر دو اسفر ناول مجھ سے گم ہو گیا۔'' ہچکیوں کے درمیان دعا نے کہا تھا اور اسفر کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ چند لمحے کمرے میں دعا کی ہچکیوں کی آواز گونجتی رہی اور پھر اسفر کی آواز کانوں میں اتری تھی وہ آواز نہیں تھی بلکہ شائد پگھلا ہوا سیسہ ہی تھا۔

''خود ناول ضائع کرنے کے بعد یوں ٹسوے مت بہاؤ۔ میں سب سمجھتا ہوں۔ بھلا تم کیوں چاہو گی کہ میں رائٹر بن سکوں۔''

دعا ساکت سی بیٹھی اسفر کو دیکھے گئی۔

☆......☆......☆

''تم بلاوجہ پریشان ہو رہی ہو۔'' ساری بات سننے کے بعد بھی سدرہ اسی طرح اطمینان سے چیونگم چباتی رہی جیسے پہلے چبا رہی تھی۔

''پہلے تو مجھے شک ہے کہ اسفر جیسے نکمے لڑکے نے ناول لکھ کیسے لیا اور بالفرض لکھ بھی لیا اور بقول تمہارے پونے چار سو صفحوں کا ناول ایک مہینے میں لکھ لیا تو ایک مہینہ کونسا زیادہ عرصہ ہے اسے کہو دوبارہ سے لکھ لے۔'' سدرہ کے پاس آسان حل موجود تھا۔

دعا پشیمان سی سر جھکائے بیٹھی رہی وہ سدرہ کو بطور ثالث درمیان میں لانا چاہتی تھی۔ جو نقصان وہ کر چکی تھی اس کی تلافی چاہتی تھی۔

''سدرہ یوں مت کہو ناول بلاشبہ شاندار تھا میں نے ایک دو اقتباس پڑھے تھے......'' دعا مزید کچھ کہتی کہ سدرہ نے بات درمیان میں اچک لی۔

''اسفر نے لکھا تھا۔ تمہیں تو شاندار لگے گا ہی۔ پر اتنی پریشان مت ہو تم نے خود تھوڑی گم کیا ہے۔ ایسا حادثہ خود اسفر سے بھی تو پیش آ سکتا تھا۔ اسفر کی ناراضی کو تم خاطر نہ لاؤ۔ وہ تو ہے ہی قنوطی، ہر چھوٹی بڑی بات کو دل سے لگا کر بیٹھ جانے والا، ابھی تم خود ہی تو بتا رہی ہو کہ بقول اسفر ناول لکھنے کے لیے لگن اور جذبے کی ضرورت ہے اگر اتنا ہی لگن اور جذبہ اس کے اندر ہے تو دوبارہ سے ناول لکھ ڈالے۔ پہلے ایک مہینے میں لکھا ہے اب بیس دنوں میں لکھ لے گا۔'' چیونگم چبا چبا کر سدرہ تھک گئی تو چیونگم نکالا اور پاس پڑی ڈسٹ بن کی طرف اچھال دیا۔

سدرہ نے اس سلسلے میں دعا کی کوئی مدد نہیں کرنی تھی۔ دعا کو یہ اندازہ ہوا تو اس نے سدرہ سے مزید کوئی اس سلسلے میں بات نہیں کی۔

گھر واپس آ کر بھی کئی بار اس کی آنکھیں ٹپکیں۔ رات کو نیند ہی صحیح طرح نہ آئی۔ بار بار آنکھ کھلتی رہی۔ دل میں کتنی بار خیال آیا کہ اسفر کو فون کر کے اپنی صفائی میں کچھ کہہ دے پر خود میں فون کرنے کی ہمت بھی نہیں پاتی تھی۔

اگلے دن پہلی فرصت میں وہ گئی اور مارکیٹ سے سوری کا ایک کارڈ لے آئی۔

ٹیوشن سنٹر میں لیکچر کے دوران کن اکھیوں سے وہ اسفر کو دیکھتی رہی۔ ساکت نگاہیں بورڈ پر جمائے۔ اسفر اس قدر مغموم تھا کہ لیکچرز کا ایک لفظ سمجھنا بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔

لیکچرز کے بعد دعا اسفر کے پاس گئی۔

''سوری اسفر'' کارڈ اسفر کی طرف بڑھایا تھا۔ آنکھیں ایک بار پھر چھلکنے لگی تھیں۔ اسفر نے ایک نظر کارڈ کو دیکھا اور دوسرے لمحے کارڈ کے ٹکڑے کر

دیے۔

"مجھے تم سے شدید نفرت ہے۔ میرا دل تمہارے منہ پر تھوکنے کا چاہتا ہے۔ آئندہ مجھ سے بات کرنے کی کوشش مت کرنا۔" اسفر بولتا نہیں پھنکارتا تھا۔

☆......☆......☆

چنبیلی سے سونی بننے کا سفر اتنا آسان بھی نہ تھا۔ درمیان میں پچیس سال تھے۔ پچیس سال کے نقوش خود سے تو نہیں مٹ جاتے۔

...زوار بے حد خوش رہنے لگے تھے چنبیلی کی چھوٹی چھوٹی بات کا خیال رکھتے روزانہ اس سے کئی کئی گھنٹے باتیں کرتے۔ ایک ہی باتیں۔ رخسار کو بہت یاد کرتے چنبیلی کو اس کے بچپن کے قصے اتنی بار سنائے کہ اسے ازبر ہوگئے۔

اور چنبیلی تھوڑی الجھی الجھی سی رہتی، بے شک وہ خوش تھی۔ زندگی پلٹ گئی تھی وہ تمام بد افعال چھٹ گئے تھے جو کہ چنبیلی زندگی کا حصہ تھے پر پھر بھی ایک عجیب سی کیفیت تھی جو طبیعت پر چھائی رہتی۔ شب و روز میں آنے والا تغیر اچھا تھا پر یوں کم از کم قبول نہیں ہو رہا تھا۔

آج طبیعت پر کسلمندی چھائی ہوئی تھی۔ روزانہ سگریٹ کی پوری پوری ڈبی پی جانے والی چنبیلی کو ہفتے گزر گئے تھے سگریٹ لبوں کو چھوا ہی نہ تھا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ رہے تھے۔ تھوڑے کپکپا بھی رہے تھے اور بلاوجہ غصہ آئے جا رہا تھا۔ دراصل یہ علامات جسم کو نکوٹین نہ ملنے کی وجہ سے ظاہر ہو رہی تھیں۔ جسم تو نکوٹین کا بے تحاشا عادی تھا وہ تو برداشت ہی نہ کر پا رہا تھا۔

یہ تو بعید از قیاس ہی تھا کہ زوار سگریٹ پیتے لیکن چنبیلی نے پھر بھی زوار کی قمیض کی جیب چیک کر لی۔ ان کی جیب میں والٹ کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ نوجوان لڑکے بھی تو گھر والوں سے چھپ چھپ کر سگریٹ پیتے ہیں چنبیلی کو سگریٹ کی طلب اتنی زیادہ ہو رہی تھی کہ اس نے اسفر کی جیب کی تلاشی کی ٹھانی۔

عموماً چنبیلی اس کمرے میں نہیں آتی تھی۔ لیکن آج گربہ پائی سے چلتی آ گئی۔ کمرے میں کوئی نہ تھا اور اسفر کی قمیض سامنے کھونٹی پر لٹک رہی تھی۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے چنبیلی نے یہ اطمینان کر لیا کہ فی الوقت کوئی نہیں آئے گا۔ لیکن جب وہ سامنے والی جیب دیکھ لینے کے بعد سائیڈ والی میں ہاتھ ڈال رہی تھی تبھی اس کی نظر مغربی دیوار پر پڑی۔ مغربی دیوار میں بھی کھڑکی تھی۔ چنبیلی شائد دوسری دفعہ اس کمرے میں آئی تھی اسی لیے کھڑکی کی طرف اس کا دھیان ہی نہ گیا تھا اس نے تو بس دروازے کی طرف سے اطمینان کیا تھا۔

مغربی دیوار والی کھڑکی راہداری میں کھلتی تھی بالوں میں مساج کرتی راہداری میں کھڑی سدرہ کھڑکی سے اندر ہی جھانک رہی تھی نگاہوں کا محور چنبیلی اور اسفر کی قمیص کی جیب میں موجود چنبیلی کا ہاتھ تھا۔

سدرہ سے نظریں ملیں تو چنبیلی کا دل اچھل کر جیسے حلق میں اٹک گیا تھا۔

☆......☆......☆

بڑا پرانا ریڈیو تھا۔ یونہی کاٹھ کباڑ میں پڑا تھا۔ زوار کی نظریں پڑی تو اٹھا لیا۔ صاف صفائی کر کے نئے سیل ڈالے تو چل بھی پڑا۔ پرسکون انداز میں آرام کرسی پر بیٹھے زوار ریڈیو سے پرانے گانے سننے لگے۔ چنبیلی کے آنے کے بعد بڑی تبدیلیاں آگئی تھیں۔ ہر کام سے کنارہ کش رہنے والے زوار اب ایسے کاموں میں بھی دلچسپی لیتے جن میں دلچسپی کا عنصر بھی نہ ہوتا۔ تبھی فاخرہ کمرے میں آئیں۔ دروازے میں کھڑے ہو کر انہوں نے شوہر کو جھولتے دیکھا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی زوار کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

زوار نے ریڈیو بند کیا اور تھوڑا سیدھا ہو کر بیٹھ گئے فاخرہ کے انداز انہیں باور کروا چکے تھے کہ وہ کوئی خاص بات ہی کرنے آئی ہیں۔

"کچھ کہنا ہے تم نے؟" زوار متوجہ تھے۔

"ہاں' فاخرہ کچھ سوچتے ہوئے گویا ہوئیں۔

"آج کل بڑے خوش و مطمئن رہتے ہیں۔"

زوار میں آنے والی تبدیلیاں دوسری گلی میں رہنے والے محلے دار محسوس کر رہے تھے اور وہ تو ان کے

ساتھ ایک چھت تلے رہنے والی ان کی شریک حیات تھیں۔

"ہاں شائد۔تم بتاؤ تم نے کیا کہنا ہے؟" زوار خوش مزاجی سے بولے تھے۔

"چنبیلی کے بارے میں کیا سوچا ہے آپ نے؟" زوار چاہتے تھے کہ چنبیلی کو سونی بلایا جائے پر یہاں یہ عالم تھا ان کے علاوہ سب ہی اسے چنبیلی بلاتے تھے۔

"کیا سوچا ہے سے کیا مطلب؟" زوار اچنبھے سے فاخرہ کو دیکھنے لگے۔ فاخرہ بلاوجہ گلہ کنکھارتے بولیں۔

"زوار ممکن ہے تمہیں میری بات بری لگے۔لیکن آنکھیں بند کرنے سے بھلا کبوتر بلی کی دسترس سے دور تھوڑی ہو جاتا ہے۔"

"جو بات ہے صاف صاف کرو۔" لہجے کی خوش مزاجی اب سنجیدگی میں بدل چکی تھی۔

"چنبیلی جہاں سے آئی ہے یہ توقع تو نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ اچھی عادات لے کر آئے گی۔"

زوار کو چبھن سی ہوئی۔ ان کا دل چاہا فاخرہ کو ٹوکیں مگر انہوں نے بولنے دیا۔

"تمہیں میری بات بری لگے گی مگر یہ سچ ہے۔ اب کل کی بات دیکھ لو سدرہ نے دیکھا وہ اسفر کی کھونٹی پر لٹکی قمیص کی جیب سے کچھ چرا رہی تھی۔"

زوار لمحے بھر کے لیے ساکت ہو گئے۔پھر بولے تو ان کی آواز پھنسی پھنسی سی تھی۔

"اسفر بھائی ہے سونی کا وہ ضرور تا اس کی جیب سے کچھ نکال سکتی ہے۔"

"زوار جانبداری سے کام مت لو۔ بلاشبہ بہن بھائی کا رشتہ ہے مگر ابھی جبکہ چنبیلی کو اس گھر میں آئے چند ہفتے ہی ہوئے ہیں اور ابھی تک اسفر اور چنبیلی میں ڈھنگ سے بات چیت بھی نہیں ہوئی تب یوں چوری چھپے اسفر کی جیب میں ہاتھ ڈالنا بہن بھائی والی بے تکلفی کو ظاہر نہیں کرتا۔" فاخرہ کچھ تلخ سی ہوئی تھیں۔ حقیقتاً زوار کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ تھا۔آنکھیں موند کر وہ کرسی ایک بار پھر جھلانے لگے۔

"زوار میری نیت بری نہیں اور نہ میں تمہاری دل آزاری چاہتی ہوں۔لیکن مجھے لگا کہ تم سے بات کر لینی چاہیے تم چنبیلی کو سمجھاؤ۔" مزید کچھ کہنے سے پہلے فاخرہ لمحے بھر کو رکیں۔

"یہ حقیقت ہے مجھے چنبیلی سے دلی وابستگی نہیں مگر میں اس کا برا بھی نہیں چاہتی۔ میرے خیال میں اگر تم اجازت دو تو چنبیلی کے لیے کوئی بر ڈھونڈیں کسی رشتہ کرنے والی سے کہوں۔۔۔۔"

زندگی کی حقیقتیں زوار کا منہ چڑانے کو آ گئی تھیں۔ زوار یونہی کرسی جھلاتے خاموش بیٹھے رہے۔

☆......☆......☆

سونی کے ملنے پر ہر کو یا انگشت بدنداں ہوا۔ بھلا ایسے کرشمے، ایسے معجزے بھی رونما ہوتے ہیں ، بات حیرانگی والی تو تھی ہی۔

صفدر بھی حیران ہوئے تھے۔ سالوں پہلے جب زوار کی بیٹی گم ہو گئی تھی تو وہ بھائی کے غم میں شریک تھے لیکن اب جب پچیس سال بعد وہ لوٹ آئی تھی تب وہ خوش نہ ہو پائے وجہ وہ جگہ تھی جہاں سے سونی لوٹ کر آئی تھی۔ دنیا نہیں سونی کا یوں لوٹ آنا ٹھیک تھا کہ نہیں لیکن ابھی ان سے بھی زیادہ عجب بات ہوئی تھی۔

"کیسے ہیں صفدر بھائی؟" دھڑکتے دل کے ساتھ زوار نے آج بھائی کو فون کیا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں تم سناؤ۔آج بڑے دنوں کے بعد یاد کیا۔" صفدر کا لہجہ ہشاش بشاش تھا۔ اور سناؤ گھر خیر خیریت ہے۔تمہاری سونی کیسی ہے۔ میں ملنے آؤں گا بلکہ تم اسے ادھر جہلم لے آؤ۔ بھابھی اور دوسرے بچوں کو بھی لے آؤ۔میری طرف سے دعوت ہو گئی بلکہ تم فون نہ کرتے تو ایک دو دن تک دعوت کا پیغام دینے کے لیے فون کا ارادہ رکھتا تھا۔"

زوار نے بات ان سنی کر دی یوں ہی جس بات کے لیے انہوں نے فون کیا تھا اس کے سامنے یہ باتیں بے کار تھیں۔

"احمد کیسا ہے؟"

"ٹھیک ہے امتحان ہے تو پڑھائی میں آج کل زیادہ مصروف ہے۔"

''صفدر بھائی وہ آپ نے اس کا کہیں رشتہ تو نہیں طے کیا۔'' پوچھتے ہوئے زوار نے نچلا لب دانتوں تلے دبایا ہوا تھا۔

''نہیں، نہیں'' صفدر کو لگا زوار سدرہ کی بابت یہ پوچھ رہے ہیں بعید تو نہیں تھا کہ وہ کہتے سدرہ کو احمد سے منسوب کرلیں۔ لیکن زوار نے کچھ اور ہی کہا۔

''صفدر بھائی اگر آپ کو مناسب لگے تو میری سونی کو اپنی بہو بنالیں۔'' صفدر لمحے بھر میں سکتے میں آگئے لیکن یہ دورے لمحے میں انہوں نے سکتہ توڑنا ضروری سمجھا۔

''احمد اپنی کلاس فیلو نیلم کو پسند کرتا ہے۔'' بروقت یہی بہانہ سوجھا۔

زوار خاموش کے خاموش رہ گئے۔ انہیں لگنے لگا کہ بھائی سے یہ بات کر کے انہوں نے غلط قدم اٹھایا۔

مزید کچھ گفتگو کرنے کے بعد انہوں نے فون بند کر دیا اور فون ہاتھ میں لیے بیٹھے کچھ سوچتے رہے۔ انہیں راشدہ آپا کو فون کرنا چاہیے کہ نہیں۔۔۔ شائد نہیں۔۔۔ لیکن پھر بھی انہوں نے فون کیا۔ ایک امید تھی انہیں کہ راشدہ منع نہیں کریں گی۔ آخر جب سونی پیدا ہوئی تھی تب انہوں نے اپنے ارسلان کے لیے خواہش کا اظہار تو کیا تھا۔ ارسلان کی شادی ہوگئی تو کیا ہوا سلمان تھا، ذیشان تھا۔ گاؤں کے ایسے کڑیل جوان تھے کہ نظر ہی نہ ٹھہرتی تھی۔

''لیکن زوار میرا سلمان تو سونی سے چھوٹا ہے۔''

زوار کو یاد تھا کہ سلمان سونی سے محض چھ مہینے ہی چھوٹا تھا۔ شائد چھ مہینے چھوٹا ہونا اتنا بڑا فرق تھا کہ رشتہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

زوار اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

''زوار دل برا مت کرنا تم میرے بھائی ہو پر۔۔۔ میں خود بھی تم سے رشتہ داری مضبوط کرنا چاہتی ہوں اگر تم اپنے اسفر کے لیے میری خولہ کو سوچو تو۔۔۔'' راشدہ نے بات ادھوری چھوڑی تھی۔

یوں تو وہ اپنے منہ سے یہ بات کہنا تو نہیں چاہتی تھی لیکن جب زوار سارے زمانے کی دھول چاٹنے والی بیٹی کے لیے سلمان کے نام لے سکتے تھے تو وہ کیوں نہیں۔۔۔

''فون بند کرنے کے بعد راشدہ کا دل ملال سے بھرنے لگا۔ بھائی کو انکار کر کے خود انہیں بھی برا لگا تھا لیکن کم از کم اولاد کے معاملے میں تو وہ غرض دکھا سکتی تھیں۔ ایڈز، ہیپاٹائیٹس اور جانے کیا کیا۔۔۔ نئے زمانے میں نئی نئی بیماریاں بھی تو آگئی تھیں۔

خدانخواستہ ان کے بیٹے کو کوئی بیماری لگ جاتی تو پھر۔۔۔۔

☆......☆......☆

چنبیلی کا باپ کے ساتھ مشترکہ کمرہ تھا کسی اور کو یہ بات عجیب لگتی یا نہیں مگر چنبیلی کو ضرور عجیب لگتی تھی۔ زوار دکان پر گئے تھے۔ چنبیلی کو تنہائی میسر تھی اور اسی تنہائی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چنبیلی سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہی تھی۔ جیسے کتنے دنوں کے سگریٹ آج ہی پی لینے کا ارادہ تھا۔

تبھی دروازے پر دستک ہوئی اور چنبیلی ہڑبڑا گئی۔ کمرہ سگریٹ کے دھویں سے بھرا ہوا تھا۔ اب کیا کرے؟ دوسری بار دستک ہوئی چنبیلی نے اٹھ کر فل سپیڈ میں پنکھا چلا دیا اور پچھواڑے والی کھڑکی کھول دی۔

تیسری بار دستک قدرے تیز تھی۔ چنبیلی کے دل میں خواہش جاگی کہ دروازہ نہ کھولے اور جب پھر کوئی استفسار کرے گا تو کہہ دے گی سو رہی تھی۔

''چنبیلی دروازہ کھولو'' اب کے بار زوار نے صدا لگائی تو ناچار چنبیلی نے دروازہ کھول دیا۔ اور زوار جو پوچھنے کا ارادہ رکھتے تھے کہ دروازہ کھولنے میں کیوں دیر لگائی، فضا میں رچی تمباکو کی بو سے خود ہی جان گئے کہ دروازہ کھولنے میں کیوں دیر ہوئی تھی۔ شرمندہ شرمندہ سی چنبیلی دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ زوار نے نظر بھر کر چنبیلی کو دیکھا تھا کتنی دراز قد تھی منہ سے بے ساختہ ماشاء اللہ نکلتا تھا۔ قد کاٹھ میں بالکل رخسار جیسی تھی ورنہ زوار خود تو ناٹے قد کے تھے۔ چنبیلی کو دیکھتے ہوئے ان کے دل میں بے پناہ شفقت امڈ آئی۔ بیٹی کو ساتھ لگا کر شفقت سے اس

کے بال سہلانے لگے۔ چنبیلی کی آنکھیں بے ساختہ نم ہوگئیں اور جب زوار نے چنبیلی کو خود سے الگ کیا تو وہ رو رہی تھی۔

"روتے نہیں۔ تم روؤ گی تو میں بھی رو دوں گا۔"
زوار نے ہاتھ بڑھا کر چنبیلی کے آنسو خود پونچھتے تھے۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" سر تھپتھپاتے ہوئے زوار نے کہا تھا۔

اس کے بعد زوار الماری کھول کر اپنا سامان نکالنے لگے جسے لینے کے لیے وہ دکان سے آئے تھے۔

اسی وقت فاخرہ کمرے میں آئیں جب سے چنبیلی گھر میں آئی تھی اپنے گھر کی فضا خود بھی اجنبی اجنبی سی لگتی تھی۔ چنبیلی کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ زوار سے مخاطب ہوئی تھیں۔

"سدرہ کے سسرال والوں کو طعام پر بلایا ہے۔ ہماری طرف کریں گے۔ چنبیلی کے گھر سے بھی لوگ آئیں گے۔"

"اچھی بات ہے۔ کسی چیز کی ضرورت ہے تو بتا دو میں لے آؤں گا۔"

"نہیں سامان اسفر سے منگوالوں گی۔ کافی امیر لوگ ہیں تو کھانے میں اہتمام بھی اس حساب سے زیادہ ہونا چاہیے۔ چنبیلی تمہیں کوکنگ آتی ہے؟"
فاخرہ نے اب چنبیلی کو مخاطب کیا تھا اور چنبیلی کو جتنی کوکنگ آتی تھی وہ ہرگز اتنی نہیں تھی کہ کہا جاتا ہاں میں کوکنگ کر لیتی ہوں۔

شرمندگی سے چنبیلی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ فاخرہ نے کوشش کی اندر کی کڑواہٹ منہ پر مت ظاہر ہو۔ کمرے میں کھلی تماکو کی بو کو بھی تو وہ نظر انداز کر رہی تھیں اس سے قبل بھی انہوں نے چنبیلی کو سگریٹ پیتے دیکھا تھا۔

مزید کچھ کہنا فاخرہ جانے کو مڑیں کہ اچانک انہیں کچھ یاد آیا۔

"اپنے سارے کپڑے دکھانا میں بتاؤں گی ڈنر کے لیے کیا پہننا۔" یہ فاخرہ اس لیے نہیں کہہ رہی تھیں کہ وہ چاہتی تھیں چنبیلی اچھی لگے بلکہ انہیں دوسرے قسم کے تحفظات تھے۔

"ٹھیک ہے۔" چنبیلی کا لہجہ تھکا تھکا تھا اس کے پاس شریفوں کی دعوت میں پہننے لائق کپڑے نہیں تھے۔ چنبیلی کے لہجے کی تھکاوٹ کو زوار نے محسوس کیا تھا۔

"میں اور سونی آج کپڑوں کی خریداری کے لیے بازار جا رہے ہیں۔ میری بیٹی کے پاس ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں اور میرا دھیان ہی نہ گیا تم نے کچھ لینا ہے تو ساتھ چلو۔" یہ پروگرام زوار نے ابھی کھڑے کھڑے بنایا تھا۔

"نہیں مجھے کچھ نہیں لینا۔" سپاٹ تاثرات کے ساتھ کہتی فاخرہ چلی گئیں اور چنبیلی نے بمشکل تمام آنکھوں کو نم ہونے سے روکا تھا۔ باپ کی محبت اکثر و بیشتر اس کی آنکھوں کے کونے نم کر دیتی تھی۔

☆......☆......☆

کمرے کی سجاوٹ میں اب وہ نوخیزی اور نوعمری نہیں نظر آتی تھی جو چند سال پہلے ہوا کرتی تھی۔ کئی شوخ رنگ کی چیزیں سادہ اور گہرے رنگ کی چیزوں سے بدل گئی تھیں۔ اب تو دعا دیواروں کا رنگ بھی تبدیل کروانا چاہ رہی تھی۔ فرقان بھائی کو کہہ بھی دیا تھا۔ انہوں نے یہ کام فرصت کے دنوں کے لیے ڈال دیا تھا۔

اسفر ناراض تھا تو کیا ہوا۔ وہ اب بھی خوابوں میں آتا تھا۔ کبھی موتیوں کی بارش میں چھتری لیے کھڑا ہوتا تو کبھی پہاڑوں کے درمیان ندی کنارے کھڑا ندی کے پانی میں پتھر اچھال رہا ہوتا۔ یہ خواب تو جیسے معمول کا حصہ تھے۔ سوتی آنکھیں اس کے خواب دیکھتے نہ تھکتی تھیں تو جاگتی آنکھیں اس کے خیالوں میں کھوئی رہتیں۔ تاحال اسفر سے دعا نے دوبارہ معذرت نہ کی تھی بلکہ ہمت ہی نہیں ہوئی تھی۔

ناول نادانستہ گم ہوا تھا۔ تھوڑی بہت دعا سے بھی بے احتیاطی ہوگئی کہ اس نے بیگ یونہی دوسرے کمرے میں رکھ چھوڑا۔ اسفر ناراض تھا تو وہ حق بجانب تھا لیکن "میرا دل تمہارے منہ پر تھوکنے کو چاہتا ہے" جیسا کہنا درست نہ تھا۔ بہرحال صحیح یا درست کا

تعین کرنے سے بہتر تھا کہ بات کو سرے سے ختم کر دیا جائے۔ لیکن کس طرح ختم کیا جائے دعا کو سمجھ نہ آتا اب یہ تو نہ ہو سکتا تھا کہ دعا ناول لکھ کر اسفر کو دے اور کہے۔

"لو اسفر تمہارا ناول گم ہو گیا تو میں نے خود لکھ کر دیا یہ تم اپنے نام سے چھپاؤ۔" کیسے مضحکہ خیز اور ناممکنات سے خیالات ذہن کے دروازے پر دستک دیتے تھے۔ دعا سر جھٹک کر رہ گئی۔

اگلے مہینے بی اے کے پیپرز تھے اور پھر سی ایس ایس کی تیاری بی اے کی تیاری تو خیر بندہ آسانی سے کر لیتا ہے لیکن سی ایس ایس کی تیاری کے لیے وہ اسفر کا ہاتھ پکڑ کر چلنا چاہتی تھی۔

اسفر اگر تعلیم کے میدان میں کمزور تھا تو اس کمزوری کا مقابلہ کرنے کے لیے اسفر کا ساتھ دینا دعا کی ذمہ داری تھی اور وہ اپنی ذمہ داری بطریق احسن نبھانا چاہتی تھی۔

"اسفر میری اس خطا کو معاف کر دو۔ میں وعدہ کرتی ہوں آئندہ ایسی بے احتیاطی پوری زندگی نہ ہو گی۔" کتاب بند کر کے دعا کتنے دیر سے اسفر کو سوچے جا رہی تھی۔ کہنی رائٹنگ ٹیبل پر ٹکائے نظریں لیمپ پر جمائے وہ کتنی دیر یونہی بیٹھی رہی اور جب یونہی بیٹھے بیٹھے تھک گئی تو اٹھی اور قدم قدم چلتے کھڑکی تک آئی اور بلا وجہ نیچے کی جھانکنے لگی۔

کھڑکی بہت بڑی تھی۔ دعا کے قد سے بھی بڑی۔ اس عمارت کی سجاوٹ کو مد نظر رکھتے ہوئے تمام فلیٹس کی کھڑکیاں قد آدم رکھی گئی تھیں۔

نیچے سڑک پر سکون تھی یہ فلیٹس رہائشی عمارتوں کے بین الاقوامی اصولوں کو مد نظر رکھ کر بنائے گئے تھے۔ اسی لیے مین سڑک سے دور تھے۔ ٹریفک کا بے ہنگم شور مکینوں کو تنگ نہیں کرتا تھا۔ آمنے سامنے کے فلیٹس کے درمیان گزرتی سڑک پر نظریں جمانے کے لیے دعا کو ایڑیاں اٹھانی پڑی تھیں۔ ایڑیاں اٹھاتے ہوئے جب اس نے فریم پر ہاتھ جمائے تو فریم کھڑ کھڑ کرنے لگی۔ مدت سے کھڑکی کی فریم ڈھیلی تھی۔

"فرقان بھائی کو بتاؤں گی جب کمرہ پینٹ کروائیں گے تو فریم بھی فکس کروا دیں گے۔" دعا نے نیچے جھانکتے ہوئے دیکھا تھا۔ نیچے جھانکتے ہوئے اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اسفر نیچے کھڑا ہوا۔

"کیسی احمقانہ خواہشیں دل میں جنم لیتی ہیں یہ محبت بھی نا۔" اپنی سوچ پر دعا مسکرا دی۔

☆......☆......☆

وہ لڑکی جو میٹرک میں ہی پڑھ پڑھ کر تھک چکی تھی اور پڑھنے سے اتنا بیزار رہتی تھی کہ اس کا میٹرک کے بعد پڑھنے کا بالکل کوئی ارادہ نہیں تھا اس لڑکی نے داخلہ جمع کروا دیا تھا اور اس کے اگلے مہینے بی اے کے پیپر تھے۔

یہ ایک عام سی صبح تھی صحن میں افقی سمت چارپائیاں بچھی تھیں سب گھر والے باہر صحن میں سوئے ہوئے تھے ادھر موذن نے اذان دی تھی اور ادھر خولہ کی آنکھ کھلی تھی۔ وضو کر کے نماز پڑھنے سے پہلے اس نے ماں کو اٹھایا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ راشدہ بے خوابی کا شکار ہوتی جا رہی تھی رات کو کروٹ بدل بدل کر تھک جاتی اور آنکھ نہ لگتی اور صبح کھلنے کا نام نہ لیتی۔ نماز کے بعد اس نے بھائیوں کو اٹھایا سلمان اٹھ گیا ذیشان نہ جاگا وہ نمازوں کا چور تھا صبح کی نماز تو شاذ و نادر ہی پڑھتا اس دوران والد صاحب خود ہی اٹھ گئے۔

نماز کے بعد قرآن مجید کی تلاوت بھی ان کی صبح کے معمول کا حصہ تھی۔ قرآن مجید پڑھنے کے بعد وہ قرآن مجید گود میں لیے بیٹھی رہی۔

صحن کے وسط میں کھجور کے تین درخت یوں ساتھ ساتھ جڑے ہوئے محسوس ہوتے تھے جیسے قریبی دوست باہم گلے مل رہے ہوں۔ ایک طرف نیم کا گھنا پیڑ تھا۔ دوسری طرف کچھ بھینسیں بیٹھی جگالی کر رہی تھیں۔

خولہ کو اچانک صحن میں بھاگتی ہوئی خولہ نظر آئی۔ مرغیاں آگے آگے اور وہ پیچھے۔ نیم کے تنے کے ساتھ بندھے جھولے کی طرف دیکھا تو وہاں بھی خود کو

جھولا جھولتے دیکھا۔ کھیتیوں کے قریب زمین پر شاپو بناتے ہوئے اور بنانے کے بعد کھیلتے ہوئے بھی دیکھا۔ صحن کے ہر کونے میں وہ تھی اور کسی نہ کسی کھیل میں مصروف تھی۔

ایک دلفریب مسکراہٹ خولہ کے لبوں پر آن ٹھہری۔ بچپن گزر گیا تھا اور یادیں چھوڑ گیا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا ساری زندگی بچپن ہی رہتا۔

قرآن مجید سینے سے لگائے خولہ اٹھی اور رحل میں رکھ آئی۔ برآمدے میں لٹکے مٹھو کے پنجرے میں کٹے ہوئے ٹماٹر کا ٹکڑا رکھا تھا۔ مٹھو بوڑھا ہو چکا تھا۔ پنجرے کی دیواروں پر چڑھنے اترنے کا شغف کم ہی رکھتا تھا وقت جیسے ہر چیز پر گزرا تھا۔

صحن میں اپنی چارپائی پر تکیے سے ٹیک لگائے والد صاحب کو منہ میں پان رکھتے دیکھا تو اندر سے پیک دان لینے چلی گئی۔ یہ پیک دان بھی کسی زمانے گلدان تھا۔ گلدان کا منہ ایک طرف سے ٹوٹا تو اسے پیک دان کا عہدہ دے دیا گیا۔ پیک دان رکھنے کے بعد پلٹی اور باورچی خانے ناشتے کی تیاری کے لیے چل دی۔

''راشدہ ماشاء اللہ سے ہماری بیٹی کس قدر سلیقہ مند ہے۔'' بچپن میں کس قدر شرارتی ہوا کرتی تھی ایک منٹ نچلا نہ بیٹھتی تھی اب تو اتنی سگھڑ اور خدمت گزار ہے کہ دل سے ہر وقت دعا نکلتی ہے۔'' پیک دان میں تھوک پھینکتے ہوئے والد صاحب نے کہا تھا۔ راشدہ طویل سانس بھر کر رہ گئی۔

''بے شک بس اللہ نصیب بھی اچھے کھڑے۔'' بائیس سالہ خولہ کو دیکھتے ہوئے راشدہ اب یونہی آہیں بھرا کرتی تھی۔ گاؤں میں لڑکیوں کی سترہ اٹھارہ یا حد سے حد بیس سال کی عمر میں شادی ہو جاتی تھی اور خولہ کے لیے تو تا حال کوئی رشتہ بھی نہ آیا تھا۔ زوار سے انہوں نے تذکرہ کیا تھا پر انہوں نے بھی کوئی جواب نہ دیا۔

''اے خدا جانے اس تاخیر میں کیا مصلحت ہے۔'' راشدہ ایک اور طویل سانس بھرتی، خولہ کا ہاتھ بٹانے کے لیے باورچی خانے کی طرف چل دیں۔

☆☆☆

چکن قورمہ، مٹن قورمہ، بیف کباب، مٹن پلاؤ، چائنیز رائس، اٹالین پاستا، فرنچ سینڈوچز، میٹھے میں کسٹرڈ، کھیر اور گجریلا، فاخرہ نے صحیح معنوں میں ڈنر پر ہزاروں خرچ کر دیے تھے۔

''اتنا سب کچھ تیار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔'' زوار سٹپٹا گئے۔ یہ فضول خرچی انہیں بھائی نہیں تھی۔

''لو زوار میں کوئی شوق میں تھوڑا کر رہی ہوں۔ بھئی امیر لوگوں میں بیٹی بیاہ رہے ہیں تو ان کو کھانا تو ان کے شایان شان کھلائیں۔ اور امیروں کے کھانے کی میزیں یونہی بھری ہوتی ہیں۔'' فاخرہ کا انداز مصروف سا تھا۔ کرنے کے لیے ابھی بہت سے کام پڑے تھے۔

''اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے چاہئیں۔ اتنا بجٹ تو ہمارے پندرہ دن کے کھانے کا ہوگا جو تم نے ایک عشائیے پر لگا دیا۔'' ناگواری زوار کے لہجے میں عیاں تھی پر حسب معمول فاخرہ نے زوار کی ناگواری کو خاطر خواہ نہ سمجھا۔

''جانے دو زوار بیٹی کے سسرال والے پہلی دفعہ آ رہے ہیں کچھ مت کہو۔ آئندہ تمہاری بات ہی مانوں گی۔'' صبح سے وہ کام میں لگی تھیں اور ابھی تک ان کی پھرتی قابل دید تھی سکول سے بھی انہوں نے آج کے کھانے کی تیاری کی غرض سے چھٹی لے لی تھی۔ زوار کو کم مائیگی کا احساس تو ہوا بہر حال وہ مزید کچھ کہے بنا اندر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

سدرہ کو انہوں نے زیادہ کام نہیں کروایا تھا۔ البتہ اسفر کو بھی باہر کے خوب چکر لگوائے تھے اور چنبیلی سے بھی کئی چھوٹے موٹے کام کروائے تھے بلکہ وہ بھی صبح سے ان کے ساتھ کچن میں ہی تھی۔ کبھی پیاز چھیل رہی تھی تو کبھی ہری مرچیں کاٹ رہی تھی تو کبھی آنچ پر رکھے سالن میں چمچ ہلا رہی تھی۔

''بس اسفر یہ آخری چکر تھا جانے چاندی کے ورق مجھے کیسے بھول گئے تم اب آرام کرو۔'' اسفر سے انہوں نے کہا تو اسفر ورق رکھتا جانے کو مڑا۔

''سنو اسفر آج اپنی وہ سرخ شرٹ پہن لینا جو

پچھلے ہفتے خریدی تھی۔" فاخرہ مسکرا کر کہہ رہی تھیں۔
ان کے خیال میں بیٹا سرخ شرٹ میں کافی ہینڈسم لگتا ہے۔ اسفر سر ہلاتے ہوئے نیچا نے لگا۔
"اور بیٹا جی جواد کے ساتھ مسکرا کر بات کرنا۔ میں جانتی ہوں وہ تمہیں زیادہ پسند نہیں پر اپنے اور اس کے رشتے کی نوعیت بھی تو دیکھو اور کب تک چھوٹی سی بات کو دل سے لگا کر رکھو گے۔" فاخرہ مسکرا کر بیٹے کو سمجھا رہی تھیں۔ اسفر کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ اسفر لب کچلتا کچن سے باہر نکل ہی رہا تھا تبھی دعا سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔
"السلام علیکم۔" دعا نے دھڑکتے دل کے ساتھ سلام کیا تھا۔
"وعلیکم السلام" اسفر نے نارمل لہجے میں سلام کیا اور دعا نے شکر بجالائی۔
"کتنی دیر سے آ رہی ہو دعا، جلدی آ جاتی تو تھوڑا میرا ہاتھ بھی بٹا لیتیں۔" بھابی کا گال چومتے ہوئے فاخرہ نے شکوہ کیا۔ انہوں نے صبح سے دعا کو فون پر آنے کا کہا تھا اور وہ اب شام ڈھلے آ رہی تھی۔
"سوری آنٹی کوئی ڈرائیور کرنے والا نہ تھا۔"
"اچھا اچھا اب مہمان بن کے مت کھڑی ہو جاؤ۔ ہاتھ بٹاؤ۔" دعا مسکراتے ہوئے ساتھ لگ گئی۔
"آپی آپ کیسی ہو؟" دعا نے مسکراتے ہوئے چنبیلی سے پوچھا تھا۔ چنبیلی بھی جواباً مسکرا دی۔
"ٹھیک ہوں۔" بہن بھائی کی یہ کزن اسے بھی اچھی لگتی تھی۔
"چنبیلی اگر ایک بات کروں تو برا تو نہیں مناؤ گی۔" فاخرہ درمیان میں اچانک بولیں۔
"جی۔" چنبیلی چٹنی کا مصالحہ کوٹتی رہی۔
"تم مہمانوں کے سامنے مت آنا۔" فاخرہ نے حدالمقدور کوشش کی کہ لہجہ سرسری ہی رہے مگر بات سرسری لینے والی نہ تھی۔ چنبیلی بنا کچھ کہے مصالحہ کوٹتی رہی۔
فاخرہ کو دراصل کئی قسم کے تحفظات تھے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کہیں کمی رہ جائے۔
حقیقتاً یہ آخری بات ہوتی کہ وہ برداشت کریں ایک Prostitute آ کر ان کے گھر میں رہے جو وہ برداشت کرتیں لیکن کسی نہ کسی طرح انہوں نے اس بات کو برداشت کر لیا یہ سوچ کر اگر خدانخواستہ بچپن میں سدرہ۔۔۔۔ اس سے آگے وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں پھر زدار میں آنے والی مثبت تبدیلیاں بھی انہیں اچھی لگی تھیں۔
دعا کے دل میں خواہش تو پیدا ہوئی کہ کوئی ایسی بات کہہ دے جس سے خالہ کے کہنے کی تلافی ہو سکے پر کہنے کو اسے کچھ سوجھا ہی نہیں۔
یہ بات سدرہ کے سسرال والوں کو نہیں بتائی گئی تھی کہ چنبیلی کون ہے کہاں؟ سے آئی ہے؟ دراصل یہ پہلا موقع ہی تھا جب ان کا چنبیلی سے سامنا ہوتا چج بتانے کی ہمت شاید کسی میں نہیں تھی اور بتانا جانا کوئی انتہائی مناسب سا جھوٹ بن نہیں پایا تھا۔

☆......☆......☆

"چنبیلی مہمانوں کے سامنے نہیں جائے گی تو میں بھی نہیں جاؤں گا۔" زدار کا لہجہ غیر لچکدار تھا۔
"لیکن زدار۔۔۔" فاخرہ کچھ کہنا چاہتی تھیں پر زدار نے موقع ہی نہ دیا۔
"کچھ لیکن ویکن نہیں چنبیلی میری بیٹی ہے جو اسے لعنت سمجھے گا وہ مجھے بھی لعنت سمجھے۔"
برسوں کا ساتھ تھا۔ فاخرہ نے زدار کو پہلے ایسے حتمی انداز میں بات کرتے نہ دیکھا تھا۔ فاخرہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگیں۔ مزید کچھ کہے بنا اٹھ آئیں۔
"کوئی قیامت ہی نہ آ جائے۔" فاخرہ خود سے کہہ رہی تھیں۔
لیکن قیامت تو آنی ہی تھی۔
جواد کا سارا گھرانہ مدعو تھا اور سبھی لوگ آئے تھے۔ والد صاحب، والدہ صاحبہ، بھائی بدر، بہن مائرہ اور جواد خود۔
مہمانوں کو کھانا ڈرائنگ روم میں سرو کیا گیا ڈائننگ ٹیبل سال بھر پہلے خریدی گئی تھی اور وہ ڈرائنگ روم کی ہی زینت بنائی گئی تھی۔

''آپ لوگ بھی ہمارے ساتھ مل کر کھائیں نا۔''

دعا اور سدرہ نے کھانا لگانا شروع کر دیا تھا۔

''جی ضرور'' فاخرہ خوش دلی سے مسکرا دیں۔

''بیٹا چنبیلی کو بلاؤ آ کر مہمانوں کو سلام کرے۔''

زوار نے کہا فاخرہ کے مسکراتے لب بھینچ گئے اور دعا چنبیلی کو بلانے چلی گئی۔ چنبیلی آنا تو نہیں چاہتی تھی مگر گھنٹہ بھر پہلے زوار اور فاخرہ کے درمیان ہونے والا مکالمہ سن چکی تھی آئے بنا چارہ نہ تھا۔

ادھر چنبیلی نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھے تھے اور ادھر بدر نے چنبیلی کو دیکھا تو ساکت ہی رہ گیا۔ سلام کرتے ہوئے چنبیلی کی نظر بدر پر پڑی تو وہ بھی جیسے بت ہی ہوگئی۔ زندگی دونوں کو ایک بار پھر آمنے سامنے لائی تھی اور بس موڑ پرلا کھڑا کیا تھا۔

''یہ میری پہلی بیٹی ہے، میری پہلی شادی سے بچپن میں کھوگئی تھی۔ اب ایک مشہور چینل نے شو کروایا۔۔۔۔۔۔'' زوار بتا رہے تھے اور فاخرہ پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔

''سب بتانا ضروری تو نہیں۔'' فاخرہ سوچنے کے علاوہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھیں چنبیلی اور بدر کو یوں چونکتے ہوئے کئی آنکھوں نے دیکھا تھا۔

☆......☆......☆

زوار نے کئی باتیں باریکیوں سمیت بتائی تھیں اور کئی باتیں سرے سے بتائی ہی نہیں تھیں جیسے چنبیلی کون تھی کہاں رہی اس وقت تو سب خاموش ہی رہے لیکن واپسی پر جواد کے والد ثناء اللہ اپنی زوجہ سے کہہ رہے تھے۔

''بیگم تم ذرا بچیوں کے پاس رکو میں نے لڑکوں سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔'' ثناء اللہ مرد تھے ایک زمانہ دیکھا تھا۔ زوار کی باتوں سے انہوں نے وہ باتیں بھی اخذ کر لی تھیں جو انہوں نے نہیں بتائی تھیں۔

''ہاں تو بدر مجھے دوٹوک بات ہی پسند ہے اسی لیے تم دوٹوک بات ہی کرنا۔'' بدر کو جسم میں سنسناہٹ دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی پتا نہیں والد صاحب یوں اکیلے کیا بات کرنا چاہ رہے تھے۔

''ہاں تو تم اس لڑکی کو کیسے جانتے ہو؟''

''کون سی لڑکی؟'' بدر کا دل پہلو کو چیر کر باہر نکلنا چاہتا تھا۔

''بدر'' ثناء اللہ کے لہجے میں تنبیہہ آن سمائی۔

''مجھے اس بات سے دلچسپی نہیں تم کیا کرتے رہے میں یہ جاننا چاہ رہا ہوں جس لڑکی کو ہم نے اپنے خاندان کا حصہ بنانے کے لیے چنا ہے وہ کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔''

ثناء اللہ کا لہجہ روکھا تھا۔

بدر نے سر جھکا لیا اور دھیرے دھیرے کچھ نہ کچھ بتا دیا وہ بھی اس طرح کہ خود کے دامن پر کم ہی چھینٹیں پڑیں بات ختم ہونے تک جواد کی آنکھیں تحیر سے پھیل چکی تھیں۔ چند لمحے تک کمرے میں خاموشی رہی۔ پھر ثناء اللہ صاحب کی آواز خاموشی کو چیرتی ہوئی ابھری۔

''جواد میں جانتا ہوں کہ تم سدرہ کو بہت پسند کرتے ہو لیکن جب بات خاندان اور نسل پر آجائے تو پسند کو ملحوظ خاطر نہیں رکھنا چاہیے جو گھرانہ ایک پیشہ کرنے والی کو اپنے گھر کا حصہ بنا سکتا ہے وہ خود کیسا ہوگا؟ زوار کا ماضی جو بھی تھا لیکن حال تو وہ لڑکی ہے۔ بدنما حال چھپایا جاتا ہے دکھایا نہیں جاتا۔ کل تمہارا کوئی کولیگ کوئی دوست تم سے اس بابت پوچھے گا تو تم کیا جواب دو گے۔ وہ لڑکی لاہور گھومتی رہی ہے ایک زمانہ واقف ہوگا تم خود دیکھ لو تمہارے گھر میں ایک واقف کار موجود ہے۔'' آخری جملہ کہتے ہوئے چبھتے ہوئے انداز میں بدر کو دیکھا تھا بدر سر جھکائے بیٹھا رہا۔

''میرے خیال میں ہمیں یہ رشتہ برقرار نہیں رکھنا چاہیے یہ کوئی معمولی بات نہیں جو چھپی رہ سکے یوں بھی میں پہلے بھی اس رشتے کے حق میں نہیں تھا ان کا اسٹینڈرڈ ہی ہم سے الگ ہے۔'' ثناء اللہ کہہ رہے تھے۔

جواد غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ منہ سے کچھ نہ بولا۔

سب کچھ خیر و عافیت سے ہوا تھا۔ کھانا بھی پسند کیا گیا تھا۔ رخصت ہوتے وقت بھی اچھے کلمات کا تبادلہ ہوا تھا لیکن پھر بھی فاخرہ کو احساس ہو رہا تھا جیسے کچھ غلط بہت غلط ہوا ہے۔ دل کی پھانس کو دل میں دباتے انہوں نے کسی سے کوئی بات نہ کہی۔

جانے سے پہلے دعا نے چنبیلی کا ہاتھ پکڑا تھا اور مدہم لہجے میں بولی تھی۔

''آپی آپ سے اکیلے میں دل کی بات کہنی ہے۔'' نظریں جھکائے اضطراری طور پر چنبیلی کا ہاتھ دبائے چہرے پر آئی لٹ کو کان کے پیچھے اڑستے۔ ہوئے دعا کہہ رہی تھی۔

چنبیلی دعا کو اپنے اور زوار کے مشترکہ کمرے میں لے آئی۔

''میں اسفر سے محبت کرتی ہوں۔'' آنکھیں جوت سی روشن تھیں چنبیلی رشک سے آنکھوں کی اس روشنی کو دیکھتی گئی۔

''مگر اسفر مجھ سے ناراض رہتا ہے۔ میں نے اس کا ناول گم کر دیا تھا نا۔ شائد مجھے پسند بھی نہیں کرتا۔'' دعا کے لہجے میں یاسیت اتر آئی۔

کیسی چھوٹی چھوٹی الجھنیں تھیں کاش اس کی زندگی بھی ایسی ہوتی۔ سادہ، باوقار۔ چنبیلی سوچ رہی تھی۔ سوچنے پر تو خیر کوئی پابندی نہ تھی۔

''آپ کو اس لیے بتایا کہ آپ کچھ مدد کر پائیں قسم سے اپنے بعد آپ پہلی ہیں جسے راز دار بنایا ہے۔''

''آپ مدد کریں گی نا'' دعا امید سے پوچھ رہی تھی اور چنبیلی نے اثبات میں سر ہلا دیا باوجود اس کے وہ جانتی تھی کہ وہ مشکل ہی مدد کر پائے۔

رات کو زوار جب کمرے میں سونے کی نیت سے آئے تھے تب چنبیلی اپنی چارپائی سے ٹانگیں لٹکائے سر جھکائے بیٹھی تھی۔

''اتنی چپ اور اداس کیوں رہتی ہو۔'' زوار مسکراتے ہوئے کہہ رہے تھے چنبیلی جواباً مسکرا بھی نہ پائی۔

ہنسا کھیلا کرو۔ بہن بھائی سے دوستی کرلو۔''

زوار اب بستر پر لیٹ چکے تھے چنبیلی کے پاس جیسے کرنے کو کوئی بات ہی نہ تھی۔ چپ بیٹھی رہی۔

''اپنی اس ٹی وی والی سہیلی کا شکریہ ادا کرنا تمہارے ملنے کے بعد میں اس قدر خوش رہا کہ ذہن میں ہی نہیں آیا کہ اس بچی کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے۔'' زوار ردا کا تذکرہ کر رہے تھے تبھی چنبیلی کو دو دن پہلے ردا سے فون پر ہونے والی گفتگو یاد آئی۔

''ابو وہ دو دن پہلے ردا باجی کا فون آیا تھا۔ وہ چاہتی ہیں کہ آپ اور میں ان کے شو میں آئیں تاکہ لوگوں کو پتا چلے۔'' یہ خواہش صرف ردا کی ہی نہیں چینل کے اونر کی بھی تھی جس طرح لوگوں نے اس حساس موضوع پر اچھا فیڈ بیک دیا تھا اس شو کی وجہ سے چنبیلی اپنے بچھڑے ہوئے باپ تک پہنچی تھی۔ وہ اس بات کو ہائی لائٹ کرنا چاہ رہے تھے۔ لوگوں کو اچھا پیغام دینے کے لیے بھی اور اپنی پی آر بڑھانے کے لیے بھی۔

زوار نے کوئی جواب نہ دیا کئی لمحے یونہی طویل خاموشی چھائی رہی۔

''ابو'' چنبیلی کو شبہ ہوا کہ زوار نے اس کی بات سنی ہی نہیں اسی لیے باپ کو پکارا تھا۔

''ہوں'' زوار سوچوں کی دنیا سے لوٹتے ہوئے زوار نے چنبیلی کو جواب دیا تھا۔

''نہیں بیٹا، اُس بچی کو انکار کر دو۔ ہم نے اس کے شو میں شرکت نہیں کرنی۔'' زوار کی آواز میں تھکاوٹ اتر آئی تھی۔ اس شو میں جاتے تو کہانی کا وہ حصہ دوہرایا جاتا جسے وہ خود سوچتے تھے اور نہ کسی بتانا پسند کرتے تھے۔

لیکن زوار بھی کتنے سادہ تھے سمجھتے تھے کہ لوگوں کو پتا ہی نہ چلے گا۔ لوگوں نے بھی اسی دنیا میں زندگی گزاری تھی جہاں زوار نے گزاری تھی اور زوار سے زیادہ ہی زندگی کے نشیب و فراز سے واقف تھے۔ وہ خود ہی جان جاتے کہ ادھوری کہانی کے بقیہ حصے میں کیا ہوا ہوگا۔ یہ سچ ہے کہ شتر مرغ ریت میں منہ دے دے تو طوفان کی شدت کم نہیں ہو جاتی۔ ہاں

البتہ شترمرغ کے دل کو ڈھارس مل جاتی ہے۔

☆......☆......☆

زندگی میں اتنی تکلیفیں کیوں لکھی ہیں۔ اسفر جب بھی سوچتا رنجیدگی میں اضافہ ہی ہوتا۔ ساری زندگی اس نے طعنے سہے کہ وہ لڑکا ہے اور سدرہ لڑکی مگر پھر بھی سدرہ اس سے کہیں آگے۔ اپنی بھرپور کوششوں کے بعد بھی وہ کبھی سدرہ کے مقابل نہ کھڑا ہوسکا یہاں تک کہ سدرہ بہت آگے چلی گئی۔ بہت آگے یا پھر شائد بہت آگے سے بھی آگے۔

ایک ناول لکھا تھا۔

''موسم حسین تھا۔ بادل اٹکھیلیاں کرتے تھے ہوا بھی شرارت بھری تھی ایسے لگتا تھا کہ ایسی حسین شام زندگی میں پہلے کبھی آئی تھی اور نہ آئندہ کبھی آئے گی۔۔۔۔۔'' اسفر کو ناول ابتدائیہ حرف حرف یاد تھا۔ ناول کو سوچتا تو دل دکھ سے بھر جاتا۔ کاش دعا کو ناول نہ پکڑاتا تو شائد یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔

ایک زمانہ تھا وہ دعا کو اتنا ہی ناپسند کرتا تھا جتنا کہ سدرہ کو لیکن ایف ایس سی اور بعد کے سالوں میں یہ ناپسندیدگی زائل ہوتی گئی۔ دعا اچھی لڑکی تھی اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتی یہ احساس نہ دلاتی کہ وہ زندگی کی دوڑ میں اس سے پیچھے ہے۔

دعا کے مشورے پر ہی تو اس نے بی اے میں داخلہ لیا تھا اور آگے سی ایس ایس کا ارادہ تھا۔ لیکن پھر دعا نے وہ ناول ضائع کر دیا۔ آدھا دل کہتا تھا کہ دعا سے بے احتیاطی ہوئی تھی اور اس نے دانستہ ناول نہیں گم کیا ہوگا۔ مگر آدھا دل دعا کو کمینہ اور قصوروار ٹھہراتا تھا اور اسفر اس آدھے دل کی پیروی کر رہا تھا جو بدگمان تھا۔ کس قدر بری بات تھی۔

بی اے کے پیپرز آئے اور ختم ہوگئے۔ اسفر نے اتنی محنت کی جتنی اس سے ممکن تھی اور بی اے کے نتیجے سے پہلے سی ایس ایس کے تحریری امتحان کی تیاری کے لیے اکیڈمی جوائن کر لی۔ کلاسیں شروع ہوئیں اور اسفر نے ایک بار پھر محنت شروع کر دی وہ پیچھے نہیں رہنا چاہتا تھا وہ دنیا کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ کسی سے کم نہیں۔ اسی لیے وہ دل و جان سے پڑھ رہا تھا۔ باقاعدگی سے لیکچرز سنتا۔ اسرار و رموز سمجھتا۔ لیکچرز کے اہم نکات نوٹ کرتا اور گھر آ کر مختلف کتابیں چھانتا۔ اس امتحان میں کامیابی اس کی بقاء کے لیے ضروری تھی اور وہ اپنی بقاء کے لیے اپنی بساط سے زیادہ ہی کوشش کر رہا تھا۔

دعا بھی اس کی اکیڈمی میں پڑھنے آتی تھی۔ دونوں ایک ہی کمرے میں بیٹھ کر لیکچرز سنتے تھے۔ زیادہ دور بھی نہ بیٹھے ہوتے۔ دعا کن اکھیوں سے اسفر کو دیکھتی رہتی مگر اسفر کے انداز ایسے ہوتے جیسے اجنبی ہوں۔

ایک عام سے دن دھڑکتے دل کے ساتھ دعا آئی اور دانستہ طور پر اسفر کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی۔

''اسفر اب تو مجھے معاف کر دو۔ میں قسم اٹھا کر کہتی ہوں۔ ناول میں نے خود نہیں گم کیا۔ مجھ سے بے احتیاطی ہوگئی۔'' لیکچرز ختم ہو چکے تھے۔ کلاس میں اکا دکا طلباء تھے کچھا کیلے طلباء اور کچھ دو یا تین کے گروپس کی شکل میں۔

اپنی کتابوں کو سمیٹتے اسفر نے نظریں اٹھا کر دعا کو دیکھا تھا۔ جانے اس کی آنکھوں میں نمی اتری ہوئی تھی یا اسفر کو محسوس ہوئی تھی۔

''خالہ ٹھیک ہیں؟ حنان کی شادی کا کب تک ارادہ ہے۔'' اسفر نے جو بات کی اس کا دعا کی بات سے کوئی تعلق تو نہ تھا مگر یہ صلح کا اشارہ تھا۔

مسکراہٹ دعا کے لبوں کا احاطہ کر چکی تھی۔

''امی اچھی ہیں۔ حنان بھائی کی شادی اسی سال کے آخر تک متوقع ہے تم آج میرے ساتھ گھر ہی کیوں نہیں چلتے سب سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔'' بے ضرری گفتگو ہونے لگی اور بات سے بات نکلتی گئی۔

☆......☆......☆

پہلے پہل سدرہ کو لگا کہ اتفاقاً جواد اس سے بات نہیں کر پا رہا۔ لیکچرز، پریکٹیکلز اور ڈسکشنز کلاسز کی مصروفیت میں جواد کو اس سے بات کرنے کا موقع نہیں مل پا رہا۔ مگر وہ میسج کا ریلائی تو کر سکتا تھا۔ پتا نہیں کیا بات ہوئی۔ جب کچھ دن یہی روٹین رہی تو سدرہ نے

اسے کال کی۔ صبح کال کی جواد نے فون ریسیو نہ کیا۔
دوپہر کال کی جواد نے فون ریسیو نہ کیا۔
شام اور رات کو بھی اس نے فون ریسیو نہ کیا
آخر کتنی بار وہ اتفاقاً فون نہ اٹھا سکا ہوگا۔ خود کال بیک بھی تو کر سکتا تھا۔ کہیں جواد اس سے ناراض تو نہیں۔ سدرہ سوچنے لگی کہ آخر کونسی بات ہو سکتی ہے جو جواد کو بری لگی ہو گی مگر بہت سوچنے کے پر بھی ایسی کوئی بات یاد نہ آئی۔

''آج تو جواد سے ضرور بات کروں گی۔ ناراض ہے تو بندہ ناراضگی کا اظہار کرے یہ کیا بول چال اور ملنا جلنا ہی چھوڑ دے۔'' صبح کالج کے تیار ہوتے ہوئے سدرہ سوچ رہی تھی۔

تین سو طلباء کی کلاس تھی۔ لیکچر تھیٹر میں طلباء کا جم غفیر ہوتا تھا۔ سدرہ نے ایک دفعہ پوری کلاس پر نظر دوڑائی اس مخصوص کونے میں بھی دیکھا جہاں جواد اپنے دوستوں کیساتھ بیٹھتا تھا۔ مگر جواد نظر نہ آیا۔

لیکچرز کے اختتام کے بعد سدرہ نے سوچا پریکٹیکل کلاس میں جا کر جواد سے مل لے گی۔ پریکٹیکل کلاسز گروپس کی شکل میں ہوتی تھیں۔ مختلف گروپس کے مختلف سبجیکٹ کی پریکٹیکل کلاس ہوتی چونکہ سدرہ اور جواد کا گروپ الگ الگ تھا اس لیے ان کی پریکٹیکل کلاس مختلف ہوتی۔ آج بدھ تھا۔ موبائل میں شیڈول کی تصویر تھی۔ شیڈول سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ جواد کا آج فارماکولوجی کا پریکٹیکل ہے اپنا پریکٹیکل بنک کرتے ہوئے سدرہ نے فارماکولوجی کے ڈیپارٹمنٹ کی طرف قدم بڑھائے تھے۔

ٹیچر ابھی نہیں آئے تھے لڑکے فارما لیب میں بیٹھے ٹیچر کا انتظار کرتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ گہرے بنفشی رنگ کی ٹی شرٹ میں جواد ہمیشہ کی طرح بے حد جاذب نظر لگ رہا تھا۔

''جواد'' سدرہ تھوڑا سائڈ پر کھڑی تھی جواد کی نظر سدرہ پر پڑی تو دوستوں سے مدھم آواز میں کچھ کہتا سدرہ کی طرف بڑھا تھا۔ سدرہ اور جواد منگیتر تھے یہ بات کلاس کے بیشتر لڑکے لڑکیوں کو پتا تھی۔

''کیا تم پریکٹیکل کلاس بنک کر سکتے ہو، میرے لیے۔'' سدرہ نے ادا سے کہا تھا۔

چہرے پر سنجیدگی کے تاثرات لیے جواد نے اثبات میں سر ہلایا تھا اور دونوں لیب سے باہر نکلے تھے۔

''ادھر اس طرف بیٹھتے ہیں۔'' ڈیپارٹمنٹ سے باہر نکلے تو جواد نے بائیں طرف والے گھاس کے قطعے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

گھاس کے قطعے پر آمنے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ سدرہ کہنی ٹکائے جواد کے بولنے کا انتظار کرتی رہی مگر جواد اردگرد دیکھتا گھاس نوچتا رہا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اردگرد کی ہر چیز اہم ہے سوائے سدرہ کے۔

''کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟'' سدرہ نے گہری نظروں سے جواد کو دیکھا تھا اور گویا ہوئی تھی جواد نے جواب دینا ضروری نہ سمجھا کالر میں اٹکا چشمہ نکال کر آنکھوں پر چڑھا لیا۔

''سدرہ تم اچھی لڑکی ہو تمہیں اچھا سا رشتہ مل سکتا ہے۔'' جواد اب سدرہ کو دیکھ رہا تھا۔ سدرہ کا دل یکدم دھک دھک دھڑکنے لگا۔

''تم کیا کہہ رہے ہو؟'' یوں اچانک یہ سن کر سدرہ کو انہونی کا احساس ہونے لگا۔

''سدرہ میں اب یہ منگنی قائم نہیں رکھ سکتا۔'' سدرہ سکتے میں آ گئی۔ یک ٹک جواد کو دیکھے گئی۔

''کیوں؟'' کئی لمحوں بعد سدرہ نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا تھا۔

''سوری میں نے منگنی میں دیے گئے تمام تحائف استعمال کر لیے۔ اب استعمال شدہ چیزیں تو نہیں لوٹا سکتا۔ البتہ انگوٹھی تمہارے گھر پہنچا دوں گا۔'' جواد کا لہجہ ایسا تھا جیسے معمول کی گفتگو کر رہا ہو۔

''ایسی کیا بات ہو گئی جو تم یہ فیصلہ کر رہے ہو؟'' چہرے پر گہری سنجیدگی کے سائے تھے۔ دل جسے کانوں میں ہی دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ بھی لرزنے لگے تھے۔

''کیا بتانا ضروری ہے؟'' جواد نے پینٹ کی جیب سے اپنا جدید ماڈل کا موبائل نکالا تھا اور میسج چیک کرنے لگا۔ ہتک کے احساس سے سدرہ کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ یہ وہی جواد تھا جو اس کے آگے پیچھے پھرتا

تھا۔ اور آج ہر چیز پر توجہ دے رہا تھا سوائے اس کے۔
"یہ تو بتانا پڑے گا اتنا بڑا فیصلہ تم نے کیوں کیا۔"
اپنے احساسات کنٹرول کرتی سدرہ کتابیں سمیٹنے لگی۔ حالانکہ وہ کتابوں کو اس طرح فرصت سے سمیٹنے کی ضرورت نہ تھی۔
ان دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ گھنے پیڑ پر بیٹھی کوئل وقفے وقفے سے کوک رہی تھی۔ کوریڈور سے گزرتی لڑکیاں خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ جواد نے موبائل دوبارہ پینٹ کی جیب میں ڈالا تھا۔ ایک نظر سامنے بیٹھی سدرہ پر ڈالی تھی۔ بلاشبہ حسین لڑکی تھی مگر حسن کے علاوہ کونسی خوبی تھی اس میں؟ ذہانت؟؟ جس سے وہ متاثر ہوا تھا۔ دنیا میں کتنے لوگ ذہین ہوتے ہیں اور اس نے ذہانت کا کونسا اچار ڈالنا تھا۔
سرخ چہرے لیے سدرہ وجہ جاننے کے لیے جواد کے سامنے بیٹھی تھی۔ کم مائیگی کا احساس تو تھا مگر وہ جواب سن کر ہی جانا چاہتی تھی۔
سدرہ کا مکمل جائزہ لینے کے بعد جواد نے جواب دیے دیا وہ جواب جو خود ایک سوال تھا۔
"کیا تمہاری برسوں بعد ملنے والی بہن Prostitute ہے؟" سدرہ یکدم سناٹے میں آ گئی تھی کہنے کے لیے اس کے پاس ایک حرف بھی نہ بچا تھا۔

☆......☆......☆

سدرہ اس کی کلاس ون سے کلاس فیلو تھی۔ روشن آنکھوں والی ذہین لڑکی۔ فرسٹ پوزیشن تو جیسے اس کے نام تھی۔ سکول کے زمانے میں انسان کو سب سے زیادہ ذہانت ہی تو متاثر کرتی ہے اور جواد بھی اس کی ذہانت سے بے حد متاثر تھا۔ آٹھویں کلاس تک وہ جواد کو اس قدر اچھی لگنے لگی کہ جواد نے دل ہی دل میں خود سے اقرار کرلیا کہ وہ سدرہ سے محبت کرتا ہے۔ حالانکہ اس وقت عمر ہی کتنی تھی۔ ٹین ایج کی ابتداء تھی مگر اس زمانے میں رومانوی فلمیں بکثرت ریلیز ہوتی تھیں۔ انہی رومانوی فلموں کا اثر تھا کہ وہ خود کو محبت کے بندھن میں جکڑا ہوا پانے لگا۔ ہائی سیکشن کی کلاسوں میں اس نے سدرہ کے بھائی سے تعلقات بڑھائے محض سدرہ تک رسائی کے لیے۔ حالانکہ سدرہ کا بھائی اسے زندگی میں پالا پڑنے والے بے وقوف ترین لوگوں میں لگا تھا۔ نکما، حسد کے جذبے تلے زندگی گزارنے والا۔
ہائیر سیکنڈری کلاسز میں اس نے سدرہ سے محبت کا اعتراف بھی کرلیا اور پھر ان کی منگنی ہوگئی۔ سدرہ کی فیملی مڈل کلاس فیملی تھی۔ ایک چھوٹی گاڑی ان لوگوں کے پاس تھی اور وہ بھی بلا ضرورت باہر نہ نکالی جاتی کہ فیول کا خرچ ہوتا ہے۔ سدرہ کے والد کی ایزی لوڈ کی دکان تھی۔ گھر کا کوئی فرد بھی اس رشتے کے لیے رضامند نہ ہوا۔ مگر جواد نے ضد کر کے اپنی منوا ہی لی۔
میڈیکل کالج میں داخلے کے ساتھ ہی جیسے ایک نئی دنیا سے واسطہ پڑا تھا۔ تین سو طلباء تھیان میں ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ بلا کی خود اعتماد اور طرح دار تھیں۔ یہ نہیں تھا کہ جواد کا پہلے بھی خوبصورتی سے پالا نہ پڑا تھا۔ بلکہ پڑا تھا اور خوب پڑا تھا۔ اب جب کہ سدرہ ہمہ وقت، بات ہو سکتی تھی اور کتنی سدرا میں آنکھوں کے سامنے تھیں تو دل میں یہ احساس بھی جاگنے لگا کہیں سدرہ سے تعلق قائم کرنے کا فیصلہ ٹین ایج میں لیا گیا جذباتی فیصلہ تو نہیں سدرہ اور اس کے درمیان ایک معاشرتی تفاوت تھا۔ چاہے وہ جتنا بھی چھپاتے اصلیت تو نظر آ ہی جاتا ہے۔
اس سوچ کو جھٹکتے ہوئے وہ میڈیکل کالج کی لائف انجوائے کرتا رہا۔ تب بھی جب بھی وہ محاسبہ کرتا تو اسے احساس ہوتا اگر وہ تھوڑا جلد بازی سے کام نہ کر لیتا تو شائد سدرہ سے بہتر ہم سفر چنتا۔
تبھی سبین اس کی زندگی میں آئی۔ سبین ایک سال جونیئر تھی اور کامل حسن کی مالک تھی گاڑی بدل بدل کر کالج آتی۔ اس کے ہر انداز میں تمکنت تھی جہاں جہاں سے گزرتی اپنا سحر چھوڑ جاتی۔ سبین خود جواد کی طرف بڑھی تھی۔ باوجود اس کے وہ واقف تھی کہ جواد انگیجڈ ہے مگر پھر بھی جواد کو اشارتاً کہہ گئی کہ وہ بھی اس کی شریک حیات بن سکتی ہے۔
جواد کو کم قلق نہ ہوا مگر قدرت نے راستے خود ہی ہموار کردیے۔ سدرہ کے گھر سالوں بعد کھوئی ہوئی بہن آئی والد صاحب نے اعتراض اٹھایا۔ اعتراض کی شکل

اور تھی ورنہ یہ اعتراض وہ دوسری اشکال میں پہلے بھی کر
چکے تھے بس فرق یہ تھا اس اعتراض پر جواد نے کان
دھرے اور باپ کی ہاں میں ہاں ملائی اور اس بار فیصلہ
کرنے سے پہلے اس نے خوب سوچا۔ اچھی طرح
سوچنے سمجھنے کے بعد ہی اس نے سدرہ سے منگنی توڑنے
کا فیصلہ کیا تھا۔ اور اس دن گھاس کے قطعے پر آنکھوں پر
چشمہ چڑھائے موبائل پینٹ کی جیب میں ڈالتے
ہوئے وہ سدرہ سے پوچھ رہا تھا۔

"کیا تمہاری برسوں بعد ملنے والی بہن
Prostitute ہے؟"

☆......☆......☆

گھر میں ایک طوفان سا برپا تھا۔
سدرہ نے جب گھر آ کر فاخرہ کو اطلاع دی تو فاخرہ
اسی وقت طیش میں آ گئیں ہذیانی انداز میں چیخنے لگیں۔
ساتھ والے کمرے میں بیٹھے زوار چنبیلی کو ماضی کا
کوئی دلچسپ قصہ غیر دلچسپ انداز میں سنا رہے تھے۔
سر جھکائے بیٹھی چنبیلی سنتے ہوئے بھی نہ سن رہی تھی۔
غائب دماغی سے وہ سر جھکائے بیٹھی تھی جب فاخرہ تیز
تیز بولتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں۔

"تمہارے لیے صرف تمہارے لیے زوار میں نے
یہ کڑوا زہر پیا کہ تمہاری مردہ زندگی میں جان آ رہی ہے
تو حرج کیا ہے۔ لیکن میں نہیں جانتی تھی یہ زہر میرے
بچوں کی زندگی کو بھی برباد کرے گا۔" فاخرہ کی آواز اونچی
تھی۔ انداز جارحانہ تھے۔

"کیا ہوا فاخرہ؟ تم اتنے غصے میں کیوں ہو؟"
زوار کا لہجہ دھیما اور مدھم تھا جیسے ہمیشہ ہوا کرتا تھا۔

"ہونے کو رہ کیا گیا ہے جواد نے رشتہ توڑ دیا۔
سدرہ سے کہتا ہے کہ وہ کسی حرافہ کی بہن سے کیونکر شادی
کرے۔" تب تک سدرہ بھی اندر آ چکی تھی۔ نخوت سے
چنبیلی کو دیکھتے وہ ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

فاخرہ کے منہ سے لفظ نہیں جیسے آگ کے گولے
نکلے تھے لمحے بھر میں چنبیلی بھسم ہو کر رہ گئی۔ زوار یہ سن
سکتے میں ہی آ گئے۔ ٹکر ٹکر فاخرہ کو تکنے لگے۔

"مجھے یوں کیوں دیکھتے ہو، اب جس گندگی کی پوٹ
کو گھر میں رکھو گے وہ اپنا اثر تو دکھائے گی سارا گھر برباد
کر دیا۔ جس گھر میں آدمی سگریٹ نہیں پیتے تھے وہاں
ایک عورت سگریٹ پیتی ہے۔ کوئی ہے جو جواب دہ
ہو۔" فاخرہ کی آواز تیز تھی اور اس قدر اونچی تھی کہ
دیواروں سے ٹکرا کر واپس آ جاتی۔

چنبیلی سر جھکا کر کھڑی رہی۔ آخر وہ عدالت لگ
ہی گئی تھی جس کے کٹہرے میں کھڑے ہونے سے وہ
ڈرتی تھی۔ کٹہرے میں کھڑی مجرم پر فرد جرم عائد ہو چکا
تھا۔ ایسا جرم جو اس سے سرزد ہوا تھا مگر اس کا قصور نہ
تھا۔

"بس زوار میں جو برداشت کر سکتی تھی کر چکی
ہوں۔ ایسی نیکی جو گلے کا طوق بن جائے کو اتار
پھینکنا چاہیے۔ اب چنبیلی اس گھر میں نہیں رہے گی۔
اسے یہاں سے جانا ہو گا۔"

فاخرہ کر و فر سے کہہ رہی تھیں۔ چنبیلی یونہی سر
جھکائے کھڑی رہی۔ زوار کو جیسے ہوش آیا تھا۔

"سونی کہیں نہیں جائے گی، یہ سونی کا بھی گھر ہے
اور اپنا گھر چھوڑ کر کوئی نہیں جاتا۔" زوار آگے بڑھے اور
چنبیلی کے کندھے پر اپنا ہاتھ پھیلا کر اسے جیسے اپنے
حصار میں لیا تھا۔ یوں باپ کے بازوؤں کے سائے
تلے بھی چنبیلی کو تحفظ اور اطمینان کا احساس نہ ہوا۔

فاخرہ تحیر سے زوار کو دیکھ رہی تھیں۔ بیٹی سے
لگاوٹ کا یہ منظر انہیں زہر لگا۔

"ٹھیک ہے چنبیلی نہیں جائے گی تو میں چلی جاتی
ہوں، یا تو اس گھر میں چنبیلی رہے گی یا پھر میں اور میرے
بچے۔" فاخرہ کا لہجہ پھنکارتا تھا غصہ آنکھوں سے جھلکتا
تھا۔ اس سے قبل کہ زوار کچھ کہتے۔ کوئی صلح کی بات
کرتے کوئی درمیانی راستہ نکالتے کچھ بھی کرتے۔
کمرے سے باہر کو جاتی فاخرہ کو کچھ یاد آیا اور وہ واپس
مڑیں اور کہنے لگیں۔

"میں اور میرے بچے کیوں کہیں جائیں زوار تم
شاید بھول رہے ہو، یہ میرا گھر ہے حق مہر میں تم نے مجھے
یہ گھر ہی تو لکھ کر دیا تھا اور میں اپنے گھر میں مزید گند نہیں
برداشت کروں گی۔ چنبیلی کو جانا ہو گا۔" فاخرہ کا دل تو چاہا
کہ ابھی چنبیلی کا ہاتھ پکڑے اور کھینچتی لے جائے اور گھر
سے باہر دھکیل کر دروازہ بند کر دے۔ مگر وہ ضبط سے کام

لیتی تیز نگاہوں سے چنبیلی کو گھورتی رہی۔

چنبیلی کو بے اختیار وہ واقعات یاد آنے لگے جب وہ سڑک کنارے انتظار میں کھڑی ہوتی اور موٹر سائیکلوں پر سوار منچلے فقرے اچھالتے، مختلف القابات نوازتے گزرتے چلے جاتے، تب بھی اتنی تکلیف نہ ہوتی تھی جتنی اب ہو رہی تھی۔

فاخرہ ایک بار پھر کمرے سے باہر جانے کو تھیں۔ ابھی دروازہ پار کر رہی تھیں کہ زوار کے الفاظ نے اس کے قدم روک لیے۔

"اگر چنبیلی اس گھر سے جائے گی، تو میں بھی اس کے ساتھ جاؤں گا میں اپنی بیٹی کو اکیلے کیسے بھیج سکتا ہوں۔" زوار کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

زوار کی طرف پشت کیے فاخرہ لمحے بھر کو رکی۔ رخ موڑے بغیر گویا ہوئیں۔"

"ٹھیک ہے زوار جیسے تمہاری مرضی۔" فاخرہ کمرے سے چلی گئیں۔ سدرہ بھی ماں کی پیروی میں باہر نکل گئی۔

اپنی نم آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے زوار نے چنبیلی کو اپنے ساتھ بھینچا تھا۔

"تم بالکل اپنی ماں کی طرح دراز قد ہو، رخسار بھی ایسے متاثر کن قد کی مالک تھی۔ مجھ سے ایک آدھ انچ قد بڑا ہی تھا۔" کس قدر بے جوڑ بات تھی جو زوار بے وقت کر رہے تھے۔

☆......☆......☆

پیارے ابو، ہمیشہ سلامت رہیے۔ آپ کے ساتھ مختصر وقت ہی گزارا اور یہ مختصر وقت ہی میری زندگی کا سرمایہ ہے۔ میں آپ کے لیے تکلیف کا سامان نہیں بننا چاہتی اور نہ ہی یہ برداشت کر سکتی ہوں کہ میری وجہ سے آپ کا گھر برباد ہو۔ میں آپ سے بے حد پیار کرتی ہوں لیکن ابو اس دنیا کے دستور نرالے ہیں اور شائد ہمارے پاؤں ان دستور نے باندھ رکھے ہیں۔ مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے اور میں یہاں سے جا رہی ہوں۔

آپ کی سونی

یہ چند سطریں چنبیلی نے کس طرح زوار سے چھپ کر لکھی تھیں۔ اسے ہی اندازہ تھا۔ فاخرہ کے ساتھ ہونے والی تلخ کلامی کے بعد زوار نے جہلم صفدر بھائی کو فون کیا تھا اور انہیں اپنے آنے کا بتایا تھا۔

"میری بیٹی مغموم نہ ہو، ہم صبح صبح ہی ادھر سے چلے جائیں گے۔ تم اپنا سامان باندھ لو۔" زوار نے اپنا اٹیچی کیس خود ہی بنا لیا۔ چنبیلی نے بھی میکانکی انداز میں اپنے کپڑے ایک تھیلے میں بھر لیے۔ یہ سب اس کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ مستقبل میں اس سے بڑے بگاڑ ہی آتے۔ تھیلے کی زپ بند کرتے ہوئے چنبیلی نے سوچ لیا تھا کہ اسے یہاں سے چلے جانا چاہیے، چنانچہ رات کو نکل جانے کا ارادہ بنا لیا۔

زوار حسب معمول چنبیلی سے پرانی باتیں کرتے رہے اور چنبیلی وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگی۔

اور یہ رات کا دوسرا پہر تھا جب چنبیلی چپکے سے اٹھی، اپنا تھیلا اٹھایا گربہ پائی سے چلتے کمرے کے دروازے تک پہنچی۔ دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ آخری بار باپ کو دیکھ لے مڑ کر دیکھا تو اندھیرے میں باپ کا ہیولا ہی نظر آیا۔ آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ آنکھیں رگڑتے ہوئے چنبیلی مڑی اور جانے لگی۔ ابھی اس نے برآمدہ بھی پار نہ کیا تھا کہ اسے کمرے سے عجیب سی آواز سنائی دی۔ ایسے جیسے کوئی آدمی فرش پر گر گیا ہو۔

دل بڑے زور سے دھڑکا تھا۔ برآمدے سے صحن تک ہی پہنچی تھی کہ ایک آواز نے اس کا تعاقب کیا تھا۔

"سونی" زوار کے لہجے میں کراہ تھی درد کا عنصر گھلا ہوا تھا۔ چنبیلی کے حرکت کرتے پاؤں لمحے بھر میں ساکت ہو گئے۔ یہ زوار کا مخصوص لہجہ نہ تھا۔ کچھ تھا جو غلط تھا۔ لمحے سے بیشتر چنبیلی واپس مڑی، برآمدہ پھلانگتی کمرے میں پہنچی۔ کمرہ روشن کیا تو دیکھا زوار زمین پڑے آڑے ترچھے بیٹھے ہیں۔ ہاتھ سینے پر بائیں طرف جبکہ ہیں چہرہ درد کی شدت سے بگڑ رہا ہے۔

"ابو، ابو۔۔۔" چنبیلی پیروں کے بل باپ کے پاس بیٹھی تھی۔

"ابو کیا ہوا سنبھالیں خود کو۔" چنبیلی باپ کی پیٹھ سہلاتے چیخ رہی تھی۔

زوار کی سینے پر رکھے ہاتھوں کی گرفت تھوڑی اور

مضبوط ہوگئی۔ درد تھا کہ جیسے جان ہی نکل رہی تھی۔
''ابو، ابو جی، اسفر، اسفر۔۔۔۔'' چنبیلی چیختے ہوئے اٹھی اور اسفر کو بلانے لگی۔
''اسفر، اسفر، سدرہ، بچی، اسفر۔۔۔۔'' چنبیلی کی آواز در و دیوار ہلاتی تھی۔ زوار کی آنکھیں الٹ رہی تھیں اور جسم ٹھنڈا پڑ رہا تھا۔ دوسرے کمرے میں سوئے گھر کے دوسرے مکینوں کے اٹھنے اور اس کمرے میں آنے سے قبل ہی زوار مٹی کا ڈھیر بن چکے تھے۔
اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔
بے شک ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

☆......☆......☆

تعزیت کے لیے آنے والے لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔
ساتھ والے ہمسائیوں کے گھر کے صحن میں شامیانے لگا کر مردوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ عورتوں کے بیٹھنے کا انتظام اپنے گھر میں ہی کیا گیا تھا۔ ملگجے کپڑوں میں ملبوس اسفر کی آنکھیں غیر مرئی نقطے پر ساکن تھیں۔ تعزیت کے لیے آئے مرد اسفر کے ساتھ آ کر بیٹھتے، تعزیتی کلمات ادا کرتے اور گلے مل کر دوسرے مردوں کو جگہ دیتے۔ اسفر یونہی میکانکی انداز میں گلے ملتا جاتا۔
اب وہ گھر کا مرد واحد تھا۔ زوار کی جگہ اسی کے لیے تو خالی ہوئی تھی۔
''آپ کے ہوتے ہوئے یتیموں جیسی زندگی گزاری ہے۔'' یہ اسفر ہی تھا جس نے زوار سے ایسے کہا تھا۔ کہنے اور ہونے میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ اسفر کو اندازہ ہونے لگا۔ آنکھیں جھکائیں تو پلکیں بھیگ گئیں اور دوسرے لمحے ہی وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔
جنازہ اٹھایا گیا اسفر جنازے کو کندھا دیے قبرستان کی طرف چلا جا رہا تھا۔
''بیٹے تو نعمت ہوتے ہیں۔ باپ کا بوجھ کندھوں پر لادتے ہیں۔'' گزرے سالوں میں زوار نے کسی خاص موقع پر کہا تھا۔ جانے انہوں نے کس بوجھ کی بات کی تھی۔ اسفر کی آنکھیں چھلکتی ہی جاتی تھیں۔

گھر میں عورتوں کے جھرمٹ میں بیٹھی فاخرہ کی آنکھوں سے آنسو پانی کی طرح بہتے تھے۔ گالوں پر بہتے آنسوؤں کو انہوں نے اتنی بار رگڑا کہ گالوں پر رگڑ کے نشان بن گئے۔
''زوار میاں بیوی میں لڑائی تو ہوتی ہی ہیں اس کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ بندہ روٹھ کر ہی چلا جائے۔'' فاخرہ کو پچھتاوے نے آگھیرا تھا کاش کہ وہ کل زوار سے نہ لڑتیں۔ سال دو سال کا ساتھ تھوڑی تھا دہائیوں کی رفاقت تھی۔ گزرے وقت کی فلم آنکھوں کے سامنے گزرنے لگی تو فاخرہ کا غم دوہرا ہونے لگا۔
''زوار یہ میں نے کیا کیا تمہاری کبھی خدمت کی ہی نہیں۔'' فاخرہ کو اب احساس ہو رہا تھا جب دامن خالی ہو چکا تھا۔
''زوار کاش کہ تم لوٹ آؤ۔'' آنکھیں پونچھتے ہوئے فاخرہ زوار کو پکارتی تھیں۔
دوسری طرف بیٹھی سدرہ کی سسکیاں نہ تھمتی تھیں۔ دعا کی گود میں سر رکھے وہ روئے جاتی تھی اور دعا دلاسے دیے جاتی تھی۔
ایک کونے میں چنبیلی بھی بیٹھی تھیں۔ چنبیلی جو سونی بھی تھی۔ میت کو قبرستان لے جایا جا چکا تھا۔ اب تک کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ ہاں البتہ ہمسائیوں نے طعام کے لیے جب تعزیت کرنے والے لوگوں کو کھانا دینا شروع کیا تو ایک ہمدرد عورت نے چنبیلی کو بھی کٹوری میں سالن اور دو روٹیاں لا دیں۔
پیٹ میں بھوک کا درد جاگا ہوا تھا۔ درد مٹانے کو کھانا تو تھا۔ آنسو پیتی چنبیلی نوالے حلق سے اتارنے لگی۔
کھانے کے بعد بھی یہ احساس جاری رہا کہ یہ منظر اس کے لیے نہیں تھا وہ غیر ضروری تھی۔ کسی کو اس سے سروکار نہ تھا۔ اب تو شاندیوں بھی اب اس کے لیے اس گھر میں جگہ نہ بچی تھی۔
چنبیلی اٹھی اور خارجی دروازے سے باہر نکلتی چلی گئی۔ چنبیلی کو باہر کی طرف جاتے راشدہ نے دیکھا تھا۔ مگر دانستہ نہ روکا تھا۔
(جاری ہے)

ناول

کاشی چوہان

زہرِ عشق

خوف اور رگوں میں لہو جما دینے والے مناظر سے بھرپور، عشق کی ایک ایسی ناقابلِ یقین داستان، جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ یہ سچی کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

قسط نمبر: 17

سلمان اور اس کی ماں زلیخاں کے پاؤں ٹھٹک گئے۔ لیکن سلمان نے پیچھے سے آنے والی آواز سن کر پہچان لی تھی وہ سلمان کا دوست کنعان تھا۔۔۔ وہ قریب پہنچا تو سلمان اس سے گلے ملا۔۔۔

''میں جانتا تھا تم اپنے ابا کو چھڑانے ضرور پہنچو گے۔۔۔'' کنعان نے یہ کہنے سے پہلے زلیخاں کو سلام کیا۔

''ہاں میں انھیں اس طرح سردار کی قید میں نہیں دیکھ سکتا'' سلمان نے کہا۔

''لیکن تم اکیلے سردار کی پوری فوج کا مقابلہ کس طرح کرو گے؟'' کنعان اس کی بات سن کر حیرت سے بولا۔

''جانتا ہوں'' سلمان نے کہا۔۔۔

''یہی بات اسے میں سمجھا رہی ہوں۔ بیٹا مگر یہ میری بات سمجھنے کو تیار نہیں ہے'' زلیخاں نے تائید میں کہا۔

''تو مجھے کیا کرنا چاہیے۔۔۔ کیا میں اپنے بابا کو اس طرح سردار کے بے رحم انصاف کے حوالے کر دوں؟''

سلمان کی آواز میں اپنے باپ کی محبت اور کچھ کر دکھانے کا جوش صاف محسوس ہوتا تھا۔۔۔

''میں یہ نہیں کہہ رہا سلمان'' کنعان نے صراحت کا سہارا لیا۔ ''میں کہنا چاہتا ہوں کہ تم اکیلے ہو اور سردار کی طاقت بہت زیادہ ہے۔۔۔ میں یہی سوچ کر تمہارے ساتھ آیا ہوں۔۔۔ میں تمہیں اکیلے نہیں جانے دینا چاہتا۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔''

''کیا تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔۔۔!''

سلمان کی حیرانی میں پوشیدہ خوشی کو کنعان نے محسوس کر لیا تھا۔ اور اس کے چہرے پر ایک نامعلوم جذبے کی لہریں سی اٹھنے لگیں۔

''میں دوست ہوں تمہارا اور ایک دوست اپنے دوست کو مصیبت کی اس گھڑی میں کیسے اکیلا چھوڑ سکتا ہے''

''جیتے رہو بیٹا۔۔ تم نے تو واقعی دوستی کا حق ادا کر دیا۔''

زلیخاں سے رہا نہیں گیا اور اس نے بے ساختہ کنعان کی تعریف کی۔۔۔

''مگر خالہ! ہم دونوں مل کر بھی سردار کی طاقت کے سامنے کچھ نہیں ہیں۔۔۔ اس لیے میں۔۔۔'' کنعان کی بات اس کے ہونٹوں پر دم توڑ گئی۔۔۔



''تمہارا پوری بات نہ کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ تم جانتے ہو اس مقابلے میں ہم ہار جائیں گے اس لیے تم مجھے اس مقابلے سے روکنا چاہتے ہو یا یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں اپنی جان بچاؤں اور اس مقابلے سے باز آجاؤں... لیکن یہ بھی ہے تمہارے دل میں کہ اگر میں تمہاری بات نہ مانوں تو تم میرے ساتھ چلو گے اور اپنی جان بھی دوستی کے نام پر قربان کر دو گے یہی نا... یہی کہنا چاہتے ہو تم...''
سلمان نے کہا اور کنعان کے جھکے ہوئے سر کو دیکھ کر اسے کنعان کا جواب مل گیا کہ ہاں میں یہی کہنا چاہتا ہوں...
''تو پھر میرے بہت اچھے دوست میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ تم واپس چلے جاؤ اور ایک ایسی لڑائی میں خود کو مت جھونکو جس کی جیتنے کی تمہیں ہلکی سی بھی امید نہ ہو... تم جاؤ میں اکیلا جاؤں گا... کیونکہ میں ہاروں یا جیتوں مگر میں اپنے باپ کو یوں سردار کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔ ایسے حالات میں ایک بیٹے کا جو فرض ہونا چاہیے مجھے وہ پورا کرنا ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ کسی بیٹے کا باپ موت کے منہ میں جا رہا ہو تو اسے اپنی جان کی پروا کرنی چاہیے...''
سلمان کی گفتگو سے اس کے ارادے کی پختگی صاف ظاہر ہو رہی تھی...
''تو پھر ٹھیک ہے۔ تم اگر اپنے بابا کے لیے اپنی جان.. جان آفریں کے سپرد کرنے کا ارادہ رکھتے ہو تو میں بھی اپنے دوست کی خاطر ایسا ہی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کوئی لازمی نہیں ہے کہ جان صرف ماں باپ کی خاطر ہی قربان کی جاتی ہے۔ دنیا میں جان دوستوں کی خاطر بھی قربان کرتے آئے ہیں لوگ۔ اب مجھے تم مت روکو میں اپنے دوست کی خاطر قربان ہونا چاہتا ہوں۔''
کنعان نے کا ارادہ بھی آن کی آن میں فولاد بن چکا تھا اس کا سینہ ایک ایسے انگارے کی مانند دہک رہا تھا جہاں جذبات نے آگ بھڑکا دی تھی۔ زلیخاں نے بڑھ کر اس کا ماتھا چوم لیا۔
''تمہاری ماں بڑی عظیم ہے جس نے تمہارے جیسے بیٹے کو جنم دیا ہے'' زلیخاں نے کہا تو کنعان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں... پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ سلمان اس کی طرف ایسے دیکھ رہا تھا جیسے مسلسل حیران ہو رہا ہو اس نے بھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ بےوقوف اور لاابالی جن کا بچہ اس کا اتنا جاں نثار دوست ثابت ہو سکتا ہے۔
''اور ہاں... اب مجھے بھی یقین ہے کہ ہم یہ جنگ ضرور جیتیں گے۔ جنگ کوئی احمق ہی ہوگا جو ہارنے کے لیے لڑتا ہو۔ جنگ تو لڑی ہی جیتنے کے لیے جاتی ہے۔ جہاں تک یہ بات ہے کہ سردار کی طاقت زیادہ ہے تو پھر کیا ہوا۔ ہمیں اپنے خدا پر یقین ہے اور ہم ضرور تمہارے بابا کو سردار کی قید سے آزاد کرائیں گے۔''
زلیخاں دونوں دوستوں کی گفتگو سن کر دل ہی دل میں خوشگوار حیرانی سے نہال ہوئی جا رہی تھی۔ اسے معلوم تھا اس کا بیٹا کوئی معمولی جن نہیں ہے وہ ایسا ہی ہے کہ کوئی بھی اس کے لیے اپنی جان کی بازی لگانے کو آمادہ ہو جائے۔
''لیکن ایک بات جو تم شاید بھول رہے ہو وہ میں تمہیں ضرور یاد دلانا چاہتا ہوں'' سلمان نے کہا تو کنعان چونکا۔
''کیا کیسی بات؟'' اس نے عجلت سے کہا۔
''تم شاید نہیں جانتے کہ سردار کو اس بات کا پتا چل ہی جائے گا کہ میرے بابا کو آزاد کرانے میں تم نے میرا ساتھ دیا تھا۔ یہ جاننے کے بعد وہ تمہاری جان کا دشمن ہو جائے گا اور پھر تم اس کے قبیلے میں رہ نہیں سکو گے...''
سلمان کی بات سن کر کنعان پر ایک قسم کا سکوت طاری ہو گیا۔ جوش جذبات میں اس نے واقعی اس پہلو پر تو سوچا ہی نہیں تھا۔
''دشمن تو وہ تمہارا ابھی ہو جائے گا بلکہ ہو چکا ہے تو تم کیا کرو گے؟'' کنعان نے جیسے سوچ لیا تھا کہ وہ اب سے سلمان کے ساتھ ہی رہے گا۔
سلمان سوچ میں پڑ گیا کہ اسے کیا جواب دے۔ اگر وہ کہتا ہے کہ اس کا ارادہ تو اپنے ماں باپ کو انسانوں کی

بستی میں لے جانے کا ہے تو پتا نہیں کنعان کا کیا ردعمل ہوگا۔ لیکن اب کیا کیا جائے۔ وہ اس موقع پر اپنے جانثار دوست سے کچھ چھپانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے سلمان نے سوچ بچار کرنے کے بعد سب کچھ کنعان کو بتانے کا فیصلہ کرلیا مگر ابھی اس نے کنعان سے صرف اتنا کہا۔

''میں تو اپنے ماں باپ کو لے کر یہاں سے دور انسانوں کی بستی کی طرف نکل جاؤں گا پھر وہیں جا کر کوئی رہنے کا ٹھکانہ تلاش کروں گا۔ کیونکہ جنات کا کوئی بھی قبیلہ سردار کی پہنچ سے باہر نہیں ہے لیکن انسانوں کی بستی میں اس کی حیثیت بھی وہ ہی ہوگی جو ہماری ہے۔ اول تو وہ ہمیں انسانوں کی بستی میں تلاش نہیں کر سکے گا۔''

سلمان نے سوچتے ہوئے کہا۔ سلمان کی باتیں سن کر زلیخاں بھی اداس سی ہوگئی۔ اسے اپنے قبیلے سے جانے کا دکھ ہو رہا تھا مگر وہ بولی کچھ نہیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس موقع پر اپنا دکھ ظاہر کر کے اپنے بیٹے کے حوصلوں کو پست کرے۔ اس لیے چپ ہی رہی۔

''تو کیا تمہارے ساتھ میں وہاں نہیں جا سکتا...؟'' کنعان نے اس طرح کہا جیسے اسے کچھ اور سمجھ ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ کنعان کی بات سن کر سلمان بھی ایک دم سے پریشان ہوگیا کہ یہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس طرح انسانوں کی بستی میں جا کے رہنا کوئی ہنسی کھیل تو نہیں ہے۔ اس نے چونک کر کنعان کو دیکھا اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''اور تمہارے ماں باپ ان کا کیا ہوگا سردار تمہاری وجہ سے انھیں بھی تنگ کرے گا؟''

''میں انھیں بھی ساتھ لے چلتا ہوں ویسے بھی خالہ کا وہاں اکیلے کیسے دل لگے گا۔ اچھا ہے نا میری اماں بھی ساتھ ہوں گی تو دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل کے رہ لیں گی کیوں خالہ؟''

کنعان نے اتنا اچانک پوچھا کہ زلیخاں کی سمجھ میں فوری طور کوئی جواب نہیں آیا اور وہ آں ں کرتی رہ گئی۔ اسی اثنا میں زلیخاں کو اپنے کانوں میں ہنسی کی آواز سنائی دی... اس نے آواز کی سمت میں دیکھا تو یہ سلمان تھا۔

''یہ کنعان تو بالکل دیوانہ ہے ابھی ہمارے سامنے موت اور زندگی کی موت کا مرحلہ درپیش ہے اور یہ آپ دونوں کے دل لگانے کی باتیں سوچ رہا ہے پتا نہیں ہمیں وہاں کس قیامت سے گزرنا ہے۔''

سلمان کہتے کہتے جیسے ایک دم جوش رندانہ کی کیفیت میں چلا گیا۔

اب ہمیں باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے یہ کام ہمیں اگلے کچھ گھنٹوں میں نمٹانا ہوگا ابھی سردار کے محافظوں کے ٹولے خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہوں گے ہمارے لیے اپنے مقصد کو پانا ہوسکتا ہے زیادہ دشوار نہ ہو'' سلمان نے مذید کہا۔

''تو پھر چلو...'' کنعان نے جواباً کہا اور تینوں اپنی منزل کی طرف چل دیے۔

زلیخاں کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اس کے تو بیٹے اور شوہر دونوں کی ہی جان کو خطرہ لاحق تھا وہ جانتی تھی کہ آج یا تو وہ اپنے بیٹے کو بھی کھو دے گی یا پھر اللہ نے چاہا تو اس کے شوہر اور بیٹا دونوں اس کی آنکھوں کے سامنے ہنسی خوشی زندہ سلامت ہوں گے۔ لیکن سردار کے محافظوں کا سوچنے کے بعد اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی اور وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگتی کہ یا اللہ آج میری ممتا اور میرا شوہر دونوں تیری مدد کے محتاج ہیں۔ انھیں زندگی دے، کامیابی دے اور اگر تیری رضا میں یہ شامل نہیں ہے تو مجھے بھی ان کے ساتھ اس دنیا سے بلا لے۔ میرے رب تو جانتا ہے میں ان دونوں کے بغیر اس دنیا میں کبھی نہیں جی سکتی... کبھی نہیں....'' اپنے ہی خیالوں میں گم وہ تیز اور کبھی آہستہ چلنے لگتی ایسے میں سلمان نے اسے سوچوں میں گھرا ہوا دیکھا تو وہ اس کے قریب آکر بولا۔

''ماں آپ کو کسی قسم کا ڈر لگ رہا ہے؟''

''نہیں بیٹے میں کیوں ڈروں گی۔ اور پھر تم بھی تو ساتھ ہو میرے۔ میرے بیٹے کے ہوتے ہوئے مجھے کس بات کا ڈر لگ سکتا ہے'' زلیخاں کا جواب سلمان کے حوصلے بڑھانے کے لیے بہت کافی تھا۔

''تو پھر آپ کیا سوچ رہی ہیں؟'' جیسے اسے اطمینان نہیں ہوا ماں کی بات سن کر۔

''کچھ نہیں بیٹے تمہاری اور تمہارے بابا کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی ہوں۔''

زلیخاں کے اس جواب نے سلمان کی تشفی کر دی۔ وہ جانتا تھا مائیں ہمیشہ اپنے بچوں کی سلامتی اور حفاظت کی دعائیں مانگتی رہتی ہیں۔ سلمان نے ماں کو کاندھے سے پکڑ کر اپنے آپ سے مس کیا اور ایک نئے عزم کے ساتھ بولا۔

''فکرمند نہ ہوں انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم بابا کو ضرور آزاد کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔''

''انشاء اللہ بیٹے...'' بیٹے کا ہاتھ دباتے ہوئے زلیخاں نے کہا۔

تینوں نے تیز تیز قدم بڑھانے شروع کر دیے۔ رات مہیب تھی اور اونچے نیچے راستے دشوار گھاٹیاں عبور کرتے ہوئے وہ تینوں بس کسی بھی احساس کے بنا چلے جا رہے تھے۔ سلمان نے سردار کے قید خانے تک پہنچنے کے لیے جن راستوں کا انتخاب کیا تھا وہ عام راستوں سے زیادہ مشکل اور ناقابل عبور تھے۔ اسی لیے دونوں کو بار بار زلیخاں کا خیال کرنا پڑ رہا تھا... لیکن زلیخاں نے اس وقت دونوں نوجوان لڑکوں سے زیادہ ہمت جمع کر رکھی تھی اور وہ کسی بھی دشوار گھاٹی میں ایسے باہمت ہو کر اتر رہی تھی جیسے وہ سلمان کی ماں نہ ہو بلکہ جھانسی کی رانی ہو۔

رات دھیرے دھیرے مزید گہری ہوتی جا رہی تھی..... اور یہ تینوں قدموں کی آہٹ اور کوئی سرسراہٹ پیدا کیے بغیر... اس قدیم قید خانے کی طرف قدم بڑھا رہے تھے جہاں ابراہیم... جنوں کے سردار شماش کی قید میں تھا۔

گہری راتوں میں جنوں کا معمول ہوتا ہے کہ گہری گھاٹیوں کے بجائے اونچائی اور پیڑ در پیڑ... ٹیلہ در ٹیلہ سفر جاری رکھتے ہیں تاکہ ان کی آنکھیں دور دور تک کے منظر کو ایک ہی نظر میں دیکھ سکیں۔ لیکن یہ تینوں اس گہری اور دبیز رات میں گھاٹیوں میں محو سفر تھا... کیونکہ سلمان، کنعان اور زلیخاں کی اولین کوشش یہ تھی کہ شماش یا شماش کا کوئی جاسوس انہیں منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی دیکھ نہ لے... یہ تینوں کسی کی نظر میں آئے بغیر... شماش کے اس عقوبت خانے تک پہنچنا چاہتے تھے جہاں انہیں نامعلوم صورتحال کا سامنا ہونے والا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ وہاں پہنچ کر جنگ کیے بغیر سلمان اپنے بابا تک نہیں پہنچ سکے گا۔ لیکن وہاں پہنچنے سے پہلے اگر شماش کو ان کی اس حملہ ورانہ حکمت عملی کے بارے میں پہلے سے کچھ پتا چل جاتا... تو یقیناً شماش ہوشیار اور چوکنا ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ان کے پہنچنے سے قبل ابراہیم کو یعنی سلمان کے باپ اور زلیخاں کے شوہر کو کسی اور مقام پر منتقل کر دیتا اور یوں سلمان اور زلیخاں اور کنعان شماش کے عقوبت خانے پر حملہ کرنے کے باوجود بھی ناکام رہتے۔

یہی وجہ تھی کہ یہ تینوں شعلہ اور جوالا مکھی ہونے کے باوجود بھی... اندھیرے میں چلتے ہوئے تیروں کی مانند... تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے تھے۔

سفر جاری تھا... اور رات گہری سے گہری ہوتی جا رہی تھی۔ چٹیل میدانوں کو عبور کرتے ہوئے کہیں کہیں گھاس کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں والے میدان ان کے پیروں تلے آ جاتے اور کبھی ایسا لگتا کہ جن راستوں پر وہ چل رہے ہیں ان پر کبھی بارش کی ایک بوند تک نہیں گری۔ بھربھری موٹی موٹی خشک مٹی کے ڈھیلے ان کے پیروں تلے چل کر ریت ہو رہے تھے... کہیں کہیں بالکل ایسی سیم وتھور زدہ زمین آ جاتی کہ ان کے پیروں کو یہ گمان ہونے لگتا کہ یہ زمین پر نہیں بلکہ سخت کھردرے چٹیل اور ہموار پتھروں پر چل رہے ہیں۔ لیکن سفر جاری رہا اور سفر کے ساتھ ساتھ رات کی چادر مزید موٹی اور گہری ہوتے چلی جا رہی تھی۔ انہوں نے نہ رکنے اور آپس میں بات نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ لہٰذا ایک دوسرے کی موجودگی کے احساس میں بس یہ تینوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ کبھی کوئی دو قدم آگے نکل جاتا اور کبھی کوئی چار قدم پیچھے ہو جاتا۔ لیکن ان کے جذبے اور ارادے ایک ہی سان پر چڑھے ہوئے تھے۔ انہیں ابراہیم کو... شماش کی قید سے رہا کرانا تھا۔ کسی بھی حد تک جا کر آج ابراہیم کی آزادی کو یقینی بنانا تھا۔ اچانک ہی ان کے پیروں کے نیچے بھربھری ریت کے بجائے ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس کی ایک اور ٹکڑی آ گئی۔

سلمان نے چلتے ہوئے سوچا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ رات ایسی ہی تاریک خاموش اور پر اسرار ہوتی لیکن اس کے دل میں باپ کی آزادی کا جذبہ نہ ہوتا اور وہ کچھ لمحے یہاں رک کر... اس نرم روگھاس پر چپ چاپ کھڑا رہتا... لیکن یہ وقت کھڑے ہونے اور ٹھہرنے کا نہیں تھا۔ اسے آگے بڑھنا تھا۔ کنعان اور زلیخاں اس سے دور لیکن اس کے ہم سفر تھے۔ آسمان کی چادر پر چاند کا دائرہ کچھ بے ترتیب سا ہو کر ساکن تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے آج کی رات چاند بھی کسی عجوبہ معرکے کو دیکھنے کے لیے کچھ ڈرا کچھ سہما ہوا سا تھا۔ اور اس آب و تاب سے چمک نہیں رہا تھا جس سے وہ معمول کے مطابق چمکا کرتا ہے۔

پھر یکا یک... گہرے سیاہ بادلوں کی ایک ٹکڑی نے چاند کو اپنی لپیٹ میں لے لیا... اور گہرا تاریک جنگل اور بھی گہرا اور خاموش ہو گیا... اب ایسا دبیز اور ہولناک اندھیرا ان تینوں کو چاروں سمت سے گھیر چکا تھا... کہ نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں اپنے قدم روک لینا پڑے..... سلمان کو اپنے آس پاس اپنے پیارے اور جاں نثار دوست کنعان کی موجودگی محسوس ہو رہی تھی... لیکن دوست کی موجودگی کے ساتھ ہی اسے کچھ کم بھی لگ رہا تھا۔ وہ آواز پیدا کیے بغیر کچھ دیر اس گہرے مہیب اندھیرے میں کھڑا رہا... اس کی سانسوں کی آواز اس کے اپنے کانوں تک پہنچ رہی تھی اور گہرے مہیب سناٹے اور اندھیارے میں اس کی چمکتی آنکھیں کسی اور کو اپنے پاس دیکھنے کی حسرت سے بھری ہوئی لگ رہی تھیں۔ اسے لگا کنعان اس کے پاس ہے۔ اور پھر اگلے ہی لمحے... وسوسے اور وہم کے ایک ان دیکھے ناگ نے اس کے ذہن اور دل میں پھن اٹھا لیا... کیا یہ کنعان ہی ہے۔ اور اماں... وہ کہاں ہے۔ آخری بار وہ مجھے کوئی بیس قدم دور دکھائی دی تھیں۔ بیس یا شاید پچیس یا تیس۔ اور کنعان تو ان کے بھی پیچھے تھا۔ پھر یہ میرے اس قدر قریب کون ہے۔؟

ہوا میں ایک عجیب پر اسرار خاموشی نے بگل بجانا شروع کر دیے تھے۔ ہر چند کہ دور دور تک خاموشی تھی سناٹا تھا ویرانی تھی... لیکن کوئی گپت سرسراہٹ سلمان کو اپنے پاس... بہت پاس محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دل و دماغ کو اس پر اسراریت پر فوکس کرنے کی کوشش کر رہا تھا تا کہ جان سکے کہ وہ کیا ہے؟... لیکن بار بار اماں زلیخاں کا خیال اور دوست کنعان کی فکر اس کا فوکس بگاڑ رہی تھی۔ اور وقت کی اس بے رحم گھڑی میں منہ سے آواز نکالنا خود اس کے لیے یا کنعان اور اماں کے لیے خطرناک ہو سکتا تھا... لہٰذا وہ اس خاموش رات میں اور بھی خاموش ہو کر کھڑا رہا۔ اچانک سے ایسے تنہا ہو جانا از خود ایک طرح کا خوف اور پریشانی کی بات ہوتی ہے۔ اور اس کے ساتھی... یعنی اس کی ماں اور اس کا دوست یہ تو اسے بہت عزیز تھے... یہ کہاں رہ گئے؟

کیا اس کے پاس یہ ہی دونوں ہیں؟

کیا یہ ان دونوں کی موجودگی ہی ہے؟

اف رات اتنی گہری اور تاریک کیوں ہو گئی ہے کہ اسے اپنے ہاتھ تک نہیں دکھائی دے رہے۔

کیا وہ بھٹک گیا ہے اور اس نے شماش کے عقوبت خانے کی طرف جانے کے بجائے کسی اور سمت قدم بڑھا دیئے ہیں اور اب کسی اور ہی نامعلوم دنیا میں آنکلا ہے۔؟

ایک لمحہ... پھر اسکے ساتھ پیوست ایک دوسرا لمحہ... پھر تیسرا لمحہ اس کے اوپر سے گزرا اور اسے لگا وہ تین صدیوں سے اس اتھاہ خاموش سناٹے میں کھڑا ہے اور بس ہر کسی سے بچھڑ گیا ہے۔ اس نے سر اٹھائے بغیر آسمان کو دیکھا۔ وہ آسمان نہیں تھا۔ خلا تھی۔ گہری تاریک ستاروں سے خالی خلا۔ کہیں کوئی روشنی کوئی ٹمٹماہٹ نہیں تھی۔ وہ کھڑا سوچتا رہا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ کنعان کو اور اماں کو پکارنا چاہیے یا نہیں۔ پھر اسے لگا کہ اس نے آواز پیدا کی تو یہ گہری المناک قسم کی خاموشی فوراً سے بیشتر اپنے ٹوٹ جانے پر اس پر حملہ آور ہو جائے گی۔

یہ پریشان خیالی کیسی ہے... کیا میں کسی اور کے قابو میں جا رہا ہوں یا جا چکا ہوں؟

اگلے ہی لمحے اسے شماش کا خیال آیا۔ اس کی طاقت اور اس کی جادوگریاں شدید اور بے مثل تھیں... سلمان نے

سوچا ہوتا ہو.... شماش کو میرے آنے کی خبر مجھ سے پہلے پہنچ گئی اور اس نے مجھے اپنی کالی اور شیطانی طاقتوں کے زور سے بے دم کر دیا ہے۔ یہ پریشان خیالی اس کی شہ پر مجھ پر حملہ آور ہو رہی ہے۔ لیکن مجھے کھڑے رہنا ہے اس وقت تک کھڑے رہنا ہے جب تک کوئی مجوبہ بات خود مجھ تک چل کر نہ آ جائے۔ وہ بظاہر سانس بھی نہیں لے رہا تھا لیکن اس کا روم روم چوکس اور ہوشیار ہو چکا تھا۔ وہ اپنے ہر انگ انگ سے کہہ رہا تھا کہ اگر یہ کوئی مشکل گھڑی ہے کوئی طلسم ہے کوئی جادوگری ہے تو مجھے ہمت سے ڈٹے رہنا ہے۔ مجھے اس پریشان خیالی کو اپنے حواسوں سے دور رکھنا ہے۔ مجھے بادل کی اس شدید کالی ٹکڑی کے چھٹ جانے کا انتظار کرنا ہے تا کہ چاند کی اداس روشنی مجھے ایک بار پھر میری منزل کا پتا دے سکے۔ لمحے گھسٹ گھسٹ کر گذرتے رہے شاید یہ دو منٹ گذرے تھے یا شاید دو گھنٹے۔ بادل کی کالی ٹکڑی تمام ہونے کو نہیں آ رہی تھی بلکہ لگتا تھا تاریکی اور بھی گہری ہو گئی ہے۔ اس نے بہت آہستہ سے.... دو تین بار اپنی آنکھوں کو بند کیا اور کھولا۔ پھر اس نے خود سے کہا۔ نہیں نہیں یہ مت کرو.... یہ تو اس شک میں پڑنے جیسا ہے جیسے کسی نے مجھ سے میری بینائی چھین لی ہے۔ شماش لاکھ طاقتور سہی.... لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ مجھ سے کوسوں دور بیٹھ کر مجھے اندھا کر دے۔ ساتھ ہی ایک اور وسوسے نے اسے ڈسا.. اور یہ خاموشی... یہ کیوں ہے کیا میں سننے کی صلاحیت سے بھی گیا۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ میں ابھی کچھ لمحے پہلے تک اپنی ماں اور اپنے پیارے دوست کنعان کے ساتھ تھا۔ یہ ناممکن ہے۔ شماش ایسے اچانک مجھے اس قدر بے دست و پا نہیں کر سکتا۔ وہ جنوں کے ظالم قبیلے کا سردار ہے تو میں بھی سلمان ہوں... میں ایک جن ہوں اور اس قسم کے کسی طلسم سے مجھے اندھا اور بہرا نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن میں اندھا نہیں ہوا بہرا نہیں ہوا تو مجھے کچھ دکھائی کیوں نہیں دے رہا اور نہ ہی کچھ سنائی دے رہا ہے۔ میں کہاں پہنچ گیا ہوں؟

سلمان کا جی چاہا وہ زور سے بول پڑے... تا کہ اسے کم سے کم اپنے ہونے کا احساس تو ہو... لیکن پھر اسے لگا کہ اس کی آواز بھی اس کے حلق میں پھنس گئی ہے۔ بجلی بن کر ایک خیال اس کے دماغ میں کوندا...... کیا میں مر گیا ہوں؟؟



ادھر شماش عقوبت خانے کی موٹی دیواروں کے اس پار اپنے محافظوں کے نرغے میں ساغر و مینا کے مزے لوٹ رہا تھا۔ شراب کے جام اس کے سامنے تھے اور قریب ہی آگ کے بھڑکتے شعلے کسی مستانی رقاصہ کی طرح اس کے سامنے ناچ رہے تھے۔ وہ فیصلہ کر رہا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ ابراہیم کی موت اب شماش کے لیے ضروری ہو چکی تھی۔ کیونکہ ابراہیم کو اس نے قید ہی اس وجہ سے کیا تھا تا کہ سلمان اور زلیخاں اسے رہا کرانے کے لیے خود اس کے پاس آ ئیں۔ اس سے قبل شماش نے ہزارہا طریقوں سے سلمان کو قابو کرنے، گرفتار کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ہر بار کی کوشش میں ناکامی کے بعد شماش اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ جنوں کے نظام میں گڑبڑ پیدا کرنے والے سلمان۔ اس کے باپ ابراہیم اور ماں زلیخاں کو اب سزا دینے کا وقت آ گیا ہے۔

سلمان جب کسی طور شماش کے قابو نہ آیا تو اس نے سلمان کے باپ کو قید خانے میں لا ڈالا کہ اب تو سلمان خود چل کر اس کے پاس آ جائے گا۔ لیکن اب تو اس بات کو بھی کئی دن اور کئی راتیں گذر گئی تھیں۔ شماش جانتا تھا کہ جیسے ہی وہ ابراہیم کو سخت قسم کے تشدد کا نشانہ بنائے گا تو ابراہیم کے بیٹے سلمان اور بیوی زلیخاں کو خود بخود ان اذیتوں کی خبر پہنچ جائے گی اور تب وہ ضرور اس کے پاس آ جائیں گے۔ اس پورے منظر کا تصور کر کے... شماش کے ہونٹوں پر ایک شیطانی سی مسکراہٹ ناچنے لگی تھی۔ اپنی اسی تکلیف پہنچانے والی خصلت کو اس نے مزید صراحت سے سوچا کہ اگر میں زلیخاں اور سلمان کے علم میں لائے بغیر ابراہیم کو موت کے اندھیروں میں دھکیل دوں تو کیا ہوگا؟ پھر وہ نشے میں دھت ابراہیم کی لاش کو اپنے آنکھوں کے سامنے دیکھنے لگا... اسے لگا کہ وہ ابراہیم کو جان سے مار چکا ہے اور سلمان اور زلیخاں اس کے سامنے زنجیروں میں بندھے پیش ہو گئے ہیں... اسی منظر کو اپنے چشم تصور میں دیکھتا ہوا

شماش وحشیانہ قسم کے قہقہے لگانے لگا۔ پھر اس نے اپنے ایک محافظ کو نشے میں ڈوبی آواز کے ساتھ پکارا.... چار سمتوں سے چار محافظ آن کی آن میں شماش کی خدمت کو حاضر ہو گئے۔
اور چاروں نے ایک ہی ساتھ شماش کو جاں نثاری اور عاجزی سے مخاطب کیا...
''حکم کیجیے آقا''
''ابراہیم کی کیا خبر ہے محافظو'' شماش نے جام کو منہ سے لگا کر ایسی بے فکری سے سوال کیا جیسے ابرہیم کی زندگی اور موت دونوں ہی اس کے لیے بے معنی ہوں۔
''وہ قید خانے میں ہے'' ایک محافظ نے تیزی سے آقا کو خوش کرنے کے لیے باقیوں سے پہلے جواب دیا۔
شماش یہ سن کر آگ بگولہ ہو گیا اور مڑ کر محافظ کو گھورا۔
''میں کیا تجھے گدھے کا بچہ لگتا ہوں... یہ میں جانتا ہوں.... میں تم سے اس کا حال پوچھ رہا ہوں.... کس حال میں ہے وہ....؟؟''
''آقا'' محافظ کو شماش کی جلال بھری ڈانٹ نے ذرا محتاط کر دیا تھا اس لیے محافظ نے تھوک نگلتے ہوئے قیدی ابراہیم کی موجودہ حالت زار بیان کرنے سے پہلے لمحے بھر رک کر سوچا اور پھر بولنے کی کوشش کی...
''آقا وہ قیدی... ابراہیم... وہ... عقوبت خانے کی سلاخوں کی طرف کمر کیے بیٹھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ دیوار کو گھور رہا ہے۔ میں نے... میں نے اسے کئی بار مخاطب کیا لیکن اس نے ایک جنبش تک نہیں کی... نہ مجھے مڑ کر دیکھا اور نہ ہی میرے کسی سوال کا جواب دینا ضروری سمجھا....''
محافظ کو لگا کہ اب وہ اپنے آقا کو خوش کرنے والی ساری معلومات جملہ با جملہ بہت اچھے انداز میں پہنچا رہا ہے... اس لیے اس نے ابراہیم کی کچھ اور برائی کرنا چاہی تاکہ آقا شماش اس پر مزید مہربان ہو سکے۔
''آقا... مجھے لگتا ہے ابراہیم ایک خودسر بد دماغ اور نافرمان جن ہے۔ اسی لیے وہ میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیتا... آپ حکم کریں تو میں اسے کڑی سزا دے کر آپ کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دوں گا''
شماش اس محافظ کی اس لکھن بازی کو سنتا رہا اور بے تاثر چہرے سے اسے گھورتا رہا... پھر سامنے رکھا ایک بھرا ہوا جام اٹھا کر اس نے محافظ کو دیکھتے ہوئے بڑے گہرے لہجے میں سوال کیا۔
''محافظ یہ سب تم مجھے خوش کرنے کے لیے کہہ رہے ہو تاکہ میں تمہیں انعام واکرام سے نواز دوں...''
محافظ کو لگا کہ آقا اس سے براہ راست بات کر کے اسے عزت دے رہا ہے اس لیے وہ شماش کے اور بھی قریب چلا گیا اور تقریباً اس کے سامنے پورا جھک کر اپنے دل کی بات کہنے لگا۔
''نہیں آقا'' وہ مسکرا رہا تھا اور اس کے لہجے میں چاپلوسی اور مصنوعی عاجزی کی بے انتہا باس اٹھ رہی تھی ''میں تو آپ کا خادم ہوں۔ جو میرے آقا کا دشمن ہے میرا دشمن ہے۔ اسے سزا پہنچا کر اور اپنے آقا کو راحت پہنچا کر مجھے وہ خوشی ملے گی جو لاکھوں کروڑوں کے انعام واکرام سے کہیں زیادہ ہے''
''اگر تو اپنی وفاداریوں میں مخلص ہے اور میری خیر اور میری خوشی ہی تیری زندگی کا مقصد ہے تو اس جلتی ہوئی آگ میں ہاتھ ڈال کر یہ دہکتا ہوا انگارہ اٹھا'' شماش شراب کے نشے میں دھت تو تھا ہی۔ محافظ کی چاپلوسی، سلمان کے ہاتھوں ہونے والی بار بار شکست اور کچھ دیر قبل ابراہیم کی موت کی تصوراتی موت نے شماش کو اچانک ہی بہت بے حس اور ظالم بنا دیا تھا۔ محافظ اپنے آقا کی یہ اچانک والی بے تکی فرمائش سن کر دم بخود کھڑا تھا۔ شماش نے اسے قہر ناکی سے دیکھا اور ایک بار پھر چیخ کر کہا۔
''مجھے پاگل سمجھ رہا ہے...... یہ میری فرمائش نہیں میرا حکم ہے۔ جلتی آگ میں ہاتھ ڈال اور یہ انگارہ اٹھا...''
محافظ کی ٹانگیں یکدم ہی کانپنے لگی تھیں۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ اس نے غلط وقت پر چاپلوسی دکھا کر اپنے آقا سے قریب ہونے کی کوشش کی ہے اور اب وہ کسی بڑی مصیبت میں پھنسنے والا ہے۔ شماش اس کی بزدلی سے اور بھی محظوظ

ہونا چاہتا تھا اس لیے ایک بار پھر گڑ گڑ اگیا۔
"تیری وفاداری اس امتحان کی محتاج ہے محافظ۔ میں تجھے دہکتا انگارہ منہ میں رکھنے کو نہیں کہوں گا... لیکن میں یہ جلتا انگارہ تیری ہتھیلی پر دیکھنا چاہتا ہوں... اور اگر تو نے یہ نہ کیا تو میں تجھے تیری دونوں ہتھیلیوں سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دوں گا اور افسوس کا مقام ہے یہ... کہ تیری ہتھیلیاں تیرے ہاتھوں کا حصہ ہیں۔" شماش اسے غصے سے گھورتا رہا اور محافظ کو لگا کہ موت اس کے سامنے ناچ رہی ہے۔ اگر اس نے اس وقت نشے میں دھت اس بدمست آقا کی بات نہیں مانی تو اسے سچ مچ اپنے دونوں ہاتھوں سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ اس لیے وہ... مریل قدموں سے روشن تھرکتی آگ کے پاس بڑھنے لگا... باقی تینوں محافظ دم سادھے کھڑے تھے اور منتظر تھے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔
چاپلوس محافظ نے آگ کے پاس پہنچ کر ایک بار پھر التجا کرتی ہوئی نظروں سے اپنے سرپھرے آقا کو دیکھا جو کسی بانس کی طرح سیدھا تنا بیٹھا تھا اور اس کے حکم میں ایک ذرا سی لچک بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ شماش نے اسے اشارے سے حکم دیا... انگارہ اٹھا... اور محافظ نے ڈرتے ہوئے آگ میں ہاتھ ڈال کر انگارہ اپنی ہتھیلی پر رکھ لیا...
اسی لمحے شماش نے شراب کا بھرا ہوا جام اس چاپلوس محافظ پر اس تیزی سے انڈیلا کہ آناً فاناً وہ محافظ زندہ جلنے لگا اور دیوانوں کی طرح چیختا ہوا پورے میدان میں دوڑنے لگا۔ اس کی چیخیں اتنی دردناک اور بلند تھیں کہ آسمان تک پہنچ رہی تھیں اور شماش بے فکری سے بیٹھ کر اسے جلتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ زندہ جلتا ہوا محافظ کچھ ہی دیر میں جل کر خاک ہو گیا اور شماش نے اس کی آخری ہچکی سے قبل باقی محافظوں کو حکم دیا۔
"آج کی رات بہت سوں پر بھاری پڑنے والی ہے۔ آج میں سلمان سے۔ اس کے باپ ابراہیم سے اور اس کی ماں ترلیجاں سے اپنا سارا حساب برابر کرنا چاہتا ہوں۔ جاؤ اور قید خانے میں بند اس ابراہیم بڈھے کو میرے سامنے لے آؤ۔ اس کی موت کا نظارہ شاید آج کی رات کا سب سے دلچسپ ترین منظر ہوگا۔ اور مجھے اس منظر کو دیکھنا ہے۔"
تینوں محافظ کچھ دیر قبل بولنے والے محافظ کی جلی ہوئی لاش کو دیکھ رہے تھے لہٰذا تینوں نے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا اور خاموشی سے گردنیں اور سر جھکا کر اثبات کیا اور ابراہیم کو قید خانے سے باہر لانے چلے گئے۔
☆......☆......☆
ابراہیم قید خانے میں سلاخوں کی طرف کمر کیے قید خانے کی دیوار کو مسلسل گھور رہا تھا اور اس کی زبان پر کوئی ورد تھا۔ جیسے وہ کسی ان دیکھے منظر کو دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو... جیسے وہ کسی تک اپنی بات پہنچانے کی کوشش کر رہا ہو... اور بہت دیر سے وہ اس رابطے کو بنانے کی کوشش کر رہا ہو... لیکن دوسری جانب سے مسلسل خاموشی ہونے کی وجہ سے وہ اب تک بھی رابطہ نہیں بنا سکا تھا۔ دراصل اس وقت ابراہیم ایک خاص ورد کے ذریعے سلمان سے ہمکلام ہونے کی کوشش کر رہا تھا وہ اپنے بیٹے کو اپنی تازہ ترین صورتحال بتانا چاہتا تھا۔ وہ سلمان کو بتانا چاہتا تھا کہ آج شماش اسے جان سے مارنے والا ہے اور موت سے قبل ابراہیم ایک بار اپنے بہادر جوان بیٹے کی صورت دیکھنا چاہتا تھا۔ اسی لیے ابراہیم اس وقت ایک خاص ورد کے ذریعے سلمان سے ہمکلام ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس خاص ورد کا کمال یہ تھا کہ جس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہوتی ہے وہ باقی دنیا سے اندھا اور بہرا ہو کر صرف اس شخص سے رابطے میں آ جاتا ہے جو اس سے کلام کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہوتا تھا کہ سامنے والا ایک خوف اور پریشانی میں مبتلا ہو جائے گا اور اس وقت خاص ورد کے ذریعے ان دونوں کا رابطہ نہیں ہو پائے گا جب تک سامنے والا اس ڈر کو شکست دے کر منہ سے آواز نہ نکالے اور سوال نہ کرے۔ جیسے ہی سامنے والا ہمت کر کے سوال کرے گا ویسے ہی دونوں کا رابطہ بالکل ایسے جڑ جائے گا جیسے اب سامنے والے نے فون اٹھا لیا ہے اور اب دونوں بڑے آرام سے بات کر سکتے ہیں۔ ابراہیم کے اس خاص ورد کے ذریعے سلمان کی طرف مسلسل فون کی گھنٹی بج رہی تھی لیکن سلمان کسی انجانے خوف اور وسوسوں میں مبتلا ہو کر یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ

یہ کوئی اور نہیں قید خانے میں بند اس کا اپنا باپ ہے اور اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ سلمان جیسے ہی بولتا باپ بیٹے میں بات چیت شروع ہو سکتی تھی لیکن سلمان کو یہ خوف دامن گیر تھا کہ اگر میں بول پڑا تو کہیں میں اپنے پیارے دوست کنعان اور اپنی محبت کرنے والی ماں کو کسی مشکل میں نہ ڈال دوں۔ کشمکش کی اسی گھڑی میں بے رحم اور سر پھرے شماش نے زندہ بچ جانے والے تین محافظوں کو یہ حکم دیا تھا کہ قید خانے میں بند ابراہیم کو اس کے سامنے لے آؤ۔ اور اب وہ تینوں محافظ بڑی تیزی سے قید خانے کی لمبی راہداریوں میں چلے آ رہے تھے۔ یعنی ابراہیم کے پاس اب بہت کم وقت رہ گیا تھا۔ اگر اسے کے بیٹے نے ہمت کر کے بولنے کی کوشش نہیں کی تو اس کے بعد وہ اپنے بیٹے سے کبھی سے بات نہیں کر سکے گا۔ ابراہیم کو اپنی موت سامنے دکھائی دے رہی تھی۔

☆......☆......☆

جنگل بیابان میں ساکت و جامد کھڑا سلمان خود کو عجیب حصار میں محسوس کر رہا تھا... کافی غور کرنے کے بعد اسے لگا کہ نہیں میں مرا نہیں ہوں زندہ ہوں... اس نے ایک بار پھر تمام ہمت جٹاتے ہوئے اس دبیز سناٹے میں منہ سے آواز نکالنی چاہی ''کون ہے...؟؟''

اور اسی لمحے عقوبت خانے میں پابندی بنے باپ اور جنگل میں تنہا کھڑے بیٹے کے درمیان رابطہ جڑ گیا۔ سلمان نے اپنے پیارے بابا کی کال ریسیو کر لی تھی لیکن وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ شماش کے محافظ کسی بھی لمحے اس جادوئی بنا تاروں والی فون کال کو ختم کرنے والے تھے۔ ابراہیم نے جیسے ہی سلمان کی آواز سنی وہ بے قابو ہو کر بول اٹھا...

''جان ابراہیم یہ میں ہوں تمہارا غمزدہ باپ.... کب سے دھونی جمائے ایک خاص ورد کے ذریعے میں تم سے کلام کرنے کی کوشش کر رہا تھا..... تم نے بولنے میں اتنی تاخیر کیوں کی جان پدر....''

سلمان نے باپ کی آواز سنی تو یک لخت ہی اس کی آواز جذبات سے مغلوب ہو گئی.....

''بابا... بابا یہ آپ ہیں... یہ کون سا انوکھا طریقہ ہے جس کے ذریعے آپ مجھ سے ہمکلام ہو رہے ہیں....''

ابراہیم جانتا تھا کہ شماش کے ہرکارے کسی بھی لمحے اس تک پہنچنے والے ہیں اس لیے اس نے تیزی سے بیٹے کو الوداعی پیغام دینا چاہا۔

''بابا کی جان یہ وقت ان وضاحتوں کا نہیں ہے۔ شماش کے ہرکارے بہت جلد مجھے تم سے، تمہاری ماں سے ہمیشہ کے لیے دور کرنے والے ہیں۔ میرے پیارے بیٹے... تم... تم اپنا بہت خیال رکھنا۔ ہمیشہ اپنی ماں کے ساتھ رہنا۔ تم اس کی نبض ہو، اس کی دھڑکن ہو۔ تمہاری ماں نے سب سے زیادہ تم سے پیار کیا ہے۔''

سلمان کو باپ کی آواز میں چھپی بے بسی صاف سنائی دے گئی اور وہ سمجھ گیا کہ اس کا باپ کسی شدید خطرے سے دوچار ہے۔

''بابا آپ مجھ سے ایسے کیوں بات کر رہے ہیں۔ میں کنعان اور اماں... ہم تینوں آپ کو شماش کی قید سے رہا کرنے کے لیے آ رہے ہیں... اور مجھے یقین ہے کہ ہم آپ سے اب زیادہ دور نہیں.....''

''نہیں نہیں میرے بچے'' ابراہیم کی آواز میں کسی مرتے ہوئے بیمار جیسی بے بسی اور بے چینی تھی۔ ''اب بہت دیر ہو چکی ہے سلمان۔ اپنی ماں کو لے کر تم یہاں سے کہیں دور چلے جاؤ۔ شماش کے عقوبت خانے کی طرف آنے کی غلطی ہرگز مت کرنا میرے بچے۔ میں اپنی زندگی بچانے کے لیے اپنے پیارے بیٹے اور اپنی زلیخاں کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔''

''نہیں بابا'' جنگل میں کھڑا سلمان ہوا میں زور سے چیخا لیکن صرف وہ ہی جانتا تھا کہ اس وقت وہ اپنے بابا سے ہمکلام ہے ''میں آپ کو اس ظالم کے پاس نہیں رہنے دوں گا۔ اس کے قید خانے کی دیواریں چاہے آسمان تک بلند ہوں میں وہاں آؤں گا اور آپ کو بچاؤں گا''

''نہیں نہیں نہیں'' ابراہیم کی جذبات بھری آواز سلمان کے کانوں میں گونجی... ''تم یہ نہیں کرو گے سلمان۔ یہ میرا حکم ہے۔ اور سنو... میں تم سے پیار کرتا ہوں... بہت پیار... آج تک میں شاید تم سے کھل کر اپنی محبت کا اظہار نہیں کر سکا لیکن... تمہاری تمام نادانیوں اور بے وقوفیوں کے باوجود میں یہ ہی کہوں گا کہ تم اس دنیا کے سب سے پیارے بیٹے ہو... اور مجھے

فخر ہے کہ تم میرے بیٹے ہو..... اور میں تمہارا باپ ہوں.....''
''بابا آپ مجھ سے ایسے کیوں بات کررہے ہیں جیسے یہ ہماری آخری بات چیت ہو.....''
سلمان کی آواز اب باقاعدہ رندھنے لگی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے باپ کو سولی کی طرف لے جایا جارہا ہے اور باپ اس سے اپنی آخری خواہشیں اور آخری نصیحتیں بیان کررہا ہے۔ یہ خیال ہی کہ آج کے بعد وہ اپنے بابا سے کبھی بات نہیں کرپائے گا اس کے لیے روح فرسا تھا۔
''سوال کرنے کا وقت نہیں ہے سلمان'' ابراہیم نے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کی ''اور سنو... اپنی ماں سے کہنا... میری پیاری زلیخاں کو بتانا کہ وہ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے اس کا شکریہ ادا کرنا۔ اسے کہنا اس کی محبت اس دنیا میں میرے لیے سب سے زیادہ قیمتی، سب سے زیادہ باعث رحمت تھی۔ اسے کہنا ابراہیم اس جہان کا سب سے خوش نصیب جن تھا جسے زلیخاں جیسی بیوی ملی۔ اس کی وفاداری اور اس کی کبھی نہ ختم ہونے والی محبت ملی.... اسے کہنا........''
پھر یکدم سناٹا چھا گیا۔ سلمان جس سیاہ بادل کی ٹکڑی کی وجہ سے اندھیرے میں کھڑا تھا وہ یکدم چھٹ گئی اور اداس چاند کی روشنی سارے میں پھیل گئی۔ سلمان طلسم کی اس دنیا سے نکل کر ہوش وحواس میں واپس آ گیا اور دیوانوں کی طرح بابا بابا.... بابا.... پکارنے لگا۔ اچانک سے رابطہ منقطع ہونے پر سلمان کی حالت غیر ہورہی تھی۔ وہ بار بار... بابا بابا کہتا ہوا ادھر سے ادھر دوڑ رہا تھا۔ اور پھر اچانک زلیخاں اور کنعان اس کے سامنے تھے۔ کنعان نے اسے دیکھا تو پریشانی سے کہا....
''تم کہاں غائب ہوگئے تھے سلمان... ہم کب سے تمہیں تلاش کررہے ہیں....''
''اماں... بابا نے مجھ سے بات کی ہے ابھی....'' سلمان نے پاگلوں کی طرح ماں کو بتایا ''وہ مجھ سے ایسے بات کر رہے تھے جیسے... آخری بار بات کررہے ہوں......'' وہ... وہ.....''
زلیخاں نے بے حد سنجیدگی اور بردباری سے بیٹے کی دیوانگی کو ملاحظہ کیا... اور پھر بہت جما جما کر بولی...
''یعنی تمہارے باپ نے تم سے آخری بار کلام کرنے کی کوشش کی سلمان... اس کا مطلب جانتے ہو....؟؟ اس کا مطلب ہے... وہ سردار... شماش... تمہارے باپ کو تختہ دار کی طرف لے جارہا ہے......''
کنعان نے یہ سنا تو اس کی بھی روح فنا ہوگئی۔
''اس کا مطلب ہے... ہمارے پاس اب بہت ہی کم وقت بچا ہے... ہمیں جلد سے جلد شماش کے عقوبت خانے تک پہنچنا ہوگا.....''
''میں اپنے بابا کو ایسی بے بسی کی موت نہیں مرنے دوں گا... چلو کنعان... چلیں اماں......''
سلمان نے کہا اور تیزی سے بے خوف ہو کر اس نے شماش کے قید خانے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اب اس کے قدموں میں ایسی دھمک اور ایسی پختگی تھی... کہ اگر اسے اکیلے ہزاروں جنوں سے بھی لڑنا پڑا تو وہ لڑ جائے گا.... کنعان اور زلیخاں دلیر اور نڈر سپاہیوں کی طرح اس کے دائیں بائیں چل رہے تھے۔ شماش کا عقوبت خانہ کچھ ہی دیر میں میدان جنگ بننے والا تھا۔

☆......☆......☆

سلمان کو بہرحال اس امر کا بھی اندازہ تو تھا کہ اسے اپنے بابا کو بچانے میں کیسی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ پکڑا جائے اور اسے بھی اس کے بابا کے ساتھ موت کے منہ میں دھکیل دیا جائے ایسا ہوا تو..... اس کی صنوبر کا کیا ہوگا.... اسے یاد آیا کہ وہ شرجیل کے جسم کو ایک گہرے اور نامعلوم غار کے اندر چھوڑ آیا ہے۔ اگلے دن جب یہ خبر صنوبر کے کانوں نے بھی سنی ہوگی کہ شرجیل بنا کسی کو کچھ بھی بتائے کہیں چلا گیا ہے.... بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ وہ اپنے ہی گھر سے ایسے نکلا ہے جیسے اسے کسی قید خانے سے فرار ہونا پڑا ہو۔ تب صنوبر کیا سوچتی ہوگی۔ اس کے دل پر کیا گزرتی ہوگی... اسے اپنے شرجیل سے کس قدر پیار ہے وہ یہ سب جان کر کہ شرجیل اسے یوں بنا کچھ بھی کہے چھوڑ کر چلا گیا ہے تو

اس کا ری ایکشن کیا ہوگا... کیا وہ اسے بے وفائی سمجھے گی یا کچھ اور... پتا نہیں وہ کیا کیا سوچتی ہوگی... ہائے قسمت کہ اسے اپنے باپ کو بچانے کے لیے اپنی صنوبر کو یہ دکھ پہنچانا پڑا۔ وہ کیا کرتا شرجیل کے ماں باپ جواب اس کے ماں باپ بن چکے تھے ان کی نظر میں تو وہ موت کے منہ سے واپس آیا تھا وہ اسے کہیں بھی جانے کی اجازت کیسے دے سکتے تھے اور اگر وہ صنوبر کو بتا کے آنا بھی چاہتا تھا تو یہ اور بھی مشکل بلکہ ناممکن ہوتا۔ وہ صنوبر کے سوالوں کا کیا جواب دیتا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے اور کہاں اور کیوں جا رہا ہے اس لیے اسے اپنی صنوبر سے کچھ بھی کہے بنا آنا پڑا...

یکا یک اس کے ذہن میں ایک خیال کوندا اور وہ اپنے سارے وجود سے لرز کر رہ گیا... خیال کیا تھا اس کے خرمن دل کو جلا کے بھسم کر دینے والی ایک کاری سوچ تھی۔ اس کے ذہن میں آیا کہ اگر صنوبر نے اس کی غیر موجودگی کو اس کا فرار سمجھ لیا اور فارس کو اس کی غیر حاضری کا جواز بنا کر خود کو صنوبر کا سب سے بہترین طلب گار ثابت کرنے کی کوشش کی جو وہ ضرور کرے گا تو کہیں صنوبر فارس سے شادی پر راضی تو نہیں ہو جائے گی....!!! اف یہ کیا ہو گیا۔ عموماً جو مرد اس طرح کی بے دفائی کرتے ہیں یا اس طرح اپنے عشق کو بیچ میں چھوڑ کے چلے جاتے ہیں ان کی محبوبائیں کسی اور کی ڈولی میں بیٹھ ہی جایا کرتی ہیں کہ ان کے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ جو نہیں ہوتا... اس خیال نے سلمان کے بڑھتے ہوئے قدم روک دیے اور وہ ایسا ہو گیا جیسے کسی کشمکش میں مبتلا ہو... اسے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کرنے جا رہا ہے اسے یاد تھا تو بس یہ کہ اس کی صنوبر کس حال میں ہوگی اس پر پتا نہیں کیسی قیامت گزر رہی ہوگی...

اے دل خاکستراب میں کیا کروں... کیسے اپنی صنوبر کو یقین دلاؤں کہ میں کتنا مجبور تھا میں نے کن حالات میں یہ قدم اٹھایا ہے... میں واپس جا کر سب ٹھیک کر دوں گا.....

''واپس جا کر'' یہ الفاظ اس کے کانوں میں ایک گونج بن کے رہ گئے... اگر میں واپس نہ جا سکا تو... اس ''تو'' سے آگے وہ کچھ اور نہیں سوچ سکا.....

''کیا بات ہے بیٹا اپنا ارادہ نہیں بدل رہے تو پھر تمہارے یہ قدم ایک جگہ رکے ہوئے کیوں ہیں۔ میں جانتی ہوں تم اتنے کمزور نہیں ہو کہ راستے میں کھڑے ہو کر باپ کو بچانے اور نہ بچانے کی کشمکش تمہارے پاؤں جکڑ لے۔ یہ ضرور کوئی اور ہی پریشانی ہے جو اس وقت تمہارے دل کو مٹھی میں بھینچ کر تمہارا راستا روک کر کھڑی ہو گئی ہے''

زلیخاں کی بات سن کر اس نے اندھیرے میں اپنی ماں کی انگارہ ہوتی ہوئی آنکھوں کو دیکھا... وہ اب بھی بول رہی تھی...

''تم نے کسی بھی وجہ سے اگر اپنا ارادہ بدل بھی لیا اور اپنے باپ کو بچانے کے بجائے تم لوٹنا چاہو تو میں تمہیں معاف کرتی ہوں کہ یہی دانش مندی ہے کہ تم طاقت ور سردار کا سامنا کرنے کے بجائے اپنی جان بچا کر یہاں سے چلے جاؤ... لیکن میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ اب میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گی... میں اپنے شوہر ابراہیم کو بچا تو نہیں سکتی مگر اس کے آخری وقت میں، آخری لمحوں میں اس کے سامنے تو ہو سکتی ہوں۔ شاید تم نہیں جانتے مجھے سامنے دیکھ کر اس کی جان اس کے جسم سے ایسے نکلے گی جیسے کسی پھول سے خوشبو نکلتی ہے...''

''نہیں ماں تم مجھے غلط مت سمجھو میں بابا کو اس طرح چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا... جا ہی نہیں سکتا مگر انسانوں کی دنیا میں میں نے جو بے وفائی کی ہے اس کے بارے میں سوچ کر میری روح کچھ بے کل ہو گئی تھی لیکن اب میں ٹھیک ہوں اور ہمیں کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے مقصد کی طرف بڑھنا چاہیے...''

''انسانوں کی دنیا میں بے وفائی..... یہ تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو بیٹا؟''

زلیخاں کے اس سوال کو سن کر سلمان کی نظر ایکا ایکی کنعان کی طرف اٹھ گئی جو نہایت انہماک سے دونوں ماں بیٹوں کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔

''کچھ نہیں ماں... زندہ رہا تو میں تمہیں ساری بات تفصیل سے بتاؤں گا ابھی ہمیں چلنا چاہیے'' یہ کہہ کر سلمان آگے بڑھ گیا۔ زلیخاں الجھ گئی مگر وہ سمجھدار تھی اور جانتی تھی کہ اس وقت کسی بھی الجھن کو ہوا دینے کا مطلب بیٹے کے

قوت بازو کو کمزور کرنے کے برابر ہوگا اس لیے اس نے بھی آگے کی طرف قدم بڑھا دیے......

☆......☆......☆

رات کو یہ بات شرجیل کے ماں باپ کو پتا چل چکی تھی کہ شرجیل گھر سے فرار ہو گیا ہے اور اب وہ نہایت پریشانی سے یہ سوچ رہے تھے کہ انھیں کیا کرنا چاہیے۔ شرجیل کی ماں بار بار ایک ہی بات دہرا رہی تھیں کہ پتا نہیں کہاں ہوگا میرا بیٹا۔ جبکہ شرجیل کا باپ سرفراز ملک یہ سوچ رہا تھا کہ آخر اس کے بیٹے نے ایسا کیا کیوں اسے یہاں کیا پریشانی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ صنوبر کے گھر فون کر چکے تھے یہ پوچھنے کے لیے شرجیل کہیں گھر سے بھاگ کر صنوبر کے پاس تو نہیں چلا گیا....

کمال احتیاط سے درشہوار نے اپنے طور پر صنوبر کے کمرے میں جا کے سارے کمرے کا جائزہ لے کر یہ یقین کر لیا تھا کہ شرجیل وہاں ہے کہ نہیں ہے۔ وہ یہ بات ابھی اپنی بیٹی کو بتانا نہیں چاہتی تھی کہ شرجیل اپنے گھر سے کس طرح اور کن حالات میں گیا ہے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ سنتے ہی صنوبر کی نیندیں حرام ہو جائیں گی اور ہو سکتا ہے شرجیل کچھ دیر بعد خود ہی واپس آ جائے۔ ویسے بھی وہ گھر سے بھاگ کر جا بھی کہاں سکتا ہے۔ ایسا ہی شرجیل کے ماں باپ بھی سوچ رہے تھے اور اب تک انھوں نے کسی کو کوئی اطلاع نہیں دی تھی انھیں یقین تھا کہ صبح ہونے سے پہلے پہلے ان کا بیٹا واپس گھر آ جائے گا۔

درشہوار وقفے وقفے سے شرجیل کے گھر فون کر کے اس کی واپسی کا پتا کر رہی تھیں... رات کافی ہو چکی تھی درشہوار اب تک جاگ رہی تھی لیکن اسے اب تک بھی یہ خوشخبری نہیں مل سکی تھی کہ شرجیل واپس آ گیا ہے خوف اور دکھ سے اس کا دل مسلسل لرز رہا تھا اور وہ بار بار دعا میں مانگ رہی تھی کہ صبح ہونے سے پہلے پہلے شرجیل واپس آ جائے.....

''اور وہ اگر نہ آیا تو.....!!!'' یہ سوال کسی ناگ کی طرح اس کے دماغ میں سرسرایا اور وہ بیٹھے بیٹھے ایسے کھڑی ہو گئی جیسے سچ مچ اس نے ناگ دیکھ لیا ہو۔ وسوسہ تھا کہ کوئی چبھتا ہوا بھالا تھا اس کے دل میں ایسے چبھنے لگا جیسے کوئی اس کے دل کا آپریشن کر رہا ہو۔ یا اللہ اگر ایسا ہوا تو صبح وہ اپنی بیٹی کو کیا جواب دے گی... ایسا ہی سوچتے سوچتے وہ بالکونی میں آ گئی دور دور تک سڑک ویران پڑی تھی اور کسی کوبرا سانپ کی طرح ایسے لیٹی ہوئی تھی جیسے وہ مر چکی ہو اس کی زندگی ختم ہو چکی ہو... لمحے بھر کو درشہوار نے اپنے جوانی کے دن یاد کیے۔ جب وہ بھی آصف کی محبت میں ایسی ہی دیوانی تھی کہ اگر آصف اس سے کہتا کہ رات کے اندھیرے میں وہ اپنے ماں باپ کی عزت کے جنازے پر پاؤں رکھ کر اس کے ساتھ چلی آئے تو وہ ایک لمحے سے زیادہ نہ سوچتی اور اس پر عمل کر گزرتی۔ مگر آصف وہ تو اتنا کٹھور تھا کہ اس نے تو کبھی دیسے سیدھے بھاؤ اسے ملنے کی دعوت نہیں دی۔ تو وہ اسے بھاگ چلنے کی دعوت تو مر کے بھی نہیں دے سکتا تھا۔

کتنے ظالم ہوتے ہیں یہ مرد... اور بدقسمتی سے اس کی بیٹی کو بھی ایسی ہی محبت نے پکڑ لیا تھا جس کا نام لے لے کر وہ جیتی تھی۔ اگر خدانخواستہ اسے شرجیل نہ ملا تو صنوبر...! اس کے آگے وہ سوچ نہیں سکی... اور بس وسوسوں میں گھری ہوئی دعاؤں کا ورد کرتی رہی اسے تو ٹھیک سے قرآن کی کوئی صورت بھی یاد نہیں آ رہی تھی جو وہ اس کا سہارا لیتی ماؤں کے خوف کس قدر مہیب اور ناقابل بیان ہوتے ہیں.....

☆......☆......☆

جیسے ہی وہ تینوں قید خانے کے سامنے پہنچے تو انھیں لگا پورا منظر موت کی سی خاموشی میں ڈوبا ہوا ہے۔ دیوہیکل سنگی عمارت چاروں طرف سے ڈھکی ہوئی تھی اور اس میں سانس لینے کا ایسا انتظام کیا گیا تھا جس کے بارے میں انسان تو انسان جنات بھی سوچ نہیں سکتے تھے۔ اس عمارت میں کسی کا باہر سے داخل ہونا تو ناممکن ہی تھا۔ اسی لیے باہر کوئی دربان اور پہرے دار موجود نہیں تھے اگر تھے بھی تو وہ سلمان اور زلیخاں اور کنعان کو دکھائی نہیں دیے...

''اب کیا کریں اس عمارت میں کیسے داخل ہوں۔ تمہارے بابا ضرور اسی میں قید ہیں۔ تم نے شاید بھی سنا ہو کہ اس عمارت سے کبھی کوئی جن فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکا اسے ایک ایسے آہنی حصار سے ہر طرف سے باندھا گیا ہے کہ جنات بھی اپنی ساری صلاحیتوں کے باوجود اس میں داخل نہیں ہو سکتے۔'' کنعان نے جو کچھ بھی کہا وہ ہی سب سلمان اور

زلیخاں سوچ رہے تھے۔ سلمان نے ایک ایسی ہی مایوسی سے کنعان کی طرف دیکھا لیکن بولا کچھ نہیں.....

''کیا سوچ رہے ہو اب کیا کریں بولو نا اس طرح سوچتے رہے تو رات ختم ہو جائے گی اور صبح کا اجالا تو جیسے ہمارے مقصد کی کھلی ناکامی کا اعلان ثابت ہوگا۔'' کنعان سے اسے اس طرح خاموش دیکھا تو کچھ وقفے کے بعد پھر پوچھا۔

''سوچ رہا ہوں جس خدا نے ہمیں یہاں تک آنے کی قوت اور ہمت عطا کی ہے کیا وہ ہماری اس کے آگے مدد نہیں کرنے گا؟'' سلمان کی آواز میں وہ جوش اور ولولہ مفقود تھا جو گھر سے چلتے وقت اس کے لہجے کی پہچان بنا ہوا تھا۔

''تو کیا تم خدا کی مدد کا انتظار کر رہے ہو؟'' کنعان کو جیسے اس کے رویے پر حیرت ہوئی۔

''تو پھر تم ہی بتا دو کیا کریں۔ تم ہی تو کہہ رہے ہو سردار نے عالم جنات کے ذریعے قید خانے کی عمارت کو ایسے نہ دکھنے والے حصار سے باندھا ہوا ہے جس سے کوئی معمولی جن گزرنے کی طاقت نہیں رکھتا کسی جن میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہے کہ وہ اس آہنی ان دیکھے حصار کو عبور کر سکتا ہو۔''

سلمان کی بات سن کر زلیخاں بھی پریشانی کے اتھاہ گہرائیوں میں چلی گئی وہ سوچ رہی تھی کہ کیا وہ اپنے شوہر کا آخری دیدار بھی نہیں کر سکے گی۔

''ہم آگے تو بڑھیں شاید کچھ ایسا ہو جو ہمیں عمارت کے اندر جانے میں ہماری مدد کرے۔ تم تو ویسے بھی ہمیشہ سے عام جنات سے مختلف ہو... ہو سکتا ہے تمہاری مخفی قوتیں جن کا تم نے کبھی استعمال بھی نہیں کیا ہے اس مشکل کو عبور کرنے میں مدد معاون ثابت ہوں۔ کوشش تو بہر حال کرنی ہی ہوگی۔''

کنعان کی بات سن کر سلمان ہی نہیں زلیخاں بھی چونکے بغیر نہیں رہ سکی۔ اور اس کے دل میں یہ خیال سرسرایا کہ کہیں کنعان کی بات ٹھیک ہی تو نہیں ہے۔ ویسے بھی جب تک وقت نہ پڑے کسی ذی نفس کو یہ پتا نہیں چل سکتا کہ اس میں کیا کیا شکتیاں موجود ہیں۔ بھلا انسان کو بھی یہ کب معلوم تھا کہ وہ خود سے کئی گنا بڑے اور تنو مند ہاتھی کو اس طرح سدھا کر اپنا غلام اور مطیع بنا سکتا ہے کوئی تو پہلا انسان رہا ہوگا جس نے یہ کوشش کی ہوگی۔

''کنعان ٹھیک کہتا ہے بیٹا مجھے پورا یقین ہے تم وہ کچھ کر سکتے ہو جو کوئی اور جن نہیں کر سکتا۔ تمہیں آگے بڑھنا چاہیے۔'' ماں کے حوصلہ دلانے پر سلمان کو محسوس ہونے لگا جیسے وہ واقعی کوئی مختلف جن ہے۔ اسے یاد آیا کہ وہ تو الگ ہے سب جنات سے الگ... اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کو کسی انسان لڑکی صنوبر سے محبت کیوں ہوتی۔ یہ بات اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ اوروں سے بہت الگ اور منفرد ہے۔

صنوبر کا خیال آتے ہی اس میں ایسی غیر معمولی شکتیوں نے کروٹ لینا شروع کر دیا کہ کچھ دیر تک وہ اپنے جسم کو کسی تپتی ہوئی بھٹی میں جلتے ہوئے محسوس کرنے لگا اسے تکلیف ہو رہی تھی وہ بھی اتنی شدید کہ وہ چلانا چاہتا تھا لیکن اس کی آواز حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئی تھی وہ طاقت کی جمع ہونے والی لہروں اور ان دیکھی شکتیوں کو اپنے اندر اٹھتے اور باہر سے گھستے محسوس کر رہا تھا اس کا چہرہ تکلیف سے ٹیڑھا ہوا جا رہا تھا۔ اس کا منہ بار بار کھل رہا تھا اور یہ منظر زلیخاں اور کنعان اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے لیکن ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ یکا یک سلمان کو ہوا کیا ہے۔ وہ ایسے کیوں ظاہر کر رہا ہے جیسے کوئی اسے اندر سے پکڑ کے بھینچ رہا ہو۔ زلیخاں سے رہا نہیں گیا اور وہ اپنے بیٹے سے مسلسل پوچھنے لگی۔

''تمہیں کیا ہو رہا ہے میرے بچے..... تم بولتے کیوں نہیں.....''

لیکن سلمان اسے تو جیسے کوئی باہر سے آنے والی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اس کی سماعتیں جیسے بند ہو چکی تھیں... اور وہ تکلیف سے دوہرا ہوا جا رہا تھا پھر ایسا ہوا کہ وہ نیچے کی طرف جھکتا چلا گیا اس کی ساری کوششیں بھی اسے سنبھال نہ سکیں وہ کھڑا نہیں رہ پا رہا تھا باوجود کوشش کے وہ خود کو زمین پر گرنے اور لوٹنے سے نہیں روک سکا۔ زلیخاں کی چیخیں نکلنے والی تھیں تب ہی پریشانی سے یہ سارا منظر دیکھنے والا کنعان آگے بڑھا اور اس نے زلیخاں کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے سلمان سے الگ کیا اور ایک طرف کو کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

''خالہ اسے ضرور غیبی امداد پہنچ رہی ہے آپ پریشان نہ ہوں۔ خدا اسے اس قابل بنا رہا ہے کہ یہ شیاطین کی لامحدود

طاقت کا مقابلہ کر سکے۔''

یہ بات سن کر زلیخاں نے اپنے دونوں کپکپاتے ہوئے ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پیوست کرتے ہوئے اللہ سے اپنے بیٹے کی صحت یابی اور تکلیف سے نجات کی دعا مانگی۔ وہ گڑگڑانے لگی اور پھر کچھ دیر تک جب زلیخاں اور کنعان کی امیدیں ٹوٹنے ہی والی تھیں تو سلمان ساکت ہو گیا۔ وہ شاید بے ہوش ہو چکا تھا۔ جلدی سے زلیخاں اس کے قریب پہنچی اور اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے اسے ہلکی اور نیچی آوازیں دینے لگی.....

''سلمان میرے بچے آنکھیں کھولو! سلمان.....''

اور کچھ دیر کی کوششوں اور زلیخاں کو جو علم اور آیتیں یاد تھیں انہیں پڑھ کر پھونکتے رہنے کے بعد سلمان نے دھیرے سے آنکھیں کھول دیں۔ مسرت کی ایک لہر زلیخاں کے وجود میں تیر گئی۔ کنعان کی آنکھوں سے بھی خوشی جھانکنے لگی۔

''تم لوگ پریشان لگ رہے ہو؟'' سلمان نے ان کے چہروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کنعان نے جلدی سے اس کے سینے سے لگ کر کہا۔

''تم نے تو ہماری جان ہی نکال دی تھی۔ پوچھو خالہ سے کیا ہوا تھا''

اور پھر دونوں نے سلمان کو ایک ایک بات ایک ایک لمحے کی روداد سنائی اور سلمان کو بھی سب کچھ یاد آ گیا۔ اسی لمحے ایک مختلف آواز کنعان کے منہ سے نکلی۔

''کیا ہوا بیٹا کنعان؟'' زلیخاں کو لگا اب ایسی ہی کوئی چیز کنعان کو بھی تکلیف اور اذیت میں گھسیٹ رہی ہے۔

''کچھ نہیں خالہ! میں تو خوشی سے چیخنا چاہتا تھا پھر یہ سوچ کر تھم گیا کہ کہیں سردار کے پہرے داروں تک میری آواز نہ پہنچ جائے'' کنعان نے کہا۔

''خوشی کیسی خوشی بیٹا؟'' زلیخاں کے اب بھی پوری بات سمجھ نہیں آئی تھی۔

''خالہ! ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔ ہم ابراہیم خالو کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔'' خوشی میں کنعان کے منہ سے الٹے سیدھے الفاظ نکل رہے تھے وہ کیا کہنا چاہتا تھا اور کیا کہہ رہا تھا۔

''تمہارے منہ میں گھی شکر ایسا ہی ہوگا اللہ نے چاہا تو۔ مگر تمہیں اچانک کیا ہوا ہے؟'' زلیخاں اور کنعان کی اس گفتگو سے سلمان جیسے محظوظ ہو رہا تھا۔

''مجھے وہی ہوا ہے جو آپ کو بھی ہوا ہے لیکن اس وقت پریشانی کی وجہ سے آپ بھی میری طرح اس تبدیلی کو محسوس نہیں کر سکی تھیں خالہ۔'' وہ رکا اور پھر زلیخاں کے قریب آ کر بولا۔ ''میں بتاتا ہوں۔ میری طرح آپ نے بھی سلمان کو گلے سے لگایا تھا یاد کریں اس وقت کچھ ایسا محسوس ہوا تھا جیسے سلمان کوئی ایسی طاقت ہو جس سے چھونے کے بعد ہمارے اپنے بدن میں ایک ایسی لہر دوڑنے لگی تھی جیسے کوئی پگھلا ہوا سیسہ ہمارے جسم میں تیر رہا ہو۔''

کنعان کی بات سن کر زلیخاں کو بھی یہ یاد آ گیا اور وہ بھی خوشی سے چیخنے والی ہو گئی کہ ایک دم اس نے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

''اس کا مطلب ہے میرے بیٹے کو خدا کی مدد پہنچ چکی ہے اور اب وہ نا قابل تسخیر ہو چکا ہے'' وہ خوشی سے اپنی آواز کو نیچا رکھنے کی کوشش میں ایسے بولی کہ اس کے منہ سے الفاظ آسانی سے نہیں نکل رہے تھے اور جوش محبت میں وہ سلمان سے چمٹ گئی..... اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ سلمان نے ماں کو تسلی دی اور اپنے بابا کو آزاد کرانے کی امید دلائی۔ اب تینوں میں پھر سے ایک نئے جذبے اور ولولے نے گھر کر لیا تھا۔ ان کی ٹوٹی ہوئی امیدیں پھر سے جڑ کر بحال ہو گئی تھیں اور سلمان کو اپنے آپ پر ایک عجیب سا تفاخر کا احساس ہو رہا تھا کہ اس کے پیدا کرنے والے نے اس کی مدد کرتے ہوئے اسے نئے حوصلے سے ہمکنار کر دیا تھا اب اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ اپنے بابا کو ضرور آزاد کرانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

تینوں..... دکھائی نہ دینے والے اس دروازے تک پہنچ گئے تھے جو اس قدر دیوہیکل اور طول طویل تھا کہ اس میں

سے سوہاتھیوں کو بیک وقت گزارا جا سکتا تھا۔ اس کی سختی اور مضبوطی کا تو بیان ہی کیا اور پر سے جنات کے بہترین عالموں نے اس پر ایک ایسا روحانی جادوئی حصار بھی کھینچ رکھا تھا کہ کوئی عام سی قوتوں والا جن یا کوئی عام سے بھی زیادہ شکتیوں کا مالک جن یہاں اس دروازے سے گزر سکتا تھا اور نہ ہی اسے توڑ سکتا تھا۔ ایسا صرف وہ ہی کر سکتا تھا جو ان جناتی عالموں سے زیادہ روحانی قوتوں کا مالک ہو اور یہ بات سارے قبیلے کو معلوم تھی کہ ایسا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ کوئی کوشش بھی کرے تو ان روحانی بزرگوں کے علم کو نہیں پہنچ سکتا تھا جو ہزاروں سال سے اسی کام اور ریاضت میں لگے ہوئے تھے۔ اسی لیے سردار مطمئن تھا۔ اور چین کی نیند سو رہا تھا۔ ویسے بھی رات بھر اس نے مشروب پی کر اور ایسے کاموں میں جاگ کر گزاری تھی کہ اب نیند نے اس کی آنکھوں کو مذید کھلے رہنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اسی وقت اچانک بزرگوں کے اس مٹھ سے ایک ایلچی دوڑا ہوا آیا اور سردار کو نیند سے جگا کر ایک ضروری پیغام دینے کی بابت بتایا تو سردار کے خادموں کو بڑی حیرت ہوئی کہ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا لیکن دستور تھا کہ روحانی مجلس سے جب اور جس وقت بھی کوئی آئے تو سردار کو لازمی اسی وقت بتایا جائے۔ اس لیے سردار کو جگایا گیا۔ روحانی مجلس کے ایلچی کا سن کر سردار کی نیند خود بخود رفو چکر ہوگئی اور وہ جلدی سے ملاقاتی کمرے میں پہنچا۔ نیند کا خمار اب بھی اس کی آنکھوں میں دیکھا جا سکتا تھا۔

''کیا بات ہے تم اس طرح اتنی رات گئے۔ کیوں آئے ہو؟'' سردار کی گرج دار آواز سنائی دی۔

''سردار عظیم روحانی باپ نے پیغام بھیجا ہے کہ سلمان اپنی ماں کے ساتھ قید خانے کے قریب پہنچ چکا ہے۔'' ایلچی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''تو کیا ہوا وہ قریب ہی پہنچا ہے اندر تو داخل نہیں ہو سکتا پھر اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے؟'' سردار کی آواز میں اب پہلے جیسے طنطنہ نہیں تھا بلکہ حیرت نے اسے مذید جاننے کی بے چینی میں مبتلا کر دیا تھا۔

''سردار شاہ شن عظیم روحانی بزرگ کا علم بتاتا ہے کہ سلمان اپنے ساتھیوں سمیت قید خانے میں داخل ہونے میں کامیاب ہو جائے گا اور روحانی حصار بھی اسے روک نہیں سکے گا'' ایلچی نے رک رک کر کہا جیسے اسے سردار کے جلال سے ڈر لگ رہا ہو۔

''کیا..... یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ ہوش میں تو ہو۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' سردار کی صورت دیکھنے والی تھی۔

''میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ رہا سردار مجھ سے عظیم بزرگ نے کہلوایا ہے میں تو وہ ہی عرض کر رہا ہوں۔ آپ فوراً قید خانے پہنچ کر اس کی بڑھتی ہوئی پیش رفت کو روکنے کا بندوبست کیجیے نہیں تو وہ اپنے باپ کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو جائے گا۔''

ایلچی کی بات سنتے ہی سردار نے نقارے پر زور کی چوٹ ماری جو اس کے محل میں ہی ایستادہ تھا۔ اس کا مطلب تھا جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اور چاروں طرف سے سردار کی فوج میں شامل جنات نے سردار کی طرف بجائے جانے والے نقارے کی آواز سن کر سردار کے محل کی طرف بڑھنا شروع کر دیا.....

☆......☆......☆

''آپ دونوں میرا ہاتھ کسی بھی قیمت پر نہیں چھوڑیں گے سمجھ گئے نا'' سلمان نے اپنی ماں اور کنعان کو سخت لہجے میں ہدایت دی۔ اور پھر وہ تینوں اس قید خانے میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے جس میں کبھی کوئی داخل ہونے کا سوچ بھی نہیں سکا تھا۔

''سلمان اور اس کی ماں کو حراست میں لے لیا جائے'' سردار کی آواز کے تعاقب میں سلمان نے دیکھا کہ اس کے خونخوار فوجیوں کا ایک بڑا دستہ ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

(ایک جن اور آدم کی محبت لیے، اسرار بھری عشق کی دنیا میں لے جانے والے سطر سطر زہر عشق لہو میں دوڑاتے، اس ناول کی اگلی کڑی ماہ اگست میں پڑھیے)

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا دقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات تو ان منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم ان خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)..... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)..... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)..... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II۔ خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

عزیزانِ من!

میری دعا ہے کہ اللہ ہم سب کو قبر کی سختی سے محفوظ رکھے، ہمارا خاتمہ ایمان پر ہو اور ہمیں اپنے رب کی رضا حاصل ہو۔

میں اپنے اُن بچوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے اس رمضان ہمیشہ کی طرح دوسروں کا خیال رکھا اور میری بات کا بھی مان رکھا۔ اللہ انہیں اس کا اجر ضرور دے گا۔ میں دورانِ اعتکاف اپنے تمام بچوں کے نام لے کر ان کے لیے اور ان کے اہل وعیال کے لیے خصوصی دعا کروں گا۔ میری نصیحت ہے کہ زندگی کتنی ہی کیوں نہ مصروف ہو، نماز ترک مت کرنا۔ نماز کی پابندی کرنے والا بہت سے مسائل سے دور رہتا ہے اور پھر اللہ کی خوشنودی بھی حاصل ہوتی ہے۔

درود شریف کا ورد کرنے سے زندگی میں برکت رہتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ نشیب و فراز زندگی کا حصہ ہیں مگر اللہ کی رسی کو تھامنے والے مشکل وقت سہولت سے گزار لیتے ہیں۔ لہٰذا نماز کی پابندی بہت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ تھوڑا تھوڑا قرآن روز پڑھو گھر میں برکت رہتی ہے۔ کسی کا دل مت دکھاؤ اور اللہ کی زمین پر سبزہ اُگاؤ۔ یہ عمل بہت ضروری ہے تمہاری آنے والی نسلوں کے لیے...... میری دعا ہے کہ اللہ ہم سب کو سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

□ نورین۔ فیصل آباد۔

○ باباجی! میں بہت دکھی عورت ہوں۔ ہر سال کی طرح پھر سے آپ سے دستِ سوال ہوں۔ بیوہ ہوں، تین بچے ہیں، شوہر کی ساری جائیداد پر پہلی بیوی نے قبضہ کر رکھا ہے۔ میں سارے خاندان میں دھکے کھاتی پھرتی ہوں۔ باباجی! خود سوچیے، تین بچوں کے ساتھ مجھے کون برداشت کرے گا؟ پھر سچ بھی ہے، مہنگائی نے سب کو تنگ کر دیا ہے۔ میرے رشتے کے بہنوئی ہیں، وہ خاموشی سے میری مدد کرتے ہیں مگر وہاں بھی لوگ عجیب و غریب باتیں کرتے ہیں۔ ڈرتی ہوں، کسی دن انہیں پتا چل گیا تو یہ آسرا بھی جائے گا۔ باباجی! آپ کے پڑھنے والے باہر ملکوں میں بھی رہتے ہیں، کیا اُن کے دل میں بھی اتنی جگہ نہیں کہ وہ ہم جیسوں کے لیے ہر ماہ کچھ نہ کچھ رقم بھجوا دیا کریں۔ کم از کم آپ سے مدد لیں گے تو لوگ انگلیاں تو نہیں اٹھائیں گے۔ کچھ عرصہ ایک خاتون میری مدد کرتی رہیں مگر جب ڈاک خانے والوں کے انداز مجھے بدلے بدلے لگے تو میں نے بھائی کو بھیجنا شروع کیا، بس وہ دن ہے اور آج کا دن، مجھے کچھ نہیں ملا۔ باباجی! آپ تو اللہ کے نیک بندے ہیں، لوگ آپ کی بات مانتے بھی ہیں، اُن سے کہیں کہ پاکستان میں بہت غربت ہے اور مجھ جیسی عورتیں تو اپنے بچوں کے ساتھ خودکشی بھی کر لیں گی تو بتائیں، اس کا ذمے دار کون ہوگا؟ اتنی بڑی دنیا میں باباجی! ہم چار لوگوں کے پاس کھانے کو نہیں، اور لوگ کتنے خوش رہتے ہیں۔ باباجی! مجھے معاف کر دیں، میں آج اتنا روئی ہوں۔ پچھلے سال تک فکر ہی نہیں تھی کہ بچے عید کیسے منائیں گے مگر اب دل پھٹ رہا ہے۔ باباجی! کچھ مت بتائیے، صرف صبر کی دعا بتائیے تاکہ ہم دنیا کی ضروریات سے آشنائی ہی چھوڑ دیں۔

☆ بیٹی نورین! تمہارا خط پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ تمہارے سوال کا جواب میرے پاس بھی نہیں۔ کچھ

اطلاعِ عام

قارئین، بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمائیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: II-C-88۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7۔ کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 021-35893121 - 35893122

عرصے پہلے تک میرے بچے بہت خیال کرتے تھے۔ رمضان اور پھر عید کے بعد یتیم بچیوں کی شادی کا مگر شاید اب وہ بھی زندگی میں بہت مشغول ہو گئے ہیں یہ بھول گئے ہیں ساتھ صرف اعمال جاتے ہیں۔ ایک تکلیف دہ صورتِ حال اور بھی ہے ڈاک خانے والے لفافے کھول کر خط پھاڑ دیتے تھے اس لیے میں سب کو یہی نصیحت کرتا ہوں کہ لفافے میں صرف خط اور جوابی لفافہ رکھیں۔

بیٹی! تم اللہ سے صبر مانگ رہی ہو وہ تمہیں صبر ضرور دے گا۔ سورۃ البقرۃ آیت 39 بکثرت پڑھا کرو اور بیٹی! ایک بات پھر کہوں گا کہ دنیا میں اچھے لوگ ہیں شاید انہی کے لیے دنیا چل رہی ہے۔ ہمت رکھو اور صبر رکھو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔

□ عندلیب۔ بھٹ شاہ

○ بابا جان! اللہ آپ کو صحت دے۔ میرا مسئلہ بہت سنگین ہے۔ میری ایک ہی بیٹی ہے جسے شادی کے تین مہینے بعد بغیر کسی وجہ کے طلاق دے دی گئی۔ بابا جی! اس پر ہزاروں الزامات لگائے گئے ایسی باتیں کہی گئیں کہ میں دہرا بھی نہیں سکتی۔ بہرحال بابا جی! ظالموں کی رسی بہت دراز ہے۔ میں اور میرے شوہر بیٹی کے دکھ میں پاگل ہو گئے ہیں اور پھر لوگوں کی طرح طرح کی باتیں۔ بابا جان! اب تو یقین ہو گیا ہے کہ بیٹی کے والدین ہونا جرم ہی ہے۔ مجھے کوئی ایسا تعویذ دیجیے جس کی بدولت میری بیٹی پھر سے آباد ہو جائے۔ یہ آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا۔

☆ بیٹی عندلیب! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ بیٹی! مجھے تمہاری تکلیف کا اندازہ ہے۔ بیٹی اللہ کی رحمت ہے۔ کبھی بھی کوئی شیطانی خیال دل میں مت لانا۔ بدنصیب تھے وہ لوگ جو تمہاری بیٹی کو بسا نہیں سکے۔ جہاں تک لوگوں کی بات ہے تو ان کی پرواہ مت کرو۔ اللہ تمہاری بچی کو بہت خوشیاں عطا فرمائے گا۔ صبر اور مستقل مزاجی سے کام لو۔ تعویذ کے لیے فوری طور پر سچی کہانیاں کے آفس فون کر کے معلومات حاصل کر لو۔

□ ایچ ہاشم۔ لودھراں

○ بابا سائیں! اللہ کے واسطے میری مدد کریں۔ میں بہت غریب ہوں بچوں کے کپڑے گھر میں سیتا ہوں اور بازار میں لے جا کر فروخت کرتا ہوں مگر بابا سائیں! اس مہنگائی کے دور میں گزارہ بہت مشکل ہے۔ میرے دو بچے ہیں۔ بیوی بہت لڑاکا ہے ہر وقت کے جھگڑے سے زندگی دوبھر ہو گئی ہے۔ بابا سائیں! میری مدد کریں میں بہت پریشان رہتا ہوں۔ زندگی سے عاجز ہوں بچوں کی طرف دیکھتا ہوں تو اور پریشان ہو جاتا ہوں مجھے رزق میں برکت کی دعا چاہیے اور بابا سائیں! میں آپ سے تعویذ بھی لینا چاہتا ہوں طریقہ بتا دیں۔ بڑا مشکور ہوں گا۔

☆ بیٹے ہاشم! اس بار خط پڑھ کر میں بہت دکھی ہوں۔ ہر خط میں صرف لوگ ضرورت کی اشیاء ہی کو ترس رہے ہیں۔ بیٹا! میں بوڑھا ضعیف آدمی صرف دعا ہی کر سکتا ہوں۔ تم اپنی بیوی سے نرمی سے بات کرو وہ بھی حالات ہی کی وجہ سے بدمزاجی کرتی ہے۔ رزق کا وعدہ اللہ کا ہے وہ اپنے ہر بندے کو رزق فراہم کرتا ہے۔ ہاں آج کل کے دور میں تقسیم میں بے انصافی ہو رہی ہے۔ بہرحال ایسا کرنے والوں کو اللہ ہدایت دے۔ وظیفہ دے رہا ہوں پابندی کے ساتھ کرو کرم ہوگا۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے آفس فون کر کے معلومات حاصل کر لو۔ نماز کی پابندی کرو۔

نماز فجر ظہر اور عشاء کے بعد 101-101 بار سورۃ الکوثر اول و آخر درود شریف 3-3 بار پھر سورۃ الکوثر دعا کرو۔ مدت 21 روز ہے۔ اللہ خیر کرے گا۔

□ زرینہ۔ کوہاٹ

☆ بیٹی زرینہ!...... تمہارا مسئلہ قابل اشاعت نہیں لہٰذا جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو میں جواب دے دوں گا۔

□ شمع۔ حیدر آباد

○ باباجان! ہم آپ کو تین بار خط لکھ چکے ہیں مگر آپ جواب نہیں دیتے۔ باباجان! ہم بہت پریشان ہیں ہماری بات ہمارے والد اور چچا نے اپنے دوست سے پیسے کے بدلے طے کر دی۔ وہ 60 سال کا ہے اور ہم 18 سال کے ہیں۔ باباجان! اللہ کا واسطہ ہم کو بچاؤ ہم ایسی زندگی سے موت کو ترجیح دینا پسند کرتے ہیں۔ آپ نے جواب نہیں دیا تو واقعی میں سندھو دریا میں کود کر جان دے دیں گے۔

☆ بیٹی شمع! اسلام نے بچیوں کو حق دیا ہے کہ وہ اپنی

رضا سے شادی کریں اور اپنی پسند اور ناپسند سے والدین
کو آگاہ کریں۔ تمہارے والدین زیادتی کر رہے ہیں مگر
تم اپنے ساتھ زیادتی مت کرو۔ خودکشی حرام ہے۔ اللہ
سے مدد مانگو۔ لوگ یقین نہیں رکھتے مگر معجزے ابھی بھی
ہوتے ہیں۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین پڑھو اور
جہاں جہاں لفظ مبین آئے، وہاں رُک کر 7 بار سورۃ
الفاتحہ پڑھو اور دُعا کرو۔ یہ وظیفہ نہایت پابندی کے ساتھ
ایک ماہ کرو۔

□ شان۔ اسلام آباد

○ باباجی! میرا تعلق ایک حساس ادارے سے ہے۔
نوکری کے سلسلے میں اکثر گھر سے دور رہتا ہوں۔ ایک
عجیب سے احساس نے گھیر رکھا ہے۔ مجھے لکھتے ہوئے دُکھ
ہو رہا ہے اور شرم بھی محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اپنی بیوی پر شک
ہے۔ اُن کا رویہ بھی عام عورتوں جیسا نہیں ہے۔ لکھنا
چاہوں تو شاید صفحے بھر جائیں۔ آپ سمجھ جائیں کہ میں شوہر
ہو کر سمجھتا ہوں کہ وہ میری موجودگی سے خوش نہیں رہتی۔ بس
میرے کم لکھے کو بہت جانیں اور میری مدد کریں۔

☆ بیٹے شان! شک کا علاج ممکن نہیں۔ تم اگر اپنی
بیوی سے کھل کر اس مسئلے پر بات کرلو تو بہتر ہے۔ ایسے
مسائل بہت بگڑتے چلے جاتے ہیں۔ بات کرلو اور اپنا
رویہ بھی درست کرلو۔

□ فاطمہ۔ U.K

○ باباجی! السلام علیکم! میری والدہ لاہور میں رہتی
ہیں میں انہیں اپنے پاس بلانا چاہتی ہوں۔ وہ آپ سے
رابطے میں رہتی ہیں۔ آپ نے انہیں تعویذ کا مشورہ دیا
ہے اور میرے لیے وہ اپنے ساتھ جلد اور روزن کی دوا
لے کر آئیں گی۔ باباجی! ہدیہ میں بذریعہ چیک ماہنامہ
"سچی کہانیاں" کے نام اِرسال کر رہی ہوں۔ آپ میرا یہ
کام جلد از جلد کردیں، مشکور رہوں گی۔

☆ بیٹی فاطمہ..... !تمہارا چیک مجھے مل گیا ہے۔ دوا
اور تعویذ تیار کر کے لاہور کے پتے پر والدہ کو اِرسال
کردوں گا۔ ملنے پر مطلع کرنا۔

□ راحیلہ۔ قلندر آباد

○ باباجی! آپ سے اولاد کے لیے تعویذ لیا تھا۔
طبیعت ٹھیک نہ تھی، اس لیے بتا نہ سکی۔ اب 5 ماہ کا حمل
ہے۔ بتائیے تعویذ کا کیا کروں؟ باباجی! میری بڑی بہن
اور خالہ زاد بہن کا بھی یہی مسئلہ ہے۔ اُن کے لیے بھی کیا
تعویذ تیار کردیں گے؟ اللہ آپ کو اچھا رکھے۔

☆ بیٹی راحیلہ! اللہ کا شکر اَدا کرو۔ تعویذ تلف کردو
اور حفاظت کا تعویذ منگوالو۔ تمہاری بہنوں کے لیے بھی
تعویذ تیار کردوں گا۔

□ درشہوار۔ کینیڈا

○ باباجی! اِس سے پہلے بھی آپ سے رابطہ کیا
تھا، اب پھر آپ کو انشورڈ لیٹر بھیجا مگر جواب ندارد......
میرا مسئلہ بہت سنگین ہے، بتائیے کیا کروں؟

☆ بیٹی شہوار...... !تمہارا یہ پہلا خط ہے جو مجھے ملا
اور یہ دو سطریں بھی اِس لیے پڑھ پایا کہ یہ تم نے لفافے
کے اندر لکھی تھیں۔ تم نے یقیناً ہدیہ لفافے میں رکھا جو یہاں
نکال لیا گیا اور تمہارا خط پھاڑ دیا گیا۔ بتاؤ، اب میں مسئلہ
جانے بغیر کیا جواب دوں؟ جانتا ہوں تم لوگ اتنی دور سے
خط لکھتے ہو یقیناً جواب نہ ملنے پر کوفت ہوتی ہوگی۔

□ ناز گل۔ لندن

☆ بیٹی ناز...... !بہت عرصے سے تمہارا کوئی خط
مجھے نہیں ملا، اپنی خیریت سے آگاہ کرو۔ اعتکاف میں
تمہارے لیے خصوصی دُعا کا بھی اہتمام کروں گا۔ یقیناً
اب اچھی خبر تمہاری منتظر ہوگی۔

□ فیصل۔ قصور

○ باباجی! پچھلے ماہ کراچی آنا ہوا تھا مگر آپ سے
ملاقات نہ ہوسکی۔ روزگار کے سلسلے میں آپ سے وظیفہ لیا
تھا۔ اللہ کا شکر ہے، اب روزگار سے ہوں۔ پہلی تنخواہ پاتے
ہی رب کے بعد آپ کا شکریہ ادا کیا۔ اللہ آپ کو اِسی طرح
ضرورت مندوں کی مدد کرنے کی توفیق دیتا رہے۔

☆ بیٹے فیصل...... !اللہ کا شکر اَدا کرتے رہو اور اس
کے بندوں کا بہت خیال رکھنا۔ اللہ اپنے ان بندوں سے
بہت محبت کرتا ہے جو اس کے بندوں سے محبت کرتے
ہیں۔ نماز کی پابندی رکھنا اور صدقہ خیرات بہت دینا۔

□ حلیمہ۔ میانوالی

○ باباجی! اللہ کے بعد آپ کی بڑی شکر گزار ہوں
کہ دُعاؤں کی برکت سے میری شادی ہوگئی مگر باباجی!
مسئلہ یہ ہے کہ اب میرے چہرے پہ بہت دانے نکل

رہے ہیں۔ پہلے میری جلد بہت صاف تھی۔ آپ مجھے دوا بھجوا دیں، بڑی مہربانی ہوگی۔ بابا جی! اِس کے علاوہ میری جیٹھانی کی بھی میرے ساتھ ہی شادی ہوئی تھی مگر اُس کا وزن بہت بڑھ گیا ہے۔ آپ وزن کم کرنے کی بھی دوا دے دیں، بڑا احسان ہوگا۔

☆ بیٹی حلیمہ......! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ دوا میں تیار کر دوں گا۔ مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو اور اپنی عمریں اور وزن بھی لکھو۔

□ آیت۔ راولپنڈی

○ قابلِ احترام بابا جی! السلامُ علیکم! بابا جی! میں اس سے پہلے بھی دیگر مسائل کے سلسلے میں آپ سے رابطے میں رہ چکی ہوں مگر بابا جی! اِس بار میں بہت مشکل اور دکھ سے بھرے ہوئے دل سے آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں۔ بابا جی! میری بہن جس کا نام نور تھا، اُس کا آٹھ شعبان کو انتقال ہوگیا ہے۔ وہ ماشاء اللہ سے قرآن پاک پڑھی ہوئی تھی اور دین سے بھی اُس کو بہت محبت تھی اور نعتوں کا بھی بہت شوق تھا۔ بابا جی! میں جس مسئلے کی وجہ سے آپ کو خط لکھ رہی ہوں، وہ میرے لیے بہت مشکل اور ذہنی پریشانی کا باعث بن ہوا ہے۔ بات یہ ہے کہ رجب کے مہینے میں، میں نے تقریباً صبح کے وقت ایک بہت ہی عجیب خواب دیکھا، تاریخ مجھے یاد نہیں، میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ ہیں، وہ ہماری بلڈنگ کے سامنے موجود ہیں اور لوگ بھی اُن کے گرد جمع ہیں۔ میں اور میری امی کہتے ہیں کہ آؤ چلو دیکھتے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے؟ تو ہم سامنے جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ بزرگ کے پاس ایک لڑکا لیٹا ہوا ہے اور وہ بزرگ اُس کی کھال اتار رہے ہیں مگر اس لڑکے کو بالکل بھی تکلیف نہیں ہو رہی ہے اور پھر وہ لڑکا دیکھتے دیکھتے ہی قرآن شریف بن گیا اور قرآن شریف ایسا چمک رہا تھا جیسے چاند تو یہ دیکھ کر میں اور میری امی کہتی ہیں کہ...... ”یہ کیسے ہوا؟“ تو وہ بزرگ پیچھے مڑ کر مسکراتے ہیں اور میری امی سے کہتے ہیں کہ...... ”تو اپنی بیٹی کی خوشیاں نہیں دیکھ سکے گی اور دینے بھی عید تو آنے ہی والے ہیں۔“ اُس کے بعد فوراً میری آنکھ کھل گئی۔ بابا جی! اُس دن کے بعد سے مجھے بہت ڈر لگنے لگا تھا مگر پھر میں نے سوچا شاید یہ میرا وہم ہے مگر بابا جی! یہ میرا خواب بالکل سچا تھا۔ آٹھ شعبان کی صبح کو میری بہن اٹھی۔ وہ بالکل ٹھیک تھی، منہ ہاتھ دھویا، بال بنائے، ناشتا کیا، بس دس بجے اچانک اُس کی طبیعت خراب ہوگئی۔ بابا جی! اُس کو بہت گھبراہٹ ہو رہی تھی اور یہ ایسی گھبراہٹ تھی کہ میں شاید بھی بیان نہ کر سکوں۔ ہم فوراً اُسے اسپتال لے کر گئے، وہیں پر اُس کا انتقال ہوگیا۔ بابا جی! اِس سے پہلے بھی میرے والد کو خواب میں درختوں سے پتے گرتے نظر آتے رہے ہیں۔ مجھے بھی بہن کے انتقال سے پہلے ایسا ہی سب کچھ خواب میں نظر آیا تھا۔ کیا یہ خواب اسی حادثے سے تعلق رکھتے ہیں یا پھر یہ کیا معاملہ ہے؟ بابا جی! آپ مجھے یہ ضرور بتائیں کہ اس خواب کا اس حادثے سے کیا تعلق ہے؟ ورنہ بابا جی! مجھے لگتا ہے کہ سوچ سوچ کر میں مر جاؤں گی یا پاگل ہو جاؤں گی۔ بابا جی! میرا خدا کے بعد آپ کے سوا کوئی آسرا بھی نہیں ہے جسے میں اپنے دل کا حال بتاؤں۔ بابا جی! خدا گواہ ہے، بہن کے انتقال کے بعد لگتا کہ جیسے زندگی ختم ہوگئی ہے، صرف سانس چل رہی ہے۔ بابا جی! مجھے بالکل بھی صبر نہیں آتا ہے۔ امی ایصالِ ثواب کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے ہیں کہ صبر کی مگر صبر نہیں آتا، صبر آجائے بھی کوئی دُعا بتائیں اور بابا جی! آپ اجتماعی دُعا میں میری بہن نور جس کا انتقال ہوا ہے، اُس کے لیے اور ہمارے لیے ضرور دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اُس کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ہمیں صبر عطا ہو۔ میرے اِس خط کا جواب جولائی کے شمارے میں ضرور شائع کیجیے گا۔ میں ایک ایک دن گن کر گزاروں گی۔ بابا جی! خط لکھنے میں کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معافی کی طلب گار ہوں۔

☆ بیٹی آیت! جو دنیا میں آیا ہے، اس کو واپس بھی جانا ہے۔ بعض اوقات خوابوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ بندے کو آنے والے حالات سے آگاہ کرتے ہیں۔ تم پریشان ہونے کی بجائے اپنی بہن کے لیے قرآن مجید پڑھ کر بخشا کرو۔ یقین کرو، بہت سکون ملے گا۔

□ امتل۔ کراچی

○ محترم بابا جی! السلامُ علیکم! بابا جی! آپ نے

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

”مسئلہ یہ ہے“ کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب..... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرایئے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

ہزاروں لوگوں کے مسائل حل کیے ہیں۔ بابا جی! میرا مسئلہ شاید آپ کو اتنا بڑا نہ لگے مگر بابا جی! میرے لیے یہ بہت بڑا مسئلہ ہے اس میں میرے ہزاروں آنسو شامل ہیں۔ برائے کرم مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتا دیں جس سے میری والدہ کا مسئلہ حل ہو جائے۔ بابا جی! ہم نے اپنی والدہ کا بہت علاج کروایا مگر میری والدہ کو آج بھی معدے اور ہائی بلڈ پریشر کا مسئلہ ہے۔ میری والدہ کے معدے میں زخم ہیں جو کبھی کبھی شدید درد کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ والدہ کبھی کبھی گھریلو مسائل کی وجہ سے اتنی ٹینشن لے لیتی ہیں کہ اُن کے دماغ کی نسیں پھٹنے لگتی ہیں۔ پلیز' بابا جی! مجھے میری والدہ کے اس مرض کا علاج بتا دیں۔

☆ بیٹی انجمن! شفا دینے والی ذات اللہ کی ہے۔ اپنی والدہ سے کہو غذا میں احتیاط کریں۔ دوپہر میں دہی میں اسپغول ملا کر ضرور کھائیں۔ پریشان ہونے سے مسائل ختم نہیں ہوتے بلکہ اور بڑھتے ہیں۔ اللہ پر اگر کامل یقین ہو تو انسان مطمئن رہتا ہے کہ دنیا میں بھیجا ہی گیا آزمائش کے لیے ہے لہٰذا خوشی پر خوش اور دُکھ پر صبر کرنے والے ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ اپنی والدہ سے کہو نماز کی پابندی کریں۔ بکثرت یاشافعی کا وِرد کریں اور ہر وقت باوضو رہیں۔ کرم ہوگا۔

□ عفت علی۔ کھاریاں

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! میری شادی کو سات سال ہو چکے ہیں' چھے سال کا ایک بیٹا ہے مگر اس کے بعد اولاد نہ ہو سکی۔ متواتر دو بار Miscarriages جو کہ دوسرے اور تیسرے مہینوں میں ہوئے۔ اس کے بعد سات مہینے میں بیٹے کی پیدائش مگر دو دن کے بعد ہی اُس کا انتقال ہو گیا۔ اُس کے بعد pregnancy کے تیسرے مہینے میں پھر Miscarriage. بہترین ڈاکٹروں کو دکھایا مگر سارے ٹیسٹ clear ہیں۔ ڈاکٹرز کوئی بھی وجہ بتانے سے قاصر ہیں۔ میں اپنے حالات سے بہت پریشان ہوں' سوچتی ہوں کہ کہیں کسی نے کچھ کر تو نہیں دیا ہے اسی لیے آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ ایک اور بات یہ کہ میرے سسرال میں بچے بہت کم ہیں' بہت چاہنے کے باوجود بھی نند اور جیٹھانی کو ایک ایک اور بڑی نند کو دو بچے ہیں۔ اب تو سب بڑے ہو چکے ہیں۔ بابا جی! آپ میری مدد فرمائیں۔ اگر کوئی اثر ہے تو کیا آپ کوئی اشارہ دے سکتے ہیں؟ اپنے علم کی رہنمائی میں کیا مجھے بتا سکتے ہیں کہ میرے یہاں اور اولاد ہو گی یا نہیں؟ مہربانی فرما کر مجھے دُعائیں اور وظائف بھیجیں۔ میں اپنا اور والدہ کا نام تو بھیج رہی ہوں اور ساتھ ہی شوہر اور اُن کی والدہ کا نام بھی بھیج رہی ہوں۔ مہربانی فرما کر جلد از جلد میری مدد فرمائیں۔ میں بہت شکر گزار رہوں گی۔

☆ بیٹی عفت! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ مناسب ہوگا' مجھ سے اس سلسلے میں تعویذ منگوالو۔

□ شازیہ۔ بونیر

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! پچھلے دس سال سے ایک ہی طرح کے عذاب میں مبتلا ہوں' سمجھ نہیں آتا' بندش ہے یا پھر خدا کی طرف سے دیر ہے؟ اس سلسلے میں پلیز' میری رہنمائی کیجیے۔ میرے رشتے کے لیے لوگ آتے ہیں اور واپس آنا بھول جاتے ہیں۔ کہیں بات نہیں بنتی۔ میں کب تک خود کو سجا سنوار کر لوگوں کے آگے پیش کروں؟ میں اب تھک گئی ہوں۔ اپنے لیے اللہ سے بہت رو رو کر دُعائیں کرتی ہوں۔ غم اس بات کا ہے کہ مجھ سے دو چھوٹی بہنوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ میری عمر بڑھتی جا رہی ہے۔ اللہ کے لیے کوئی وظیفہ یا تعویذ ارسال کر دیجیے۔ زندگی بھر آپ کی مشکور رہوں گی۔ اگر تعویذ دیں گے تو اس کے حصول کے لیے طریقہ ارسال کیجیے گا۔

☆ بیٹی شازیہ! تعویذ کے حصول کے لیے مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو۔

□ رُوبا۔ کراچی

☆ بیٹی رُوبا! اللہ تمہارے بچوں کو کامیابی عطا فرمائے۔ دیگر مسائل کے لیے میں خصوصی دُعا کروں گا۔ تم خود بھی ربُ العزت کو راضی کرو۔

□ سلمٰی۔ جھنگ

○ بابا جی! اللہ کے بعد آپ سے بڑی امید ہے کہ آپ میرا مسئلہ ضرور حل کریں گے۔ میری شادی کو 14 سال ہو گئے ہیں۔ اولاد نہیں ہے۔ اس وجہ سے اب تو طلاق تک نوبت آ جاتی ہے۔ میری مدد کریں۔

☆بیٹی سلمیٰ! تم نمازِ فجر کے بعد 700 بار یا مصوّرُ کا ورد کرو اور مجھے تفصیل سے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو۔

□ فریحہ۔ میرپور خاص

☆بیٹی فریحہ! تمہارے چڑچڑے ہونے کا سبب یہ ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسہ نہیں ہے۔ ہم وہیں روتے دھوتے ہیں جہاں ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ہمارے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے حالانکہ ہر کام اپنے طے کردہ وقت پر ہی ہوتا ہے۔ تمہیں جس معاملے میں دیر لگ رہی ہے ہوسکتا ہے وہی بہتر وقت ہو لہٰذا بیٹی! نماز پابندی سے ادا کیا کرو۔ کوشش کرو کہ ہر وقت باوضو رہو اور بکثرت یَارَبُّ کا ورد کیا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ ربیعہ۔ صادق آباد

☆بیٹی ربیعہ! میں تمہیں دونوں مسائل کے لیے ایک ہی حل دے رہا ہوں۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 33-33 بار سورۂ اخلاص پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ نورین۔ لاہور

☆بیٹی نورین! انشاء اللہ تمہارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ تم مجھے تفصیل سے خط لکھو ہمراہ جوابی لفافہ تاکہ میں تمہیں تفصیل سے جواب دے سکوں۔

رفعت۔ سجاول

☆بیٹی رفعت! تمہارا خط اتنا پیچیدہ ہوتا ہے کہ مجھے پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ زندگی میں جہاں لوگ زیادہ ہوتے ہیں وہاں مسائل بھی ہوتے ہیں۔ تم نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۂ رحمٰن ضرور پڑھو۔ کرم ہوگا۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ زاہدہ۔ بدین

☆بیٹی زاہدہ! جو حالات ہیں اس میں مجھ سے تعویذ منگوالو۔ اس کے لیے مجھے تفصیل سے خط لکھو ہمراہ جوابی لفافہ۔

□ رخسانہ۔ ہارون آباد

☆بیٹی رخسانہ! تمہارے لیے کامرس بہت مشکل ہوجائے گی۔ آرٹس کے سبجیکٹ دیکھو۔ دوسرا مسئلہ تو اٹل ہے تمہارے ہاں عمل عملیات کا بہت چکر ہے۔ سب گھر والے سورۃ الناس اور سورۃ کوثر بہت پڑھا کریں۔ کرم ہوگا۔

□ نزہت۔ جیکب آباد

☆بیٹی نزہت! ہدیہ بذریعہ منی آرڈر ارسال کرو۔ میں تعویذ تیار کردوں گا۔ تمہارے دونوں مسئلے ایک تعویذ سے ہی حل ہو جائیں گے۔

□ عنبرین۔ ٹھٹھہ

☆بیٹی عنبرین! اگر خط موصول ہو گیا ہو تو مجھے مطلع کرو ورنہ دوبارہ مسئلہ لکھ کر بھیج دو۔

□ مسرت۔ جہلم

☆بیٹی مسرت! تمہارا خط اس قدر بے ربط ہوتا ہے کہ مجھے پڑھنے اور سمجھنے میں بہت دشواری ہوتی ہے۔ خط میں صاف اور واضح صرف دو مسئلے لکھو تاکہ جواب دینے میں سہولت ہو۔ آپسی رنجش کی پوری کہانی پڑھنے اور سمجھنے سے میں قاصر ہوتا ہوں۔ تم خط میں خاندان کے ہر فرد کے مسئلہ لکھ دیتی ہو مگر آخر میں حل کسی اور مسئلے کا مانگتی ہو۔ آئندہ جو حاجت ہو صرف وہ لکھو۔ دنیا میں ہر شخص لوگوں کے درمیان ہی رہتا ہے بعض اوقات ناپسندیدہ حالات کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ صرف جادو یا بندش عملیات ہیں۔ زندگی بذاتِ خود بہت مشکل ہے اور ان مشکلات سے نمٹنے کا حل قرآن مجید کی شکل میں موجود ہے لہٰذا وہم اور وسوسے مت پالو یہ شیطانی عمل ہے۔

□ افشاں۔ کراچی

☆بیٹی افشاں! تمہیں اپنی بیماری کا علاج کروانا پڑے گا۔ یہ مسئلہ ایسے حل نہیں ہوگا بلکہ اتنا شدید ہوجائے گا کہ پھر شاید لاعلاج ہو جائے۔ دوا اور دُعا دونوں ضروری ہیں۔ دوا شروع کرو پھر مجھے حالات سے آگاہ کرو۔

□ فوزیہ۔ ملتان

☆بیٹی فوزیہ! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 33-33 بار سورۂ کوثر پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ انشاء اللہ ضرور حاجت قبول ہوگی۔

□ انعم شاہ۔ کراچی

☆بیٹی انعم! اللہ تمہیں اسی طرح خلقِ خدا کی مدد

کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ بیٹی سیما سے کہو مجھے تفصیل سے خط لکھے۔

□ حنا۔ رحیم یار خان

☆ بیٹی حنا! تم بھی جانتی ہو کہ لڑکے والوں کا رویہ درست نہیں۔ کیا ایسے بنا دیکھے بنا جانے رشتے ہوتے ہیں؟ اور یونیورسٹی کا ماحول اگر خراب ہے تو وہ وہاں کیا کر رہا تھا اور کیا وہ تمہاری بیٹی کو ساری زندگی طعنے نہیں دے گا کہ تم خراب ماحول میں پڑھ رہی تھیں؟ بیٹی! صاف ظاہر ہے کہ وہ انتہائی شکی اور تنگ نظر شخص ہے جو تعلیم کے خلاف ہے' وہ زندگی کی کوئی سہولت نہیں دے گا۔ دراصل اس کو سچائی کھلنے کا خوف ہے اس لیے بچی کی یونیورسٹی ختم کروا دی تاکہ کسی اور سے اس کے بارے میں معلومات حاصل نہ ہوں۔ اب بھی وقت ہے' سنبھل جاؤ اور بچی کی پڑھائی شروع کروا دو۔

□ نصرت خدا۔ کراچی

☆ بیٹی نصرت! خوش رہو۔ تمہارا نام بالکل درست ہے۔ اتنی ناامیدی اچھی نہیں۔ جب مل جل کر رہا جاتا ہے تو ایک دوسرے کے کام بھی کرنے پڑتے ہیں۔ تم یقیناً گھر میں چھوٹی ہو' سوچ مثبت رکھو بیٹی! خوش رہو گی۔ نماز کی پابندی رکھو۔

□ خوشی۔ لاہور

☆ بیٹی خوشی! کبھی بھی بلا اجازت وظیفہ مت کرنا۔ ضروری نہیں کہ جس وظیفے سے کسی اور کو فائدہ ہو' تمہیں بھی ہو۔ نماز کی پابندی رکھو اور کثرت سے درود شریف کا ورد کرتی رہا کرو۔ نمازِ فجر اور ظہر کے بعد 111-111 مرتبہ پڑھو۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ

اول و آخر سورۃ فاتحہ 7-7 بار پھر حاجت بیان کرو۔ وظیفے کی مدت 3 ماہ ہے۔

□ ثناء۔ گجرات

☆ بیٹی ثناء! تمہارا شمار سرو قد لڑکیوں میں ہوتا ہے پھر مزید قد لمبا کرنا میری سمجھ سے باہر ہے بلکہ میں کہوں گا کہ تم ناشکرا پن کر رہی ہو۔ جہاں تک تمہاری ساس کا تعلق ہے تو ان کا دل تم سے صاف نہیں ہے اور اس کے لیے تمہیں بہت قربانیاں دینا پڑیں گی۔ جہاں تک تمہارے منگیتر کا تعلق ہے تو اس سے کہو کہ کثرت سے یَا حَافِظُ کا ورد کرے اور نمازِ عشاء کے بعد سورۃ الحدید 21 بار پڑھ کر حاجت بیان کرے۔ وظیفہ نماز کی پابندی کے ساتھ 2 ماہ کرے۔ انشاء اللہ کرم ہوگا۔

□ صوفیہ۔ سکھر

☆ بیٹی صوفیہ! اللہ تم پر رحم فرمائے۔ نمازِ عشاء کے بعد سورۃ نساء پڑھو ترجمے کے ساتھ اور اللہ سے دعا کرو کہ وہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ مدت 41 دن ہے۔

□ صدف۔ وزیر آباد

☆ بیٹی صدف! بے شک' پسند ناپسند کا اختیار ہمارے مذہب نے لڑکی کو دیا ہے مگر بیٹی! والدین' اولاد کے بھلے کی لیے ہی فیصلے کرتے ہیں۔ تم اللہ سے دعا کیا کرو کہ وہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ بعض اوقات جو چیز بظاہر اچھی نظر آ رہی ہوتی ہے' وہ حقیقت میں اچھی نہیں ہوتی نہ۔ ایسے میں معاملات اللہ کے سپرد کر دینے چاہئیں۔ تم نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد ایک ہزار مرتبہ توبہ استغفار پڑھو۔ ہر وقت باوضو اور والدین کی فرمانبردار رہو۔ فکر مند ہونے سے آج تک کچھ نہیں ہوا ہے۔ اپنی توجہ اپنی تعلیم اور گھر پر دو۔ اللہ کرم کرے گا۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔

□ نغمہ۔ جاتی، سندھ

○ بابا جی! پچھلے سال میں اپنے شوہر کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ میرے شوہر شوگر فیکٹری میں اچھی پوسٹ پر کام کرتے ہیں۔ مراعات بھی ہیں مگر بابا جی! میں یہاں خوش نہیں' بالکل گاؤں جیسا ماحول ہے۔ کہیں باہر آیا جایا بھی نہیں جاتا۔ میں چاہتی ہوں' میرے شوہر کی پوسٹنگ کسی بڑے شہر میں ہو جائے۔ یہاں میرے بچوں کے لیے بھی ماحول سازگار نہیں۔ میں وظیفہ کرنے کے لیے تیار ہوں' بس بہت مشکل نہ ہو۔

☆ بیٹی نغمہ...... اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ حسب

استطاعت صدقہ خیرات ضرور کیا کرو۔ روزانہ سورۃ واقعہ نمازِ فجر یا نمازِ عشاء کے بعد پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ ارباز۔ شیخوپورہ

○ بابا سائیں! آپ نے میری بیوی کو اولاد کے لیے تعویذ دیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ خیریت کے ساتھ اللہ نے ہمیں بیٹی سے نوازا ہے۔ گھر والے سب بہت خوش ہیں۔ ہمارے خاندان کی یہ پہلی بچی ہے۔ بابا! ہم بھی 5 بھائی ہیں۔ میرے والد کے بھی کوئی بہن نہیں اور والدہ اکلوتی ہیں۔ ہمارے تو پورے خاندان میں بس عید کا ماحول ہے۔ بابا سائیں! یہ بتائیں کہ اب تعویذ کا کیا کروں؟

☆ بیٹے ارباز! اللہ تمہیں بہت خوشیاں عطا فرمائے۔ جن گھرانوں میں بیٹیوں کی پیدائش پر اللہ کا شکر ادا کیا جاتا ہے وہ بہت خوش نصیب ہیں اور اللہ ان پر ہمیشہ اپنا کرم رکھتا ہے۔ تعویذ تلف کردو اور خوب صدقہ خیرات کرو۔ بیٹے! زندگی میں ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کرتے رہا کرو بے شک وہ نہایت مہربان آقا ہے۔

□ سویرا۔ میر پور خاص۔

☆ بیٹی سویرا! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بہن سے کہو ہر نماز کے بعد 7 تسبیح اَلْلّٰہُ قادرُ کی ضرور پڑھے۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ فائزہ۔ کراچی

☆ بیٹی فائزہ! نماز پابندی سے ادا کیا کرو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 7-7 بار الحمد شریف پڑھو اول و آخر درود شریف پھر حاجت بیان کرو۔ مدت 2 ماہ ہے۔

□ عذرا۔ کراچی۔

☆ بیٹی عذرا! تمہارا خواب بہت اچھا ہے۔ اللہ تمہیں خوشیاں عطا فرمائے گا جو ساری دُنیا دیکھے گی۔ اس خواب میں تمہیں اللہ کی طرف رجوع کرنے کے بارے میں بھی کہا جا رہا ہے۔

☆☆.....☆☆

ہائیڈ پارک

ڈی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے گئے منتخب مراسلوں اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے

بزرگ کا جواب

سخت سردی کا موسم تھا۔ لوگ اپنے گھروں میں لحاف اوڑھے دبکے پڑے تھے۔ بادشاہ محمود غزنوی کسی ضروری کام کے لیے باہر نکلے۔ ایک جگہ سے گزر ہوا تو انہوں نے دیکھا کہ ایک فقیر تنور کے قریب لیٹا ہوا ہے۔ اس قدر شدید سردی میں کھلے آسمان کے نیچے اس طرح فقیر کا لیٹنا بادشاہ کے لیے حیرانی کا باعث ہوا، لیکن کام میں مصروف رہنے کی وجہ سے وہ اس بات کو بھول گئے، جب صبح ہوئی تو بادشاہ کو فقیر کا سردی میں تنور کے پاس سونا یاد آیا۔ ایک خادم کے ذریعہ فقیر کو بلوایا۔ جب فقیر دربار میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے پوچھا۔

''بابا! رات کو میں نے آپ کو تنور کے پاس سوتے دیکھا۔ شدید سردی تھی۔ بتایئے رات کیسی گزری؟''

فقیر نے نہایت بے تکلفی سے جواب دیا۔

''محمود! آدھی رات تمہاری طرح گزری اور آدھی رات تم سے بہتر گزری۔''

محمود غزنوی یہ سن کر اور بھی زیادہ حیران ہوئے اور کہا۔

''بابا! آپ اپنی بات واضح کریں، میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' فقیر بولا۔

''بات یہ ہے کہ آدھی رات تک تنور گرم رہا۔ اس کی گرمی سے مجھے نیند آگئی۔ سو جانے کے بعد بادشاہ اور فقیر ایک طرح کے ہوتے ہیں۔ اس لیے پہلی آدھی رات تو تمہاری طرح گزری لیکن جب تنور ٹھنڈا ہو گیا تو پھر مجھ کو نیند نہ آئی اور میں خدا تعالیٰ کی عبادت میں مصروف ہو گیا۔ رات کا یہ حصہ تم سے بہتر گزرا۔'' یہ جواب سن کر محمود غزنوی حیران رہ گئے۔

حسنِ انتخاب: نعمان احمد آرائیں۔ کوٹری

تم نہ سمجھو گے

جس وقت تم یہ کہہ رہے تھے کہ چھوڑو یار تم نہ سمجھو گے۔ دراصل اس وقت تم یہ بالکل نہیں سمجھ رہے تھے کہ میں تمہارے بغیر بتائے بہت کچھ سمجھ چکا ہوں۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنی زبان سے بتا کر اپنا کچھ غم ہلکا کر لو پر جب تم نے یہ کہا کہ تم نہ سمجھو گے تو میں فوراً سمجھ لیا کہ تم مجھے اپنا نہیں سمجھتے افسوس ہے تمہاری ناسمجھی پر کہ تم اتنا بھی نہ سمجھے کہ میں تمہیں اپنا سمجھتا ہوں اور اسی لیے تو تمہارے بغیر بتائے سب کچھ سمجھ گیا ہوں لیکن ہائے افسوس کہ تم مجھے نہ سمجھو گے۔

حسنِ انتخاب: اسد اللہ سائگی، رحیم یار خان

راہِ زندگی

انسان کے کئی روپ ہوتے ہیں۔ ماں، باپ، بہن، بھائی، میاں، بیوی، دوست یا سہیلی۔ ہر ایک کی اپنی جگہ قدر و قیمت ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی بعض انسان تنہائی کا سہارا لیتے ہیں۔ ایسی تنہائی جہاں ان کے قیمتی

آنسو سوائے رب العالمین کے کوئی نہ دیکھ پائے۔ ویسے تو کمزوریاں ہر انسان میں موجود ہیں، مگر کوئی بھی رشتہ آپ کی کمزوریوں کو نہیں پہچان سکتا۔ جب تک آپ خود اپنی کمزوری کو پہچان لیں۔ یہ طے ہے کہ کوئی بھی انسان اس وقت تک خود سے مطمئن نہیں ہو سکتا، جب تک اس کی اپنی کوئی شناخت نہ ہو۔ ممکن ہے کہ دوسروں سے امیدیں وابستہ کر کے آپ اپنی قدر و قیمت بھی کھو دیں۔ لہٰذا انسان کی بہترین ساتھی اس کی اپنی تنہائی ہے۔ جسے اپنا کر وہ بہت صابر ہو جاتا ہے۔ کوئی بھی آپ کو مکمل اطمینان یا خوشی نہیں دے سکتا اور ایک مکمل انسان اس وقت بنتا ہے، جب اللہ پر کامل یقین ہو کہ میرے رب نے میرے بارے میں بہترین فیصلے کیے ہیں۔ انسان کا سوز زندگی اس وقت سہل ہو جاتا ہے جب وہ خود کو مکمل طور پر پہچان کر، اپنا آپ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیتا ہے۔

حسنِ انتخاب: شازیہ گل۔ بھیر کنڈ

چار اشعار

کوئی نہ گیت پیار کے گائے اندھیری رات میں
کب ملتے ہیں دوستو! سائے اندھیری رات میں
غم کے بھیس میں ہمیں زندگی نئی ملی
روشنی ہے دور جب آئے اندھیری رات میں
چاندنی میں چل دیے دل میں بات ڈال کر
آج کیا ہے آپ کی رائے اندھیری رات میں
سوچتا ہوں ہاتھ میں لے کے یاد کے چراغ
کچھ اندھیرے اور ہیں پائے اندھیری رات میں

شاعر: محمد قاسم خان بلوچ۔ ضلع ٹوبہ 184 گ ب

افسانچہ

تم مجھے اپنے اپنے سے کیوں لگتے ہو۔ کیوں میرا جی چاہتا ہے کہ تم آنکھوں کے سامنے رہو۔ آخر کیوں؟ کہیں مجھے تم سے محبت تو نہیں...... ہاں...... شاید! مجھے تم سے محبت ہے اور شدید محبت ہے۔ دن کے آغاز میں جب تک تم سامنے نہ ہو میری آنکھیں کھل نہیں پاتیں اور جب تم پاس ہوتے ہو نا۔ میری روح تک سرشار ہو جاتی ہے۔ زندگی حسین دکھتی ہے، پھول کھلتے محسوس ہوتے ہیں، خوشبوؤں کے میلے لگتے ہیں، ہاں جب تم سامنے ہوتے ہو۔ میری زندگی کا وجود بس تم سے ہے۔ میری سانسیں تمہیں دیکھ دیکھ کر چلتی ہیں۔ اُف میں حیران حیران رہ جاتی ہوں۔ اپنی ہی محبتوں پہ کہ میں تمہیں کس قدر چاہتی ہوں۔

اور جانتے ہو یہ چاہت ہی ہے کہ مجھے تمہارا ساتھ اچھا لگتا ہے، اچھا لگتا ہے اور خدا کرے تمہارا ساتھ ہمیشہ رہے۔ بس تمہیں دیکھ دیکھ جیوں۔

اے میری چائے کے "مگ"

زورِ قلم: عظمیٰ شکور۔ اسلام آباد

ذرا سوچیے

لڑکے والے ایسی لڑکی کی تلاش میں تھے جو ان کے لڑکے کے برابر ہو تعلیمی لحاظ سے اور اس کے علاوہ امورِ خانہ داری سے بھی اچھی خاصی واقف ہو اور تو اور نوکری بھی کرتی ہو، ورنہ آج کے اس دورِ جدید میں بغیر نوکری والی بیوی تو ایسی ہے جیسے بغیر چینی کے چائے اگر چہ فہرست فرمائش دیکھ کر تو یہی خیال آتا ہے کہ ایسی لڑکی تو خداوند کریم سے آرڈر دے کر ہی تیار کروائی جا سکتی ہے لیکن قربان جاؤں، ڈھونڈنے والی نظر پہ انہیں اپنے مطلب کی لڑکی مل ہی گئی، پر افسوس کہ لڑکی کی عمر لڑکے کی عمر کے برابر معلوم ہوتی تھی اب یہ تو ازل سے اصول رہا ہے کہ لڑکی کی عمر لڑکے کی عمر سے قدرے کم ہونی چاہیے۔ لہٰذا رشتے سے انکار ہو گیا، صاحب ذرا سوچیے، آپ کے انکار سے تو لڑکی کی عمر اور بڑھ جائے گی اور ویسے بھی کم عمری میں نہ تو اعلیٰ تعلیم مکمل ہوتی ہے اور نہ ہی نوکری ملتی ہے۔

حسنِ انتخاب: حسین خواجہ۔ مخین آباد

کیوں بھول گئے......!

کیوں بھول گئے تم! اے میرے بچوں!
وہ بچپن کا پیار، وہ بانہوں کا ہار
وہ چاہت بے شمار!

کیوں بھول گئے تم؟ اے میرے بچو!
وقت نے کیسی کروٹ لی
تم ہو گئے ہم سے دور......
تم سنگ دیکھے جو سپنے، وہ ہو گئے سارے چُور
اے میرے بچو!
وہ دن کی فقط چاہت کے لیے
ہم کو بھلا تم نے کیوں ٹھکرایا
کیا خوب تماشا دکھلایا
جنت بھی اپنی گنوا بیٹھے
دنیا میں بھی حاصل رسوائی!
کیوں بھول گئے تم؟ اے میرے بچو!
لوٹ کے اب تم آ جاؤ!
اس دل کی تڑپ کو دور کرو
سینے سے آ کر لگ جاؤ
دنیا اور جنت چمکاؤ!
اے میرے بچو!

شاعرہ: ثمینہ ناز۔ اورنگی ٹاؤن۔ کراچی

فریاد

دو عورتیں ایک درخت کے نیچے بیٹھی کافی دیر سے باتیں کر رہی تھیں کہ اچانک درخت سے ایک آم گر گیا۔ یہ دیکھ کر ایک عورت بولی۔
"یہ آم کیسے گرا ہے؟"
ابھی دوسری عورت کچھ بولنے ہی لگی تھی کہ آم خود بول پڑا۔
"اللہ کے واسطے چپ ہو جاؤ، تمہاری باتیں سُن سُن کر میں پک بلکہ تپ گیا تھا، اس لیے گر پڑا ہوں۔"

مرسلہ: شعبان کھوسہ۔ کوئٹہ

آپ بھی جانیے

☆...... سلطان ابراہیم غزنوی ہر سال اپنے ہاتھ سے قرآن مجید لکھتا تھا۔
☆...... پنجابی زبان میں سب سے پہلے قرآن مجید کا ترجمہ حافظ محمد لکھوی نے کیا تھا۔
☆...... حرم شریف کے اندر دنیا کی چھ زبانوں کی گھڑیاں لگی ہوئی ہیں۔
☆...... درختوں میں سب سے پہلے کھجور کا درخت پیدا ہوا۔
☆...... رکشا جاپان نے ایجاد کیا۔
☆...... دنیا میں سب سے زیادہ سگریٹ نوشی امریکا میں ہوتی ہے۔

مرسلہ: جمیل جاوید۔ سرگودھا

زندگی! مضامین کی زبان میں

☆...... اسلامیات، خدا کی عطا کردہ ایک بہت بڑی نعمت ہے، اس لیے اس کا جتنا شکر ادا کیا جائے، کم ہے۔
☆...... فزکس، ایک اسراع ہے۔ محبت، اعتماد اور خلوص کی سمت میں جتنی گنجائش بڑھتی جائے گی، اتنا ہی مثبت اسراع بڑھتا جائے گا۔
☆...... کیمسٹری، وہ مالیکیول ہے، جو عزم اور اعتماد کے ایٹم سے مل کر بنتا ہے۔
☆...... ریاضی، وہ عدد ہے، جو محبت اور خلوص کو جمع کرنے سے حاصل ہوتا ہے، اسے بڑے سے بڑا نفرت جیسا عدد بھی تقسیم نہیں کر سکتا۔

مرسلہ: اسامہ بلال اعوان۔ لاہور

نشانہ

شہر میں ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان فساد برپا تھا۔ ہندوؤں کے علاقے میں ان کے ہاتھ ایک سکھ لگ گیا۔ اس پر خوب تشدد کیا گیا۔ داڑھی اور سر کے بال اس طرح کاٹ دیے گئے کہ وہ بالکل ہندو معلوم ہو پھر اسے خوب مار پیٹ کر چھوڑ دیا گیا۔
اسی شام ایک ہندو سکھوں کے ہاتھ لگ گیا۔ پہلے اسے خوب مارا پیٹا گیا اور پھر ایک کھمبے سے باندھ دیا گیا۔ اس نے چیخ چیخ کر کہا کہ میں سکھ ہوں، ہندو نہیں مگر اس کی کون سنتا۔ لوگوں نے اس کا سر پھاڑ دیا۔
اگلی صبح دونوں علاقوں کے واقعات اخبار میں آئے اور تصویر بھی۔ لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ

دونوں تصویریں ایک ہی شخص کی تھیں۔
مہر پرویز احمد۔میاں چنوں

خیریت

ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد دو دوست تارا سنگھ اور بادل سنگھ ایک دوسرے سے ملحقہ گاؤں میں زندگی کے دن گزارنے لگے۔ ایک روز تارا سنگھ نے بادل سنگھ کو رات کے کھانے پر بلایا۔ بادل سنگھ نے رات کا خیال کرتے ہوئے لالٹین اپنے ہمراہ لے لی۔ دعوت رات گئے تک جاری رہی۔ جس کے بعد بادل سنگھ نشے کی حالت میں لالٹین وہیں بھول کر اپنے گھر چلے گئے۔

اگلی صبح ان کے دروازے پر دستک ہوئی۔ بادل سنگھ نے دیکھا تو تارا سنگھ کا ملازم کھڑا تھا۔ اس نے پوچھا۔

''سردار جی نے مجھے یہ پتا کرنے بھیجا ہے کہ آپ اپنے گھر خیر خیریت سے پہنچ گئے تھے؟''

بادل سنگھ نے خوش ہو کر بتایا کہ وہ بڑے اچھے طریقے سے گھر پہنچ گئے تھے۔

''مگر آپ کی لالٹین تو ہمارے گھر ہی رہ گئی تھی، وہ میں واپس کرنے آیا ہوں۔'' ملازم نے بتایا۔

''تو پھر میں رات کو لالٹین کی جگہ کیا اٹھا لایا تھا؟'' بادل سنگھ نے حیرت زدہ ہو کر ملازم سے پوچھا۔

ملازم نے اپنی ہنسی چھپاتے ہوئے کہا۔
''ہمارے طوطے کا خالی پنجرہ۔''

اجالا لطیف۔کراچی

غزل

اے غمِ یار فرصت یک گام ہو اگر
مجھ پہ بھی یہ گراں بہا انعام ہو اگر
تیرا بیمارِ غم کیوں نہ ہو محوِ رقص
'فہرست چارہ گراں' میں تیرا نام ہو اگر
خاک نشینوں کو دے دوں تیرا تختِ شاہی
میرے بس میں تیرے جہاں کا انتظام ہو اگر
جراتِ انکارِ فضیلت اہل جنوں نہ ہو تجھے
تجھ پر بھی یہ لطفِ الہام ہو اگر
افشاں محروم قربتِ حسن رہتا نہیں کوئی
بات اتنی ہے نگاہِ طلب میں احترام ہو اگر
شاعر: نزاہت افشاں۔فتح جنگ

نیپچون کی دریافت

25 ستمبر 1846ء کو نظام شمسی کا آٹھواں سیارہ دریافت ہوا' جس کا نام نیپچون رکھا گیا۔ یہ پہلا سیارہ تھا جسے دیکھنے کی بجائے پہلے علم ریاضی سے اس کا مقام اور اس کا زاویہ معلوم کیا گیا اور پھر جب اس کے مدار اور مقام کا تعین ہو گیا تو اسے تلاش کر لیا گیا۔
مرسلہ۔عمر العطاس' کراچی۔

خود کو میرا رہنے دیتے

کچھ دیر کے لیے تو مجھے تنہا رہنے دیتے
اپنی یادوں کو میرے دل میں بسا رہنے دیتے
اک درد دل میں چھپا ہوا تھا کب سے
اس درد کو تو آنسوؤں میں بہہ جانے دیتے
میرے دل نے تم سے صرف اتنا ہی مانگا تھا
تمہاری مہربانی ہوتی اگر خود کو میرا رہنے دیتے
میری زباں پہ آئے ہوئے الفاظ کیوں روک لیے تھے
وہ الفاظ تو مجھے اپنے آپ سے کہنے دیتے
میری آنکھوں کے سامنے کسی اور کو اپنا لیا
کاش مجھے اس دنیا سے گزر جانے دیتے
شاعرہ: عمارہ ناز۔کمالیہ

رشتے

کھلے زندگی کے راز ہم پہ کتنے
دل کے نہاں خانوں میں خزانے چھپے کتنے
زباں ہے خاموش آنکھیں ہیں بولتی
نگاہوں کو سمجھنے والے ہیں یہاں کتنے
ٹوٹ سا جاتا ہے دل کبھی یہ سوچ کر
رشتے بچے ہیں پاس میرے اب کتنے
شاعرہ: شبانہ نسیم۔کراچی

ایک لڑکا رشتے کے سلسلے میں لڑکی دیکھنے گیا۔
لڑکے کو لڑکی پسند آ گئی تو اس نے لڑکی سے پوچھا۔
"کیا آپ کے والد کی استطاعت ہے کہ وہ
شادی میں مجھے کار دے سکیں؟"
لڑکی نے جواب دیا۔ "میرے ابا کی حیثیت تو
ہوائی جہاز دینے کی ہے، کیا آپ کے ابا کی حیثیت
ایئرپورٹ بنانے کی ہے؟"

مرسلہ: عریبہ اشفاق۔ کراچی

بارش

تم کیا جانو۔۔۔ یہ بارش کیا کہتی ہے؟
یہ بجلی کی چمک اور جب گرا کرتی ہے، ہزاروں غم
لے کر ماتم کرتی ہے۔
یہ بارش کسی دل کے ساز چھیڑتی ہے، کبھی
آنکھیں نم کر دیتی ہے، کبھی صحرا میں پھول کھلاتی
ہے، کبھی زرد پتوں کو ہرا کر دیتی ہے۔
تم کیا جانو۔۔۔ یہ بارش کیا کہتی ہے؟
مگر جب بچھڑ جاتی ہے، کبھی یادوں میں ہوتی ہے، کبھی
پیار ایک جدائی ہے۔
ادھر تم بھی دیکھو۔۔۔ تم بھی سن لو
یہ بارش بہت کچھ کہتی ہے۔

مرسلہ: ماہ جبیں محبوب۔ ڈی جی خان

کوزے میں دریا

☆ جس راستے سے پھول بکھرتا ہو جانا آسان اور
واپسی مشکل ہو، اس راستے سے پرہیز کریں۔
☆ ظالم کے ساتھ ذلت کی زندگی گزارنے سے
عزت کی موت بہتر ہے۔
☆ جسے اپنی عزت، آبرو اور وقار کا خیال ہو، بڑائی جھگڑے
سے کنارہ کشی ہو جاتے ہیں۔
☆ قلم ایک ایسی چیز ہے، جو بند کھول دیتا ہے
مگر کہیں بند کر دیتا ہے۔
☆ ان لوگوں سے عبرت پکڑو جو خود دوسروں سے
عبرت نہیں پکڑتے۔

چلتے ہیں، انسان کبھی اپنی فطرت جب کبھی پارہ تھے
شاعر کہاں سے آیا سو ان کو سمجھ نہیں آتی قبر کرنی
چاہیے ہی نہیں۔
☆ اگر تم ایمان، دلیری اور استقلال کے ساتھ
زندگی بسر کرو تو کوئی قوت تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتی۔
☆ جس کو اقتدار مل جاتا ہے وہ خود غرض
ہو جاتا ہے۔

مرسلہ: محمود شریف۔ کراچی

ریلوے لائن

27 ستمبر 1825ء کو انگلستان میں اسٹاکٹن سے
ڈارلنگٹن تک دنیا کی پہلی ریلوے لائن کا افتتاح
ہوا۔ یہ ٹرین 38 ڈبوں پر مشتمل تھی، جس میں تقریباً
250 مسافر سوار تھے۔ اس ٹرین کو جارج اسٹیفنسن کا
بنایا ہوا انجن کھینچ رہا تھا۔ اس کی
رفتار 12 میل فی گھنٹہ تھی اور اس نے اس کا فاصلہ
65 منٹ میں طے کیا تھا۔

مرسلہ: حوریہ فاطمہ۔ کراچی

محبت کیا ہے

مشہور دانشور کنفیوشس جب انتقال ہونے لگے تو
شاگرد نے جا کر دریافت کیا۔
"مشہور! محبت کیا ہے؟"
اس نے کہا کہ سوال کسی اور سے پوچھو۔ دوسرے دن
اسے ایک کی طرف لے جایا اور ہاتھ پکڑا کہنے لگے۔
اس نے اس سے کہا۔
"محبت کی ابتدا تو ہوتی ہے، انتہا نہیں ہوتی۔"

مرسلہ: نور العین۔ اسلام آباد

ایک شعر

جانتا ہے مجھے بچھڑوں سے شغف ہے اس نے
میری تصویر بنائی بھی تو رونے کے لیے

شاعر: ۔ کاوش کا پسندیدہ: شبانہ احمد۔ کراچی

تیر نیم کش

قارئین

اپنی سخن فہمی کو آزمایئے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں
نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے۔

رضوانہ کوثر۔ لاہور

اپنے بالوں کی سفیدی سے لرز جاتا ہوں
زندگی اب تری رفتار سے ڈر لگتا ہے

کنول جی تنہا۔ گگو منڈی

اے روشنی کی لہر کبھی تو پلٹ کے آ
تجھ کو بلا رہا ہے دریچہ کھلا ہوا

ابوہریرہ بلوچ۔ بورے والا

اتنا تو کسی نے چاہا بھی نہ ہوگا ساقی
جتنا میں نے صرف تمہیں سوچا ہے

ذیشان خان۔ نیو چڑ کالونی۔ کراچی

شکوے شکایتوں کی نہیں نہ ظرف ظرف کی بات ہے
ترے وہم وگمان میں بھی ہم نہیں تو لفظ لفظ ہمیں یاد ہے

ابوذر غفاری۔ بورے والا

پھر یوں ہوا کہ یاد کی انگلی پکڑ کے ہم
اتنا چلے کہ راستے حیران ہوگئے

خضر حیات۔ روڈہ تھل

عشق عبادت ہے اسے کھونے مت دینا
بے وفائی گناہ ہے اسے ہونے مت دینا
اگر تم نے بھی کسی سے پیار کیا ہے
تمہیں رب کی قسم ہے اُسے رونے مت دینا

ثمینہ ناز۔ اورنگی ٹاؤن۔ کراچی

اتنا سا حق مانگتا ہوں تیرے وجود میں اپنا
کہ فصلِ تنہائی ہو جب تو 'اپنا خیال رکھنا'

عبدالغفار عابد۔ چیچہ وطنی

میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے آپ سے پوچھ
کیا میں تیری جھوٹی قسمیں کھا سکتا ہوں

نزابت افشاں۔ جھورہ، فتح جنگ

عجیب رسم ہے چارہ گروں کی محفل میں
لگا کے زخم نمک سے مساج کرتے ہیں

حسین خواجہ۔ مچن آباد

تھک ہار کے بیٹھے ہیں سرِ کوئے تمنا
کام آئے تو پھر جذبۂ ناکام ہی آئے

شازیہ گل۔ بھیر کنڈ

ضرورت جب بھی تھی مجھ کو کسی کے ساتھ ہونے کی
ان ہی مخصوص لمحوں میں مجھے اپنوں نے چھوڑا ہے

سلیمان شبیر۔ اکوال، تلہ گنگ

کیسی محبت کیسی چاہت، ہم پر سب کچھ روشن تھا
یوں ہی ذرا سا شوق ہوا تھا آؤ دل برباد کریں

ایم افضل آزاد۔ ساہیوال

اچھا خاصا بیٹھے بیٹھے گم ہو جاتا ہوں
اب میں اکثر میں نہیں رہتا تم ہو جاتا ہوں

ایم یعقوب احمدانی۔ ڈی جی خان

دنیا ہنسانے والی، دنیا رُلانے والی دوست
ابھی ضبط رکھو، ابھی بہت کچھ ہونا باقی ہے

مقصود احمد بلوچ۔ میاں چنوں

رات سڑکوں پہ بیت جاتی ہے
گھر کے بستر اُداس رہتے ہیں

علی اصغر۔محسن آباد

نہ سر اٹھانے کی فرصت نہ بات کرنے کی
اسیر وقت ہوں اور دشتِ امتحان میں ہوں

اسداللہ سانگی۔رحیم یار خان

وہ سرخرو ہے سرمد و منصور کی طرح
الزام سارے میری وفاؤں پہ آئے ہیں

ثناءاللہ۔رحیم یار خان

نہ پوچھو کس لیے غم سہنے کی قوت زیادہ ہے
ہمارے حلقۂ احباب کی وسعت زیادہ ہے
ہمارے عہد کے لوگوں کی آنکھیں غور سے دیکھو
ہجومِ آرزو اتنا نہیں وحشت زیادہ ہے

نبیل جاوید۔سرگودھا

میں ایسے شخص کو زندوں میں کیا شمار کروں
جو سوچتا بھی نہیں خواب دیکھتا بھی نہیں

فیضان خورشید۔کوٹری

ملے ہو بعد مدت کے تو کرلو کچھ توقف بھی
خدا معلوم کتنے ہجر کے پھر سال رکھے ہیں

رانا حبیب الرحمٰن۔ڈسٹرکٹ جیل ٹوبہ ٹیک سنگھ

جواب اس کے خط کا میں لکھوں گا کیا
لفافہ ہی مجھ سے کھلا تک نہیں

قاسم خان بلوچ۔ٹوبہ ٹیک سنگھ

اس عشق بے مثال نے اچھا نہیں کیا
اپنے غموں کی ڈھال نے اچھا نہیں کیا
ٹھیک ہے کہ آپ نے رستہ بدل دیا
تحسین میرے خیال سے اچھا نہیں کیا

سبحان علی۔جارشورہ

کون کہتا ہے کہ حالات بدل جاتے ہیں
شعبدہ گر کے کمالات بدل جاتے ہیں

افضال حسین بابر۔کراچی

مسکرا کے پڑھ لینا پیار کی کہانی کو
گو کہ ہم نے اشکوں سے اختتام لکھا ہے

تنویر فاطمہ۔کراچی

لمبی بہت تھی شامِ غم دل میں بھی تھے کئی الم
جاگتے ہم کہاں تلک پچھلے پہر ہی سو گئے

انگبین خان۔ہزارہ

نسبتیں کتنی ٹوٹ جاتی ہیں
جب عداوت ہو خاندانوں میں

معاویہ عمر وٹو۔ہڑپہ سٹی

سولی پہ جبر کی کبھی دیکھا گیا انہیں
رسموں پہ ہو گئیں کبھی قربان بیٹیاں
ماں باپ کے گھر دل سے اچانک چلی گئیں
جیسے ہوں گھر میں باپ کے مہمان بیٹیاں

کاشف عبید۔بٹ گرام

تیری دنیا چھوڑ کے ساجن اب ہم کو آرام بہت ہے
پیار محبت ایک حقیقت لیکن ہم کو کام بہت ہے

ایم نعمان۔شارجہ

سکوں رسا تو بہت ہے خیال
تو سامنے ہو تو وحشت سی ہونے لگتی ہے

ممتاز اقبال اعوان۔لاہور

پیڑ کو دیمک لگ جائے یا آدم زاد کو غم
دونوں ہی کو امجد ہم نے بچتے دیکھا کم

کوپن برائے

تیرِ نیم کش

اگست 2016ء

میرا یہ پسندیدہ شعر "سچی کہانیاں" کی نذر ہے

نام

پتا

علی اصغر۔مخن آباد

نہ سر اٹھانے کی فرصت نہ بات کرنے کی
اسیرِ وقت ہوں اور دشتِ امتحان میں ہوں

اسداللہ سانگی۔رحیم یار خان

وہ سرخرو ہے سرمد و منصور کی طرح
الزام سارے میری وفاؤں پہ آئے ہیں

ثناءاللہ۔رحیم یار خان

نہ پوچھو کس لیے غم سہنے کی قوت زیادہ ہے
ہمارے حلقۂ احباب کی وسعت زیادہ ہے
ہمارے عہد کے لوگوں کی آنکھیں غور سے دیکھو
ہجومِ آرزو اتنا نہیں وحشت زیادہ ہے

نبیل جاوید۔سرگودھا

میں ایسے شخص کو زندوں میں کیا شمار کروں
جو سوچتا بھی نہیں خواب دیکھتا بھی نہیں

فیضان خورشید۔کوٹری

ملے ہو بعد مدت کے تو کرلو کچھ توقف بھی
خدا معلوم کتنے ہجر کے پھر سال رکھے ہیں

رانا حبیب الرحمٰن۔ڈسٹرکٹ جیل ٹوبہ ٹیک سنگھ

جواب اس کے خط کا میں لکھوں گا کیا
لفافہ ہی مجھ سے کھلا تک نہیں

قاسم خان بلوچ۔ٹوبہ ٹیک سنگھ

اس عشق بے مثال نے اچھا نہیں کیا
اپنے غموں کی ڈھال نے اچھا نہیں کیا
ٹھیک ہے کہ آپ نے رستہ بدل دیا
لیکن میرے خیال سے اچھا نہیں کیا

سبحان علی۔جامشورو

کون کہتا ہے کہ حالات بدل جاتے ہیں
شعبدہ گر کے کمالات بدل جاتے ہیں

افضال حسین بابر۔کراچی

مسکرا کے پڑھ لینا پیار کی کہانی کو
گو کہ ہم نے اشکوں سے اختتام لکھا ہے

تنویر فاطمہ۔کراچی

لمبی بہت تھی شامِ غم دل میں بھی تھے کئی الم
جاگتے ہم کہاں تلک پچھلے پہر ہی سو گئے

انجلین خان۔ہزارہ

نسبتیں کتنی ٹوٹ جاتی ہیں
جب عداوت ہو خاندانوں میں

معاویہ عنبر وٹو۔ہڑپہ سٹی

سولی پہ جبر کی کبھی دیکھا گیا انہیں
رسموں پہ ہوگئیں کبھی قربان بیٹیاں
ماں باپ کے گھروں سے اچانک چلی گئیں
جیسے ہوں گھر میں باپ کے مہمان بیٹیاں

کاشف عبید۔بٹ گرام

تیری دنیا چھوڑ کے ساجن اب ہم کو آرام بہت ہے
پیار محبت ایک حقیقت لیکن ہم کو کام بہت ہے

ایم نعمان۔شارجہ

سکوں رسا تو بہت ہے خیال
تو سامنے ہو تو وحشت سی ہونے لگتی ہے

ممتاز اقبال اعوان۔لاہور

پیڑ کو دیمک لگ جائے یا آدم زاد کو غم
دونوں ہی کو امجد ہم نے بچتے دیکھا کم

میرا یہ پسندیدہ شعر ''سچی کہانیاں'' کی نذر ہے

نام

پتا

کوپن برائے

تیر نیم کش

اگست 2016ء